الحمد لائبریری
0314.595.1212
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# کلیاتِ منٹو

## (منٹو کے خاکے)

تحقیقِ متن و تدوین

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

صدر شعبۂ اردو، بوکارو اسٹیل سٹی کالج

بوکارو (جھارکھنڈ)


ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی



Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

© جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ!

KULLIYAT-E-MANTO
(MANTO KE KHAKE)

by

Dr. Humayun Ashraf

Year of Ist Edition 2005
ISBN 81-8223-090-x

Price Rs. 400/-

| | |
|---|---|
| نام کتاب | کلیاتِ منٹو (منٹو کے خاکے) |
| تحقیقِ متن وتدوین | ڈاکٹر ہمایوں اشرف |
| سنِ اشاعتِ اوّل | ۲۰۰۵ء |
| قیمت | ۴۰۰ روپے |
| مطبع | عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی |
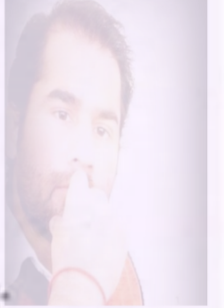
Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162, 23214465 Fax: 0091-011-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# انتساب

استادِ محترم

معتبر نقاد
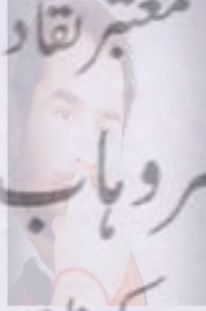
## پروفیسر وہاب اشرفی

کے نام

جن کی نظر ہمارے عہد کے ادبی اسالیب و فکریات پر
امتیاز اور اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔

○
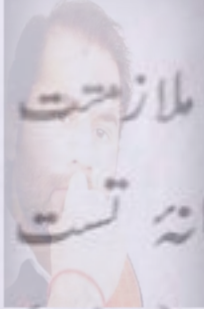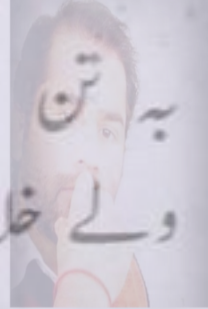
بہ تن مُقصّرم از دولتِ ملازمتت
ولے خلاصۂ جاں خاکِ آستانۂ تست
(حافظ)

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| ☆۔ | تقریب | پروفیسر وہاب اشرفی | ۹ |
| ☆۔ | منٹو نامہ | ڈاکٹر ہمایوں اشرف | ۱۱ |
| ☆۔ | کچھ منٹو کے خاکے کے بارے میں | ڈاکٹر ہمایوں اشرف | ۳۵ |
| ☆۔ | گنجے فرشتے (پیش لفظ) | سعادت حسن منٹو | ۵۴ |
| ۱۔ | آغا حشر سے دو ملاقاتیں | | ۶۱ |
| ۲۔ | اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں | | ۷۳ |
| ۳۔ | اشوک کمار | | ۸۴ |
| ۴۔ | انور کمال پاشا | | ۱۰۰ |
| ۵۔ | بابوراؤ پٹیل | | ۱۰۶ |
| ۶۔ | باری صاحب | | ۱۱۸ |
| ۷۔ | پارو دیوی | | ۱۴۱ |
| ۸۔ | پراسرار نینا | | ۱۵۴ |
| ۹۔ | پری چہرہ نسیم بانو | | ۱۷۱ |
| ۱۰۔ | تپش کشمیری | | ۱۸۶ |
| ۱۱۔ | تین گولے | | ۱۹۴ |
| ۱۲۔ | چراغ حسن حسرت | | ۲۰۶ |
| ۱۳۔ | دیوان سنگھ مفتون | | ۲۲۰ |


الحمد لائبریری
بس بک گروپ
کتابیں پڑھنے
0314 .595. 1212
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

۱۴۔ رفیق غزنوی ۲۳۱

۱۵۔ ستارہ ۲۵۱

۱۶۔ سعادت حسن منٹو ۲۷۴

۱۷۔ عصمت چغتائی ۲۷۹

۱۸۔ کشتِ زعفران ۲۹۷

۱۹۔ کے کے ۳۰۷

۲۰۔ مرلی کی دھن ۳۱۵

۲۱۔ میرا صاحب ۳۳۵

۲۲۔ نرگس ۳۵۱

۲۳۔ نواب کاشمیری ۳۶۸

۲۴۔ نور جہاں ۳۷۳

☆ اشاریہ ۴۰۵


☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری
0314 ,595, 1212

# تقریب

"منٹو کے خاکے" دراصل اُس انسائیکلوپیڈیا کا حصہ ہے جو منٹو کی تمام نگارشات پر مبنی ہے۔ منٹو یوں تو ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ملکی اور بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔ لیکن اس کے خاکے کم اہم ہیں۔ ہوا یہ کہ اس کی افسانہ نگاری کی دھوم نے اس کی دوسری تخلیقی نگارشات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے لیکن حقیقتاً اس نے دوسری صنفوں میں بھی وہ کمال حاصل کیا ہے جو ہر لحاظ سے امتیازی ہے۔

منٹو کے خاکے میں شخصیتیں اپنی تمام تر کیفیتوں کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس کا فن دراصل خاکے کو صرف دلچسپ بنانے کا فن نہیں ہے بلکہ شخصیت کی خارجی اور داخلی احوال کو کشید کرنے کا فن ہے۔ لہٰذا اس کے یہاں جو شخصیتیں زیرِ بحث آئی ہیں، وہ ہماری آنکھوں کے سامنے اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ منٹو ہر جگہ اپنے کو منہا کر دیتا ہے، اس طرح کہ جو تصویریں ابھرتی ہیں، وہ اپنے آپ میں مکمل ہوتی ہیں۔ نہ کوئی آدمی فرشتہ ہوتا ہے، نہ ہی شیطان۔ ان دونوں کے بیچ ہی شخصیت کے تمام پہلو اُبھرتے ڈوبتے رہتے ہیں۔ یوں تو انسان کی فطرت ثانیہ بدلتی نہیں ہے لیکن منٹو نے کہیں کہیں اس کا احساس دلایا ہے کہ انسان بدلتا بھی ہے اور اس کے طور طریق میں تبدیلی بھی آتی ہے۔ منٹو کوئی نفسیات کا ماہر نہیں لیکن زندگی کو بغور پڑھنے میں اس سے آگے جانا شاید مشکل ہے۔ وہ خارجی خدوخال پر ہی نگاہ نہیں ڈالتا بلکہ ان کے اندرون میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ تمام داخلی اور خارجی امور صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف جو منٹو کے انسائیکلوپیڈیا کے مرتب ہیں، انہوں نے "کچھ منٹو کے خاکے کے بارے میں" کے عنوان سے ایک تفصیلی تحقیقی و تنقیدی مضمون قلمبند کیا ہے جو زیرِ نظر کتاب کا ایک جزو ہے۔ موصوف نے جہاں خاکے کی فنی حیثیت پر بحث کی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری
بس بک گروپ
0314 .595. 1212

ہے، وہیں منٹو کے بیشتر خاکوں کا جائزہ بھی لیا ہے۔ یہ جائزہ اپنے آپ میں اتنا مکمل ہے کہ مزید کچھ لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ مقالہ نگار نے کوشش کی ہے کہ معروضیت ہر جگہ قائم رہے اور وہ نکات جو منٹو کے خاکے کے سلسلے میں اہم اور مرکزی ہیں، وہ سامنے آجائیں۔ اس عمل میں انہوں نے ایک تو خاکے کے مواد سے بحث کی ہے تو دوسری طرف اس کی تکنیکی صورتوں پر بھی ایک نگاہ ڈالی ہے۔ ان کا محاکمہ عام طور سے قابل لحاظ ہے۔ کہیں محسوس نہیں ہوتا کہ کسی شخصیت کے جائزے میں ان کے اپنے تاثرات داخل ہو رہے ہیں۔ اس طرح خاکوں کے ہمہ جہت سمتوں سے آشنائی ہو جاتی ہے اور معاً طبیعت راغب ہوتی ہے کہ براہ راست اِن کا مطالعہ کیا جائے۔ گویا مقالہ نگار مصنّف تک پہنچنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔

ایسے مباحث میں فلم انڈسٹری کی کتنی ہی باوقار شخصیتیں سامنے آگئی ہیں۔ ان سب سے ہم بیک نظر آشنا ہو جاتے ہیں اور ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی مساعی کی تحسین کرتے ہوئے منٹو کے خاکے کی اہمیت کے قائل ہو جاتے ہیں۔

تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ رواں دواں ہو۔ اس میں اشکال نہ ہوں۔ ترکیبیں اس طرح استعمال نہ کی جائیں جو دور از کار ہوں۔ جملے مختصر اور پُر معنی ہوں۔ الفاظ سامنے کے ہوں۔ یہ ساری کیفیت ہمایوں اشرف کے متعلقہ مضمون میں پائی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اسلوب یہ رنگ ڈھنگ خود منٹو سے سیکھا ہو جس کا انفرادی انداز بیان، اپنی سلاست اور روانی میں یکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ منٹو کے خاکے پھر سے پڑھے جانے لگیں گے۔ یہ کتاب راقم الحروف کے نام ہی منسوب ہے۔ میں اسے اپنی عزّت افزائی سمجھتا ہوں۔

۲۵ر جولائی ۲۰۰۸ء

پروفیسر وہاب اشرفی
ہارون نگر، سیکٹر 2، پٹنہ

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
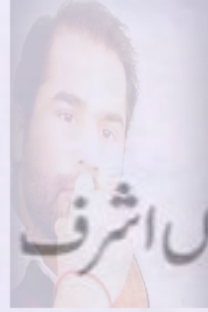
الحمد لائبریری
بس بک گروپ
0314.595.1212

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

# منٹو نامہ

**نام** : سعادت حسن

**قلمی نام** : منٹو (اصل نام سعادت حسن سے لکھنے کی ابتداء کی - بعد میں منٹو ہی اصل نام ہو گیا)

**فرضی نام**: مفکر، کامریڈ، آدم، ونٹم (ونٹم کے حروف الٹ دینے سے منٹو ہو جاتا ہے) اور خواجہ ظہیر الدین
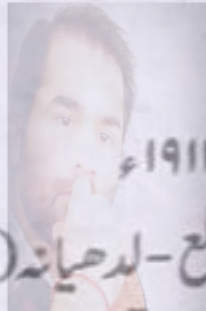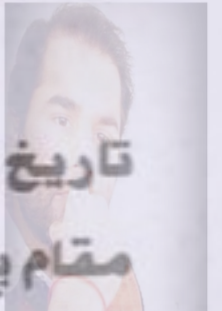
**تاریخ و سن پیدائش** : ۱۱رمئی ۱۹۱۲ء

**مقام پیدائش** : موضع - سمبرالہ، ضلع - لدھیانہ (لدھیانہ سے بائیس میل دور، چنڈی گڑھ جانے والی سڑک پہ واقع)

**نسل** : کشمیری

**ذات/ خاندان** : منٹو (اصل "من وٹی")

**والد کا نام** : خواجہ غلام حسن (موصوف بڑے دیندار، صوم وصلوٰۃ کے پابند اور کثیر الاولاد تھے - ان کی دو بیویاں تھیں - پہلی بیوی کا نام جان بی بی (بڑی بیگم) تھا - ان سے نو اولادیں ہوئیں - تین بیٹے خواجہ الحاج محمد حسن، خواجہ سعید حسن، خواجہ سلیم حسن اور چھ بیٹیاں ہوئیں - دوسری بیوی کا نام سردار بیگم تھا، جن کے بطن سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں - منٹو دوسری بی بی کی اولاد تھے - غلام حسن صاحب رسالہ "حقیقت اصلیت جہاد" اور "تحقیق اسلام" کے مصنف بھی تھے)

**پیشہ** : حکومت پنجاب کے محکمۂ عدل میں منصف (سب جج کے عہدہ سے ۷۰ رسال کی عمر میں سبکدوش ہوئے)

**وفات** : ۳رفروری ۱۹۳۲ء

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

**جد اعلیٰ:** خواجہ رحمت اللہ (کاروبار کے سلسلے میں انیسویں صدی کے اوائل میں کشمیر سے ترک وطن کر کے پنجاب پہنچے)

**دادا کا نام** : خواجہ جمال الدین **پیشہ** : تجارت

**پردادا کا نام** : خواجہ عبدالغفور **پیشہ** : تجارت

**مستقل مستقر** : کوچۂ وکیلاں، امرتسر

**قیام** : امرتسر، علی گڑھ، لاہور، دہلی اور بمبئی

**والدہ کا نام** : سردار بیگم (معروف چھوٹی بیگم، بڑی نیک اور نرم مزاج خاتون تھیں، سعادت حسن منٹو، ان کے ہی بطن سے تھے)

**وطن** : کابل **وفات** : جون ۱۹۴۰ **مدفن:** بمبئی
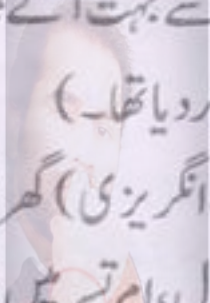
**تعلیمی لیاقت** : انٹرنس (Intrance) پاس (تھرڈ ڈویژن میں)

(منٹو کاغذی سند کے اعتبار سے بہت آگے نہیں تھے لیکن مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ نے اس کو بے حد حساس اور ذی علم کر دیا تھا۔)

- ابتدائی تعلیم (عربی، فارسی، اردو، انگریزی) گھر میں ہوئی۔
- ۱۹۲۱ء میں ایم۔اے۔او۔ مڈل اسکول، امرتسر میں چوتھی جماعت میں داخل ہوئے۔
- دسویں کے امتحان میں تین بار فیل ہوئے، چوتھی کوشش میں، مسلم ہائی اسکول، شریف پورہ، امرتسر سے ۱۹۳۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ (حیرت کی بات ہے کہ وہ برابر اردو کے مضمون میں ہی فیل ہوئے)
- ۱۹۳۱ء میں ہی ہندو سبھا کالج، امرتسر میں داخلہ لیا لیکن ایف۔اے پاس نہ کر سکے۔
- ۱۹۳۳ء میں ایم۔اے۔او کالج، امرتسر میں سال دوم کی جماعتوں کا اجراء ہوا تو منٹو اس کالج میں داخل ہو گئے (واضح رہے کہ اسی سال ایم۔اے۔او ہائی اسکول، امرتسر کا درجہ بڑھا کر اسے کالج بنایا گیا تھا)۔ منٹو، کالج میگزین "ہلال" کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے رہے لیکن امتحان میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ دوسری کوشش میں بھی پاس نہ ہو سکے۔
- ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں داخلہ لیا لیکن بیماری کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور اسی سال واپس ہو گئے۔ (دق کے عارضے کی وجہ سے انہیں علی گڑھ یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔)

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

**قابل ذکر اساتذہ** : خواجہ محمد عمر جان، فیض احمد فیض اور صاحبزادہ محمود الظفر

**قابل ذکر ہم جماعت** : ابو سعید قریشی، خواجہ حسن عباس، اسرار الحق مجاز، جاں نثار اختر، معین احسن جذبی، شاہد لطیف، علی سردار جعفری

**قریبی دوست** : ابو سعید قریشی (مصنف۔ ''منٹو: رحم دل دہشت پسند'')، خواجہ حسن عباس، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، ن۔م۔ راشد، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، بلونت گارگی، میرا جی، بہزاد لکھنوی، لالہ حفیظ جاوید، رفیع پیر، چٹو پادھیائے، کمال امروہوی، حسرت لکھنوی، نذیر اجمیری، ناظم پانی پتی، غلام حیدر، اشوک کمار۔

**ابتدائی ادبی تربیت** : منٹو کو زمانہ طالب علمی سے ہی ادب سے لگاؤ تھا اور وہ روسی مصنفین روسو، مارکس، لینن، ٹرائسکی، اسٹالن، گورکی، وکٹر ہیوگو کی کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔ انگریزی زبان میں انہیں دسترس حاصل تھی۔ اپریل ۱۹۳۳ء میں جب منٹو بارہویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کی ملاقات باری علیگ سے ہوئی جو ان دنوں روزنامہ ''مساوات'' امرتسر کے ایڈیٹر تھے۔ خود منٹو نے لکھا ہے کہ اس ملاقات کے بعد شعر و ادب سے ان کی دلچسپی بڑھنے لگی اور ان کا زیادہ وقت ''مساوات'' کے دفتر میں کٹنے لگا۔

**ادبی رہنمائی** : باری علیگ، اختر شیرانی

(منٹو کی ذہنی تشکیل میں ان کے دوست فلسفی اور راہبر باری علیگ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے ہی منٹو کو تحریر و تصنیف کے راستے پر ڈالا تھا۔ منٹو کا رشتہ ادب و سخن سے استوار کرانے میں باری صاحب کا ہاتھ تھا۔ منٹو نے بارہا اس امر کا اعتراف خلوص دل سے کیا ہے۔ دیکھئے ''آج کل میں جو کچھ ہوں اس کے بنانے میں سب سے پہلا ہاتھ باری صاحب کا ہے۔ اگر امرتسر میں ان سے ملاقات نہ ہوتی اور متواتر تین مہینے میں نے ان کی صحبت میں نہ گذارے ہوتے تو یقیناً میں کسی اور ہی راستے پر گامزن ہوتا۔'' (اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں)

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

**ادبی زندگی کا آغاز :** (صحافت) ان کی پہلی تحریر باری صاحب ہی کی زیر ادارت شائع ہونے والے اخبار "مساوات" میں شائع ہوئی تھی اور منٹو نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اسی روزنامہ میں کالم نگاری سے کیا تھا۔
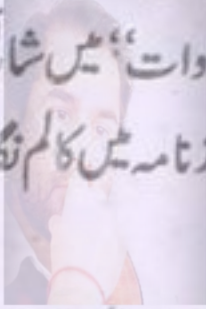
**ابتدائی مطبوعہ تحریریں :**

پہلی تحریر : تبصرہ		روزنامہ "مساوات" امرتسر، اپریل ۱۹۳۳ء

پہلی تالیف: وکٹر ہیوگو کے ناول **"Last days of a Condemned"** کا ترجمہ "اسیر کی سرگذشت" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں اردو بک اسٹال، لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

پہلا طبع زاد افسانہ/ پہلی کہانی: منٹو نے اپنا اولین افسانہ "تماشا" کے عنوان سے لکھا، جو باری علیگ کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ "خلق" امرتسر کے پہلے شمارے (اگست ۱۹۳۴ء) میں شائع ہوا۔ بعد میں اسے منٹو نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے میں شامل کیا۔
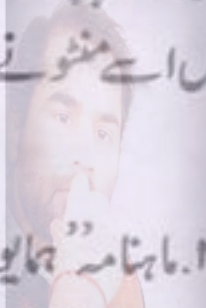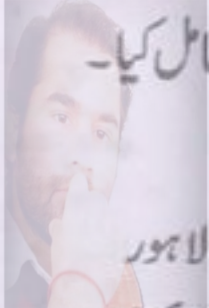
**ذریعۂ معاش :** ادب وصحافت

**ادارت :** ۱. ہفتہ وار "پارس"، لاہور ۲. ماہنامہ "ہمایوں"، لاہور ۳. ماہنامہ "عالمگیر"، لاہور ۴. ہفتہ وار "مصور"، بمبئی ۵. ہفتہ وار "کارواں"، بمبئی ۶. ہفتہ وار "کہکشاں"، بمبئی ۷. سہ ماہی "اردو ادب" لاہور ۸. روزنامہ "احسان"، لاہور ۹. روزنامہ "منشور"، لاہور ۱۰. روزنامہ "مغربی پاکستان" لاہور ۱۱. ہفت روزہ "سماج"، بمبئی ۱۲. "نگارش"، لاہور (سعادت حسن منٹو نے ماہنامہ "ہمایوں" لاہور اور ماہنامہ "عالمگیر" لاہور کے لئے بالترتیب روسی اور فرانسیسی افسانہ نمبر مرتب کیا تھا۔)

**مصروفیتیں/ ملازمتیں :**

- ۱۹۳۶ء میں ہفت روزہ اخبار "پارس" لاہور سے بحیثیت مدیر ملازمت کا آغاز کیا اور صرف ڈھائی ماہ اس سے وابستہ رہے۔ چالیس روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔
- دسمبر ۱۹۳۶ء میں بطور مدیر چالیس روپے ماہوار تنخواہ پر ہفت روزہ "مصور"، بمبئی سے وابستہ ہوگئے۔ اپریل ۱۹۳۷ء تک اس سے وابستگی رہی۔
- "مصور" سے وابستگی کے دوران امپیریل فلم کمپنی، بمبئی میں بطور منشی بھی کام کرتے رہے۔ یہاں سے منٹو کو چالیس روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جولائی ۱۹۳۸ء میں اس کمپنی سے علیحدہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
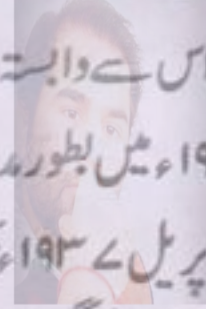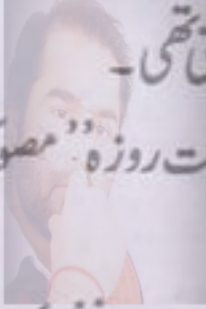
الحمد لائبریری
فیس بک گروپ
کتابیں بیٹے

ہو گئے۔

- یکم مئی ۱۹۳۷ء سے ہفت روزہ "سماج" بمبئی میں بطور مدیر کام کرنے لگے۔
- کچھ عرصہ بعد "سماج" سے علیحدہ ہو کر "مصور" میں واپس چلے گئے اور ۳۱/ جولائی ۱۹۴۰ء تک "مصور" سے وابستہ رہے۔
- منظر نویس و مکالمہ نگار کی حیثیت سے فلم سٹی، بمبئی میں ایک سو روپے ماہوار پر ملازمت۔
- بطور کہانی نویس و مکالمہ نگار، سروج مووی ٹون فلم کمپنی، بمبئی میں اگست ۱۹۳۸ء سے اکتوبر ۱۹۳۸ء تک وابستگی۔ ایک سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔
- ہندوستان سنے ٹون کمپنی، بمبئی سے بطور کہانی نویس و مکالمہ نگار نومبر ۱۹۳۸ء تا اگست ۱۹۳۹ء وابستہ رہے۔
- اردو پبلسٹی کے لئے فینس پکچرز لمیٹیڈ، بمبئی میں ستمبر ۱۹۳۹ء تا یکم دسمبر ۱۹۴۰ء ملازمت۔
- اگست ۱۹۴۰ء سے بابوراؤ پٹیل کے پرچے ہفت روزہ "کارواں" کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی جو صرف پانچ ماہ (دسمبر ۱۹۴۰ء) تک ان کی ادارت میں نکلا۔
- جنوری ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں ڈیڑھ سو روپے ماہانہ تنخواہ پر بطور فیچر نگار و ڈرامہ نویس ملازمت اختیار کر لی۔ یہ سلسلہ تقریباً ڈیڑھ سال جاری رہا۔ ستمبر ۱۹۴۲ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر بمبئی واپس چلے گئے۔
- اکتوبر ۱۹۴۲ء میں "مصور" بمبئی کی ادارت دوبارہ سنبھالی۔
- کہانی و منظر نویس کی حیثیت سے فلمستان لمیٹیڈ، بمبئی میں ۱۹۴۳ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک تین سو روپے ماہوار پر کام کیا۔
- بطور کہانی نویس و مکالمہ نگار، بمبئی ٹاکیز لمیٹیڈ، بمبئی میں ۱۵/ اگست تا ۳۱/ دسمبر ۱۹۴۷ء ملازمت۔ اس کمپنی میں منٹو معقول تنخواہ پر ملازم تھے۔ ان کی تنخواہ ساڑھے آٹھ سو روپیہ ماہانہ مقرر تھی۔ انکم ٹیکس کمپنی کے ذمے تھا۔ معاہدے میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ کمپنی کے لئے جو دوسری فلمی کہانی لکھیں گے، اس کے عوض میں کمپنی تنخواہ کے علاوہ مبلغ پانچ ہزار روپے ادا کرے گی۔ اس کمپنی میں ان کی بڑی عزت و توقیر تھی۔ انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ لیکن اپنی انا کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے یہ نوکری چھوڑ دی اور پاکستان چلے گئے، جہاں وہ تادمِ حیات قلم کی مزدوری کرتے رہے۔

**پاکستان ہجرت :** جنوری ۱۹۴۸ء

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری
بس بک گروپ
0314.595.1212

* بطور ادیب پاکستان میں منٹو کو صحیح مقام نہیں ملا۔ وہاں ان کے حالات دگرگوں رہے۔
* لاہور سے منٹو نے دوماہی ''اردو ادب'' اور ''نگارش'' کا اجراء کیا لیکن حالات بہتر نہ ہو سکے۔
* ''مکتبہ منٹو'' کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی۔ منٹو کی خواہش تھی کہ وہ اپنی کتابیں خود شائع کرائیں لیکن ناشرین کے لئے ان کی یہ خواہش نقصان دہ تھی اس لئے منٹو اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

**منٹو کی اہم فلمیں / فلمی کہانیاں :** منٹو نے بے شمار فلمی کہانیاں/ منظرنامے اور مکالمے لکھے جن میں چند قابل ذکر ہیں۔

۱. کیچڑ (ٹڈ) (بہ اشتراک کرشن چندر)　۲. بنجارہ (بہ اشتراک کرشن چندر)
۳. کسان کنیا　۴. مجھے پاپی کہو
۵. چل چل رے نوجوان　۶. بیگم
۷. نوکر　۸. شکاری
۹. گھمنڈ　۱۰. آغوش
۱۱. آٹھ دن (اس فلم میں منٹو نے ایک پاگل فوجی لفٹننٹ کرپارام کا رول بھی کیا تھا۔)
۱۲. مرزا غالب (یہ منٹو کی سب سے کامیاب فلم تھی۔ یہ فلم ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد فلمائی گئی تھی۔ اسے بہترین فلم کا قومی ایوارڈ بھی ملا تھا۔)
۱۳. تو بڑا نہ میں بڑا　۱۴. اسٹیل
۱۵. پڑوسن　۱۶. دھرم پتنی

**پاکستان میں:**

۱۷. بیلی　۱۸. دوسری کوٹھی

* آخرالذکر دونوں فلمیں پاکستان میں فلمائی گئی تھیں اور بری طرح ناکام ہوئیں۔

**شادی** : ۲۶/اپریل ۱۹۳۹ء کو کشمیر کے ایک باعزت گھرانے میں۔

**اہلیہ کا نام** : بیگم صفیہ بنت خواجہ قمرالدین (زنجبار (افریقہ) پولس میں پبلک پراسی کیوٹر تھے)

**اولاد** : بیٹا: ۱. عارف (اکلوتا بیٹا عارف، آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں ملازمت کے دوران محض ایک سال کی عمر میں فوت ہوا جس کی موت کا دکھ منٹو تمام عمر نہ بھلا سکے)

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
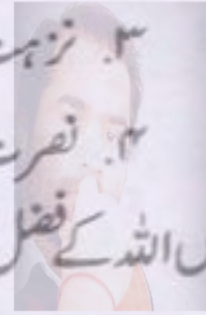
بیٹیاں: ۲۔ نگہت (اب نگہت پٹیل)

۳۔ نزہت (اب نزہت ارشد فاروق)

۴۔ نصرت (اب نصرت شاہد جلال)

تینوں بیٹیاں اللہ کے فضل سے بقید حیات ہیں۔

**مطبوعہ کتب:**

## افسانوی مجموعے

(۱) آتش پارے — طبع اوّل ۱۹۳۶ء — ناشر: اردو بک اسٹال، لاہور

**افسانے:** (۱) خونی تھوک (۲) انقلاب پسند (۳) جی آیا صاحب (۴) تماشا (۵) طاقت کا امتحان (۶) دیوانہ شاعر (۷) چوری
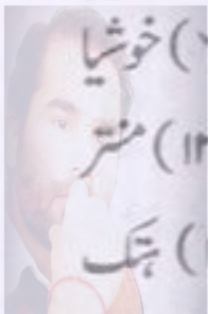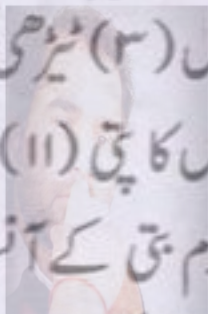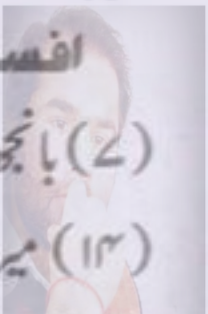
(۲) منٹو کے افسانے — طبع اوّل ۱۹۴۰ء — ناشر: مکتبۂ اردو، لاہور

**افسانے:** (۱) نیا قانون (۲) شغل (۳) ٹیڑھی لکیر (۴) پہچان (۵) شوشو (۶) خوشیا (۷) بانجھ (۸) نعرہ (۹) بلاؤز (۱۰) اس کا پتی (۱۱) موسم کی شرارت (۱۲) بیگو (۱۳) منتر (۱۴) میرا اور اس کا انتقام (۱۵) موم بتی کے آنسو (۱۶) دیوالی کے دیئے (۱۷) ہتک (۱۸) ڈرپوک (۱۹) دس روپے (۲۰) مسٹر ڈی کوسٹا

(۳) دھواں — طبع اوّل ۱۹۴۱ — ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**افسانے:** (۱) سجدہ (۲) کالی شلوار (۳) دھواں (۴) کبوتر والا سائیں (۵) الّو کا پٹھا (۶) وہ خط جو پوسٹ نہ کئے گئے (۷) مصری کی ڈلی (۸) ماتمی جلسہ (۹) قبض (۱۰) دیوانہ شاعر (۱۱) ایکٹرس کی آنکھ (۱۲) نامکمل تحریر (۱۳) لالٹین (۱۴) پھولوں کی بارش (۱۵) گرم سوٹ (۱۶) میرا ہم سفر (۱۷) ترقی پسند (۱۸) نیا سال (۱۹) چوہے دان (۲۰) چوری (۲۱) قاسم (۲۲) پریشانی کا سبب

(نوٹ: اس کتاب پر بحیثیت مجموعی فحاشی کے الزام میں منٹو کے خلاف مقدمہ درج ہوا تھا۔ اس مجموعے میں ان کا افسانہ ”کالی شلوار“ بھی شامل ہے جس کی اشاعت پر قبل ازیں اس کے خلاف فحاشی کے الزام میں پہلا مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔ ناشرین اس کتاب کی دو کتابیں بنا کر ”مقدمہ زدہ“ عنوانات کو کتابوں کے نام دے کر چھاپتے رہے ہیں۔ ”کالی شلوار“ کے نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ علیحدہ کر دیا گیا ہے)

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

(۴) افسانے اور ڈرامے طبع اوّل ۱۹۴۳ء ناشر: سیّد عبدالرزاق، کتب فروش، حیدر آباد (دکن)

طبع دوم ۱۹۹۳ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**افسانے:** (۱) بلاؤز (۲) شیرو (۳) جشن فریاد (۴) آم (۵) خونی تھوک (۶) مسز ڈی سلوا (۷) غسل خانہ

(نوٹ: منٹو کی وفات کے بعد ظفر احمد قریشی (ظفر برادرز، لاہور) نے اس کتاب کو ۱۹۵۶ء میں، افسانوں اور ڈراموں کی ترتیب نیز کتاب کا عنوان بدل کر "ایک مرد" کے نام سے شائع کیا)

(۵) لذتِ سنگ : طبع اوّل ۱۹۴۸ء ناشر: نیا ادارہ، لاہور

**افسانے:** (۱) بو (۲) دھواں (۳) کالی شلوار

(نوٹ: اس مجموعے میں تین افسانے کے علاوہ منٹو کے تین مضامین بعنوان "سفید جھوٹ"، "افسانہ نگار اور جنسی مسائل" اور "کسوٹی" بھی شامل ہیں)

(۶) سیاہ حاشئے طبع اوّل ۱۹۴۸ء ناشر: مکتبہ جدید، لاہور

**افسانچے:** (۱) مزدوری (۲) تعاون (۳) تقسیم (۴) جائز استعمال (۵) بےخبری کا فائدہ (۶) مناسب کاروائی (۷) کرامات (۸) اصلاح (۹) جیلی (۱۰) دعوت عمل (۱۱) پٹھانستان (۱۲) خبردار (۱۳) ہمیشہ کی چھٹی (۱۴) حلال اور جھٹکا (۱۵) گھاٹے کا سودا (۱۶) حیوانیت (۱۷) کھاد (۱۸) کسر نفسی (۱۹) استقلال (۲۰) نگرانی میں (۲۱) جوتا (۲۲) پیش بندی (۲۳) سوری (۲۴) رعایت (۲۵) صفائی پسندی (۲۶) صدقے اسکے (۲۷) اشتراکیت (۲۸) الہنا (۲۹) آرام کی ضرورت (۳۰) قسمت (۳۱) آنکھوں پر چربی

(۷) چغد طبع اوّل ۱۹۴۸ء ناشر: کتب پبلشرز، بمبئی

**افسانے:** (۱) ایک خط (۲) ڈھارس (۳) چغد (۴) پڑھیے کلمہ (۵) بابو گوپی ناتھ (۶) میرا نام رادھا ہے (۷) جانکی (۸) پانچ دن

(نوٹ: ۱۹۵۰ء میں منٹو نے اس کتاب میں سے علی سردار جعفری کا دیباچہ حذف کر کے اسے "البیان" لاہور سے دوبارہ چھپوایا۔)

(۸) ٹھنڈا گوشت طبع اوّل ۱۹۵۰ء ناشر: مکتبہ جدید، لاہور

طبع دوم ۱۹۵۰ء ناشر: مکتبہ نو، دہلی

**افسانے:** (۱) ٹھنڈا گوشت (۲) گولی (۳) رحمت خداوندی کے پھول (۴) ساڑھے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تین آنے (۵) پیرن (۶) خورشٹ (۷) باسط (۸) شاردا

(نوٹ: ''ٹھنڈا گوشت'' قیام پاکستان کے بعد منٹو کا پہلا افسانہ تھا اور جس پر فحاشی کے الزام میں ان کے خلاف مقدمہ درج ہوا تھا۔ ''زحمتِ مہرِ درخشاں'' کے عنوان سے اس مقدمے کی روداد بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔)

(۹)　خالی بوتلیں، خالی ڈبے　　طبع اوّل ۱۹۵۰ء　　ناشر: مکتبۂ جدید، لاہور
　　طبع دوم ۱۹۹۱ء　　ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**افسانے:** (۱) خالی بوتلیں، خالی ڈبے (۲) سہائے (۳) ٹوٹو (۴) رام کھلاون (۵) بسم اللہ (۶) ننگی آوازیں (۷) شانتی (۸) خالد میاں (۹) دو قومیں (۱۰) مجید کا ماضی (۱۱) حامد کا بچہ (۱۲) لائسنس (۱۳) کتاب کا خلاصہ

(نوٹ: ہندوستان میں اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۶ء میں ساقی بک ڈپو، دہلی نے شائع کیا۔)

(۱۰)　بادشاہت کا خاتمہ　　طبع اوّل ۱۹۵۱ء　　ناشر: مکتبۂ جدید، لاہور

**افسانے:** (۱) بادشاہت کا خاتمہ (۲) تقی کاتب (۳) والد صاحب (۴) عورت ذات (۵) عشقِ حقیقی (۶) کتے کی دعاء (۷) پری (۸) خود فریب (۹) برمی لڑکی (۱۰) فوبھا بائی (۱۱) انجی ڈوڈو

(۱۱)　یزید　　طبع اوّل ۱۹۵۱ء　　ناشر: مکتبۂ جدید، لاہور
　　طبع دوم ۱۹۸۶ء　　ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**افسانے:** (۱) یزید (۲) گورکھ سنگھ کی وصیت (۳) آخری سیلوٹ (۴) جھوٹی کہانی (۵) ٹیٹوال کا کتا (۶) ۱۹۱۹ء کی ایک بات (۷) چور (۸) ننگی (۹) ممی

(۱۲)　نمرود کی خدائی　　طبع اوّل ۱۹۵۲ء　　ناشر: نیا ادارہ، لاہور

**افسانے:** (۱) کھول دو (۲) سوراج کے لئے (۳) ڈارلنگ (۴) بدتمیز (۵) عزت کے لئے (۶) ہارتا چلا گیا (۷) شیر آیا، شیر آیا دوڑنا (۸) شریفن (۹) ہرنام کور (۱۰) شہید ساز (۱۱) بی زمانی بیگم (۱۲) دیکھ کبیرا رویا

(نوٹ: مشمولہ افسانہ ''کھول دو'' پہلی دفعہ ''نقوش'' لاہور، شمارہ نمبر ۳ میں شائع ہوا تھا، جس کے لئے ''نقوش'' کی اشاعت پر چھ ماہ کے لئے پابندی لگا دی گئی تھی)

(۱۳)　سڑک کے کنارے　　طبع اوّل ۱۹۵۳ء　　ناشر: نیو تاج پریس، دہلی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

طبع دوم ۱۹۵۳ء ناشر: نیا ادارہ، لاہور

طبع سوم ۱۹۸۹ء ناشر: ادارہ فکر جدید، نئی دہلی

**افسانے:** (۱) شاداں (۲) لتیکا رانی (۳) نفسیاتی مطالعہ (۴) موتری (۵) نطفہ (۶) سڑک کے کنارے (۷) سو کینڈل پاور کا بلب (۸) خدا کی قسم (۹) موذیل (۱۰) صاحب کرامات

(۱۴) اوپر، نیچے اور درمیان طبع اوّل ۱۹۵۴ء ناشر: "گوشۂ ادب" انشاء پریس، لاہور

طبع دوم ۱۹۸۹ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**افسانے:** (۱) اوپر، نیچے اور درمیان (۲) اپنی اپنی ڈفلی (۳) لیچیاں، آلوچے، الا ئچیاں

(۱۵) سرکنڈوں کے پیچھے طبع اوّل ۱۹۵۴ء ناشر: ادارہ فروغ اردو، لاہور

طبع دوم ۱۹۵۴ء ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

**افسانے:** (۱) بلونت سنگھ مجیٹھیا (۲) آنکھیں (۳) جاؤ حنیف جاؤ (۴) شادی (۵) اللہ دتا (۶) بچنی (۷) سرکنڈوں کے پیچھے (۸) وہ لڑکی (۹) محمودہ (۱۰) پھپھسی کہانی (۱۱) بھنگن (۱۲) ممد بھائی

(۱۶) پھندنے طبع اوّل ۱۹۵۴ء ناشر: مکتبۂ جدید، لاہور

طبع دوم ۱۹۹۱ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**افسانے:** (۱) ٹوبہ ٹیک سنگھ (۲) فرشتہ (۳) پھندنے (۴) بدصورتی (۵) مس مالا (۶) دودا پہلوان (۷) مسٹر معین الدین (۸) سودا بیچنے والی (۹) عشقیہ کہانی (۱۰) منظور (۱۱) مس اڈنا جیکسن

## منٹو کی وفات کے بعد شائع ہونے والے مجموعے

(۱۷) بغیر اجازت طبع اوّل ۱۹۵۵ء ناشر: ظفر احمد قریشی اینڈ سنز، لاہور

طبع دوم ۱۹۸۷ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**افسانے:** (۱) سونے کی انگوٹھی (۲) تانگے والے کا بھائی (۳) مسٹر حمیدہ (۴) بغیر اجازت (۵) قدرت کا اصول (۶) خوشبودار تیل (۷) سنتر پنچ (۸) جسم اور روح (۹) اب اور کہنے کی ضرورت نہیں (۱۰) رشوت (۱۱) قیمے کی بجائے بوٹیاں

(۱۸) برقعے طبع اوّل ۱۹۵۵ء ناشر: ظفر احمد قریشی اینڈ سنز، لاہور

**افسانے:** (۱) پسینہ (۲) گھوگا (۳) تیتن (۴) خط اور اس کا جواب (۵) موج دین (۶)

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

ایک خط (۷) چودھویں کا چاند (۸) باردہ شمالی (۹) قرض کی پیتے تھے (۱۰) برقعے

(۱۹) شکاری عورتیں طبع اوّل ۱۹۵۶ء ناشر: ظفر احمد قریشی اینڈ سنز، لاہور

طبع دوم ۱۹۸۰ء ناشر: اسٹار بک سنٹر، دہلی

**افسانے:** (۱) میرٹھ کی قینچی (۲) شکاری عورتیں (۳) جنٹلمینوں کا برش (۴) حجامت

(۵) لعنت ہے ایسی دوا پر (۶) حج اکبر (۷) اولاد (۸) موچنا

(۲۰) رتی: ماشہ: تولہ طبع اوّل ۱۹۵۶ء ناشر: ظفر احمد قریشی اینڈ سنز، لاہور

طبع دوم ۱۹۸۰ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**افسانے:** (۱) جھمکے (۲) شلجم (۳) برف کا پانی (۴) چند مکالمے (۵)

رتی: ماشہ: تولہ (۶) نفسیات شناس (۷) انجام بخیر (۸) ملاقاتی (۹) سگریٹ اور فونٹین پن

(۱۰) تین میں، نہ تیرہ میں

(۲۱) شیطان طبع اوّل ۱۹۵۶ء ناشر: نیو تاج آفس، دہلی

(نوٹ: اس مجموعے میں شامل تمام افسانے قبل شائع ہو چکے تھے، ناشر نے

عنوان تبدیل کر کے دوبارہ شائع کیا ہے۔)

(۲۲) طاہرہ سے طاہر طبع اوّل ۱۹۷۱ء ناشر: ظفر احمد قریشی اینڈ سنز، لاہور

(نوٹ: اس کتاب میں شامل "منٹو کی تحریریں" مطبوعہ ہیں۔ ناشر نے محض ان

کا نام تبدیل کیا ہے۔)

(۲۳) مینا بازار

(نوٹ: اس میں شامل بیشتر تحریریں اس سے قبل شائع ہو چکی تھیں)

ان مجموعوں کے علاوہ منٹو کے چند اور افسانوی مجموعے محض عنوان بدل کر شائع کئے گئے

ہیں مثلاً:

۱. انارکلی طبع اوّل ۱۹۸۲ء ناشر: اسٹار پبلی کیشن، نئی دہلی

۲. بانجھ طبع اوّل ۱۹۸۳ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

۳. کالی شلوار طبع اوّل ۱۹۸۶ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

۴. بڈھا کھوسٹ طبع اوّل ۱۹۸۸ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**مرتبہ مجموعے:**

۱. منٹو کی بہترین کہانیاں طبع اوّل ۱۹۶۳ء ناشر: مشورہ بک ڈپو، دہلی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

۲. منٹو کے نمائندہ افسانے (مرتب: اطہر پرویز)
طبع اوّل ۱۹۷۷ء ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
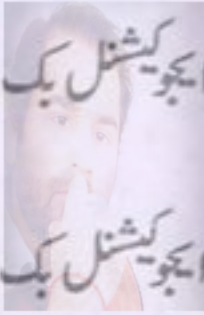
۳. اردو کے تیرہ افسانے (مرتب: اطہر پرویز)
طبع اوّل ۱۹۷۸ء ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
(اس کتاب میں منٹو کا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' شامل ہے)

۴. سو کینڈل پاور کا بلب (مرتب: پریم گوپال متّل)
طبع اوّل ۱۹۸۰ء ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی
(سعادت حسن منٹو کے اکیس منتخب افسانے شامل ہیں)

۵. منٹو، شخصیت اور فن (مرتب: پریم گوپال متّل)
طبع اوّل ۱۹۸۰ء ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی
(اس کتاب میں منٹو کے منتخب افسانے بھی شامل ہیں)

۶. منٹو کے نمائندہ افسانے (مقدمہ از ڈاکٹر سلیم اختر)
طبع اوّل ۱۹۸۴ء ناشر: مکتبہ علم وفن، لاہور

۷. منٹو کے بہترین افسانے (مرتبہ: اطہر پرویز) طبع اوّل: چودھری اکیڈمی، لاہور
(نوٹ: کتاب کے آغاز میں، منٹو پہ بلونت گارگی کا مضمون شامل ہے)

۸. منٹو کے یادگار افسانے طبع اوّل ۱۹۸۶ء ناشر: خیبر پبلی کیشن، دہلی

۹. دستاویز، منٹو (مرتب: بلراج مین را)
طبع اوّل ۱۹۸۶ء ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۱۰. منٹو کے گم شدہ اور غیر مطبوعہ افسانے (مرتب: بلراج مین را)
طبع اوّل ۱۹۹۲ء ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۱۱. موذیل (مرتبہ: سید ظہیر عباس)
طبع اوّل ۱۹۷۹ء ناشر: خیاباں پبلی کیشنز، بمبئی

۱۲. سعادت حسن منٹو کے دس بہترین افسانے (مرتب: شہزاد منظر)
طبع اوّل ۲۰۰۳ء ناشر: ایجوکیشنل، پبلشنگ ہاؤس، دہلی

## متفرق مجموعے

۱. بہترین ادب ۱۹۴۷ء (مرتبہ: ممتاز مفتی) طبع اوّل ۱۹۴۸ء ناشر: مکتبہ اردو، لاہور

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

۲. بہترین ادب ۱۹۵۱ء (مرتبہ: سردار جعفری) طبع اوّل ۱۹۵۲ء ناشر: مکتبہ شاہراہ، دہلی

**"نقوش" لاہور (منٹو نمبر) ۱۹۵۵ء میں شامل، سعادت حسن منٹو کی غیر مطبوعہ کہانیاں:**

(۱) بائی بائی (۲) مائی جنتے (۳) جان محمد (۴) بارش (۵) افشائے راز (۶) آمنہ (۷) تصویر (۸) ملاوٹ (۹) بس اسٹینڈ (۱۰) نعیمہ (۱۱) بدتمیزی (۱۲) قادرا قصائی (۱۳) خودکشی (۱۴) پشاور سے لاہور تک (۱۵) بجلی پہلوان (۱۶) ایک زاہدہ، ایک فاحشہ (۱۷) شیدا (۱۸) بڈھا کھوسٹ (۱۹) انارکلی

**متفرق افسانے** (جو وفات کے بعد شائع ہوئے)

۱. چور مطبوعہ: "نقوش" لاہور سالنامہ، ۱۹۵۷ء

۲. کالی کلی مطبوعہ: "نقوش" لاہور افسانہ نمبر، نومبر ۱۹۶۰ء

۳. سُرمہ مطبوعہ: "نقوش" لاہور اپریل، مئی، جون، ۱۹۶۶ء

۴. راجو مطبوعہ: "نقوش" لاہور افسانہ نمبر، نومبر ۱۹۶۸ء

**جن کہانیوں پر مقدمے چلے:**

(۱) کالی شلوار (۲) دھواں (۳) بو (۴) کھول دو (۵) ٹھنڈا گوشت (۶) اوپر، نیچے اور درمیان

**آخری کہانی** : کبوتر اور کبوتری

## طنز و مزاح کے مجموعے

(۱) منٹو کے مضامین طبع اوّل ۱۹۴۲ء ناشر: اردو اکیڈمی، لاہور

طبع دوم ۱۹۷۲ء ناشر: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی

**مزاح پارے / مضامین:** (۱) چھیڑ خوباں کی چلی جائے اسد (۲) کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی (۳) دیہاتی بولیاں ۱ (۴) دیہاتی بولیاں ۲ (۵) تجدید اسلحہ (۶) ہندی اور اردو (۷) اگر (۸) ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ (۹) ایک اشک آلود اپیل (۱۰) مجھے شکایت ہے (۱۱) شریف عورتیں اور فلمی دنیا (۱۲) ہندوستانی صنعت فلم سازی پر ایک نظر (۱۳) زندگی-ایک ریویو (۱۴) عصمت فروشی (۱۵) مکسیم گورکی (۱۶) سرخ انقلاب (۱۷) باتیں (۱۸) لوگ اپنے آپ کو مدہوش کیوں کرتے ہیں (۱۹) کسان، مزدور، سرمایہ دار، زمین دار (۲۰) ترقی یافتہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

قبرستان (۲۱) جون آف آرک کا مقدمہ

(۲) تلخ، ترش اور شیریں طبع اوّل ۱۹۵۴ء ناشر: ادارۂ فروغ اردو، لاہور

**مزاح پارے**: (۱) دیواروں پر لکھنا (۲) ناک کی قسمیں (۳) کھانسی پر (۴) سوال پیدا ہوتا ہے (۵) کچھ ناموں کے بارے میں (۶) میں فلم کیوں نہیں دیکھتا (۷) سویرے جو کل آنکھ میری کھلی (۸) یوم اقبال پر (۹) محبوس عورتیں (۱۰) ایمان و ایقان (۱۱) پردے کی باتیں (۱۲) مفت نوشوں کی تیرہ قسمیں (۱۳) پٹاخے (۱۴) آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی (۱۵) غالب اور چودھویں

(۳) اوپر، نیچے اور درمیان طبع اوّل ۱۹۵۴ء ناشر: گوشۂ ادب، لاہور

**مزاح پارے**: (۱) پس منظر (۲) اللہ کا بڑا فضل ہے (۳) ضرورت ہے (۴) میری شادی (۵) کرچیں اور کرچیاں (۶) قتل و خون کی سرخیاں (۷) بن بلائے مہمان (۸) اپنی اپنی ڈفلی (۹) گناہ کی بیٹیاں، گناہ کے باپ (۱۰) چچا منٹو کے نام ایک بھتیجے کا خط (۱۱) یوم استقلال (۱۲) چچا سام کے نام ایک خط (۱۳) اعداد کے ساتھ ادب اور زندگی کی چھیڑ (۱۴) چچا سام کے نام دوسرا خط (۱۵) چند تصویر بتاں اور چند حسینوں کے خطوط (۱۶) چچا سام کے نام تیسرا خط (۱۷) باتیں (۱۸) چچا سام کے نام چوتھا خط (۱۹) میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں (۲۰) چچا سام کے نام پانچواں خط (۲۱) دو گدھے (۲۲) چچا سام کے نام چھٹا خط (۲۳) چچا سام کے نام ساتواں خط (۲۴) طویلے کی بلا (۲۵) چچا سام کے نام آٹھواں خط (۲۶) چچا شام کے نام نواں خط

## ناول

۱. بغیر عنوان کے طبع اوّل ۱۹۵۴ء ناشر: ظفر برادرز، لاہور
طبع دوم ۱۹۸۳ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

## ڈراموں کے مجموعے

(۱) آؤ طبع اوّل ۱۹۴۰ء ناشر: نیا ادارہ، لاہور
طبع دوم ۱۹۸۷ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**ڈرامے**: آؤ سنو (دیباچہ) — (۱) آؤ کہانی لکھیں (۲) آؤ تاش کھیلیں (۳) آؤ خط سنو (۴) آؤ کھوج لگائیں (۵) آؤ ریڈیو سنیں (۶) آؤ بات تو سنو (۷) آؤ بحث کریں (۸) آؤ اخبار پڑھیں (۹) آؤ چوری کریں (۱۰) آؤ جھوٹ بولیں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

(۲) منٹو کے ڈرامے : طبع اوّل ۱۹۴۰ء ناشر: نیا ادارہ، لاہور

طبع دوم ۱۹۸۶ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**ریڈیائی ڈرامے** : (۱) نیلی رگیں (۲) کبوتری (۳) انتظار (۴) انتظار کا دوسرا رخ (۵) کمرہ نمبر ۹ (۶) ٹیڑھی لکیر (۷) جیب کترا (۸) عید کارڈ (۹) اکیلی (۱۰) جرنلسٹ (۱۱) ساڑی (۱۲) بیمار (۱۳) جرم اور سزا (۱۴) کیا میں اندر آسکتا ہوں (۱۵) نقش فریادی (۱۶) تحفہ (۱۷) سلیمہ (۱۸) ہتک

(نوٹ: ساقی بک ڈپو، دہلی نے ۱۹۸۶ء میں اس کتاب کا نام بدل کر ''نیلی رگیں'' کے نام سے شائع کیا)

(۳) جنازے طبع اوّل ۱۹۴۲ء ناشر: ظفر برادرز، لاہور

طبع دوم ۱۹۵۵ء ناشر: مکتبۂ شعر و ادب، لاہور

طبع سوم ۱۹۸۵ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**ڈرامے** (ریڈیائی فیچر): (۱) چنگیز خاں کی موت (۲) تیمور کی موت (۳) قلوہ پطرہ کی موت (۴) نپولین کی موت (۵) بابر کی موت (۶) شاہجہاں کی موت (۷) ٹیپو شہید کی موت (۸) راسپوٹین کی موت

(۴) تین عورتیں طبع اوّل ۱۹۴۲ء ناشر: مکتبۂ اردو، لاہور

طبع دوم ۱۹۵۳ء ناشر: مکتبۂ اردو، لاہور

طبع سوم ۱۹۶۶ء ناشر: چودھری اکیڈمی، لاہور

**ڈرامے** : (۱) تین خوبصورت عورتیں (۲) تین موٹی عورتیں (۳) تین صلح پسند عورتیں (۴) تین خاموش عورتیں (۵) تین بیمار پرس عورتیں

(۵) افسانے اور ڈرامے طبع اوّل ۱۹۴۳ء ناشر: سید عبدالرزاق، تاجر کتب، حیدر آباد، دکن

**ڈرامے** : (۱) قانون کی حفاظت (۲) ایک مرد (۳) تین انگلیاں (۴) دو ہزار سال بعد (۵) تین تحفے

(۶) کروٹ طبع اوّل ۱۹۴۶ء ناشر: اردو اکیڈمی، لاہور

**ڈرامے** : (۱) کروٹ (۲) خودکشی (۳) رندھیر پہلوان (۴) ماچس کی ڈبیا (۵) محبت کی پیدائش (۶) چوڑیاں (۷) روح کا ناٹک (۸) اس کا رامو (۹) ماتا کی چوری

(۷) شیطان طبع اوّل ۱۹۵۴ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

**ڈرامے:** (۱) شیطان (۲) کناری

## خاکوں کے مجموعے

(۱) عصمت چغتائی — طبع اوّل ۱۹۴۸ء ناشر: کتب پبلشرز، بمبئی

(۲) گنجے فرشتے — طبع اوّل ۱۹۵۲ء ناشر: مکتبۂ البیان، لاہور

طبع دوم ۱۹۵۵ء ناشر: گوشۂ ادب، لاہور

**خاکے:** (۱) میرا صاحب (۲) آغا حشر سے دو ملاقاتیں (۳) اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں (۴) تین گولے (۵) باری صاحب (۶) عصمت چغتائی (۷) مرلی کی دھن (۸) پری چہرہ نسیم (۹) اشوک کمار (۱۰) نرگس (۱۱) کشتِ زعفران (۱۲) بابوراؤ پٹیل

(نوٹ: کتاب کے آخر میں "گنجے فرشتے" کے عنوان سے بارہ صفحات پر مشتمل دیباچہ بھی شامل ہے)

(۳) نور جہاں، سرور جاں — طبع اوّل ۱۹۵۲ء ناشر: مکتبۂ ماہنامہ ڈائریکٹر، لاہور

(۴) لاؤڈ اسپیکر — طبع اوّل ۱۹۵۵ء ناشر: گوشۂ ادب، لاہور

طبع دوم ۱۹۵۵ء ناشر: آزاد بک ڈپو، امرتسر

طبع سوم ۱۹۸۷ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

**خاکے:** (۱) دیوان سنگھ مفتون (۲) نور جہاں (۳) نواب کاشمیری (۴) ستارہ (۵) چراغ حسن حسرت (۶) پرا سرار نینا (۷) رفیق غزنوی (۸) پارو دیوی (۹) انور کمال پاشا (۱۰) کے. کے

## خطوط

(۱) منٹو کے خطوط — مرتب: احمد ندیم قاسمی

طبع اوّل ۱۹۶۶ء ناشر: "کتاب نما"، راولپنڈی

(۲) منٹو کے خطوط ندیم کے نام — مرتب: احمد ندیم قاسمی

طبع اوّل ۱۹۹۱ء ناشر: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور

**متفرق خطوط:**

۱. سعادت حسن منٹو (خطوط بنام ممتاز شیریں) مطبوعہ: "نقوش"، لاہور، مکاتیب نمبر، جلد دوم

۲. سعادت حسن منٹو (خطوط بنام حسن عباس) مطبوعہ: "سیارہ ڈائجسٹ"، لاہور، جنوری، ۱۹۷۱ء

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

۳. سعادت حسن منٹو (خطوط بنام مجید امجد) مطبوعہ: "قند" مردان، مجید امجد نمبر

## تراجم

منٹو نے سینکڑوں روسی، فرانسیسی اور انگریزی افسانوں، ڈراموں اور نظموں کو اردو میں منتقل کیا۔ انہوں نے معروف رسالہ "عالمگیر" لاہور اور "ہمایوں"، لاہور کا بالترتیب "روسی ادب نمبر" اور "فرانسیسی ادب نمبر" بھی مرتب کیا تھا۔ ان کے تراجم کی تفصیل یوں ہے۔

(۱) پھانسی (ایک اسیر کی سرگذشت) از وکٹر ہیوگو (ترجمہ: سعادت حسن منٹو)

طبع اوّل ۱۹۳۲ء ناشر: دارالادب، لاہور

(بعد میں یہ کتاب "سرگذشتِ اسیر" کے نام سے بھی شائع ہوئی)

Last days of a condemned by Victor Hugo.

سرگذشتِ اسیر طبع دوم ۱۹۳۴ء ناشر: اردو بک اسٹال، لاہور

(۲) ویرا (ڈرامہ) طبع اوّل ۱۹۳۴ء ناشر: اسٹڈی سرکل، لائلپور

طبع دوم ۱۹۳۵ء ناشر: نیرنگ خیال بک ڈپو، لاہور

(نوٹ: سعادت حسن منٹو نے آسکر وائلڈ کی اس کتاب کا ترجمہ حسن عباس اور ابو سعید قریشی کے اشتراک سے کیا تھا)

(۳) روسی افسانے طبع اوّل ۱۹۳۴ء ناشر: دارالادب پنجاب، لاہور

(نوٹ: اس کتاب میں باری علیگ کا لکھا ہوا بائیس صفحات کا دیباچہ بھی شامل ہے)

(۴) چیخوف کے دو ڈرامے طبع اوّل: حسن خیال کمپنی، امرتسر

(۵) گورکی کے افسانے طبع اوّل ۱۹۴۶ء ناشر: حافظ محمد دین اینڈ سنز، لاہور

طبع دوم ۱۹۴۶ء ناشر: گوشۂ ادب، لاہور

## متفرق مضامین

۱. میکسم گورکی۔ ملت احمر کا مایہ ناز مفکر مطبوعہ: "ہمایوں" لاہور، دسمبر ۱۹۳۴ء

(ترمیم و اضافے کے ساتھ یہ مضمون "منٹو کے مضامین" میں شامل ہے)

۲. پشکن مطبوعہ: "ہمایوں" لاہور (روسی ادب نمبر)، مئی ۱۹۳۵ء

۳. اشتراکی شاعری مطبوعہ: "شاعر" آگرہ، سالنامہ ۱۹۳۷ء

۴. ادب جدید مطبوعہ: "ادب لطیف" لاہور، سالنامہ ۱۹۴۴ء

الحمد لائبریری 0314.595.1212
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

(نوٹ: یہ مضمون منٹو کے افسانوی مجموعے ''منٹو کے افسانے'' میں ''پیش لفظ'' کے طور پر شامل ہے)

۵. پانچواں مقدمہ ا مطبوعہ: ''نقوش'' لاہور (پنج سالہ نمبر) فروری، مارچ ۱۹۵۳ء

۶. پانچواں مقدمہ ۲ مطبوعہ: ''نقوش'' لاہور، مارچ ۱۹۵۶ء

۷. زحمت مہر درخشاں مشمولہ ''ٹھنڈا گوشت''

(نوٹ: یہ مضمون منٹو کے افسانوی مجموعے ''ٹھنڈا گوشت'' میں ''مقدمہ'' کے طور پر شامل ہے)

۸. حبیب کفن مشمولہ ''یزید''

(نوٹ: یہ مضمون منٹو کے افسانوی مجموعے ''یزید'' میں شامل ہے)

۹. (۱) لذت سنگ (۲) سفید جھوٹ (۳) افسانہ نگار اور جنسی مسائل (۴) کسوٹی (۵) ایک فیصلہ (۶) ایک اور فیصلہ

(نوٹ: مذکورہ چھ مضامین منٹو کے افسانوی مجموعے ''لذت سنگ'' میں شامل ہیں)

۱۰. لاؤڈ اسپیکر

(نوٹ: یہ مضمون منٹو کے خاکوں کے مجموعے ''لاؤڈ اسپیکر'' میں بطور ''پیش لفظ'' شامل ہے)

## غیر مطبوعہ مضمون:

۱. کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا تحریر ۱۵/اپریل، ۱۹۵۴ء

## دیباچہ از منٹو:

۱. دامودر گپت (مترجم: میراجی)، نثنی متم (نگار خانہ)

طبع اوّل ۱۹۵۰ء ناشر: امپریل پرنٹنگ ورکس، لاہور

## منٹو کی تصانیف وتخلیقات، دوسری زبانوں میں

(۱) جھڈو (افسانوی مجموعہ ''چغد'' کا ترجمہ پنجابی زبان میں)

(۲) خالی بوتلاں، خالی ڈبے (افسانوی مجموعہ ''خالی بوتلیں، خالی ڈبے'' کا ترجمہ پنجابی زبان میں)

(۳) دھواں (افسانوی مجموعہ) ''دھواں'' کا ترجمہ اسی عنوان سے پنجابی زبان میں)

(۴) چار دیہاڑے (چار دن) (منٹو کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ پنجابی زبان میں ''چار دیہاڑے'' نام سے شائع ہوا)

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

(۵) مانسائی ناں سمبارُا (یہ گجراتی زبان میں منٹو کے مختلف افسانوں کا مجموعہ ہے)

(۶) "Thecoachmanandthenewconstitution" (نیا قانون)

مشمولہ: "Indian Short Stories" Edited by Mulk Raj Anand & Iqbal Singh, London:1945

(۷) "BlackVeil" (کالی شلوار) مشمولہ: "PakistaniShortStories"

Translated and Edited by: Nasir Ahmad Farooqui.

Published by : Feroze & Sons, Lahore, 1955

(۸) "The insult" ("ہتک") Translated by Hamid Jalal

مشمولہ: "Pakistani Short Stories" Edited by - Nasir Ahmad Farooqui, Feroze & Sons, Lahore, 1955.

(۹) "Three Annas and Two pice" ("ساڑھے تین آنے")

Translated by - Avtar Singh Judge.

مشمولہ: "Thought" 22 December 1956

(۱۰) "Toba Tek Singh" ("ٹوبہ ٹیک سنگھ")

Translated by Mohammad Iqbal

مشمولہ: "Thought" 11 August 1956

(۱۱) "Black Milk" Translated by Hamid Jalal

Published by - "Alkitab" Lahore; 1956

(۱۲) "Five days of Grace" ("پانچ دن")

Translated by Avtar Singh Judge

مشمولہ: "Thought" 21 December 1957

(۱۳) "The Last Salute" ("آخری سیلوٹ")

Translated by - Avtar Singh Judge.

مشمولہ: "Thought" 15 March 1958

(۱۴) "Black Shalwar" ("کالی شلوار")

مشمولہ: "Span" Edited by Lionel Wigmore. London: 1959

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

(۱۵) "ODOR" ("بو") Translated by Hamid Jalal

مشمولہ: "A treasury of Modern Asian Stories"

Edited by Daniel L. Milton and William Clifford. New York:1961

(۱۶) "Manzoor" -("منظور") Translated by Desh Raj Gopal

مشمولہ: "Thought" 3 February 1962

(۱۷) "Cough Mixture" -("کھانسی کی دوا")

Translated by Madan Gupta

مشمولہ: "Thought" 11 May 1963

(۱۸) "The New Law" -("نیا قانون") Translated by Carlo Coppola

مشمولہ: "Phoenix" (Winter 1964)

(۱۹) "By God" -("خدا کی قسم")

مشمولہ: "Pakistan Review"-13 (April 1965)

(۲۰) "Zubeda" -("اولاد") مشمولہ: "Thought" 6 June 1964

(۲۱) "Exchange of Lunatics" -("ٹوبہ ٹیک سنگھ")

مشمولہ: "Land of Five Rivers"

Translated and Edited by Khushwant Singh

Jaico Publishing House, Bombay, 1965,

(۲۲) "Urinal" -("موتری") Translated by C. M. Naim

مشمولہ: "Journal of South Asian Literature" (1968)

(۲۳) "Suicide" -("خودکشی") Translated by Hardev Singh

مشمولہ: "Thought" 5 October 1968

(۲۴) "Zubeda" -("اولاد") مشمولہ: "Call It a day"

Edited by M. C. and Gwen Gabriel.

مشمولہ: Published by-"Siddartha" Delhi: 1968

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری
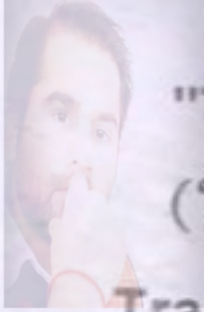
(۲۵) "These Women" -("یہ عورتیں")

Translated by Hardev Singh

مشمولہ: "Thought" 5 October: 1968

(۲۶) "Toba Tek Singh" -("ٹوبہ ٹیک سنگھ")

Translated by Robert B. Haldene.

مشمولہ: "Journal of South Asian Literature-6", 1970

(۲۷) "Cold, Like Ice" -("ٹھنڈا گوشت")

Translated by C. M. Naim and Ruth L. Schmidt.

مشمولہ: "Journal of South Asian Literature"-1

(۲۸) "The life and Works of Saadat Hassan Manto"

Written by-Fleming, A. Leslie and Tahira Naqvi

(نوٹ: اس کتاب میں شامل منٹو کے افسانوں کا انگریزی ترجمہ طاہرہ نقوی نے کیا ہے)

(۲۹) "Selected short stories from Pakistan"

Edited by - Ahmad Ali.

(نوٹ: اس مجموعے میں منٹو کے افسانہ "موذیل" کا انگریزی ترجمہ شامل ہے)

## قدر شناسی - منٹو پر دیگر مصنّفین کی کتابیں

(۱) سعادت حسن منٹو - ادب کے معمار از کرشن چندر

طبع اوّل ۱۹۴۸ء ناشر: کتب پبلشرز، بمبئی
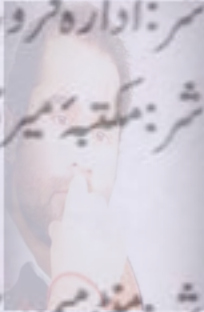
(۲) منٹو از ابو سعید قریشی

طبع اوّل ۱۹۵۵ء ناشر: ادارہ فروغ اردو، لاہور

طبع دوم ۱۹۸۸ء ناشر: مکتبہ میری لائبریری، لاہور

(۳) منٹو - میرا دوست از محمد اسد اللہ

طبع اوّل ۱۹۵۵ء ناشر: منٹو میموریل، کراچی

(۴) منٹو - میرا دشمن از اوپندر ناتھ اشک

طبع اوّل ۱۹۵۵ء ناشر: جمشید کتاب گھر، حیدر آباد

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
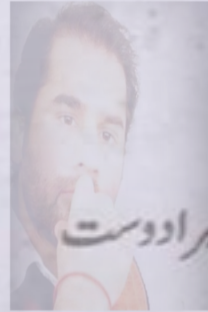
طبع دوم ۱۹۷۹ء ناشر: نیا ادارہ، الہ آباد
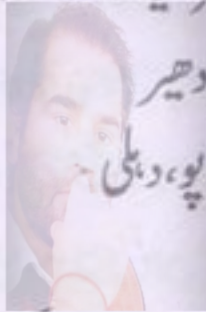
(۵) منٹو — میرا دوست (پاکٹ بک) مرتبہ: ڈاکٹر کیول دھیر

طبع اوّل: مشورہ بک ڈپو، دہلی

(۶) منٹو (انگریزی میں) از لزلی فلیمنگ

طبع اوّل ۱۹۷۸ء ناشر: وین گارڈ بکس لمیٹیڈ، لاہور

(۷) منٹو: شخصیت اور فن مرتب: پریم گوپال متل

طبع اوّل ۱۹۸۰ء ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

(۸) سعادت حسن منٹو: اپنی تخلیقات کی روشنی میں از پروفیسر سید محمد محسن

طبع اوّل ۱۹۸۲ء ناشر: دارالاشاعت، دہلی

(۹) منٹو کا فن از سید وقار عظیم

طبع اوّل ۱۹۸۲ء ناشر: اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی

(۱۰) سعادت حسن منٹو از انیس ناگی

طبع اوّل ۱۹۸۴ء ناشر: مکتبۂ جمالیات، لاہور

(۱۱) منٹو: نوری نہ ناری از ممتاز شیریں مرتب: آصف فرخی

طبع اوّل ۱۹۸۵ء ناشر: مکتبۂ اسلوب، کراچی

طبع دوم ۱۹۹۱ء ناشر: ساقی بک ڈپو، دہلی

(۱۲) دی لائف اینڈ ورکس آف سعادت حسن منٹو از لزلی فلیمنگ، طاہرہ نقوی

طبع اوّل ۱۹۸۵ء ناشر: وین گارڈ بکس لمیٹیڈ، لاہور

(۱۳) سعادت حسن منٹو — حیات اور کارنامے از ڈاکٹر برج پریمی

طبع اوّل ۱۹۸۶ء ناشر: دیپ پبلی کیشنز، شری نگر

(۱۴) دستاویز منٹو مرتب: بلراج مین را

طبع اوّل ۱۹۸۶ء ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

(۱۵) سعادت حسن منٹو مرتب: ضیاء ساجد

طبع اوّل: انجم بک ڈپو، دہلی

(۱۶) منٹو نامہ از جگدیش چندر ودھاون

طبع اوّل ۱۹۸۹ء ناشر: جواہر آفسیٹ پرنٹرز، دہلی
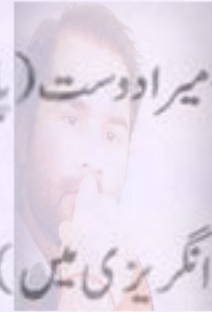
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
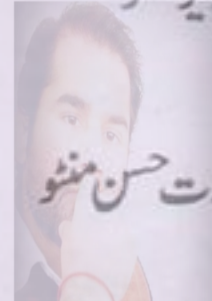
طبع دوم ۲۰۰۳ء ناشر: کتابی دنیا، دہلی
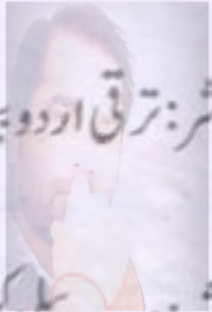
(۱۷) منٹو اور آکلو از شیریں نیازی
طبع اوّل ۱۹۹۲ء ناشر: ترقی اردو بیورو، دہلی

(۱۸) منٹو کتھا از ڈاکٹر برج پریمی
طبع اوّل ۱۹۹۴ء ناشر: ویپ پبلیکیشنز، جموں

(۱۹) سعادت حسن منٹو (ہندوستانی ادب کے معمار) از وارث علوی
طبع اوّل ۱۹۹۵ء ناشر: ساہتیہ اکادمی، دہلی

(۲۰) منٹو شناسی از شکیل الرحمن
طبع اوّل ۱۹۹۷ء ناشر: اردو مرکز، پٹنہ

(۲۱) منٹو۔ایک مطالعہ از وارث علوی
طبع اوّل ۱۹۹۷ء ناشر: و جے پبلشرز، نئی دہلی

(۲۲) سعادت حسن منٹو مرتب: پریم گوپال متل
طبع اوّل ۱۹۹۹ء ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

(۲۳) منٹو اور بیدی۔تقابلی مطالعہ از ڈاکٹر کہکشاں پروین
طبع اوّل ۲۰۰۲ء ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

(۲۴) منٹو کا سرمایۂ فکر و فن از ڈاکٹر نگار عظیم طبع اوّل ۲۰۰۳ء۔
ناشر: بزم ہم قلم، بٹلہ ہاؤس، دہلی

## رسائل کے منٹو نمبر:

۱. ماہنامہ ''نقوش'' لاہور (منٹو نمبر) مدیر: محمد طفیل (شمارہ: ۴۹-۵۰) ۱۹۵۵ء
۲. ماہنامہ ''افکار'' کراچی (منٹو نمبر) مدیر: صہبا لکھنوی مارچ-اپریل، ۱۹۵۵ء
۳. ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی (منٹو نمبر) مدیر: اعجاز صدیقی مارچ-اپریل، ۱۹۵۵ء
۴. ماہنامہ ''پگڈنڈی'' امرتسر (منٹو نمبر) مدیر: باوا مہندر/امریک آنند اپریل-مئی ۱۹۵۵ء
۵. ''گل خنداں'' لاہور (منٹو نمبر) مدیر: عبدالرؤف شمارہ ۶، جلد ۶، ۱۹۵۵ء
۶. ''نقش'' کراچی (منٹو نمبر) مدیر: شاہد احمد دہلوی ۱۹۵۵ء
۷. ''قافلہ''، لاہور (منٹو نمبر) مدیر: سید قاسم محمود جنوری-فروری، ۱۹۸۰ء
۸. ماہنامہ ''روبی'' دہلی (منٹو نمبر) مدیر: رحمن نیر ۱۹۷۷ء

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

۹.　"شعور" دہلی (سوگندھی)　　مدیر: بلراج مین را، مارچ ۱۹۸۰ء

# سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے تحقیقی مقالے

## مقالہ جات برائے پی. ایچ. ڈی

(۱)　برج کشن ایما (برج پریمی)　　موضوع: سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے

جموں و کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء

زیرِ نگرانی: ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی

(۲)　Fleming, Leslie

Topic: The life and Works

of Saadat Hassan Manto-A Critical Survey

Advisor: Professor Gopi Chand Narang

University of Wisconsin. 1973.

(۳)　علی ثناء بخاری　　موضوع: سعادت حسن منٹو

زیرِ نگرانی: ڈاکٹر وحید قریشی پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۴ء

(۴)　ارشد رضا　　موضوع: منٹو کی کہانیوں پر فرائڈ کے نظریہ جنس کا اثر

زیرِ نگرانی: مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور یونیورسٹی، ۱۹۹۲ء

**منٹو پاگل خانے میں :** منٹو کا اعصابی نظام مضمحل ہو گیا تو انہیں دو بار پاگل خانے میں داخل ہونا پڑا۔ زندگی کے آخری ایام میں بھی وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو گئے تھے۔

**ترک وطن :** جنوری ۱۹۴۸ء میں منٹو ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔

**انتقال :** سعادت حسن منٹو ۴۳ سال کی عمر میں بہ عارضۂ تپ دق، ۱۸؍ جنوری ۱۹۵۵ء کو رحلت فرما گئے۔ وہ محض ۴۲ سال ۸ ماہ اور ۴ دن جئے۔

**مدفن :** لاہور، میانی صاحب

بڑا نامور افسانہ نگار تھا

۱۳۷۴ھ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# کچھ منٹو کے خاکے کے بارے میں
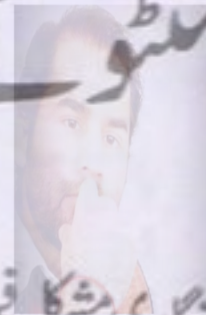
خاکہ نگاری مشکل فن ہے۔ یہ سوانح نگاری کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس معنی میں اس سے الگ ہے کہ یہاں خاکہ نگار ایک جانبدار فرد کی حیثیت سے ثبوت اور شواہد کی روشنی میں شخصیت کو پیش نہیں کرتا ہے بلکہ یہ شخصیت کے بارے میں خاکہ نگار کے اپنے تجربات ومشاہدات اور اخذ وقبول کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہاں بعض اوقات شخصی رفاقتیں اور رقابتیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں۔ اس لئے توازن اور اعتدال ہی اچھے خاکے کی خوبی کہلاتی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ رائے حقیقت پر مبنی ہے کہ:

''خاکہ کا فن بہت مشکل اور کٹھن فن ہے۔ اسے اگر نثر میں غزل کا فن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس طرح غزل میں طویل مطالب بیان کرنے پڑتے ہیں، ٹھیک اسی طرح خاکے میں مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے''۔

خاکہ دراصل کسی شخصیت کی قلمی تصویر ہوتی ہے جس کا خالق بُت ساز یا مصوّر یا فوٹو گرافر نہیں بلکہ ایک ادیب ہوتا ہے جو اپنی ادیبانہ قوتوں سے کسی شخص کی عکس کشی یا مرقع نگاری کرتا ہے۔ اس کے بنانے میں نہ سنگ تراش کے اوزاروں کی حاجت ہے، نہ رنگا رنگ پیالوں اور برش کی، نہ پنسل یا چارکول کی اور نہ کیمروں کی۔ یہ صورتیں محض الفاظ سے مرتب کی جاتی ہیں اور ان میں مجسموں، تصویروں، شبیہوں اور فوٹو سے زیادہ دلکشی اور اثر خیزی ہوتی ہے۔ مرقع کشی میں خاکہ نویس کو اس کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس کا خاکہ اتنا تخیلی نہ ہو کہ وہ صرف ہمارے تصور میں زندہ رہ سکے اور نہ اس قدر حقیقی ہو کہ نظروں تک ہی موجود رہے، اس کی دلکشی اور حسن نہ صرف وقتی اور مقامی ہو بلکہ یہ ہر خطۂ ارض اور ہر دور میں مثل تازہ گلاب نظر آئے۔ کیونکہ یہ کسی عام شخص کا عام چہرہ نہیں ہوتا جو اس کی صرف اصلی شبیہ نظر آئے بلکہ یہ وہ قلمی تصویر ہوتی ہے جس پر اس کے ظاہری رنگ وروپ کے علاوہ اس کی انفرادیت کا پرتو بھی موجود رہتا ہے۔ یعنی اس کی تصویر میں بڑی حد تک اس کی صورت جھلملاتی رہتی ہے۔

خاکے میں خارجی شخصیت کا بیان بھی ہوتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم داخلی شخصیت یعنی عادات واطوار، مزاج، نفسیات، پسند وناپسند وغیرہ کی تفصیل ہوتی ہے۔ تاثراتی پیرائے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں، کیف واثر سے لبریز۔

اگر مرقع نگار، اعلیٰ پایہ کا انشا پرداز، حق گو، بے باک، پرخلوص اور نقاش نہیں بلکہ عکاس بھی ہو تو یہ بالکل ممکن ہے کہ ہر معمولی قلم زدہ انسان غیر معمولی بن جائے اور ہر غیر معمولی فرد معمولی ہو جائے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم نے لکھا ہے کہ:

''خاکہ نگاری اردو کی ایک مقبول صنف ادب ہے۔ خاکے کے لئے ویسے موضوع کی تخصیص نہیں ہے لیکن زیادہ تر خاکے ایسی شخصیتوں کے لکھے گئے ہیں جنھوں نے فنون لطیفہ بالخصوص ادب اور شاعری یا پھر کسی اور شعبۂ حیات میں نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ جن شخصیتوں کے کارناموں سے ہم متاثر اور مستفید ہوتے ہیں ان کی نجی زندگی کی تفصیلات جاننے کی خواہش بھی ہمارے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جب سے تحلیل نفسی کے نظریے کو فروغ ہوا ہے۔ فنکاروں کی تخلیقات کے لاشعوری محرکات کا مطالعہ بھی ایک دلچسپ مشغلہ بن گیا ہے۔ ہر صنف ادب کی طرح اس کے بھی اپنے فنی تقاضے اور مسائل ہوتے ہیں، جن سے خاکہ نگار یا خاکے کا ناقد روگردانی نہیں کر سکتا۔ اردو میں خاکے تو بہت سے لکھے گئے لیکن سوائے چند ایک مضامین کے خاکے کے فن کا مبسوط انداز میں جائزہ لینے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ خاکہ نگار اپنے ذوق سلیم کے سہارے ہی اس صنف میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے اردو میں خاکہ نگاری کو پروان چڑھانے میں ایسے صاحب طرز ادیبوں نے اہم حصہ لیا جو افسانہ، انشائیہ یا مزاح نگاری کے فن پر قدرت رکھتے تھے۔ نتیجتاً خاکے کی صنف میں مختلف اصناف ادب کی خصوصیات یکجا ہو گئیں اور اس میں اسالیب کے تنوع کے ساتھ فنی اعتبار سے بھی خاصی وسعت پیدا ہوگئی۔''

اردو ادب میں خاکہ نگاری کوئی نئی صنف نہیں اور نہ ہی اس کی فروغ ونمو میں ہمارے ادباء کسی ادب مغرب کے رہین منت رہے ہیں۔ یہ ہماری پیداوار ہے، جس کی داغ بیل دیگر اصناف ادب کی طرح ہمارے ملک اور ہماری فضا میں ہوئی ہے۔ اس کی اختراع کا سہرا اردو کے ادیبوں کے سر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آگے چل کر انگریزی ادب کے اثرات بھی اس نے قبول کئے۔

خاکہ گوئی کے ابتدائی خدوخال شعراء کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی

"آب حیات" میں شعراء کے جاندار خاکے پیش کئے گئے ہیں۔ بحیثیت ایک آزاد صنف کے خاکہ نگاری کا وجود بیسویں صدی میں ہوا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، چراغ حسن حسرت، آغا حیدر حسن دہلوی، شوکت تھانوی، عصمت چغتائی، خواجہ محمد شفیع دہلوی، مجید لاہوری، مرزا محمود بیگ، شورش کاشمیری، جوش ملیح آبادی، تخلص بھوپالی، ضیاء الدین برنی، الطاف حسن قریشی، عبدالماجد دریا آبادی، اعجاز حسین، غلام السیدین، علی جواد زیدی، فکر تونسوی، رئیس احمد جعفری، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی، اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، محمد طفیل، نورالحسن نقوی، مثنیٰ رضوی، عاشق بٹالوی، نیر واسطی، مہندر ناتھ، بلونت گارگی، مجتبیٰ حسین اور سعادت حسن منٹو جیسے انشاء پردازوں نے اپنے زور قلم سے اس صنف کو اس درجہ نکھارا ہے کہ وہ موجودہ دور میں اردو ادب کی ایک دلکش اور مقبول عام صنف بن گئی ہے۔

منٹو اردو کا منفرد اور بے مثال خاکہ نگار ہے۔ جس کی تحریریں جب تک اردو ادب میں باقی رہیں گی، خاکہ اردو ادب کی ایک مقبول صنف بنا رہے گا۔ اس کے خاکوں کے دو مجموعے "گنجے فرشتے" اور "لاؤڈ اسپیکر" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ منٹو کے خاکے بھی اس کی دوسری تخلیقات کی طرح اس کی کتاب زندگی کے وہ بکھرے پنے ہیں جس میں اس کی ذات سب سے نمایاں اور غالب ہے۔ اس نے کل چوبیس ادبی، صحافتی اور فلمی شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں جن میں قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت بھی شامل ہے۔ آغا حشر کاشمیری، اختر شیرانی، چراغ حسن حسرت اور عبدالباری جیسی مقتدر ہستیاں بھی، میراجی وعصمت جیسے ہم عصر ادیب بھی اور فلمی دنیا کی کئی بڑی چھوٹی ہستیاں بھی لیکن ان سارے خاکوں میں سب سے نمایاں شخصیت خود منٹو کی ہے۔ اس نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے:

"منٹو کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ اس کے حق میں کم اور خلاف زیادہ۔ یہ تحریریں اگر پیش نظر رکھی جائیں تو کوئی صاحب عقل منٹو کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا...... منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے۔ اس لئے کہ منٹو سے مجھے قربت کا شرف حاصل رہا ہے اور سچ پوچھئے تو منٹو کا میں ہمزاد ہوں۔

اب تک اس شخص کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اتنا سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے حقیقت سے بالاتر ہے۔ بعض لوگ اسے شیطان کہتے ہیں بعض گنجا فرشتہ...... ذرا ٹھہرئیے میں دیکھ لوں کہیں وہ کم

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری بس بک گروپ 0314.595.1212

بخت سن تو نہیں رہا...... نہیں، نہیں، ٹھیک ہے مجھے یاد آ گیا کہ یہ وقت ہے، جب وہ پیا کرتا ہے۔ اس کو شام کے چھ بجے کڑوا شربت پینے کی عادت ہے۔

ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے۔ اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے۔ اسی لئے میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نبھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگر وہ زندہ رہا اور میں مر گیا تو ایسا ہو گا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہو گئی ہے۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ منٹو ایسا ون ٹو آدمی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ جسے اگر جمع کیا جائے تو وہ تین بن جائے"۔

محمد علی جناح پر لکھے گئے اس کے خاکے "میرا صاحب" کا مطالعہ کریں تو ابتدائی کئی صفحات میں قائد اعظم سے متعلق جو اطلاعات ہم پہنچتی ہیں وہ محض یہ ہیں کہ۔ وہ طبعاً بہت نظم پسند تھے۔ وہ بہت دبلے اور نحیف تھے۔ انہیں تنومند چیزیں پسند تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے لئے ملازموں کا انتخاب کرتے وقت وہ جسمانی صحت اور طاقت سب سے پہلے دیکھتے تھے۔ منٹو اس کا نفسیاتی پس منظر یہ بیان کرتا ہے کہ، جناح مرحوم خود بہت ہی لاغر اور نحیف تھے مگر طبیعت کے چونکہ بے حد مضبوط اور کسرتی تھے، اس لئے کسی ضعیف اور نحیف شئے کو خود سے منسوب ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور وہ چیز جو انسان کو مرغوب اور پیاری ہو، اس کے بناؤ سنگار کا وہ خاص اہتمام کرتا ہے۔ چنانچہ قائد اعظم کو اپنے صحت مند اور طاقت ور ملازموں کی پوشش کا بہت خیال رہتا تھا۔ منٹو کا یہ بھی خیال ہے کہ:

"جسم کی لاغری کا یہ احساس ہی ان کی مضبوط اور پر وجاہت زندگی کی سب سے بڑی قوت تھی۔ ان کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور بولنے سوچنے میں یہ قوت ہر وقت کار فرما رہی"۔

یہ ساری باتیں منٹو نے جناح صاحب کے ایک ملازم آزاد کے حوالہ سے بیان کی ہیں لیکن یہ نرے بیانات نہیں ہیں۔ محض اطلاعات نہیں ہیں۔ ان کے پیچھے منٹو کا بیدار ذہن پوری طرح متحرک نظر آتا ہے۔ وہ رواں تبصرے کرتا جاتا ہے۔ اور یہ رواں تبصرے ظاہر ہے کہ منٹو کے ہیں، جس سے قائد اعظم کی قد آور شخصیت ایک عام آدمی کی سطح پر اتر آتی ہے۔ بیوی پارسی ہے جو ساتھ نہیں رہتی۔ بیٹی نے ان کی مرضی کے خلاف ایک پارسی لڑکے سے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

شادی کرلی ہے، جس سے ان کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ ایک بہن رحمت جناح کی ہر ماہ انہیں مدد کرنی پڑتی تھی۔ ایک ہم شکل چھوٹا بھائی تھا جسے ان کے یہاں آنے کی اجازت نہ تھی۔ اور وہ سستے شراب خانوں میں بیٹھ کر سستی شراب شاہی انداز میں پیتا تھا۔ ان کی صفائی پسندی اور کرخت مزاجی کو بھی منٹو، قائداعظم کی جسمانی کمزوری کا غیر شعوری یا تحت الشعوری احساس ہی سمجھتا ہے۔ اس سے متعلق اس نے ایک شاعرانہ جملہ رقم کیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

''ان کی زندگی حباب برآب تھی مگر وہ ایک بہت بڑا بھنور بن کر رہتے تھے، بعض اصحاب کا تو یہ کہنا ہے کہ وہ اتنے دن صرف اسی قوت کے بل پر جئے۔ جسمانی کمزوری کے اس احساس کی قوت پر''۔

قائداعظم کی سیاسی زندگی نے ان کی نجی اور ذاتی زندگی کو تقریباً مخفی بنا رکھا ہے۔ منٹو نے اس خاکے میں لوہے کی صندوق کے واقعہ کی تفصیل بیان کرکے ان کی زندگی کے اس جذباتی اور رومانی پہلو سے پردہ اٹھایا ہے۔ بیوی کی جدائی اور بیٹی کا ان کی مرضی کے خلاف شادی کرنا، ان کو کس کرب والم میں مبتلا کر گیا، اگرچہ قائداعظم نے اس پر اپنی مصروفیات کا پردہ ڈال رکھا تھا لیکن جب وہ اکیلے اور تنہا ہوتے تو ان کا یہ دکھ ناگ کی مانند پھن کاڑھے ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا اور وہ تڑپ کر رہ جاتے تھے۔ آزاد بتاتا ہے:

''جب پرانے کپڑوں کا صندوق کھولا جاتا تو صاحب بڑی سنگین خاموشی سے ان کو دیکھتے، ایک دم ان کے دبلے پتلے اور شفاف چہرے پر غم واندوہ کی لکیروں کا جال سا بکھر جاتا۔ ''اِٹ از آل رائٹ۔ اِٹ از آل رائٹ'' کہہ کر وہ اپنی آنکھ سے مونوکل اتارتے اور اسے پونچھتے ہوئے ایک طرف نکل جاتے''۔

بیٹی کے بچپن کے کپڑوں کو صندوق سے نکال کر دیکھنا اور آنکھیں بھر آنا، یہ سب جناح صاحب کی انسانی شخصیت کو موثر طریقے سے اجاگر کرتی ہیں۔ منٹو نے اپنے اس خاکے کا خاتمہ پاکستان کی بدحالی پر کیا ہے۔ جس میں قائداعظم کے پسندیدہ ملازم آزاد کے پاس پان کے پیسے بھی نہیں تھے اور کراچی ایروڈرم سے گورنمنٹ ہاؤس تک انہیں پہنچانے کے لئے جو ایمبولنس تھی اس کا انجن درست حالت میں نہیں تھا۔ وہ کچھ دور چل کر رک گئی تھی۔ میں نے خصوصیت کے ساتھ اس خاکے کا جائزہ اس لئے پیش کیا ہے کہ یہ وہ ایک شخصیت تھی جس سے منٹو کی ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ایک دوسرے شخص کے حوالہ سے اس خاکہ کو مرتب کیا ہے لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس میں اگر ہم اس قائداعظم کی شبیہہ کے متلاشی ہیں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جس نے اپنے شخصی ہالہ کے چاروں طرف ایک "ممنوعہ علاقہ" بنا رکھا تھا تو آپ کو مایوسی ہو گی۔ اجمل نیازی نے منٹو کے اس خاکہ کے بارے میں درست لکھا ہے:

"اس نے جو قائداعظم کا خاکہ لکھا ہے وہ قائداعظم پر لکھی گئی بہت سی کتابوں پر بھاری ہے، اس خاکے کے ذریعے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قائداعظم ایک بڑا آدمی ہوتے ہوئے ایک عام آدمی بھی تھا۔ منٹو نے جس طرح بڑے آدمیوں میں اچھے آدمی تلاش کئے وہاں ایک غیر معمولی طور پر عظیم آدمی میں ایک عام سیدھے سادے آدمی کو بھی دریافت کیا اور اسے ہمارے سامنے پیش کرنے کی تخلیقی جرأت بھی کی"

منٹو ایک بے درد واقعہ نگار ہے۔ اسے صرف سچ پیش کرنا آتا ہے۔ انسان جو نظر آتا ہے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کی نگاہ سے اوجھل ہوتا ہے۔ منٹو اپنے خاکوں میں انسان کے اسی مخفی حصے کو دکھانے کی سعی کرتا ہے۔ وہ منافقت کا قائل ہی نہیں تھا۔ لکھتا ہے:

"میں ایسی دنیا، ایسے ملک، ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں، جہاں یہ اصول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے دھل دھلا کر آئے اور رحمت اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے"۔

مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ وغیرہ کے خاکوں میں یہ روش ملتی ہے۔ انہوں نے خاکوں میں جن اشخاص کو اپنا موضوع بنایا ہے ان کی چھوٹی موٹی خامیوں، بے اعتدالیوں اور کمزوریوں کو لفظی خوبصورتیوں میں چھپا دیا ہے صرف ان کی نیکیوں اور اچھائیوں کو ہی منعکس کیا ہے۔ منٹو ایسا قطعی نہیں کرتا۔ اس کے یہاں ایسی کوئی لانڈری، کوئی پیمانہ، کوئی کھونٹی نہیں۔ وہ ذات خاکہ کی پٹاری کو سب کے سامنے کھولتا ہے۔ باری باری تمام چیزیں نکال کر سجا دیتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کا نہ تو بناؤ سنگھار کرتا ہے اور نہ ان کے حلیے بگاڑتا ہے بلکہ جو کچھ جیسا ہے اسے بغیر استری کئے ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا۔ جیسا دیکھتا ہے، بیان کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے نہ تو میراجی کی ضلالت پر پردہ ڈالا، نہ آغا حشر کی تیڑھی آنکھ سیدھی کی اور نہ ہی شیام کے منہ سے گالیوں کی بجائے کلمۂ خیر کہلوایا۔ انہوں نے اپنے اچھوتے اور دلکش اسلوب سے ان

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کرداروں کی تصویروں میں رنگ آمیزی کی اور یہ سارے رنگ بھی اس نے اپنے کرداروں سے مستعار لئے۔ اپنی طرف سے تمام خاکوں میں صرف ایک رنگ کا اضافہ کیا اور وہ محبت اور ہمدردی کا رنگ تھا۔ اگرچہ بظاہر منٹو ان کرداروں کی بے اعتدالیوں، کمزوریوں اور خامیوں کو اچھالتا نظر آتا ہے لیکن بباطن اس کے پیچھے منٹو کی ہمدردی کارفرما ہے۔ غرض کہ منٹو نے انسان کو فرشتہ بنانے کے بجائے فرشتوں کا استرے سے مونڈن کیا ہے۔ اپنی خاکہ نگاری کے اس وصف کا اظہار منٹو ان الفاظ میں کرتا ہے:

"میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شمپو نہیں، کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی۔ اس کے منہ سے گالیوں کی بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔ میرا جی جس کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔ اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے، اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔"

منٹو اپنے خاکوں میں کرداروں کے خارجی اور باطنی کیفیات کو اجاگر کرتا ہے۔ اس نے انسانوں کو باہر سے دیکھا اور پھر بے دھڑک ان کی ذات کے اندھے کنوئیں میں اتر کر انسانی زندگی کی اچھائیوں، کمزوریوں، خامیوں، مجبوریوں، جذباتوں سے ہمیں واقف کرادیا۔ اس نے جو کچھ دیکھا پوری سچائی سے واضح کردیا۔ دراصل کونے کھدروں میں جھانکنا اس کی کمزوری ہے۔ عصمت سے متعلق منٹو نے لکھا ہے:

"پردے کے اس پار کی تفصیلات بیان کرنے میں عصمت کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ عصمت کو سماج سے نہیں شخصیتوں سے شغف ہے۔ شخصیتوں سے نہیں اشخاص سے ہے۔ عصمت کے پاس جسم کے احتساب کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ مساس...... عصمت کے افسانوں کی کوئی سمت ہی نہیں...... عصمت کی غیر معمولی قوت مشاہدہ حیرت میں غرق کردیتی ہے...... عصمت نخش نگار ہے...... ہلکا ہلکا طنز اور مزاح، عصمت کے اسٹائل کی ممتاز خوبیاں ہیں...... عصمت تلوار کی دھار پر چلتی ہے"۔

(عصمت چغتائی)

یہی بات کم و بیش منٹو کے خاکوں سے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔ منٹو کو بھی پردے کے اس پار کی تفصیلات بیان کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ اپنے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہ ایک

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا۔ بلکہ تنے ہوئے رسے پر چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا، اب گرا۔ لیکن وہ کمبخت آج تک نہیں گرا۔ شاید گر جائے اوندھے منہ...... کہ پھر نہ اٹھے۔ لیکن مرتے وقت وہ لوگوں سے کہے گا کہ میں اس لئے گرا تھا کہ گراوٹ کی مایوسی ختم ہو جائے —— سچ ہے کہ منٹو کا فن تنی ہوئی رسی پر چلنے کا فن ہے۔ وہ اپنے افسانوں کی طرح خاکوں میں بھی اسی فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ اپنے ان خاکوں کی مدد سے کئی لوگوں کی ناراضگیاں مول لیتا ہوگا لیکن ہر شخص کو اس کی خواہش رہتی ہوگی کہ کاش وہ اس پر بھی ایک خاکہ لکھ دے۔ عصمت نے جب اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی موت کے بعد ان پر "دوزخی" کے عنوان سے خاکہ لکھا تو بقول منٹو:

"ساقی میں "دوزخی" چھپا۔ میری بہن نے پڑھا اور مجھ سے کہا۔ "سعادت! یہ عصمت کتنی بے ہودہ ہے۔ اپنے موئے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا کم بخت نے —— کیسی کیسی فضول باتیں لکھی ہیں"۔

میں نے کہا —— "اقبال اگر میری موت پر تم ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج ہی مرنے کے لئے تیار ہوں"۔

شاہجہاں نے اپنی محبوبہ کی یاد قائم رکھنے کے لئے تاج محل بنوایا۔ عصمت نے اپنے محبوب بھائی کی یاد میں "دوزخی" لکھا۔ شاہجہاں نے دوسروں سے پتھر اٹھوائے، انہیں ترشوایا اور اپنی محبوبہ کی لاش پر عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔ عصمت نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے خواہرانہ جذبات چن چن کر ایک اونچا مچان تیار کیا اور اس پر نرم نرم ہاتھوں سے اپنے بھائی کی نعش رکھ دی —— تاج شاہجہاں کی محبت کا برہنہ مرمریں اظہار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دوزخی، عصمت کی محبت کا نہایت ہی لطیف اور حسین اشارہ ہے۔ وہ جنت جو اس مضمون میں آباد ہے، عنوان اس کا اشتہار نہیں دیتا"۔

(عصمت چغتائی)

منٹو صرف "دوزخی" کی تعریف نہیں کر رہا ہے، اس کا دفع نہیں کر رہا ہے بلکہ خاکہ نگاری سے متعلق اپنے اصول بھی بیان کر رہا ہے۔ وہ دوزخ جو اس کے خاکوں میں دہکتا ہوا نظر آتا ہے، اس کے پس منظر میں ایک ایسی دنیا آباد ہوتی ہے، جس پر کئی جنتیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ وہ ایک ایسے تیماردار کی مانند ہے، زخموں کو ادھیڑنا جس کی مجبوری ہے۔ لیکن ان کو صاف کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں جو کپکپاہٹ ہوتی ہے، اس کا دل جس انجانے خوف سے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

بھرا ہوتا ہے، مریض کے احساس کرب کو، وہ جس طرح محسوس کرتا ہے، وہ ان خاکوں کو ایک ایسی شکل عطا کر دیتے ہیں کہ قاری پوری طرح اس کے ٹرانس میں آجاتا ہے۔ وہ نفرت اور ہمدردی کے جذبوں سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسے مقام پر ہوتا ہے جہاں آنکھیں صرف دیکھتی ہی نہیں، بولتی بھی ہیں۔ آغا حشر کاشمیری سے متعلق یہ بیان دیکھیں:

"......اور آغا صاحب عمر کے اس آخری حصے میں شراب چھوڑ کر طوائف سے بہت پر جوش عشق فرما رہے تھے۔ پنڈت محسن سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا "عشق کے متعلق تو میں نہیں جانتا لیکن ترک شراب نوشی بہت جلد ان کو لے مرے گی"۔

آغا صاحب تو کچھ دیر زندہ رہے۔ لیکن پنڈت محسن یہ فرمانے کے تقریباً ایک ماہ بعد اس دنیا سے چل بسے۔...... کچھ عرصہ بعد یہ خبر آئی کی لاہور میں مختصر علالت کے بعد آغا حشر کاشمیری کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازے کے ساتھ گنتی کے چند آدمی تھے۔ دینو یا فضلو کمہار کی بیٹھک پر جب آغا صاحب کی موت کا ذکر ہوا تو اس نے نال کے پیسے نکال کر اپنی جالی دار ٹوپی میں رکھتے ہوئے بڑے ہی فلسفیانہ انداز میں کہا—— "بڑھاپے کا عشق بہت ظالم ہوتا ہے"۔

("آغا حشر سے دو ملاقاتیں")

پردے کے اس پار کی تفصیلات کو پیش کرنے کی کوشش میں عصمت ہی کی طرح منٹو بھی اشخاص کے دروں خانہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ مرد اور عورت کے مابین قائم رشتوں تک رسائی کی کوشش میں کبھی کبھی تو وہ انتہائی ذلیل نظر آنے لگتا ہے۔ "پارو دیوی" پر لکھے اپنے خاکے میں اشوک کمار کا ایک واقعہ آپ بھی سنئے:

"شیواجی پارک کے پاس جہاں پارو کا فلیٹ تھا، اشوک نے موٹر کی رفتار کم کی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "منٹو! تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں؟"

اس کے لہجے میں کسی قدر کپکپاہٹ تھی۔

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ یہ دلچسپ بات کیا ہو سکتی ہے۔ "بتاؤ!"

اشوک ہنسنے لگا۔ "تمہیں یاد ہے، اس روز جب ہم پارو کے یہاں کھانا کھا رہے تھے، تو وہ میرے ہاتھ دھلوانے کے لئے اٹھی تھی——؟"

اشوک نے یہ کہا تو مجھے اس کی گھبراہٹ یاد آگئی۔ "ہاں، ہاں!"

جب غسلخانے میں اس نے مجھے تولیہ دیا تو مجھ سے آہستہ سے کہا—— "کل

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

آپ اکیلے آیئے...... شام کو ساڑھے چھ بجے...... میں گھبرا گیا اور تولیہ پھینک کر بھاگ آیا"۔ اشوک نے موٹر سڑک کے کنارے ٹھہرا لی۔

میں نے اس سے پوچھا ——"تم گئے؟"

"ہاں ——!" اشوک نے اسٹیرنگ وھیل سے ہاتھ ہٹائے اور انہیں زور زور سے ملنے لگا ——"لیکن وہاں سے بھی بھاگ آیا۔"

میں تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ "ہوا کیا —— پورا اسینریو بتاؤ!"

میں بڑا ڈرپوک ہوں۔ جانے مجھے ایسے موقعوں پر کیا ہو جاتا ہے —— اس نے مجھے صوفے پر بٹھایا۔ آپ قالین پر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ دو پیگ مجھے پلائے۔ خود بھی تھوڑی سی پی اور پھر —— پھر وہ لگی اپنی محبت دکھانے —— میں سنتا رہا اور کانپتا رہا۔ جب اس نے میرا ہاتھ دبایا تو میں نے اسے بڑے زور سے جھٹک دیا —— اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن فوراً کہیں غائب ہو گئے —— وہ مسکرانے لگی —— بھیا اشوک! میں تو آپ کا امتحان لے رہی تھی —— میں نے یہ سنا تو چکرا گیا۔ اٹھا تو اس نے پھر کہا، اشوک صاحب! میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ میں نے کچھ نہ کہا اور نیچے اتر گیا —— کار میں بیٹھا —— گھر پہنچ کر میں نے آدھا پیگ پی کر سوچا تو مجھے بڑا افسوس ہوا!

"کیا ہرج تھا اگر میں" —— اشوک کے لہجے میں تاسف تھا۔

میں نے کہا۔ "ہاں کوئی ہرج نہیں تھا۔"

اشوک کے لہجے میں تاسف اور زیادہ ہو گیا —— "اور —— مجھے وہ پسند بھی تھی"۔

یہ سن کر میرے سامنے وہ منظر آ گیا جو اس وقوعے کے روز رات کو نو بجے اسٹوڈیو کے باہر سخت سردی میں فلمایا جا رہا تھا۔ جشنِ مسرّت میں لوگ ناچ گا رہے تھے —— اشوک اپنی ہیروئن ویرا کی بانہوں میں بانہیں ڈالے محوِ رقص تھا اور پارو ایک طرف مجسمۂ افسردگی بنی اکیلی کھڑی تھی ——!"

("پارو دیوی")

بیدی نے ایک افسانے میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ میں سچ میں تھوڑا سا جھوٹ شامل کر دیتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو زندگی جہنم بن جائے۔ میں طوائف الملوکی کو پسند نہیں کرتا۔ زندگی میں ایک ڈھیلا ڈھالا ہی سہی نظم قائم رہنا چاہئے لیکن منٹو اخلاقاً بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اگر یہ آخری فقرے وہ نہ لکھتا تو یہ بھرم تو قائم ہی رہتا کہ عورت اور مرد کے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مابین جنس کے علاوہ کوئی اور رشتہ بھی قائم ہے، صرف شہوانیت اور ہوس پرستی انسان کی خصلت نہیں ہوتی۔ یا پھر ایک پل کے لئے یہ ثابت کیا جاسکتا تھا کہ دادا منی کتنے عظیم انسان تھے کہ جب پارو دیوی نے انہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ انسان کو فرشتہ ثابت کرنے کا یہ ایک موقع تھا جسے منٹو نے ضائع کردیا۔ پارو کو ٹھکرا کر اشوک نے اپنی بزدلی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ واقعہ جو اشوک کی قوت بن سکتا تھا اس کی 'بزدلی' ثابت کرنے کا وسیلہ بن گیا۔ کیا ذلالت ہے؟ بیدی کا ذکر آیا ہے تو ایک اور خیال آیا۔ بیدی کے نسوانی کردار ہمیشہ معصوم، مجبور، قربانی اور محبت کی دیوی، صابر اور حالات سے سمجھوتا کرنے والی ہوتے ہیں۔ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں عورت محض ایک 'آلۂ کار' ہوتی ہے۔ خود وجہ نہیں ہوتی۔ لیکن منٹو کے یہاں عورت وہ تو ماں حوا کی سچی جانشیں ہے۔ جس نے ازل سے مرد کو ورغلانے کا فریضہ انجام دیا ہے اور گندم کے ذائقہ سے آشنا کروا کر اسے جنت سے ہی نہیں نکلوایا تھا بلکہ دربدری پر مجبور کردیا تھا۔ صرف ''پراسرار نینا'' کا جائزہ لیجئے تو ایک عجیب سی الجھن آپ کو دور تک رگیدتی لے جائے گی۔ شاہدہ جو محسن عبداللہ کی وفا شعار بیوی تھی، ڈبلو۔ زیڈ۔ احمد کی نظر کرم کے طفیل پراسرار نینا بن گئی ہے۔ مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں نے بقول منٹو ایسے پر پرزے نکالے تھے کہ حد ہی کردی تھی۔ وہ پروفیسر محمود الظفر کی بیوی تھیں اور فیض احمد فیض، رشید جہاں سے ملنے ڈیرہ دون جایا کرتے تھے۔ شاہد، سنیہہ پردھان کے دامِ گرہ گیر کے اسیر تھے۔ ڈبلو۔ زیڈ۔ احمد کی بیوی صفیہ۔ جو وزیر اعظم سندھ مرحوم غلام حسین ہدایت اللہ کی بیٹی تھی، سبط حسن پر مہربان تھی اور آخرکار انہیں سے شادی ہوگئی۔ احمد کے ایک رشتہ دار کی بیوی مسز نورانی ایک پنجابی لونڈے پر عاشق تھی۔ مسٹر نورانی خاموشی سے کرسی پر سگار سلگائے بیٹھے رہتے اور ان کی بیگم پنجابی نوجوان کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی رہتی۔ کبھی کبھی بوس و کنار بھی ہوجاتا۔ مگر مسٹر نورانی کی سگار کی راکھ ویسی کی ویسی اس پر ثابت وسالم رہتی۔ گویا کہ منٹو کے لفظوں میں:

''عجیب سلسلہ تھا کہ محسن عبداللہ، سنیہہ پردھان کے عشق کے چکر میں تھے۔ ان کی بیوی پر احمد اپنا سلسلہ جما رہے تھے۔ ادھر احمد کی بیوی صفیہ، سبط حسن سے رومان لڑا رہی تھی۔ اور ان کے جاننے پہچاننے والوں میں بھی یہ سلسلہ جاری تھا۔ میں نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو بخدا چکرا گیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میاں یہاں بیٹھے ہیں اور ان کی بیوی کسی غیر مرد سے چوما چاٹی کر رہی ہے۔ ایک مرد اپنی سہرے جلوے کی بیاہی بیوی کو چھوڑ کر کسی ایکٹریس کے پیچھے مارا مارا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

پھر رہا ہے۔ میرا خیال ہے دنیا میں ایسے واقعات کی کمی نہیں۔ عورتیں اور مرد، ہمیشہ ایسے ہی سلسلے کرتے آئے ہیں۔"

("پراسرار نینا")

شاید یہی منٹو کا فلسفہ تھا اور یہی اس کی واقعات نگاری کا جواز بھی کہ جب ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں تو پھر ان کا بیان ہونا چاہئے۔ اپنے اس نوع کے افسانوں اور خاکوں کے دفع میں منٹو نے لکھا ہے:

"میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شمپو نہیں، کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔"

منٹو کی زندگی کا طویل عرصہ فلمی ستاروں کی جھرمٹ میں گذرا۔ اس نے ایک مدت تک میک اپ کی دبیز تہوں میں چھپے چہروں کی جھریاں دیکھیں۔ مردوں کے فریب اور عورتوں کی بے وفائیاں دیکھیں۔ عورتوں کو بیڈ شیٹ جان کر ہمیشہ بدلنے والے مرد اور مردوں کو جوتی کی نوک پر رکھنے والی عورتیں، ان خاکوں میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ یہ بڑے مرد اور بڑی عورتیں منٹو کے دلکش اسلوب میں نکھر کر اس طرح جلوہ افروز ہوتے ہیں کہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ "اشوک کمار" "پارو دیوی" "پُراسرار نینا" "پری چہرہ نسیم بانو" "رفیق غزنوی" "ستارہ" "کشت زعفران" کے "مُرلی کی دھن" "نرگس" "نواب کاشمیری" "نور جہاں" جیسے خاکوں میں ایسے کردا روں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ فلم اداکار اشوک کمار، شیام اور نور جہاں، ستارہ دیوی، پری چہرہ نسیم، پارو دیوی، نرگس اور جدن بائی کے بارے میں جو نجی تفصیلات منٹو نے پیش کی ہیں، وہ کافی دلچسپ ہیں۔ منٹو نے ان کرداروں کی ایک ویڈیو فلم بنائی ہے جس میں یہ سب کردار بغیر میک اپ کے اپنے اپنے کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ اور فلم کا ہدایت کار انہیں ہدایت دینے کے بجائے ان سب کرداروں کی حرکات وسکنات کو قلم بند کر کے کہانیاں مرتب کرنے میں منہمک ہے۔ مذکورہ خاکے ایسی چھوٹی چھوٹی فلمیں ہیں جن کی شوٹنگ پہلے ہوئی ہے اور کہانیاں بعد میں لکھی گئی ہیں۔ خاکہ نگار منٹو نے آغا حشر کاشمیری، اشوک کمار، شیام، رفیق غزنوی، کے آصف، نذیر، ڈیسائی، ستارہ دیوی، پری چہرہ نسیم، نور جہاں اور نرگس کی شخصیات وعادات کے ایسے پہلوؤں سے متعارف کرایا ہے جن سے اکثر قاری واقف نہیں ہیں۔

دراصل منٹو جیسا کہ کہا جاتا ہے، ایک بے درد واقعہ نگار ہے۔ اس کے اندر ایک بڑا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہی دقیانوسی قسم کا اخلاق زدہ محتسب چھپا ہوا ہے۔ وہ سماج میں کسی طرح کی انارکی برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ اندھا دھند ان پر وار کرتا ہے اور پھر فلمی دنیا جس سے ان میں سے زیادہ تر خاکے متعلق ہیں، وہ تو بقول وارث علوی ایک مادر پدر آزاد دنیا تھی، وہاں کی زندگی کے مرقعے پیش کرنا اور وہ بھی اس طرح کہ پڑھنے والے کا انسانیت پر سے ایمان نہ اٹھ جائے۔ آسان کام نہیں تھا۔ وارث لکھتے ہیں:۔

"دراصل فلمی دنیا کی جنسی انارکی یا مادر پدر آزاد جنسی تعلقات کی صحافتی رپورٹنگ تو آسان ہے کیونکہ صحافت خصوصاً فلمی صحافت میں حمایت اور موافقت میں لکھنا، طنز وظرافت سے کام لینا، اسکینڈل بیان کرنا، منہ پر کالک ملنا، کردار کا قتل کرنا، حقائق کو چھپانا یا انہیں توڑ مروڑ کر پیش کرنا، امیج بنانا یا امیج توڑنا، بانس پر چڑھانا یا شہرت کو خاک میں ملانا بہت آسان ہے۔ "مصور" کی ادارت کے دوران اپنے فلمی کالموں میں منٹو ایسا کیا بھی کرتا تھا جیسا کہ ستارہ پر اسکیچ میں ایک دو جگہ اپنی ایسی حرکتوں کا اقبال کیا بھی ہے لیکن زیر نظر خاکوں میں اگر یہی صحافتی رویے بروئے کار ہوتے تو شاید اس کے مضامین کی مانند یہ خاکے بھی اپنی کشش کھو چکے ہوتے۔ لیکن منٹو کا ذہن ہر نوع کی اخلاقی تنگ نظری سے پاک تھا۔ لوگوں سے ملتے وقت اسے خیال بھی نہ آتا تھا کہ فلاں کی ماں طوائف تھی یا فلاں نے طوائف سے شادی کی تھی۔ دراصل وہ سمجھ ہی نہیں پاتا تھا کہ ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کے جنسی تعلقات بھی اسے پریشان نہیں کرتے تھے۔ فلمی دنیا میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ ہر نوع کی بد اخلاقی کو درگذر کرتا تھا۔ دھوکا، فریب، بے وفائی، چغلی، چال بازی کو وہ پست حرکات سمجھتا تھا، لیکن ان پر چراغ پا ہونا، آپے سے باہر ہونا، خود کو نفرت وحقارت سے بھر لینا، اس کا شیوہ نہیں تھا۔ ایسا کرنا آدمی میں اپنی دلچسپی کو ختم کرنا یعنی اپنی خاکہ نویسی کا گلا گھونٹنا ہے۔ ناپسندیدہ کرداروں پر بھی نظم وضبط سے قلم اٹھانا صحیح فنکارانہ رویہ ہے جو اپنی اخلاقی خفگی کو مناسب حدود میں رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔"

("منٹو: ایک مطالعہ" ص-۱۱۷)

منٹو کی خاکہ نگاری پر وارث علوی کا یہ اقتباس ذرا طویل ہو گیا ہے۔ دراصل میرا مقصد وارث کی اس تحریر کے حوالے سے منٹو کی خاکہ نگاری کی خصوصیات بیان نہیں کرنا تھا بلکہ یہ بتانا تھا کہ منٹو زندگی بھر کس ڈائلیما کا شکار رہا۔ وارث خود بھی اسی ڈائلیما کا شکار ہیں، اس لئے انہوں نے اس کو جانے انجانے میں بڑی اچھی طرح بیان کر دیا ہے۔ دراصل منٹو اور وارث

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ انسان اپنی پیدائش سے نہیں خود اپنے اعمال سے پہچانا جاتا ہے۔ یعنی اگر وہ کسی طوائف کی اولاد ہے یا کسی طوائف نے اس کی پرورش کی ہے تو یہ اس کا قصور نہیں ہے، اسی طرح کسی مخصوص پیشے سے جڑا ہونا جسے سماج اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا بذات خود کسی کردار کے بُرے ہونے کا جواز نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ اس کی مجبوری ہو یا وہ حالات کے جبر میں ہو۔ انسان صرف اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہوتا ہے، وہ بھی تب جب وہ کسی کو دھوکہ یا فریب دیتا ہے، کسی سے بے وفائی کرتا ہے، چغلی پر آمادہ ہوتا ہے یا چالبازیاں کرتا ہے۔ شاید وارث کے اسی طرز فکر کی بنا پر باقر مہدی نے اسے ''پیارے دقیانوسی'' کہا تھا۔ اخلاق گزیدہ، دقیانوسی، ترقی پسند۔ منٹو بھی ان معنوں میں پوری طرح ترقی پسند تھا کہ وہ اپنے کرداروں کی زندگی کے سیاہ و سفید پہلوؤں کو ان کے سیاق و سباق میں رکھ کر ان کی تحلیل نفسی کرتا تھا۔ وہ ظاہر کا نہیں باطن کا تو بی تھا۔ وہ ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کی گپ کرتے ہوئے روح کے نہاں خانوں میں اُتر جاتا تھا اور روح کی مصوری کرتا تھا۔ شاید یہی وہ عمل تھا جس میں پری چہرہ نسیم کی آوارگی میں پاکیزگی اور اشوک کمار کی بلند اخلاقی میں جنسی پیاس کے عناصر اسے نظر آ جاتے ہیں۔

''پارو دیوی'' پر اپنے خاکے میں وہ اس کا تعارف ان جملوں سے کراتا ہے:-

''(پارو) بہت ہنس مکھ اور گھلو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ میرٹھ اس کا وطن تھا۔ جہاں وہ شہر کے قریب قریب تمام رنگین مزاج رئیسوں کی منظور نظر تھی۔ ہزاروں میں کھیلتی تھی، پر اسے فلموں میں آنے کا شوق تھا۔ چنانچہ یہ شوق اسے کھینچ کر فلمستان میں لے آیا۔ جب اس سے کھل کر باتیں کرنے کا موقعہ ملا تو معلوم ہوا کہ حضرت جوش ملیح آبادی اور مسٹر ساغر نظامی بھی اکثر اس کے یہاں آیا جایا کرتے تھے اور اس کا مجرا سنتے تھے۔''
(''پارو دیوی'')

تو دوسری طرف یہ بیانات بھی ملتے ہیں:-

''اس کی زبان بہت صاف تھی اور جلد بھی، جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ چھوٹے آستینوں والے پھنسے پھنسے بلاؤز میں سے اس کی ننگی باہیں ہاتھی کے دانتوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ سفید، سڈول، متناسب اور خوبصورت جلد میں ایسی چکنی چمک تھی جو دیودار لکڑی پر رندا پھیرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ صبح اسٹوڈیو آتی۔ نہائی دھوئی صاف ستھری، اجلی، سفید یا ہلکے رنگ کی ساڑی میں ملبوس۔ شام کو جب گھر روانہ ہوتی تو دن گذرنے کی گرد و غبار کا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ذرّہ تک اس پر نظر نہ آتا۔ ویسی ہی تروتازہ ہوتی جیسی صبح کو تھی۔

..................

"صرف ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ طوائف اگر برداشت کرنے پر آئے تو بہت کچھ برداشت کر سکتی ہے۔"

"یہ سن کر میرے سامنے وہ منظر آ گیا جو اس وقو عے کے دوسرے روز رات کے نو بجے اسٹوڈیو کے باہر سخت سردی میں فلمایا جا رہا تھا۔ جشنِ مسرّت میں لوگ ناچ گا رہے تھے۔ اشوک اپنی ہیروئن ویرا کی بانہوں میں بانہیں ڈالے محوِ رقص تھا اور پارو ایک طرف مجسمہ افسردگی بنی اکیلی کھڑی تھی!"

("پارو دیوی")

اشوک کمار سے متعلق وہ لکھتا ہے:۔

"اشوک طبعاً بہت جھینپو قسم کا آدمی تھا۔ وہ کھلم کھلا کسی عورت کے اظہار عشق کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ اشوک کو پارو پسند ہے لیکن اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اس سے جسمانی تعلق پیدا کر لیتا...... اس کی زندگی میں سینکڑوں نہیں ہزاروں لڑکیاں آئیں۔ وہ لارڈ بائرن بن سکتا تھا مگر شرمیلی طبیعت کے باعث ان آسانی سے پھنس جانے والی تتلیوں سے اپنا دامن چھڑا کے بھاگ جاتا رہا۔"

("پارو دیوی")

پری چہرہ نسیم سے متعلق یہ اطلاعات فراہم کرتے ہوئے اس کے اندر کی خوشی کا اندازہ کیجئے:۔

"میرا خیال تھا نسیم بڑے عالیشان مکان میں رہتی ہے لیکن جب گھوڑ بندر روڈ پر اس کے بنگلے میں داخل ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بنگلہ انتہائی شکستہ حالت میں تھا۔ بڑا معمولی قسم کا فرنیچر جو غالباً کرائے پر لایا گیا تھا، گھسا ہوا قالین، دیواریں اور فرش سیل زدہ۔

اس پس منظر کے ساتھ میں نے پری چہرہ نسیم بانو کو دیکھا۔ بنگلے کے برآمدے میں وہ گوالے سے دودھ کے پیسوں کے متعلق بات چیت کر رہی تھی۔ اس کی دبی دبی آواز، جو ایسا معلوم ہوتا تھا کوشش کے ساتھ حلق سے نکالی جا رہی ہے، گوالے سے قبلوا رہی تھی کہ اس نے آدھ سیر دودھ کا ہیر پھیر کیا ہے۔ آدھ سیر دودھ اور پری چہرہ نسیم بانو، جس کے لئے کئی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری بس بک گروپ 0314.595.1212

فرہاد دودھ کی نہریں نکالنے کے لئے تیار تھے ...... میں چکرا گیا۔

آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ "پکار" کی نور جہاں بڑی گھریلو قسم کی عورت ہے اور اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک غایت درجہ گھریلو قسم کی عورت میں ہوتی ہے۔ اس کی پکچر "بیگم" کی پروڈکشن شروع ہوئی تو ملبوسات کا سارا کام اس نے سنبھال لیا۔ اندازہ تھا کہ دس بارہ ہزار روپے اس مد پر اٹھ جائیں گے مگر نسیم نے درزی گھر میں بٹھا کر اپنی پرانی ساڑیوں، قمیضوں اور غراروں سے تمام لباس تیار کروالئے۔"

("پری چہرہ نسیم بانو")

دراصل ہر عورت میں ایک ایسی گھریلو عورت اور ہر مرد میں ایک جھینپو اور شرمیلے مرد کی تلاش منٹو کی کمزوری ہے۔ وہ راکھوں کو کریدتے ہوئے اپنی انگلیوں کو زخمی کر لیتا ہے صرف اس امید پر کہ شاید جسم کی تباہی کے بعد بھی روح شاید صحیح سلامت اس کے ہاتھ آجائے۔ اس تلاش میں وہ در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے، گلی کوچوں کی خاک چھانتا ہے۔ کونے کھدروں میں جھانکتا پھرتا ہے۔ بیڈ روموں سے لیکر گندے نابدانوں تک میں جا گھستا ہے۔ دل و دماغ کو ماؤف کر دینے والی خوشبوؤں اور سڑاند بھری بدبو میں وہ تمیز نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ جس موتی کی اسے تلاش ہے، وہ پتہ نہیں کس سؤر یا کس کتے کے دسترس میں ہو اور اپنی آب محفوظ رکھنے کی آخری جدوجہد میں مصروف ہو۔ منٹو بذات خود شرابی بھی اور خوبصورتی کا دلدادہ بھی لیکن وہ جھینپو اور فطرتاً ڈرپوک مرد خود اس کے اندر بھی موجود ہے جس کی اسے تلاش ہے۔ وہ شاید ان خاکوں میں اپنے آپ کو ہی تلاش کرتا پھرتا تھا۔ شاید ہی کوئی خاکہ ہو جس میں وہ خود موجود نہ ہو، اپنی تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں سمیت۔ اگر منٹو کا کوئی جاوداں مرقع ترتیب دینا ہو تو اسے ان خاکوں سے مرتب کیا جانا چاہیے۔

"باری علیگ" "مرلی کی دھن" "تین گولے" "کشت زعفران" "بابو راو پٹیل" "عصمت چغتائی" وغیرہ بھی بڑے پائے کے خاکے ہیں۔ جس میں اشخاص کی تصاویر کو اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اُجاگر کیا گیا ہے۔ منٹو کے اسلوب کی انفرادیت یعنی دلکشی، بے تکلفی، بے ساختگی، تجسس، شدت تاثر ہر خاکے میں عیاں ہے۔ باری علیگ سے منٹو کے گہرے مراسم تھے۔ منٹو کی ابتدائی تربیت میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اگر باری صاحب نہ ہوتے تو شاید منٹو بہت بڑا چور یا جیب کترا ہوتا۔ "باری صاحب" کے خاکہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت sluggish قسم کے انسان تھے، بڑے بڑے منصوبے بناتے لیکن

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

عملی اقدام اٹھانے میں ہمیشہ پیچھے رہتے بلکہ ایسے مواقع پر اکثر ''رن چھوڑ'' ثابت ہوتے۔ ان کی بابت منٹو لکھتے ہیں:۔

''ہم پی رہے تھے تو حسن عباس نے چھیڑنے کی خاطر باری صاحب سے کہا ''آپ کی یہاں سب عزت کرتے ہیں۔ بی بی جان آپ کو نمازی اور پرہیز گار کی حیثیت سے جانتی ہیں۔ ان کے دل میں آپ کا اتنا احترام ہے، اگر وہ یہاں آجائیں تو کیا ہو؟''

باری صاحب نے کہا'' میں کھڑکی کھول کر باہر کود جاؤں گا۔ اور پھر کبھی ان کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔''

باری صاحب ہمیشہ اپنی زندگی کی کوئی نہ کوئی کھڑکی کھول کر باہر کود جاتے رہے۔ یہ کھڑکی کھلی رہتی۔ مگر وہ پھر کبھی اس کو اپنی شکل نہ دکھاتے۔''

(''باری صاحب'')

''تین گولے'' میں میرا جی کی زندگی کے ان انجانے اور بظاہر تاریک پہلوؤں کی فنکارانہ عکاسی کی گئی ہے جن پر اسرار کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ میرا جی کا انجام، منٹو کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

''میرا جی کی ضلالت اب اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ اسے خارجی ذرائع کی امداد طلب کرنی پڑ گئی ہے۔ اچھا ہوا جو وہ جلدی مر گیا کیونکہ اس کی زندگی کے خرابے میں اور زیادہ خراب ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اگر کچھ دیر سے مرتا تو یقیناً اس کی موت بھی ایک دردناک ابہام بن جاتی۔''

(''تین گولے'')

منٹو نے اپنی فنی چابک دستی سے اپنے خاکوں کو اس درجہ نکھارا ہے کہ ہر خاکے میں اس کی موجودگی بھی قاری کو گراں نہیں گزرتا۔ انہوں نے بڑی بے باکی سے اپنے کرداروں کا دھڑن تختہ کیا ہے۔ ان کے کبھی پہلوؤں، کبھی زاویوں، کبھی اچھائیوں اور کبھی گندگیوں کی عکاسی کر دی ہے۔ اپنی طرف سے کچھ بھی ملمع سازی نہیں کی ہے۔ منٹو کی خاکہ نگاری پر بہت کم توجہ کی گئی۔ کیونکہ بقول تحسین فراقی:

''اس نے اردو میں خاکہ نگاری کی اس روایت کو پروان چڑھایا، جس میں اس کا کوئی حریف ہو سکتا ہے تو صرف شوکت تھانوی یا شاہد احمد دہلوی۔ مگر بڑے لکھنے والے کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ دنیا صرف اس کے فن کی ایک دو جہات ہی کو لائق اعتنا سمجھتی ہے اور

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

باتی سے صرف نظر کرتی ہے۔ چنانچہ اب تک منٹو کے افسانے ہی کو مانا گیا ہے۔ حالانکہ منٹو نے خاکہ نگاری کی روایت کو بھی ایک نیا رنگ بخشا۔"

"منٹو کے خاکے" کی اشاعت سے منٹو کی خاکہ نگاری کی بہت سی جہتیں سامنے آئیں گی اور اس سے منٹو فہمی کی ایک نئی تاریخ شروع ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ "کلیات سعادت حسن منٹو" کے اشاعتی سلسلے میں حسب سابق اس جلد کی بھی پذیرائی ہوگی اور اس کا سہرا یقیناً مالکان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی الحاج محمد مجتبیٰ خان اور محمد مصطفےٰ کمال پاشا کے سر جائے گا جنہوں نے کاروباری سطح سے بلند ہو کر منٹو کے complete works کو شائع کرنے میں خصوصی دلچسپی لی۔ اس کارِ خیر کے لئے یہ حضرات یقیناً ہدیۂ تہنیت کے مستحق ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے محرک استادِ محترم پروفیسر وہاب اشرفی ہیں جن کی حوصلہ افزائی اور مفید علمی مشوروں کے طفیل اس اہم کام کی تکمیل ہو پائی۔ انہوں نے اس پراجکٹ کو ایک واضح سمت دینے میں میری مسلسل ہمت افزائی اور رہنمائی کی۔ میں واقعتاً ان کا سپاس گزار ہوں اور اس کتاب کو انہیں کے نام معنون کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

اس پراجکٹ میں برادرم ڈاکٹر جمیل اختر محبیؔ، ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی، ڈاکٹر امام اعظم، راشد احمد، محمد سبحان، سید حسین الحق جیسے مخلص اصحاب کی ہمت افزائی اور خصوصی مدد ملی جن کے لئے میں ان کا صدق دل سے شکر گذار ہوں۔

میں عزیزی محمد سرفراز احمد اور محمد ابو کاشف کا بھی احسان مند ہوں جنہوں نے پروف ریڈنگ میں بڑی مدد بہم پہنچائی۔ شریک سفر نگارینہ اشرف نے بھی اس صبر آزما کام کی انجام دہی میں بھرپور تعاون کیا۔ ان کی معاونت سے ہی اس مشکل پراجکٹ کی تکمیل ہو پائی ہے۔ اب بھلا ان کا شکریہ کیا ادا کروں۔ وہ تو اپنی ذات کا حصہ ہیں۔

کوئی کتاب نقص سے پاک نہیں ہوتی، اس میں بھی نقائص ہوں گے۔ آپ کی توجہ سے اس کی کوتاہیوں کی طرف اشارے کئے گئے تو آئندہ اشاعت میں ان سے روشنی لینا ضروری سمجھوں گا۔

۲۰ رجولائی ۲۰۰۸ء

ڈاکٹر ہمایوں اشرف
بوکارو اسٹیل سٹی، بوکارو (جھارکھنڈ)

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# گنجے فرشتے

''ٹھنڈا گوشت'' کا مقدمہ قریب قریب ایک سال چلا۔ ماتحت عدالت نے مجھے تین ماہ قیدِ بامشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دی۔ سیشن میں اپیل کی تو بری ہو گیا۔ (اس حکم کے خلاف سرکار نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر رکھی ہے۔ مقدمے کی سماعت ابھی تک نہیں ہوئی۔)

اس دوران میں مجھ پر جو گزری، اس کا کچھ حال آپ کو میری کتاب ''ٹھنڈا گوشت'' کے دیباچے بعنوان ''زحمتِ مہر درخشاں'' میں مل سکتا ہے۔ دماغ کی کچھ عجیب ہی کیفیت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ لکھنا چھوڑ دوں یا احتساب سے قطعاً بے پرواہ ہو کر قلم زنی کرتا رہوں۔ سچ پوچھئے تو طبیعت اس قدر کھٹی ہو گئی تھی کہ جی چاہتا تھا کوئی چیز الاٹ ہو جائے۔ تو آرام سے کسی کونے میں بیٹھ کر چند برس قلم اور دوات سے دور رہوں۔ دماغ میں خیالات پیدا ہوں تو انہیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دوں۔ الاٹ منٹ میسّر نہ ہو تو بلیک مارکیٹنگ شروع کر دوں، یا ناجائز طور پر شراب کشید کرنے لگوں۔ آخر الذکر کام میں نے اس لئے نہ کیا کہ مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ ساری شراب میں خود ہی پی جایا کروں گا۔ خرچ ہی خرچ ہو گا۔ آمدن ایک پیسے کی بھی نہ ہو گی۔ بلیک مارکیٹنگ اس لئے نہ کر سکا کہ سرمایہ پاس نہ تھا، ایک صرف الاٹ منٹ ہی تھی جو کار آمد ثابت ہو سکتی تھی۔ آپ کو حیرت ہو گی۔ مگر یہ واقع ہے کہ میں نے اس کے لئے کوشش کی، پچاس روپے حکومت کے خزانے میں جمع کرا کے میں نے درخواست دی کہ میں امرتسر کا مہاجر ہوں۔ بیکار ہوں۔ اس لئے مجھے کسی پریس یا سینما میں حصہ الاٹ فرمایا جائے۔

الحمد لائبریری
0314.595.1212
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

درخواست کے چھپے ہوئے فارم تھے۔ ایک عجیب و غریب قسم کا سوالیہ تھا۔ ہر سوال اس قسم کا تھا، جو اس امر کا طالب تھا کہ درخواست کنندہ پیٹ بھر کے جھوٹ بولے۔ اب یہ عیب مجھ میں شروع سے رہا ہے کہ جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ میں نے الاٹ منٹ کرانے والے بڑے بڑے گھاگوں سے مشورہ کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ تمہیں جھوٹ بولنا ہی پڑے گا، میں راضی ہو گیا۔ لیکن جب چھپے ہوئے فارم کی خالی جگہیں بھرنے لگا تو روپے میں صرف دو یا تین آنے جھوٹ بول سکا۔ اور جب انٹرویو ہوا، تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ صاحب جو کچھ درخواست میں ہے، بالکل جھوٹ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ہندوستان میں کوئی بہت بڑی جائیداد چھوڑ کے نہیں آیا۔ صرف ایک مکان تھا اور بس۔ آپ سے میں خیرات کے طور پر کچھ نہیں مانگتا۔ میں بزعم خود بہت بڑا افسانہ نگار تھا۔ لیکن اب مجھے محسوس ہوا کہ یہ کام میرے بس کا روگ نہیں۔ اللہ میاں، میاں ایم۔ اسلم اور بھارتی دت کو سلامت رکھے۔ میں ان کے حق میں اپنی افسانہ نگاری سے سبک سر ہوتا ہوں اور صرف اتنا چاہتا ہوں کہ حکومت مجھے کوئی ایسی چیز الاٹ کردے جس کے لئے مجھے کام کرنا پڑے اور اس کام کی اُجرت کے طور پر مجھے پانچ چھ سو روپے ماہوار مل جایا کرے۔

حیرت ہے کہ میری اس گفتگو کا اثر ہوا۔ قریب تھا کہ مجھے کسی برف خانے میں کوئی حصہ الاٹ ہو جائے کہ بورڈ کے ممبروں سے کسی نے کہہ دیا، تم لوگ یہ کیا غضب کر رہے ہو۔ یہ شخص جس کا نام سعادت حسن منٹو ہے، ترقی پسند ہے، چنانچہ یک قلم میری درخواست مسترد کر دی گئی۔

اِدھر یہ ہوا، اُدھر ترقی پسند مصنفین نے رجعت پسند قرار دے کر میرا حقہ پانی بند کر دیا ــــ یہ بھی خوب لطیفہ رہا۔ بہت دیر تک سوچا کیا، آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ مولے نے اوڑک ہٹی بہناں۔ چنانچہ قلم اُٹھا کر پھر لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن لکھنے سے پہلے یہ مرحلہ درپیش رہا کہ موضوع کیا ہو۔ فورم کیسی ہو۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی جان پہچان کے ایکٹر، ایکٹرسوں پر کچھ لکھوں۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون چنانچہ "پری چہرہ نسیم بانو" کے عنوان سے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہوا، جو روزنامہ ''آفاق'' میں چھپا۔ میں خوش تھا کہ ایک رستہ نکل آیا ہے جو حکومت کے احتساب سے پاک صاف رہے گا۔ اور طہارت پسند لوگوں کے لئے موجبِ اطمینان ہوگا۔ لیکن یہ مضمون چھپتے ہی طوفان برپا ہوگیا۔ ''آفاق'' کے دفتر میں بے شمار خطوط آئے، جن میں مجھے ملعون و مطعون گردانا گیا۔

۳ر جولائی کے ''آفاق'' میں ایک صاحب قاضی م۔ بشیر محمود صاحب، ادیب فاضل کا ایک خط ایڈیٹر کے نام چھپا—ان کا ملخص ملاحظہ فرمایئے۔

''سعادت حسن منٹو کا مضمون —— بے ضرر سا مضمون ''پری چہرہ نسیم بانو'' نظر سے گزرا۔ ساتھ ہی نسیم بانو کا مکتوب اپنے بھائی کے نام بھی پڑھا۔

منٹو نے بڑے اطمینان اور لطف لے لے کر بہن کے تمام محاوصف، مناقب، لغزشیں اور حکایتیں، توضیح اور وضاحت کے ساتھ رقم کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہن کی قدر و منزلت، ساکھ اور وقعت اور وقار کو کچھ حد تک نظر انداز کر چکے ہیں۔ کسی حد تک یہ بہن کی توہین و تذلیل میں شمار ہوگا۔

ایسا لکھتے ہوئے انہیں حجاب و تامل کو خدا حافظ کہنا پڑا ہوگا۔ مجھے اُن کے الفاظ پر اعتراض نہیں، حروف و سکنات پر گرفت نہیں اور نہ ہی مضمون پر حرف گیری کر رہا ہوں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ کیا نسیم بانو، منٹو صاحب کی حقیقی بہن ہے؟— کیا منٹو اس کے معاشقے پر روشنی ڈالنے کی قوت اور جسارت رکھتا ہے؟

منٹو بڑا شریر ہے۔ میرے دل میں اس کی بے انتہا عزت ہے۔ میں اس کے کئی کارنامے دیکھ چکا ہوں۔ اب ایک اور بے ضرر قسم کا'' کارنامہ بھی لگے ہاتھوں دیکھ لیا۔ میں منٹو دوست کی ''پری

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

چہرہ نسیم بانو" پر رائے زنی یا نکتہ چینی نہیں کر رہا۔ اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں — اور پھر اپنے منٹو پر نکتہ چینی کر بھی کیسے سکتا ہوں۔ اس کی بلند آشیانی تک ابھی میری پہنچ نہیں۔"

یہ خط پڑھ کر مجھے بہت کوفت ہوئی۔ اسے دور کرنے کے لئے میں نے یہ چند حروف لکھ کر محمد سرور صاحب کو بھیج دیئے۔

اس خط پر اور ایسے ہی دوسرے خطوں پر جو اس مضمون کے متعلق "آفاق" اور دوسرے اخباروں میں چھپتے رہے، میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

سرور صاحب نے شروع شروع میں ان خطوط کی کوئی پرواہ نہ کی اور مجھ سے کہا۔ "تم لکھتے رہو۔ یہ سلسلہ کافی دلچسپ ہے، جاری رہنا چاہئے۔ میں نے جاری رکھا، لعنت ملامت بھی جاری رہی۔ شیام پر مضمون چھپا تو سیالکوٹ کی ایک خاتون نیر بانو صاحبہ نے ایک طویل خط لکھا۔ جسے پڑھ کر یقین مانیے مجھے بہت ترس آیا۔ اس کے چند اقتباس دیکھیے۔

"میں سینما دیکھنا گناہِ کبیرہ میں شمار نہیں کرتی، تصویروں پر نظر پڑتے ہی آنکھوں پر پٹی باندھنے نہیں دوڑی جاتی، مگر میرے پانچ بچے ہیں۔ اور میری آرزو ہے کہ وہ نیک اخلاق ہوں۔ سینما دیکھ دیکھ کر اخلاق بنتا نہیں، بگڑتا ہے۔ اس لئے میں نے سینما دیکھنا چھوڑ دیا — میں جاؤں گی تو وہ بھی جائیں گے۔ زبردستی روکا تو اس آرزو کو دل میں پالتے رہیں گے۔ اور جب موقعہ ملے گا کسر پوری کرلیں گے۔

میں اتنی بڑی ہوں مگر بعض تصویروں پر نظر ڈالنا طبیعت کو گوارا نہیں ہوتا۔ ایسا ننگ پن محسوس ہوتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ جیسے کسی کی خلوت میں بغیر اجازت گھسے جا رہے ہیں۔ اور یہ بات آداب شرافت کے خلاف ہی تو ہے۔ آپ کہیں گے۔ ایسے رسالے، اخبار، کتابیں بچوں کو نہ دکھائی جائیں مگر یہ کتنا مشکل کام ہے کہ پڑھتے پڑھتے اخبار یا رسالہ میز پر ٹکا دینے کی بجائے خاص اہتمام سے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری
بُس بُک گروپ
کتابیں پڑھئے
0314.595.1212

تالے میں بند کرنے کی فکر کی جائے۔

ذرا "مُرلی کی دُھن" دوبارہ پڑھ کر بتایئے کہ یہ کیا چیز ہے؟ —— کیا کوئی شخص خواہ کتنا بھی نیکی سے دُور اور اخلاق باختہ ہو۔ کیا اپنے گھر میں بیوی بچّوں کے درمیان بیٹھ کر یہ پُرلطف یا گھناؤنے تجربات دہرانا پسند کرتا ہے؟ — اُس نے چاہے کتنے ہی خم لنڈھائے ہوں۔ شراب کے تالاب میں غوطے لگائے ہوں۔ پی کر منجمد رہتا ہو۔ یا مغلظات بکتا ہو۔ کتنی ہی عورتوں کو دسترخوان کی چٹنی بناتا ہو۔ جب یاد کیا ہو۔ "سالی عورت" کہا ہو۔ اور نہ پا کر بستر کو آگ لگا دی ہو۔ ان چیزوں کو اخباروں کے ذریعے سے پھیلا کر کون سی انسانیت اور اخلاق کی خدمت ہوتی ہے۔ دوسروں کے بھی گھر ہوتے ہیں۔ اُن کے بھی بیوی بچّے ہوتے ہیں۔ لڑکے، لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان کا خیال بھی اپنے گھر اور بچّوں کی طرح ہونا چاہیے۔ کُل دنیا مردوں ہی کی تو نہیں کہ خاک پھانکتے پھریں۔ گندگی اُچھالیں، خود لتھڑیں، معصوموں کو بھی سنائیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں — کوئی کہاں بھاگے۔ گھروں میں چین نہیں۔ اخبار، رسالے اور ادب جو بیج بو رہے ہیں۔ ماں، باپ کو چاہیے کہ وہ بھی ان کی پرورش اور آبیاری شروع کر دیں تاکہ بہتر اور مکمل نتیجہ سامنے آئے۔ باپ، بیٹے کو سکھائے کہ اس طرح شراب کے تالاب میں غوطہ لگا کر ان سالیوں کو اس طرح گھسیٹ لے جانا چاہیے اور مائیں اپنی بیٹیوں کو نئے نئے دام بچھانے کے تمام حربے سمجھا دیں۔ استغفراللہ، کیسی انسانیت اور کیسا معاشرہ ہوگا — ذرا تصوّر تو کیجیے۔ سوچ کر میں کتنا جلتی ہوں۔"

میں نے جب یہ خط پڑھا تو بخدا مجھ پر بہت اثر ہُوا۔ مجھے نیّر بانو کی حالت

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
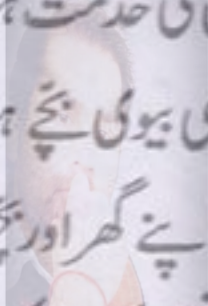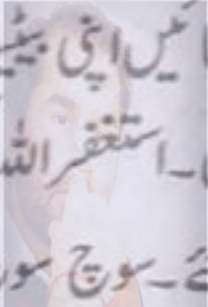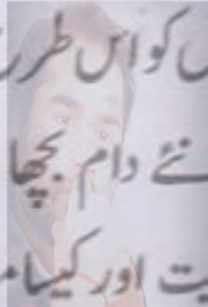
پر بہت ترس آیا۔ میں نے سوچا کہ اور کچھ نہیں تو اس خاتون پر میں نے واقعی بہت ظلم کیا ہے، جس کا کفارہ مجھے ضرور ادا کرنا چاہئے۔ لیکن پھر میں نے سوچا، اگر میں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق یہ کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی تو وہ عورت جو بعض تصویروں پر نظر ڈال کر ننگ پن محسوس کرتی ہے اور یہ سمجھتی ہے گویا وہ کسی کی خلوت میں اجازت کے بغیر گھس گئی ہے۔ یقیناً اس کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو جائے گی۔ اور بہت ممکن ہے مر بھی جائے۔

مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے کہ نیّر بانو ذہنی مریضوں کی جس فہرست میں آتی ہے، اس کے تمام افراد قابلِ رحم ہیں — ان کا علاج جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ ان کے سامنے بوتلوں کے کاگ اُڑا اُڑا کر تالاب بھرے جائیں۔ گندگی اُچھالی جائے۔ اپنے سر میں خاک ڈالی جائے۔ بال نوچے جائیں۔ مغلظات بکی جائیں۔ یہ کام خود سے نہ ہو سکے تو کرائے پر آدمی لائے جائیں۔ جو واہی تباہی بکیں — ''شمع'' ''بیسویں صدی'' ''رومان'' اور اسی قسم کے دوسرے پرچوں کے تمام مضامین، اشتہاروں سمیت پڑھ کر بار بار انہیں سنائے جائیں۔ اگر یہ نسخہ کارگر ثابت نہ ہو تو سعادت حسن منٹو سے کہا جائے کہ نیّر بانو کا پرانا سینڈل اُٹھائے اور اپنے سر پر مار مار کر اسے گنجا کر دے۔

میں نے بہت سوچا تھا کہ ان مضامین کے مجموعے کا نام میں نے ''گنجے فرشتے'' کیوں رکھا ہے — اب یہ سطور لکھتے لکھتے اس کی وجہ تسمیہ معلوم ہو گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بتایا ہوا نسخہ ہرگز ہرگز مجرّب نہیں ہے اور لوگ اپنی کمزوریاں دُور کرنے کے لئے ضرور محلہ پیر گیلانیاں کے غلام محمد ہی کی گولیاں خریدیں گے، اور انجام کار سیالکوٹ کے کسی چوراہے میں کھڑے ہو کر مجھے نیّر بانو کے پرانے یا نئے سینڈل سے اپنا سر گنجا کرنا پڑے گا۔

میرا جی والا مضمون ''تین گولے'' شائع ہوا تو اس سے بھی لوگوں کو تکلیف پہنچی۔ ''آفاق'' کے ایڈیٹر کو ایک صاحب خواجہ فرخندہ بنیادی صاحب نے یہ خط لکھا۔

> ''آپ نے ''آفاق'' کے ادبی ایڈیشن میں سعادت حسن منٹو کا مضمون ''تین گولے'' شائع کر کے میرا جی مرحوم، منٹو صاحب اور خود ''آفاق'' کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ مضمون ایک مخصوص ادبی

الحمد لائبریری
بس بک گروپ
0314.595.1212
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

حلقے کے لئے تو شاید موزوں تھا، لیکن ایک سنجیدہ اخبار اس کی اشاعت
کا قطعاً متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

دنیا کے ہر مہذّب ملک اور مہذب سماج میں یہ اصول
مروج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، اسے اچھے
الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے صرف محاسن بیان کئے
جاتے ہیں۔ اور عیوب پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ میراجی میں اگر کچھ
کمزوریاں تھیں تو ان سے صرف ان کا مخصوص حلقۂ احباب ہی
واقف تھا۔ دنیا تو انہیں ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے جانتی
اور عزّت کرتی تھی۔ کیا غضب کہ ان کے لنگوٹئے یار، اِن کے مرنے
کے بعد ان برائیوں کو الم نشرح کر رہے ہیں۔

عصمت نے "دوزخی" لکھ کر اپنے بھائی کو جس طرح
خراج ادا کیا ہے، غالباً ہمارے ادیب اب اسی ڈگر پر چل رہے ہیں
—اور پھر اس مضمون کے بعض حصّوں کی کراہت کی حد تک عریانی۔
پناہِ خدا، نہ نفاست پسند طبائع اسے برداشت کر سکتی ہیں، نہ یہ مضمون
گھر کی خواتین پڑھ سکتی ہیں، نہ بچے، نہ لڑکیاں۔ اگر منٹو کے بغیر
آپ کا ادبی ایڈیشن مکمل نہیں ہو سکتا تھا تو ایڈیٹر کے قلمی احتساب
کو کیا ہو گیا تھا"۔

میراجی مرحوم، منٹو اور آفاق، کے ساتھ جو ظلم ہونا تھا۔ وہ تو ہو گیا۔ اس مجموعے کی
اشاعت سے جو مزید ظلم ہو گا۔ اس کا میں گنہ گار ہوں۔ اور یہ گناہ بنیادی صاحب کے سر چڑھ
کر، کر رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ دنیا کے ہر مہذّب ملک اور ہر مہذّب سماج
میں یہ اصول مروج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، اسے اچھے الفاظ کے
ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے صرف محاسن بیان کئے جاتے ہیں اور عیوب پر پردہ ڈالا جاتا
ہے۔ ویسے میں ایسی دنیا پر، ایسے مہذّب ملک پر، ایسے مہذّب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہوں۔ جہاں یہ اصول مروّج ہو کے مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ دُھل دُھلا کر آئے اور رحمتہ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔

میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شیمپو نہیں، کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں ـــــ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا ـــــ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی۔ اُس کے منہ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔ میراجی کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی۔ اور، نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے ـــــ اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے، اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔

سعادت حسن منٹو

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# آغا حشر سے دو ملاقاتیں

تاریخیں اور سن مجھے کبھی یاد نہیں رہے، یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون لکھتے وقت مجھے کافی الجھن ہو رہی ہے۔ خدا معلوم کون سا سن تھا۔ اور میری عُمر کیا تھی، لیکن صرف اتنا یاد ہے کہ بصد مشکل انٹرنس پاس کر کے اور دو دفعہ ایف اے میں فیل ہونے کے بعد میری طبیعت پڑھائی سے بالکل اچاٹ ہو چکی تھی اور جوئے سے میری دلچسپی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ کٹرا جمیل سنگھ میں دینو یا فضلو کمہار کی دکان کے اوپر ایک بیٹھک تھی۔ جہاں دن رات جوا ہوتا تھا۔ فلش کھیلی جاتی تھی۔ شروع شروع میں تو یہ کھیل میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن جب آ گیا تو پھر میں اسی کا ہو رہا۔ رات کو جو تھوڑی بہت سونے کی فرصت ملتی تھی۔ اس میں بھی خواب راؤنڈوں اور ٹریلوں ہی کے آتے تھے۔ ایک برس کے بعد جوئے سے مجھے کچھ اکتاہٹ ہونے لگی۔ طبیعت اب کوئی اور شغل چاہتی تھی۔ کیا؟ ۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ دینو یا فضلو کمہار کی بیٹھک میں ایک روز ابراہیم نے جو کہ امرتسر میونسپلٹی میں تانگوں کا داروغہ تھا۔ آغا حشر کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ امرتسر آئے ہوئے ہیں۔ میں نے یہ سُنا تو مجھے اسکول کے وہ دن یاد آ گئے۔ جب تین چار پیشہ ور لفنگوں کے ساتھ مل کر ہم نے ایک ڈرامیٹک کلب کھولی تھی۔ اور آغا حشر کا ایک ڈرامہ اسٹیج کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ کلب صرف پندرہ بیس روز قائم رہ سکی تھی۔ اس لئے کہ والد صاحب نے ایک روز دھاوا بول کر ہارمونیم اور طبلے سب توڑ پھوڑ دیے تھے۔ اور واضح الفاظ میں ہم کو بتا دیا تھا کہ ایسے واہیات شغل انہیں بالکل پسند نہیں۔

اس کلب کے باقیات آغا حشر کے اس ڈرامے کے چند الفاظ ہیں۔ جو میرے ذہن کے ساتھ ابھی تک چپکے ہوئے ہیں۔ ''ارتاتھ اس کے کرم ہیں۔'' میرا خیال ہے جب داروغہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ابراہیم نے آغا حشر کا ذکر کیا تو مجھے اس وقت ڈرامے کا پورا ایک پیرا یاد تھا، چنانچہ مجھے اس خبر سے ایک گونہ دلچسپی پیدا ہوگئی کہ آغا حشر امرتسر میں ہیں۔

آغا صاحب کا کوئی ڈرامہ دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کہ رات کو گھر سے باہر رہنے کی مجھے قطعاً اجازت نہیں تھی۔ ان کے ڈرامے بھی میں نے نہیں پڑھے تھے۔ اس لئے کہ مجھے مسٹریز آف کورٹ آف لنڈن اور تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمہ کردہ، انگریزی جاسوسی ناول جیسی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا لیکن اس کے باوجود امرتسر میں آغا صاحب کی آمد کی خبر نے مجھے کافی متاثر کیا۔

آغا صاحب کے متعلق بے شمار باتیں مشہور تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کوچہ وکیلاں میں رہا کرتے تھے جو ہماری گلی تھی، جس میں ہمارا مکان تھا۔ آغا صاحب بہت بڑے آدمی تھے۔ کشمیری تھے، یعنی میرے ہم قوم ــــــ اور پھر میری گلی میں وہ کبھی اپنے بچپن کے ایام گزار چکے تھے۔ ان تمام باتوں کا نفسیاتی اثر جو مجھ پر ہوا آپ اسے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

داروغہ ابراہیم سے جب میں نے آغا صاحب کے متعلق کچھ اور پوچھا تو اس نے وہی باتیں بتائیں جو میں اوروں سے ہزار مرتبہ سُن چکا تھا کہ وہ پرلے درجہ کے عیاش ہیں۔ دن رات شراب کے نشے میں دھت رہتے ہیں۔ بے حد گندہ ذہن ہیں۔ ایسی ایسی گالیاں ایجاد کرتے ہیں کہ مغلظات میں جن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ کمپنی کے فلاں فلاں سیٹھ نے جب ان سے ایک بار ڈرامے کا تقاضا کیا تو انہوں نے اس کو اتنی موٹی گالی دی جو ہمیشہ کے لئے اس کے دل میں آغا صاحب کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لئے کافی تھی لیکن حیرت ہے کہ سیٹھ نے اُف نہ کی، اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ ”آغا صاحب، ہم آپ کے نوکر ہیں۔“ بد یہہ گو تھے۔ ایک مرتبہ ریہرسل ہو رہی تھی گرمی کے باعث ایک ایکٹرس بار بار ماتھے پر سے انگلی کے ساتھ پسینہ پونچھ رہی تھی۔ آغا صاحب جھنجھلائے اور ایک شعر موزوں ہوگیا۔

ابرو نہ سنوارا کرو کٹ جائے گی انگلی
نادان ہو تلوار سے کھیلا نہیں کرتے

ریہرسل ہو رہی تھی۔ لفظ ”فنڈ“ ایک ایکٹرس کی زبان پر نہیں چڑھتا تھا۔ آغا صاحب نے گرج کر ”فنڈ“ کا ایک ہم قافیہ لفظ لڑھکا دیا ــــ ایکٹرس کی زبان پر فوراً ”فنڈ“ چڑھ گیا۔

آغا صاحب کے کان تک یہ بات پہنچی کہ حاسد یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ ہندی کے ڈرامے ان کے اپنے لکھے ہوئے نہیں کیونکہ وہ ہندی زبان سے بالکل ناواقف ہیں۔ آغا صاحب

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

اسٹیج پر ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے آئے اور حاضرین سے کہا۔ ''میرے متعلق چند مفسدہ پرداز یہ بات پھیلا رہے ہیں کہ میں نے اپنے ہندی کے ڈرامے کرائے کے پنڈتوں سے لکھوائے ہیں ___ میں اب آپ کے سامنے شدھ ہندی میں تقریر کرونگا'' ___ چنانچہ آغا صاحب دو گھنٹے تک ہندی میں تقریر کرتے رہے، جس میں ایک لفظ بھی اردو یا فارسی کا نہیں تھا۔

آغا صاحب جس ایکٹریس کی طرف نگاہ اٹھاتے تھے۔ وہ فوراً ہی ان کے ساتھ خلوت میں چلی جاتی تھی۔

آغا صاحب منشیوں کو حکم دیتے تھے کہ ''تیار ہو جاؤ۔ اور شراب پی کر ٹہلتے ٹہلتے بیک وقت کامیڈی اور ٹریجڈی لکھوانا شروع کر دیتے تھے۔''

آغا صاحب نے کبھی کسی عورت سے عشق نہیں کیا ___ لیکن مجھے داروغہ ابراہیم کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ بات جھوٹ ہے کیونکہ وہ امرتسر کی مشہور طوائف مختار پر عاشق ہیں۔ وہی مختار جس نے ''عورت کا پیار'' فلم میں ہیروئن کا پارٹ ادا کیا ہے۔

مختار کو میں نے دیکھا ہوا تھا۔ ہال بازار میں انور پینٹر کی دکان پر بیٹھ کر ہم قریب قریب ہر جمعرات کی شام کو مختار عرف داری کو نئے سے نئے فیشن کے کپڑوں میں ملبوس دوسری طوائفوں کے ہمراہ ''ظاہرا پیر'' کی درگاہ کی طرف جاتے دیکھا کرتے تھے۔

آغا صاحب شکل و صورت کے کیسے تھے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ کچھ چھپی ہوئی تصویریں دیکھنے میں آئی تھیں، مگر ان کی چھپائی اس قدر واہیات تھی کہ صورت پہچانی ہی نہیں جاتی تھی۔ عمر کے متعلق صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ اب ضعیف ہو چکے ہیں ___ اس زمانے میں یعنی عمر کے آخری وقت میں ان کو مختار سے کیسے عشق ہوا۔ اس پر ہم سب کو جو دینو یا فضلو کمہار کی بیٹھک میں جوا کھیل رہے تھے سخت تعجب ہوا تھا ___ مجھے یاد ہے تال کے پیسے نکالتے ہوئے دینو یا فضلو کمہار نے گردن ہلا کر بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا تھا۔ ''بڑھاپے کا عشق بڑا قاتل ہوتا ہے۔''

ایک بار آغا صاحب کا ذکر بیٹھک پر ہوا تو پھر قریب قریب ہر روز ان کی باتیں ہونے لگیں۔ ہم میں سے صرف داروغہ ابراہیم آغا صاحب کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ ایک روز اس نے کہا۔ ''کل رات ہم مختار کے کوٹھے پر تھے ___ آغا صاحب گاؤ تکیے کا سہارا لئے بیٹھے تھے۔ ہم میں سے باری باری ہر ایک نے ان سے پُر زور درخواست کی کہ وہ اپنے نئے فلمی ڈرامے ''رستم و سہراب'' کا کوئی قصہ سنائیں، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ ہم سب مایوس ہو گئے۔ ایک نے مختار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آغا صاحب کی بغل میں بیٹھ گئی۔ اور ان سے کہنے لگی۔ ''آغا صاحب ہمارا حکم

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہے کہ آپ 'رستم و سہراب' سنائیں! ___ آغا صاحب مسکرائے اور بیٹھ کر رستم کا پُر زور مکالمہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ اللہ اللہ کیا گرج دار آواز تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا تیز دھارا پہاڑ کے پتھروں کو بہائے لئے جا رہا ہے۔

ایک دن ابراہیم نے بتایا کہ آغا صاحب نے پینا یک قلم ترک کر دیا ہے۔ جو آغا صاحب کے متعلق زیادہ جانتے تھے۔ ان کو بہت تعجب ہوا۔ ابراہیم نے کہا کہ یہ فیصلہ انھوں نے حال ہی میں مختار سے عشق ہونے کی وجہ سے کیا ہے۔ یہ عشق بھی کیا بلا تھی۔ ہم سمجھ نہ سکے۔ لیکن دینو یا فضلو نے نال کے کل پیسے اپنے تہمد کے ڈب میں باندھتے ہوئے ایک بار پھر کہا۔ "بڑھاپے کے عشق سے خدا بچائے --- بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔

جوئے سے طبیعت اکتا ہی چکی تھی۔ میں نے بیٹھک جانا آہستہ آہستہ چھوڑ دیا۔ اس دوران میں میری ملاقات باری صاحب اور حاجی لق لق سے ہوئی۔ جو روزنامہ "مساوات" کے ایڈیٹر مقرر ہو کر امرتسر آئے ہوئے تھے۔ جیجے کے ہوٹل "شیراز" میں دونوں چائے پینے آتے تھے اور ادب اور سیاست پر باتیں کرتے تھے۔ ان سے میری ملاقات ہوئی۔ باری صاحب کو میں نے بہت پسند کیا۔ اسی دوران میں جیجے نے اختر شیرانی مرحوم کو مدعو کیا۔ دن رات ٹھرّے کے دور چلنے لگے۔ شعر و ادب سے میری دلچسپی بڑھنے لگی۔ جو وقت پہلے فلش کھیلنے میں کٹتا تھا اب "مساوات" کے دفتر میں کٹنے لگا۔ کبھی کبھی باری صاحب ایک آدھ خبر ترجمے کے لئے مجھے دے دیتے جو میں ٹوٹی پھوٹی اردو میں کر دیا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے فلمی خبروں کا ایک کالم سنبھال لیا۔ بعض دوستوں نے کہا کہ محض خرافات ہوتی ہے لیکن باری صاحب نے کہا "بکواس کرتے ہیں۔ تم اب طبع زاد مضمون لکھنے شروع کرو۔"

طبع زاد مضمون تو مجھ سے لکھے نہ گئے۔ لیکن فرانسیسی ناول نگار کی ایک کتاب لاسٹ ڈیز آف کنڈمنڈ میری الماری میں پڑی تھی۔ باری صاحب اٹھا کر لے گئے۔ دوسرے روز دوپہر کے قریب میں "مساوات" کے دفتر میں گیا تو کاتبوں سے معلوم ہوا کہ باری صاحب کو سرسام ہو گیا ہے۔ ایک کتاب صبح سے بلند آواز میں پڑھ رہے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہاں آتے ہیں۔ اور ایک لوٹا ٹھنڈے پانی کا سر پر ڈلوا کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ میں ادھر گیا تو دروازے بند تھے اور وہ خطیبانہ انداز میں انگریزی کی کوئی نہایت ہی زوردار عبارت پڑھ رہے تھے۔ میں نے دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ باری صاحب کرتے پیجامے بغیر باہر آئے۔ ہاتھ میں وکٹر ہیوگو کی کتاب تھی۔ اسے میری طرف بڑھا کر انگریزی میں کہا۔ "اِٹ از اے ویری

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

ہوٹ بک'' اور جب کتاب پڑھنے کی گرمی دور ہوئی تو مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کا ترجمہ کروں۔''

میں نے کتاب پڑھی۔ لکھنے کا انداز بہت ہی موثر اور خطیبانہ تھا۔ شراب پی کر ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر نظروں کے سامنے سطریں گڈمڈ ہوگئیں صحن میں پلنگ بچھوا کر حقے کی نے منہ میں لے کر اپنی بہن کو ترجمہ لکھوانے کی کوشش کی۔ مگر اس میں ناکام رہا۔ آخر میں اکیلے بیٹھ کر دس پندرہ دنوں کے اندر انگریزی ڈکشنری سامنے رکھ کر ساری کتاب کا ترجمہ کر ڈالا باری صاحب نے بہت پسند کیا۔ اس کی اصلاح کی۔ اور یعقوب حسن مالک اردو بک اسٹال کے پاس تیس روپے میں بکوادیا۔ یعقوب حسن نے اسے بہت ہی قلیل عرصے میں چھاپ کر شائع کر دیا --- اب میں صاحب کتاب تھا۔

''مساوات'' بند ہوگیا۔ باری صاحب لاہور کے کسی اخبار میں چلے گئے۔ جیجے کا ہوٹل سونا ہوگیا۔ میرے لئے کوئی شغل نہ رہا۔ لکھنے کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ لیکن چونکہ دوستوں سے داد نہ ملتی تھی۔ اس لئے ادھر کوئی توجہ نہ دی۔ اب پھر دینو یا فضلو کمہار کی بیٹھک تھی۔ جوا کھیلتا تھا۔ مگر اس میں اب وہ پہلا سا لطف اور پہلی سی حرارت نہیں تھی۔

ایک دن داروغہ ابراہیم نے فلش کھیلنے کے دوران میں بتایا کہ آغا حشر آئے ہوئے ہیں اور مختار کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔ کسی روز مجھے وہاں لے چلو۔ ابراہیم نے وعدہ تو کرلیا مگر پورا نہ کیا۔ جب میں نے تقاضا کیا تو اس نے یہ کہہ کر ٹرخا دیا۔ آغا صاحب لاہور چلے گئے ہیں۔''

میرا ایک دوست تھا ہری سنگھ، اللہ بخشے خوب آدمی تھا۔ پانچ مکان بیچ کر دو مرتبہ سارے یورپ کی سیر کر چکا تھا۔ اور ان دنوں چھٹے اور آخری مکان کو آہستہ آہستہ بڑے سلیقے کے ساتھ کھا رہا تھا۔ فرانس میں صرف چھ مہینے رہا تھا۔ لیکن فرانسیسی زبان بڑی بے تکلفی سے بول لیتا تھا۔ بہت ہی دبلا پتلا، مریل سا انسان تھا مگر بلا کا پھرتیلا چرب زبان اور دھانسو، یعنی برمے کی طرح اندر دھنس جانے والا۔ ایک روز میں نے اس سے آغا حشر کا ذکر کیا۔ اس نے فوراً ہی پوچھا ''کیا تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''بہت دیر سے میری خواہش ہے کہ ان کو ایک نظر دیکھوں'' --- ہری سنگھ نے فوراً ہی کہا۔ ''اس میں کیا مشکل ہے۔ جب سے وہ یہاں امرتسر میں پنڈت محسن کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے، قریب قریب ہر روز میری اس سے ملاقات ہوتی ہے'' --- میں اچھل پڑا۔ ''تو ہری کل شام کو تم مجھے ان کے پاس لے چلو۔ ہری نے اپنا وسکی کا گلاس اپنے پتلے ہونٹوں سے لگایا اور بڑی نزاکت سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھر کر فرانسیسی زبان میں کچھ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کہا جس کا مطلب تھا۔ ”یقیناً میرے دوست۔“

اور ہری سنگھ دوسرے روز شام کو مجھے آغا حشر کاشمیری کے پاس لے گیا۔ پنڈت محسن جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کشمیری پنڈت تھے۔ نام ان کا جانے کیا تھا۔ محسن ان کا تخلص تھا۔ مشاعروں میں پرانی دقیانوسی شاعری کے نمونے کے طور پر پیش ہوتے تھے۔ آپ کا کاروباری تعلق کٹڑہ گھنیاں کے امرت سنیما سے تھا۔

آغا صاحب سے پنڈت جی کی دوستی معلوم نہیں شاعری کی وجہ سے تھی یا سنیما کی وجہ سے یا کٹڑہ گھنیاں اس کا باعث تھا۔ جس میں امرت سنیما اور مختار کا بالاخانہ بالکل آمنے سامنے تھے۔ سب کچھ بھی ہو، آغا صاحب پنڈت محسن کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور جیسا کہ مجھے ان کی باہم گفتگو سے پتا چلا، دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف تھے۔

پنڈت محسن کی بیٹھک یا دفتر کٹڑہ گھنیاں کے پاس پشم والے بازار سے نکل کر آگے جہاں سبزی کی دکانیں شروع ہوتی ہیں۔ ایک بڑی سی ڈیوڑھی کے اوپر واقع تھا۔ ہری سنگھ آگے تھا۔ میں اس کے پیچھے۔ سیڑھیاں چڑھتے وقت میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں آغا حشر کو دیکھنے والا تھا۔

باہر صحن میں کرسیوں پر کچھ آدمی بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں تخت پر پنڈت محسن بیٹھے گڑ گڑی پی رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک عجیب و غریب آدمی میری نگاہوں سے ٹکرایا۔ چیختے ہوئے لال رنگ کی چمکدار ساٹن کا لاچا، دو گھوڑے کی بوسکی کی کالر والی سفید قمیض، کمر پر گہرے نیلے رنگ کا پھندنوں والا ازار بند، بڑی بڑی بے ہنگم آنکھیں--- میں نے سوچا کٹڑہ گھنیاں کا کوئی پیر ہوگا۔ لیکن فوراً ہی کسی نے اس کو ”آغا صاحب“ کہہ کر مخاطب کیا۔ مجھے دھکا سا لگا۔

ہری سنگھ نے بڑھ کر اس عجیب و غریب آدمی سے مصافحہ کیا، اور میری طرف اشارہ کر کے اس سے کہا۔ ”میرے دوست سعادت حسن منٹو--- آپ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔

آغا صاحب نے اپنی بڑی بڑی بے ہنگم آنکھیں میری طرف گھمائیں اور مسکرا کر کہا۔ ”لارڈ منٹو سے کیا رشتہ ہے تمہارا۔“

میں تو جواب نہ دے سکا۔ لیکن ہری سنگھ نے کہا۔ ”آپ منٹو نہیں ہیں منٹو ہیں --- کشمیری۔“

آغا صاحب نے ایک لمبی ”اوہ“ کی۔ اور پنڈت محسن سے کشمیریوں کی ”آل“ کے متعلق طویل گفتگو شروع کر دی۔ میں پاس ہی بینچ پر بیٹھ گیا۔ پنڈت جی کو قطعاً آغا صاحب کی اس

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

گفتگو سے دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بار بار ان سے کہتے تھے ”آغا صاحب اس کو چھوڑیئے یہ بتایئے کہ آپ کب میرے لئے دوریل کا مزاحیہ ڈرامہ لکھیں گے۔“

آغا صاحب کو اس مزاحیہ ڈرامے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ گفتگو تو کشمیریوں کی ”آل“ کے بارے میں کررہے تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا ہے، ایک دو بار انھوں نے دوران گفتگو میں اپنے نوکر کو موٹی موٹی گالیاں دے کر کہا کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں۔

آغا صاحب جب خاموش ہوئے تو پنڈت محسن نے ان سے کہا ”آغا صاحب اس وقت آپ کی طبیعت موزوں ہے۔ میں کاغذ قلم لاتا ہوں، آپ وہ کامیڈی لکھوانا شروع کردیجئے۔“

آغا صاحب کی ایک آنکھ بھینگی تھی۔ آپ نے اسے گھما کر کچھ عجیب انداز سے پنڈت جی کی طرف دیکھا۔ ”ابے چپ کر“ آغا حشر کی طبیعت ہر وقت موزوں ہوتی ہے۔“

پنڈت جی خاموش ہوگئے اور اپنی گڑگڑی گڑگڑانے لگے۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ میرا سر چکرا رہا ہے۔ تیز خوشبو کے بھبکے آرہے تھے۔ میں نے دیکھا آغا صاحب کے دونوں کانوں میں عطر کے پھوئے پھنسے ہوئے تھے۔ اور غالباً سر بھی عطر ہی سے چپڑا ہوا تھا۔ میں کچھ تو اس تیز خوشبو اور آغا صاحب کے لاچے اور ازار بند کے شوخ رنگوں میں قریب قریب غرق ہو چکا تھا۔

بازار میں دفعتاً شور و غل برپا ہوا۔ ایک صاحب نے اٹھ کر باہر جھانکا اور آغا صاحب سے کہا۔ ”آغا صاحب تشریف لایئے۔ مہندی کا جلوس آرہا ہے۔“

آغا صاحب نے کہا۔ ”بکواس ہے۔“ اور حادثۂ کربلا پر نہایت ہی محققانہ لکچر دینا شروع کردیا۔ ایسے ایسے نکتے نکالے کہ سب دنگ رہ گئے آخر میں بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔ دجلے کا منہ بند تھا۔ فرات خشک پڑی تھی۔ پینے کو پانی کی ایک بوند نہیں تھی۔ مہندی گوندھی کس سے گئی---آغا حشر...... اس سے آگے کہتے کہتے رک گئے۔ ایک صاحب جو غالباً شیعہ تھے۔ محفل سے اٹھ کر چلے گئے۔ آغا صاحب نے موضوع بدل دیا۔

پنڈت محسن کو موقعہ ملا۔ چنانچہ انھوں نے پھر درخواست کی۔ ”آغا صاحب دوریل کی کامیڈی آپ کو لکھنی ہوگی۔“

آغا صاحب نے یہ موٹی گالی دی۔ ”کامیڈی کی...... یہاں ٹریجڈی کی باتیں ہورہی تھیں اور تم اپنی کامیڈی لے آئے ہو۔“ یہ کہہ کر آغا صاحب نے حادثۂ کربلا کے بارے میں پھر

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

عالمانہ انداز میں بحث شروع کر دی۔ کیونکہ وہ جی بھر کے اس موضوع پر اپنی معلومات اور خیالات کا اظہار نہیں کر سکے تھے۔ مگر فوراً جانے کیا جی میں آئی کہ ایک دم اپنے نوکر کو گالیاں دینا شروع کر دیں کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں۔ چنانچہ وہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ کسی نے آغا صاحب سے مولانا ابوالکلام کے تبحر علم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اس کا جواب کچھ یوں دیا۔ ''محی الدین کے متعلق پوچھتے ہو۔ ہم دونوں اکٹھے امریکی اور عیسائی مبلغوں سے مناظرے لڑتے رہے ہیں۔ گھنٹوں اپنا گلا پھاڑتے تھے۔ عجیب دن تھے وہ بھی۔''

یہ کہہ کر آغا صاحب لاچے اور ازار بند کے بھڑکیلے رنگوں اور کانوں میں اڑسے ہوئے پھوئے اور سر میں چپڑے ہوئے عطر کی تیز خوشبو سمیت بیتے ہوئے دنوں کی یاد میں کچھ عرصے کے لئے کھو گئے۔ آپ نے اپنی موٹی موٹی آنکھیں بند کر لیں۔ جو ہیئت آپ نے بنا رکھی تھی۔ اس سے گو آپ رنڈیوں کے پیر دکھائی دیتے تھے۔ لیکن ان کا چہرہ بہت ہی بارعب تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ جھکے ہوئے پپوٹوں کی جھریوں والی پتلی جلد کے نیچے موٹی موٹی کانچ کی گولیاں --- حرکت کر رہی تھیں۔ انھوں نے جب آنکھیں کھولیں تو میں نے سوچا کتنے برسوں کا نشہ ان پر منجمد ہے۔ کس قدر سرخی ان کے ڈوروں میں جذب ہو چکی ہے۔

آغا صاحب نے پھر کہا۔ ''عجیب دن تھے وہ۔ آزاد ڈھیل کے پیچ لڑانے کا عادی تھا۔ مجھے آتا تھا مزہ کھینچ کے پیچ لڑانے میں۔ ایک ہاتھ مارا۔ اور پیٹا کاٹ لیا۔ حریف منہ دیکھتے رہ گئے۔ ایک دفعہ آزاد بہت بری طرح گھر گیا۔ مقابلہ چار نہایت ہی ہٹ دھرم عیسائی مشنریوں سے تھا۔ میں پہنچا تو آزاد کی جان میں جان آئی۔ اس نے ان مشنریوں کو میرے حوالے کیا۔ میں نے دو تین ایسے اڑنگے دیئے کہ بوکھلا گئے۔ میدان ہمارے ہاتھ میں رہا۔ لیکن میرا حلق سوکھ گیا۔ قیامت کی گرمی تھی۔ مسجد دوزخ بنی ہوئی تھی۔ میں نے آزاد سے کہا ''وہ بوتل کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ''میری جیب میں۔'' میں نے کہا خدا کے لئے چلو۔ میرا حلق سوکھ کے لکڑی ہو گیا ہے۔'' دور جانے کی تاب نہیں تھی۔ وہیں مسجد میں ایک غسل خانے کے اندر جھک مارنی پڑی۔''

اتنے میں آغا صاحب کا نوکر آ گیا۔ آغا صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اس کو گالیاں دیں اور وجہ پوچھی کہ اس نے اتنی دیر کیوں کی۔ نوکر نے جو گالیوں کا عادی معلوم ہوتا تھا کاغذ کا ایک بنڈل نکالا اور کھول کر آگے بڑھایا۔ ''ایسی چیز لایا ہوں کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے۔''

آغا صاحب نے کھلا ہوا بنڈل ہاتھ میں لیا۔ شوخ رنگ کے چار ازار بند تھے آغا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

صاحب نے ایک نظر ان کو دیکھا اور آنکھوں کو بہت ہی خوفناک انداز میں اوپر اٹھا کر اپنے نوکر پر گرجے۔ یہ چیز لایا ہے تو...... ایسے واہیات ازار بند تو اس شہر کے کنجڑے بھی نہیں پہنتے۔" یہ کہہ کر انھوں نے بنڈل فرش پر دے مارا۔ کچھ دیر نوکر پر برسے، پھر جیب سے غالباً دو تین ہزار روپے کے نوٹ نکالے اور اسے حکم دیا۔ "جاؤ، پان لاؤ۔"

پنڈت محسن نے گڑگڑی ایک طرف رکھی اور کہا۔ "نہیں نہیں آغا صاحب، میں منگواتا ہوں۔"

آغا صاحب نے سب نوٹ تماش بینوں کے انداز میں اپنی جیب میں رکھے اور کہا۔ "جاؤ تمہارے پاس کچھ باقی بچا ہوا ہے۔"

نوکر جانے لگا تو انھوں نے اسے روکا۔ ٹھہرو ____ وہاں سے پتا بھی لیتے آؤ کہ وہ ابھی تک کیوں نہیں آئیں۔"

نوکر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سیڑھیوں کی جانب سے ہلکی سی مہک آئی پھر ریشمیں سرسراہٹیں سنائی دیں--- آغا صاحب کا چہرہ بشاش ہو گیا--- مختار جو ہرگز ہرگز حسین نہیں تھی۔ خوش وضع کپڑوں میں ملبوس صحن میں داخل ہوئی۔ آغا صاحب اور حاضرین کو تسلیمات عرض کی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ آغا صاحب کی آنکھیں اس کو وہاں تک چھوڑنے گئیں۔

اتنے میں پان آ گئے۔ جو اخبار کے کاغذ میں لپٹے ہوئے تھے۔ نوکر اندر چلا تو آغا صاحب نے کہا۔ "کاغذ پھینکنا نہیں سنبھال کے رکھنا۔"

میں نے ایک دم حیرت سے پوچھا۔ "آپ اس کاغذ کو کیا کریں گے آغا صاحب؟"

آغا صاحب نے جواب دیا۔ "پڑھوں گا۔ چھپے ہوئے کاغذ کا کوئی بھی ٹکڑا جو مجھے ملا ہے میں نے ضرور پڑھا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے۔ "معافی چاہتا ہوں۔ اندر ایک معشوق میرا انتظار کر رہا ہے۔"

پنڈت محسن نے گڑگڑی اٹھائی اور اسے گڑگڑانے لگے۔ میں اور ہری سنگھ تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے چل دیے۔

میں کئی دنوں تک اس ملاقات پر غور کرتا رہا۔ آغا صاحب عجیب و غریب ہزار پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے ان کے چند ڈرامے پڑھے جو اغلاط سے پُر تھے اور نہایت ہی ادنیٰ کاغذ پر چھپے ہوئے تھے۔ جہاں جہاں کامیڈی آتی تھی وہاں پھکڑپن ملتا تھا۔ ڈرامائی مقاموں پر مکالمہ بہت ہی زوردار تھا۔ بعض اشعار سوقیانہ تھے، بعض نہایت ہی لطیف۔ سب سے پُر لطف

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

بات یہ ہے کہ ان ڈراموں کا موضوع طوائف تھا۔ جن میں آغا صاحب نے اس کے وجود کو سوسائٹی کے حق میں زہر ثابت کیا تھا..... اور آغا صاحب عمر کے اس آخری حصے میں شراب چھوڑ کر ایک طوائف سے بہت پُر جوش عشق فرما رہے تھے پنڈت محسن سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا۔ ''عشق کے متعلق تو میں نہیں جانتا لیکن ترک شراب نوشی بہت جلد ان کو لے مَرے گی۔''

آغا صاحب تو کچھ دیر زندہ رہے۔ لیکن پنڈت محسن یہ فرمانے کے تقریباً ایک ماہ بعد اس دنیا سے چل بسے۔

میں نے اب مختلف اخباروں میں لکھنا شروع کر دیا۔ چند مہینے گزر گئے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ آغا حشر لاہور میں ''رستم و سہراب'' نام کی ایک فلم بنا رہے ہیں۔ جس کی تیاری پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ اس فلم کی ہیروئن جیسا کہ ظاہر ہے مختار تھی۔

امرتسر سے لاہور صرف ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ آغا صاحب سے پھر ملنے کو جی تو بہت چاہتا تھا مگر خدا معلوم ایسی کون سی رکاوٹ تھی کہ لاہور جانا ہی نہ ہو سکا۔

بہت دنوں کے بعد باری صاحب نے بلایا تو میں لاہور گیا۔ وہاں پہنچ کر کچھ ایسا مشغول ہوا کہ آغا صاحب کو بھول ہی گیا۔ شام کے قریب ہم نے سوچا کہ چلو اُردو بک اسٹال چلیں۔ چنانچہ میں اور باری صاحب دونوں عرب ہوٹل سے چائے پی کر ادھر روانہ ہوئے۔ اُردو بک اسٹال پہنچے تو میں نے دیکھا آغا صاحب یعقوب کی میز کے پاس کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میں نے باری صاحب کو بتایا کہ آغا حشر ہیں۔ انہوں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ یہ ہیں آغا حشر۔؟''

آغا صاحب کا لباس کچھ اس قسم کا تھا۔ سفید بوسکی کی قمیض، گہرے نیلے رنگ کا ریشمی لاچا۔ سر سے ننگے بیٹھے ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ پاس پہنچا تو ایک دم میرا دل دھڑکنے لگا۔ کیونکہ آغا صاحب کے ہاتھ میں میری ترجمہ کی ہوئی کتاب سرگذشت اسیر تھی۔

یعقوب نے اٹھ کر میرا اور باری کا آغا حشر سے تعارف کرایا اور کہا۔ ''یہ کتاب جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ مسٹر منٹو کی ترجمہ کی ہوئی ہے۔'' آغا صاحب نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا، میرا خیال تھا کہ وہ مجھے پہچان لیں گے۔ لیکن انہوں نے مجھے دیکھنے کے بعد کتاب کے چند اوراق پلٹے اور کہا۔ کیسا لکھنے والا ہے وکٹر ہیوگو۔''

باری صاحب نے جواب دیا۔ ''فرانسیسی اَدب میں وکٹر ہیوگو کا رتبہ بہت بلند ہے۔''

آغا صاحب ورق پلٹتے رہے۔ ''ڈراماٹسٹ تھا؟''

اب کی بار پھر باری صاحب نے جواب دیا۔ ''ڈراماٹسٹ بھی تھا۔''

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

آغا صاحب نے پوچھا۔ ''کیا مطلب؟''

باری صاحب نے انہیں بتایا کہ ہیوگو اصل میں شاعر تھا۔ فرانس کی رومانی تحریک کا امام۔ اس نے ڈرامے اور ناول بھی لکھے۔ ایک ناول ''مصیبت زدہ'' اتنا مشہور ہوا کہ اس کی شاعری کو لوگ بھول گئے اور اسے ناولسٹ کی حیثیت سے جاننے لگے۔'' آغا صاحب یہ معلومات بڑی دلچسپی سے سنتے رہے۔ آخر میں انہوں نے یعقوب سے کہا۔ ''سرگزشت اسیر'' بھی ان کتابوں میں شامل کرلی جائے جو وہ خرید رہے تھے۔ میں بہت خوش ہوا۔

اس کے بعد باری صاحب سے باتیں کرتے کرتے اٹھے اور اندر شوروم میں چلے گئے۔ باری صاحب کی گفتگو سے آغا صاحب متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے باری صاحب کی سفارش پر کئی کتابیں خریدیں۔ اس دوران میں باری صاحب نے ان سے کہا۔ آغا صاحب آپ ہندوستانی ڈرامے کی تاریخ کیوں نہیں لکھتے ایسی کتاب کی اشد ضرورت ہے۔''

آغا صاحب نے جواب دیا۔ ''ایسی کتاب صرف آغا حشر ہی لکھ سکتا ہے اس کا ارادہ بھی تھا۔ مگر وہ کم بخت آج کل قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ اس کے دروازے پر موت دستک دے رہی ہے۔''

میں نے ان سے پوچھا۔ ''آغا صاحب آپ کے ڈرامے جو بازار میں بکتے ہیں..''

میں نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ آغا صاحب نے بلند آواز میں کہا.... لاحول ولا... آغا حشر کے ڈرامے اور.... چیتھڑوں پر چھپیں ___ بغیر اجازت کے، اِدھر اُدھر سے سن سنا کر چھاپ دیتے ہیں۔'' اس کے بعد انہوں نے بہت ہی موٹی گالی ان پبلشروں کو دی۔ جنہوں نے ان کے ڈرامے چھاپے تھے۔

میں نے ان سے کہا۔ ''آپ ان پر دعوٰی دائر کیوں نہیں کرتے۔''

آغا صاحب ہنسے۔ ''کیا وصول کرلوں گا ان ٹٹ پونجیوں سے۔''

بات درست تھی۔ میں خاموش ہوگیا۔

آغا صاحب نے باہر آکر یعقوب سے بل طلب کیا اور جیب سے تماش بینوں کے انداز میں تین چار ہزار روپے کے بالکل نئے نوٹ نکالے۔ ان دنوں دس دس اور پانچ پانچ کے نئے نوٹ نکلے تھے۔ جو پہلے نوٹوں کی بہ نسبت چھوٹے تھے.... آغا صاحب نے بتایا کہ چیک کیش کرانے کے لئے جب بینک گئے تو وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے کلرک سے کہا ''آغا حشر کا وقت ابھی پورا نہیں ہوا۔ جلدی چیک کیش کراؤ۔'''' کلرک کو جب معلوم ہوا کہ آغا حشر ہیں تو وہ بھاگتا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہوا منیجر کے پاس گیا۔ فوراً ہی منیجر دوڑا دوڑا ان کے پاس آیا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔ نئے نوٹ منگوا کر اس نے بڑے ادب سے آغا صاحب کو پیش کیے اور کہا ''میں آپ کی اور کوئی سیوا تو نہیں کر سکتا۔ یہ نئے نوٹ آئے ہیں، سب سے پہلے آپکی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔''

باری صاحب نے ایک نوٹ آغا حشر صاحب سے لیا اور اس کو انگلیوں میں پکڑ کر کہا۔ آغا صاحب گرفت کچھ کم ہو گئی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح حکومت کی''

آغا صاحب نے اس فقرے کی بہت داد دی۔ ''خوب، بہت خوب..........

گرفت کچھ کم ہو گئی ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح حکومت کی ___ میں ڈرامے میں اسے ضرور استعمال کروں گا۔''

باری صاحب بہت خوش ہوئے۔ اتنے میں وہ نوکر آیا وہی جو پنڈت محسن کے دفتر میں ازار بند لایا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چار قندھاری انار تھے۔ آغا صاحب نے ایک انار لیا ناک بھوں چڑھا کر گالی دی۔ ''نہایت ہی واہیات انار ہیں۔''

نوکر نے پوچھا۔ ''واپس کر آؤں؟''

آغا صاحب بولے۔ ''نہیں بے۔ تو کھالے۔'' اس کے بعد انہوں نے ایک وزن دار گالی لڑھکا دی۔

آغا صاحب جانے لگے تو میں نے آٹو گراف بک نکال کر ان کے دستخط لئے۔ آغا صاحب جب کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنا نام لکھ چکے تو کہا ___ ''ایک زمانے کے بعد میں نے یہ چند حرف لکھے ہیں۔''

میں امرتسر چلا آیا۔ کچھ عرصے کے بعد یہ خبر آئی کہ لاہور میں مختصر علالت کے بعد آغا حشر کاشمیری کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازے کے ساتھ گنتی کے چند آدمی تھے۔ دینو یا فضلو کمہار کی بیٹھک پر جب آغا صاحب کی موت کا ذکر ہوا تو اس نے نال کے پیسے نکال کر اپنی جالی دار ٹوپی میں رکھتے ہوئے بڑے ہی فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''بڑھاپے کا عشق بہت ظالم ہوتا ہے۔''

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں
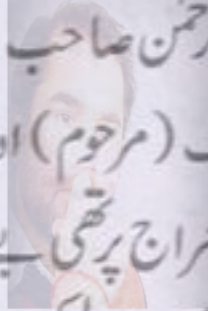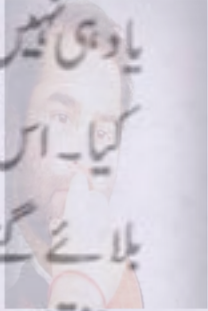
خدا معلوم کتنے برس گزر چکے ہیں۔ حافظہ اس قدر کمزور ہے کہ نام، سن اور تاریخ کبھی یاد ہی نہیں رہتے۔ امرتسر میں غازی عبدالرحمٰن صاحب نے ایک روزنامہ پرچہ "مساوات" جاری کیا۔ اس کی ادارت کے لئے باری علیگ (مرحوم) اور ابوالعلاء چشتی الصحافی (حاجی لق لق) بلائے گئے۔ ان دنوں میری آوارہ گردی معراج پر تھی۔ بے مقصد سارا دن گھومتا رہتا تھا۔ دماغ بے حد منتشر تھا۔ اسوقت تو میں نے محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دماغی انتشار میری لئے کوئی راستہ تلاش کرنے کے لئے بے تاب تھا۔

جی جے کے ہوٹل (شیراز) میں قریب قریب ہر روز گپ بازی کی محفل جمتی تھی۔ بالا، انور پینٹر، عاشق فوٹوگرافر، فقیر حسین سلیس اور ایک صاحب جن کا نام میں بھول گیا ہوں۔ باقاعدگی کے ساتھ اس محفل میں شریک ہوتے تھے۔ ہر قسم کے موضوع زیر بحث لائے جاتے تھے۔ بالا بڑا خوش گو اور بذلہ سنج نوجوان تھا۔ اگر وہ غیر حاضر ہوتا تو محفل سونی رہتی۔ شعر بھی کہتا تھا۔ اس کا ایک شعر ابھی تک مجھے یاد ہے۔
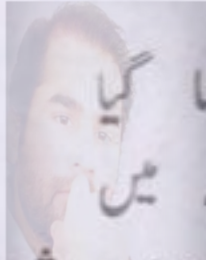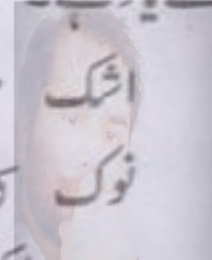
اشک مژگاں پہ ہے اٹک سا گیا
نوک سی چبھ گئی ہے چھالے میں

جی جے سے لے کر انور پینٹر تک سب موسیقی اور شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ وہ صاحب جن کا نام میں بھول گیا تھا۔ کیپٹن وحید تھے نیلی نیلی آنکھوں والے لمبے تڑنگے۔ مضبوط جسم۔ آپ کا محبوب مشغلہ گوروں سے لڑنا تھا۔ چنانچہ کئی گورے ان کے ہاتھوں پٹ چکے تھے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

انگریزی بہت اچھی بولتے تھے۔ اور طبلہ ماہر طبلچیوں کی طرح بجاتے تھے۔

ان دنوں جیجے کے ہوٹل میں ایک شاعر اختر شیرانی کا بہت چرچا تھا۔ قریب قریب ہر محفل میں اس کے اشعار پڑھے یا گائے جاتے تھے۔ جیجا (عزیز) عام طور پر "میں اپنے عشق میں سب کچھ تباہ کرلوں گا" بہت ممکن ہے کہ یہ مصرع غلط ہو، گایا کرتا تھا۔ یہ نئے قسم کا جذبہ سب کے ذہن پر مسلط ہو گیا تھا۔ معشوق کو جو دھمکی دی گئی تھی سب کو بہت پسند آئی تھی۔

جیجا تو اختر شیرانی کا دیوانہ تھا۔ کاؤنٹر کے پاس کھڑا گاہک سے بل وصول کر رہا ہے اور گنگنا رہا ہے "اے عشق کہیں لے چل۔" مسافروں کو کمرے دکھا رہا ہے اور زیر لب گا رہا ہے۔ "کیا بگڑ جائے گا رہ جاؤ یہیں آج کی رات۔" عاشق فوٹو گرافر کی آواز تو بہت پتلی تھی۔ لیکن وہ "اے عشق کہیں لے چل" بڑے سوز سے گایا کرتا تھا۔ میں نے جب بھی اس کے منہ سے یہ نظم سنی، مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اس زمانے میں چونکہ طبیعت میں انتشار تھا اس لئے یہ نظم مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کر دور ___ بہت دور ان دیکھے جزیروں میں لے جاتی تھی۔

اتنا زمانہ بیت چکا ہے مگر وہ کیفیت جو اس وقت مجھ پر طاری ہوتی تھی میں اب بھی محسوس کر سکتا ہوں ___ عجیب و غریب کیفیت تھی۔ جیجے کے ہوٹل کے بہت اندر اندھیری مگر ٹھنڈی کوٹھری میں بیٹھا میں یوں محسوس کرتا کہ کشتی میں بیٹھا ہوں۔ پریاں اسے کھے رہی ہیں۔ نازک پروں والی پریاں۔ رات کا وقت ہے اس لئے مجھے ان پریوں کا صرف سایہ سا نظر آتا ہے۔ سمندر پُرسکون ہے۔ کشتی ہلکورے کھائے بغیر چل رہی ہے۔ کسی نامعلوم منزل کی طرف۔ پاپوں کی بستی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ہم دنیوی شور و غل سے ہزاروں میل آگے بڑھ گئے ہیں۔

جیجے کے ہوٹل میں کچھ عرصے کے بعد باری صاحب اور چشتی صاحب کا آنا جانا بھی شروع ہو گیا؟ دونوں کھانا کھاتے یا چائے پیتے اور چلے جاتے۔ مگر جب جیجے کو معلوم ہوا کہ اخباری آدمی ہیں تو فوراً ان سے بے تکلف مراسم پیدا کر لئے۔

باری صاحب اختر شیرانی کے کلام سے واقف تھے لیکن ذاتی طور پر شاعر کو نہ جانتے تھے۔ چشتی صاحب ایک مدت کے بعد بغداد اور مصر وغیرہ کی سیاحت کے بعد تازہ تازہ واپس آئے تھے۔ اس لئے وہ یہاں کے شعراء کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ پھر بھی جب انہوں نے جیجے سے اختر شیرانی کا کلام سنا تو بہت متاثر ہوئے۔

اس دوران میں باری صاحب کے ساتھ گھل مل گیا۔ ان کی سنجیدگی اور متانت بھری ظرافت مجھے بہت پسند آئی۔ میرے ذہنی انتشار کو بھانپ کر انہوں نے مجھے صحافت کی طرف

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مائل کیا۔ آہستہ آہستہ ادب سے روشناس کرایا۔ پہلے میں تیرتھ رام فیروز پوری کے ناول پڑھا کرتا تھا۔ اب باری صاحب کی وجہ سے آسکر وائلڈ اور وکٹر ہیو گو میرے زیر مطالعہ رہنے لگے۔ ہیو گو مجھے بہت پسند آیا۔ بعد میں میں نے محسوس کیا کہ اس فرانسیسی مصنف کا خطیبانہ انداز باری صاحب کی تحریروں میں موجود ہے۔ آج کل میں جو کچھ بھی ہوں۔ اس کو بنانے میں سب سے پہلا ہاتھ باری صاحب کا ہے۔ اگر امرتسر میں ان سے ملاقات نہ ہوتی اور متواتر تین مہینے میں نے ان کی صحبت میں نہ گزارے ہوتے تو یقیناً میں کسی اور ہی راستے پر گامزن ہوتا۔

چونکہ اب میں کسی حد تک ادب سے روشناس ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے اختر شیرانی کے کلام کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کی شاعری ہلکی پھلکی اور رومانی تھی۔ میں اب غور کرتا ہوں تو اختر شیرانی مجھے کالج کے لڑکوں کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ ایک خاص عمر کے نوجوانوں کا شاعر، جن کے دل ودماغ پر ہر وقت رومان کی مکڑی مہین مہین جالے تنتی رہتی ہے۔ مجھے اس وادی میں قدم رکھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک دوست سے معلوم ہوا اختر شیرانی آئے ہوئے ہیں اور شیراز ہوٹل، میں ٹھہرے ہیں۔ اسی وقت وہاں پہنچا مگر معلوم ہوا کہ وہ جیجے کے ساتھ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ دیر تک ہوٹل میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ مگر یہ لوگ واپس نہ آئے۔ شام کو پہنچا تو ہوٹل کے سندھی باورچی نے کہا کہ سب اوپر کوٹھے پر بیٹھے ہیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں اوپر گیا۔ چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں بچھائی گئی تھیں۔ کچھ کرسیاں بھی تھیں۔ دیسی شراب کا دور چل رہا تھا۔ دس بارہ آدمی بیٹھے تھے جو میرے جانے پہچانے تھے۔ صرف ایک صورت اجنبی تھی اور وہ اختر شیرانی کی تھی چپٹا چہرہ، سپاٹ پیشانی، موٹی ناک، موٹے ہونٹ، گہرا سانولا رنگ چھدرے بال۔ آنکھیں بڑی بڑی اور پُرکشش، ان میں تھوڑی سی اداسی بھی تھی۔ بڑی شستہ ورفتہ اُردو میں حاضرین سے گفتگو کر رہے تھے۔

میں پاس پہنچا تو بالے نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ اور مجھ سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں چارپائی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اختر صاحب جیجے سے مخاطب ہوئے۔ ”عزیز (میری طرف اشارہ کر کے) ان کے لئے گلاس منگواؤ۔“

گلاس آیا تو اختر صاحب نے مجھے ایک پیگ بنا کر دیا جو میں نے شکریے کے ساتھ قبول کیا دو تین دور ہوئے تو کسی نے اختر صاحب سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی اس پر انہوں نے کہا۔ ”نہیں بھائی میں کچھ نہیں سناؤں گا۔ میں سنوں گا۔“ پھر جیجے سے مخاطب ہوئے۔ ”

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

عزیز، سناؤ'' رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آ'' یہ کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ جیسے بیتے ہوئے لمحات یاد آ گئے ہیں۔ جیجے کو انکار نہیں تھی۔ گلا صاف کیا اور اختر صاحب کی ایک مشہور غزل گانا شروع کر دی۔ سر تال سب ٹھیک۔ مگر آواز پھٹی پھٹی سی تھی۔ پھر بھی رنگ جم گیا۔ اختر صاحب پیتے رہے اور جھومتے رہے۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت میں شیراز ہوٹل میں بیٹھا اختر صاحب کا انتظار کر رہا تھا (وہ کسی دعوت پر گئے تھے) کہ ایک برقعہ پوش خاتون تانگے میں آئیں آپ نے ایک دم سے اختر صاحب کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں۔ آپ اپنا نام بتا دیجئے۔ برقعہ پوش خاتون نے اپنا نام نہ بتایا اور چلی گئی۔

اختر صاحب آئے تو میں نے اس خاتون کی آمد کا ذکر کیا۔ آپ نے بڑی شاعرانہ دلچسپی سے ساری بات سنی اور مسکرا دیئے۔ یوں وہ خاتون ایک اسرار بن گئی۔ کھانا کھانے سے پہلے شام کو جب ٹھرّے کا دور شروع ہوا۔ تو جیجے نے اس برقعہ پوش خاتون کے متعلق اختر صاحب سے پوچھا۔ ''حضرت وہ کون تھیں جو آج دوپہر کو تشریف لائی تھیں''۔

اختر صاحب مسکرائے اور جواب گول کر گئے۔ بالے نے ان سے کہا'' کہیں سلمیٰ صاحبہ تو نہیں تھیں''۔

اختر صاحب نے ہولے سے بالے کے گال پر طمانچہ مارا اور صرف اتنا کہا'' شریر'' بات اور بھی زیادہ پراسرار ہو گئی۔ جو آج تک صیغۂ راز میں ہے'' معلوم نہیں وہ برقعہ پوش خاتون کون تھیں۔ اس زمانے میں صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ اختر صاحب کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر شیراز ہوٹل آئی تھیں اور اختر صاحب کے بارے میں اس نے پوچھا کہ کہاں ہیں۔

سب باری باری اختر صاحب کی دعوت کر چکے تھے۔ وہیں شیراز ہوٹل میں۔ دعوت دینے کا یہ طریقہ تھا کہ دن اور رات میں ٹھرّے کی جتنی بوتلیں ختم ہوں۔ ان کے دام ادا کر دیئے جائیں۔ میں نے یہ طریقہ بھونڈا سمجھا اور دو بوتلیں اسکاچ وسکی کی لے کر ایک شام وہاں پہنچا۔ ایک بوتل پر سے کاغذ ہٹایا____ تو اختر صاحب نے کہا۔'' بھائی، یہ تم نے کیا کیا۔ دیسی شراب ٹھیک رہتی۔ ایک کے بدلے دو آ جاتیں''۔

میں نے عرض کی۔'' اختر صاحب۔ یہ ختم ہو جائے تو دوسری موجود ہے''۔

اختر صاحب مسکرائے۔'' وہ ختم ہو گئی تو۔''

میں نے کہا۔'' اور آ جائے گی۔''

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''زندہ رہو۔''

دونوں بوتلیں ختم ہو گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اختر صاحب اسکاچ سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ ملازم سے امرتسر ڈسٹلری کے کشید کردہ ٹھرے کی ایک بوتل منگوائی۔ اس نے اختر صاحب کے نشے میں جو خالی جگہیں تھیں پُر کر دیں۔

چونکہ یہ محفلیں خالص ادبی نہیں تھیں اور ان کے پیچھے صرف وہ عقیدت تھی جو ان لوگوں کو اختر صاحب سے تھی۔ اس لئے زیادہ تر ان ہی کا کلام پڑھا یا گایا جاتا۔ شعر و سخن کے متعلق کوئی بصیرت افروز بات نہ ہوتی۔ لیکن اختر صاحب کی گفتگوؤں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اردو شاعری پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔

چند روز کے بعد میں نے گھر پر اختر صاحب کی دعوت کی مگر یہ صرف چائے کی تھی جس سے اختر صاحب جیسے رند بلانوش کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن انہوں نے قبول کی اور میری خاطر ایک پیالی چائے بھی پی۔

ان محفلوں میں باری صاحب بہت کم شریک ہوئے۔ البتہ چشتی صاحب جو پینے کے معاملے میں اختر صاحب سے بھی چند پیگ آگے ہی تھے۔ اکثر ان محفلوں میں شریک ہوتے اور اپنا کلام بھی سناتے جو عام طور پر بے روح ہوتا تھا۔

اختر صاحب غالباً دس دن امرتسر میں رہے۔ اس دوران میں جیجے کے پیہم اصرار پر آپ نے شیراز ہوٹل پر ایک نظم کہی جیجے نے اسے باری صاحب کی وساطت سے بڑے کاغذ پر خوشخط لکھوایا اور فریم میں جڑوا کر اپنے ہوٹل کی زینت بنایا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کیونکہ نظم میں اس کا نام موجود تھا۔

اختر صاحب چلے گئے تو جیجے کے ہوٹل کی رونق غائب ہو گئی۔ باری صاحب نے اب میرے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ میرا شراب پینا ان کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن واعظ نہیں تھے۔ اشاروں ہی اشاروں میں کئی دفعہ مجھے اس علت سے باز رہنے کے لئے کہا۔ مگر میں باز نہ آیا۔

باری صاحب تین مہینے امرتسر میں رہے۔ اس دوران میں انہوں نے مجھ سے وکٹر ہیوگو کی ایک کتاب ''سرگذشت اسیر'' کے نام سے ترجمہ کرائی۔ جب وہ چھپ کر پریس سے باہر آئی تو آپ لاہور میں تھے۔ میں نے مطبوعہ کتاب دیکھی۔ تو اکساہٹ پیدا ہوئی کہ اور ترجمہ کروں۔ چنانچہ میں نے آسکر وائلڈ کے اشتراکی ڈرامے ''ویرا'' کا ترجمہ شروع کر دیا۔ جب ختم ہوا تو باری صاحب کو اصلاح کے لئے دیا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ میری تحریروں میں بہت ہی کم کاٹ چھانٹ کرتے تھے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

زبان کی کئی غلطیاں رہ جاتی تھیں۔ جب کوئی ان کی طرف اشارہ کرتا تو مجھے بہت کوفت ہوتی۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ باری صاحب کے بعد اختر صاحب کو ترجمے کا مسودہ دکھاؤں گا۔

عرب ہوٹل میں آنے جانے سے مظفر حسین شمیم صاحب سے اچھے خاصے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے اصلاح کی بات کی تو وہ مجھے اسی وقت اختر شیرانی صاحب کے پاس لے گئے۔ چھوٹا سا غلیظ کمرہ تھا۔ آپ چارپائی پر تکیہ سینے کے ساتھ دبائے بیٹھے تھے۔ علیک سلیک ہوئی۔ اختر صاحب مجھے پہچان گئے۔ یارانِ شیراز ہوٹل کے بارے میں پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے ان کو بتا دیا۔

شمیم صاحب اور اختر صاحب کی گفتگو بہت پر تصنع اور پر تکلف تھی حالانکہ مجھ سے کسی شخص نے کہا تھا کہ وہ دونوں کسی زمانے میں ایک جان و دو قالب تھے بہر حال شمیم صاحب نے میرے آنے کا مدعا بیان کیا۔ اختر صاحب نے کہا ''میں حاضر ہوں۔ آج رات ہی سارا مسودہ دیکھ لوں گا۔''

اختر صاحب نے سینے کے ساتھ تکیہ اس لئے دبایا ہوا تھا کہ ان کے جگر میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ٹیس سی اٹھتی تھی۔ اس زمانے ہی میں ان کا جگر قریب ماؤف ہو چکا تھا۔ میں نے ان سے رخصت لی اور شام کو حاضر ہونے کا کہہ کر شمیم صاحب کے ساتھ واپس عرب ہوٹل چلا آیا۔ انہوں نے مجھ سے اشارتاً کہا کہ اگر تم اختر سے اپنا کام جلدی کرانا چاہتے ہو تو ساتھ ''وہ چیز'' لیتے جانا۔

میں جب شام کو اختر صاحب کے پاس پہنچا تو ''وہ چیز'' میرے پاس موجود تھی جو میں نے بڑے سلیقے سے پیش کی۔ بوتل ڈرتے ڈرتے باہر نکالی اور ان سے کہا ''کیا یہاں اس کی اجازت ہے۔ معاف کیجئے گا یہ پوچھنا ہی بڑی بدتمیزی ہے۔''

اختر صاحب کی آنکھیں تمتما اٹھیں۔ میرا خیال ہے وہ صبح کے پیاسے تھے۔ مسکرائے اور میرے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ شراب پینا کوئی بدتمیزی نہیں۔ یہ کہہ کر بوتل میرے ہاتھ سے لی اور تکیہ فرش پر رکھ کر اس پر بوتل کا نچلا حصہ ٹھونکنا شروع کیا، تاکہ کارک باہر نکل آئے۔

ان دنوں پیتا تھا مگر یوں کہئے کہ زیادہ پی نہیں سکتا تھا۔ چار پیگ کافی تھے، مقدار اس سے اگر بڑھ جاتی تو طبیعت خراب ہو جاتی اور سارا لطف غارت ہو جاتا۔

ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور پیتے کافی دیر ہو گئی۔ اختر صاحب کا کھانا آیا اور جس طریقے سے آیا اس سے میں نے یہ جانا کہ ان کے گھر والوں کے تعلقات ان سے کشیدہ ہیں۔ بعد میں اس

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کی تصدیق بھی ہوگئی۔ ان کے والد مکرم حافظ محمود شیرانی صاحب (مرحوم و مغفور) ان کی شراب نوشی کے باعث بہت نالاں تھے۔ تھک ہار کر انہوں نے اختر صاحب کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

رات زیادہ گزر گئی تو میں نے اختر صاحب سے درخواست کی کہ وہ مسودہ دیکھنا شروع کر دیں۔ آپ نے یہ درخواست قبول کی اور مسودے کی اصلاح شروع کر دی۔ چند صفحات دیکھے تو آسکر وائلڈ کی رنگین زندگی کی باتیں شروع کر دیں جو غالباً انہوں نے کسی اور سے سنی تھیں۔ آسکر وائلڈ اور لارڈ الفرڈ ڈگلس کے معاشقے کا ذکر آپ نے بڑے مزے لے لے کر بیان کیا۔ رائلڈ کیسے قید ہوا یہ بھی بتایا پھر ان کا ذہن ایک دم لارڈ بائرن کی طرف چلا گیا۔ اس شاعر کی ادا انہیں پسند تھی۔ اس کے معاشقے جو کہ لاتعداد تھے اختر صاحب کی نگاہوں میں ایک جداگانہ شان رکھتے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ لارڈ بائرن کے نام سے انہوں نے کئی غزلیں اور نظمیں بھی لکھی تھیں۔

لارڈ بائرن ایک سنگدل، بے رحم اور بے پرواہ نسان تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک بہت بڑا نواب تھا۔ جس کے پاس دولت تھی۔ اختر صاحب قلاش تھے۔ بڑے رحم دل اور انسانیت دوست۔ بائرن کو بڑھیا سے بڑھیا شراب میسر تھی۔ اختر کو بہ مشکل ٹھرا ملتا تھا۔ بائرن کے ملک کی فضا اور تھی، اختر کے ملک کی فضا اور۔ وہ کسی صورت میں بھی لارڈ بائرن نہیں بن سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے دل کی تسکین کے لئے دو معشوق اختراع کر لئے تھے۔ سلمیٰ اور عذرا۔

سلمیٰ کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ سلمیٰ حقیقتاً کوئی سلمیٰ تھی۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو مگر جو سلمیٰ ہمیں اختر کے کلام میں نظر آتی ہے یکسر تخیلی ہے۔ اس کا وجود اس قدر شفاف ہے کہ صاف ایتھری معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور بات بھی ہے۔ اگر سلمیٰ کوئی گوشت پوست کی زندہ عورت ہوتی تو شاعر اس سے اتنی والہانہ محبت کبھی نہ کرتا۔ مگر چونکہ وہ اس کی اپنی تخلیق تھی۔ اس لئے وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

لارڈ بائرن کی باتیں سنتے سنتے مجھے نیند آگئی اور وہیں سو گیا۔ صبح اٹھا تو دیکھا۔ اختر صاحب فرش پر بیٹھے مسودہ دیکھنے میں مصروف ہیں۔ بوتل میں تھوڑی سی بچی ہوئی شراب تھی۔ یہ آپ نے پی اور آخری صفحات دیکھ کر مسودہ میرے حوالے کیا اور کہا۔ ”ترجمہ بہت اچھا ہے کہیں کہیں زبان کی اغلاط تھیں۔ وہ میں نے درست کر دی ہیں۔

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا اور امرتسر روانہ ہو گیا۔

اس کے بعد میں جب کبھی لاہور جاتا۔ اختر صاحب کے نیاز ضرور حاصل کرتا۔ ایک بار گیا تو دیکھا کہ آپ کے سر پر پٹیاں بندھی ہیں۔ ان سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا“

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مجھے تو قطعاً یاد نہیں لیکن لوگ کہتے ہیں کل رات میں نے تانگے میں سوار ہونے کی کوشش کی مگر گر پڑا اور چوٹیں اس وجہ سے آئیں۔"

اختر صاحب کی اپنی ذات کے بارے میں یہ صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی۔ بعض اوقات وہ بالکل بچے بن جاتے تھے۔ ان کی گفتگو اور حرکات بالکل بچوں کی سی ہوتیں، جہاں تک میں سمجھتا ہوں بچہ بن کر وہ بچکانہ قسم ہی کی مسرّت محسوس کرتے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد میں بمبئی چلا گیا۔ اختر صاحب سے اتنے مراسم نہیں تھے کہ خط وکتابت ہوتی۔ لیکن جب انہوں نے رسالہ "رومان" جاری کیا تو میں نے انہیں مبارکباد کا خط لکھا۔ اب میں افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھ چکا تھا۔ ترجمے کا دور وہیں لاہور اور امرتسر میں ختم ہو گیا تھا۔ میں نے طبع زاد افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ جو مقبول ہوئے تھے۔ "رومان" میں احمد ندیم قاسمی کا ایک افسانہ مجھے بہت پسند آیا، بمبئی کے ہفتہ وار "مصوّر" میں "رومان" پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے اس کی تعریف کی۔ اختر صاحب کو علیحدہ خط لکھا تو اس میں بھی افسانے کو بہت سراہا۔ چند دنوں کے بعد احمد ندیم قاسمی کا محبت بھرا خط موصول ہوا جو ایک طویل سلسلۂ خط وکتابت کا پیش خیمہ تھا۔

کچھ عرصے کے بعد "رومان" بند ہو گیا اور اختر میری نظروں سے مکمل طور پر اوجھل ہو گئے۔ کئی برس گزر گئے۔ ملک کی سیاست نے کئی رنگ بدلے۔ حتّٰی کے بٹوارہ آن پہنچا۔ اس سے پہلے جو ہلّڑ مچا اس سے آپ سب واقف ہیں۔ اس دوران میں اخباروں میں خبر چھپی کہ اختر صاحب ٹونک سے پاکستان آ رہے تھے، راستے میں بلوائیوں نے ان کو شہید کر دیا۔ بہت افسوس ہوا۔ میں، عصمت اور شاہد لطیف دیر تک ان کی باتیں کرتے اور افسوس کرتے رہے۔

کئی اخباروں میں ان کی موت پر مضامین شائع ہوئے۔ اُن کی پرانی نظمیں چھپیں۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کی موت کی خبر کی تردید ہو گئی معلوم ہوا کہ وہ بخیر وعافیت لاہور پہنچ گئے ہیں۔ اس سے بمبئی کے ادبی حلقے کو بہت خوشی ہوئی۔

تقسیم کے پانچ مہینے بعد میں بمبئی چھوڑ کر لاہور چلا آیا کیوں کہ سب عزیز واقارب یہیں جمع تھے۔ افراط وتفریط کا عالم تھا۔ اختر صاحب سے ملنے کا خیال تک دماغ میں نہ آیا۔ بڑی مدت کے بعد یومِ اقبال کے جلسے میں ان کو دیکھا مگر نہایت ہی ابتر حالت میں۔

رات کے جلسے کی صدارت اختر صاحب کو کرنا تھی۔ یونیورسٹی ہال میں حاضرین کی تعداد خاصی تھی۔ جلسے میں شرکت کے لئے بھارت سے علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی آئے ہوئے تھے۔ وقت ہو چکا تھا مگر صاحب صدر موجود نہیں تھے۔ میں نے ساحر لدھیانوی سے پوچھا تو اس

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نے مجھے بتایا کہ اختر شیرانی صاحب ہال کے باہر پی رہے ہیں۔ ان کی حالت بہت غیر ہے۔ اسلئے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ وہ صدارت نہ کریں مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ مُصر ہیں۔

میں باہر گیا تو دیکھا وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہیں اور پی رہے ہیں ___ ظہیر کاشمیری کے ہاتھ میں بوتل ہے۔ آپ نے گلاس ختم کیا اور ظہیر سے کہا۔ "چلو اجلاس کا وقت ہوگیا۔" ظہیر نے ان کو روکا ہے۔ "جی نہیں"۔ ابھی کہاں ہوا ہے۔" مگر اندر ہال سے نظم پڑھنے کی آواز آرہی تھی۔ آپ نے لڑکھڑاتے ہوئے الفاظ کے اپنے منہ میں کئی کئی ٹکڑے کرتے ہوئے کہا۔" جلسہ شروع ہو چکا ہے۔ مجھے آواز آرہی ہے"۔ یہ کہہ کر انہوں نے ظہیر کو دھکا دیا۔ اس موقعے پر میں آگے بڑھا اختر صاحب نے تھوڑی دیر کے لئے مجھے بالکل نہ پہچانا۔ نشے سے ان کی آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ میں نے ان کو جھنجھوڑا اور اپنا نام بتایا۔ اس پر انہوں نے ایک لمبی آہ کی اور مجھے گلے لگالیا اور سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ الفاظ چونکہ ان کے منہ میں اوپر تلے ہو کر ٹوٹ جاتے تھے۔ اس لئے میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ ظہیر نے میرے کان میں کہا کہ میں انہیں اندر ہال میں نہ جانے دوں۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے اور تو کچھ نہ کیا۔ اختر صاحب سے یہ کہا" اتنی دیر کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ کیا اس کی خوشی میں بوتل میں سے مجھے کچھ نہ ملے گا۔"

آپ نے ظہیر کاشمیری سے کچھ کہا۔ جس کا غالباً یہ مطلب تھا سعادت کو ایک گلاس بنا کر دو۔ ظہیر گلاس میں آتش سیال انڈیلنے لگا کہ اختر صاحب تیزی سے لڑکھڑاتے ہوئے ہال کے اندر داخل ہوگئے اور ہمیں اس کی اس وقت خبر ہوئی جب ان کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔ پھر بھی میں دوڑ کر اندر گیا اور چبوترے پر چڑھنے سے پہلے ان کو روک لیا مگر وہ میری گرفت سے نکل کر کرسئ صدارت پر جا بیٹھے۔ جلسے کے منتظمین بہت پریشان ہوئے۔ کیا کریں کیا نہ کریں سب اسی مخمصے میں گرفتار تھے ان کی حالت بہت بُری تھی۔ کچھ دیر تو وہ خاموش بیٹھے کرسی پر جھولتے رہے لیکن جب انہوں نے اٹھ کر تقریر کرنا چاہی تو معاملہ بڑا سنگین ہوگیا۔ مائکروفون کے سامنے آپ بار بار اپنی ڈھیلی پتلون ٹھیک کرتے اور ثابت قدم رہنے کی ناکام کوشش میں بار بار لڑکھڑاتے تھے۔ آپ کی لکنت زدہ زبان سے خدا معلوم کیا نکل رہا تھا۔

حاضرین میں سے کسی شخص نے بلند آواز میں کہا "یہ شرابی ہے۔ اسے باہر نکالو۔"

بس طوفان برپا ہوگیا۔ ایک نے بنچوں پر کھڑے ہو کر بڑے غصّے میں کہا۔ پاکستان میں کیا یہی کچھ ہوگا" ___ دوسرا چلایا۔" اور جلسے میں خواتین بھی موجود ہیں۔"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اختر صاحب برابر بولتے رہے۔ ایک تو ویسے ہی ان کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ شور میں تو وہ شور کا ایک حصّہ بن گئی تھی۔ جب معاملہ بڑھ گیا تو دوست احباب اختر صاحب کو زبردستی ہال سے باہر لے گئے۔ فضا بہت خراب ہوگئی تھی۔ لیکن شورش کاشمیری کی بروقت تقریر نے مدد کی اور ہال پُرسکون ہوگیا۔

اس کے بعد اختر صاحب سے آخری ملاقات میو ہسپتال میں ہوئی۔

میں پرویز پروڈکشنز لمیٹڈ کے لئے ایک فلمی کہانی لکھنے میں مصروف تھا کہ احمد ندیم قاسمی آئے۔ آپ نے بتایا۔ ''میں نے کسی سے سُنا ہے کہ اختر صاحب دو تین روز سے خطرناک طور پر علیل ہیں۔ اور میو ہسپتال میں پڑے ہیں بڑی کسمپرسی کی حالت میں۔ کیا ہم ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں۔؟''

ہم سب نے آپس میں مشورہ کیا۔ مسعود پرویز نے ایک راہ نکالی جو یہ تھی کہ ان کی دو تین غزلیں یا نظمیں فلم کے لئے لے لی جائیں اور'' پرویز پروڈکشنز کی طرف سے پانچ سو روپے بطور معاوضے کے ان کو دے دیئے جائیں۔ بات معقول تھی۔ چنانچہ ہم اسی وقت موٹر میں بیٹھ کر میو ہسپتال پہنچے۔

مریضوں سے ملنے کے لئے ہسپتال میں خاص اوقات مقرر ہیں۔ اس لئے ہمیں وارڈ میں جانے کی اجازت نہ ملی۔ ڈیوٹی پر اس وقت جو ڈاکٹر مقرر تھے۔ اُن سے ملے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ ہم اختر شیرانی سے ملنا چاہتے ہیں تو آپ نے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا۔ ان سے ملاقات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

ڈاکٹر صاحب نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ بے ہوش ہیں۔ جب سے یہاں آئے ہیں، ان پر غشی طاری ہے یعنی الکوہلک کوما۔''

یہ سُن کر ہمیں اختر صاحب کو دیکھنے کا اور زیادہ اشتیاق پیدا ہوا۔ ہم نے اس کا اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب اٹھے اور ہمیں وہاں لے گئے۔ جہاں ہمارا رومانی شاعر، سلمٰی اور عذرا کا خالق بے ہوش پڑا تھا۔ بیڈ کے ارد گرد کپڑا تنا تھا۔ ہم نے دیکھا اختر صاحب آنکھیں بند کئے پڑے ہیں۔ لمبے لمبے ناہموار سانس لے رہے ہیں۔ ہونٹ آواز کے ساتھ کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ ہم تینوں ان کو اس حالت میں دیکھ کر پژمردہ ہوگئے

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ ''کیا ہم ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟''

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ ''ہم امکان بھر کوشش کر چکے ہیں اور امکان بھر کوشش کر

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

رہے ہیں۔ مریض کی حالت بہت نازک ہے۔ گردے اور جگر بالکل کام نہیں کر رہے۔ انتڑیاں بھی جواب دے چکی ہیں۔ ایک صرف دل اچھی حالت میں ہے۔ گھپ اندھیرے میں امید کی بس یہی ایک چھوٹی سی کرن ہے۔"

جب ہم نے خواہش ظاہر کی کہ اختر صاحب کے اس وقت میں کسی نہ کسی طرح کام آنا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اچھا تو میں آپ کو ایک دوا کا نام بتاتا ہوں۔ آپ اسے حاصل کرنے کی کوشش کیجئے یہاں پاکستان میں تو بالکل نایاب ہے۔ ممکن ہے ہندوستان میں مل جائے۔"

ڈاکٹر صاحب سے دوا کا نام لکھوا کر میں فیض صاحب کے پاس پہنچا۔ اور ان کو ساری بات بتائی۔ آپ نے اسی وقت امرتسر ٹیلی فون کرایا اور اپنے اخبار کے ایجنٹ سے کہا کہ وہ دوا حاصل کر کے فوراً لاہور بھجوا دے۔ لیکن افسوس دوا نہ ملی۔ مسعود پرویز نے دلّی فون کیا۔ وہاں سے ابھی جواب نہیں آیا تھا کہ اختر صاحب بے ہوشی کے عالم میں اپنی سلمٰی اور عذرا کو پیارے ہو گئے۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# اشوک کمار
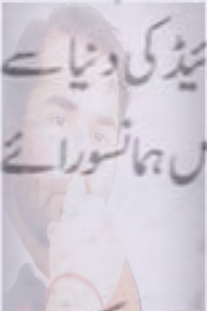
نجم الحسن جب دیویکا رانی کو لے اُڑا تو بمبئی ٹاکیز میں افراتفری پھیل گئی۔ فلم کا آغاز ہو چکا تھا۔ چند مناظر کی شوٹنگ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی کہ نجم الحسن اپنی ہیروئن کو سلولائیڈ کی دنیا سے کھینچ کر حقیقت کی دنیا میں لے گیا۔ بمبئی ٹاکیز میں سب سے زیادہ پریشان اور متفکر شخص ہمانسو رائے تھا۔ دیویکا رانی کا شوہر اور بمبئی ٹاکیز کا ”دل و دماغ پس پردہ۔“

ایس مکرجی مشہور جوبلی میکر فلم ساز (اشوک کمار کے بہنوئی) ان دنوں بمبئی ٹاکیز میں مسٹر ساوک واچا ساؤنڈ انجینئرنگ کے اسسٹنٹ تھے صرف بنگالی ہونے کی وجہ سے انہیں ہمانسو رائے سے ہمدردی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح دیویکا رانی واپس آ جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آقا ہمانسو رائے سے مشورہ کئے بغیر اپنے طور پر کوشش کی اور اپنی مخصوص حکمت عملی سے دیویکا رانی کو آمادہ کر لیا کہ وہ کلکتے میں اپنے عاشق نجم الحسن کی آغوش چھوڑ کر واپس بمبئی ٹاکیز کی آغوش میں چلی آئے جس میں اس کے جواہر کے پنپنے کی زیادہ گنجائش تھی۔

دیویکا رانی واپس آ گئی۔ ایس مکرجی نے اپنے جذباتی آقا ہمانسو رائے کو بھی اپنی حکمت عملی سے آمادہ کر لیا کہ وہ اسے قبول کر لیں۔ اور بے چارہ نجم الحسن ان عاشقوں کی فہرست میں داخل ہو گیا جن کو سیاسی، مذہبی اور سرمایہ دارانہ حکمت عملیوں نے اپنی محبوباؤں سے جدا کر دیا تھا۔

زیرِ تکمیل فلم سے نجم الحسن کو قینچی سے کاٹ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک تو دیا گیا۔ مگر اب یہ سوال درپیش تھا کہ عشق آشنا دیویکا رانی کے لئے سیلولائڈ کا ہیرو کون ہو۔

ہمانسو رائے ایک بے حد محنتی اور دوسروں سے الگ تھلگ رہ کر خاموشی سے اپنے کام

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں شب و روز منہمک رہنے والے فلم ساز تھے۔ انہوں نے بمبئی ٹاکیز کی نیو کچھ اس طرح ڈالی تھی کہ وہ ایک باوقار درس گاہ معلوم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بمبئی شہر سے دور مضافات میں ایک گاؤں کو جس کا نام ''ملاڈ'' ہے اپنی فلم کمپنی کے لئے منتخب کیا تھا.....وہ باہر کا آدمی نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے کہ باہر کے آدمیوں کے متعلق ان کی رائے اچھی نہیں تھی (نجم الحسن بھی باہر کا آدمی تھا)

یہاں پھر ایس مکر جی نے اپنے جذباتی آقا کی مدد کی۔ ان کا سالا اشوک کمار بی ایس سی پاس کر کے ایک برس کلکتے میں وکالت پڑھنے کے بعد بمبئی ٹاکیز کی لیباریٹری میں بغیر تنخواہ کے کام سیکھ رہا تھا۔ ناک نقشہ اچھا تھا۔ تھوڑا بہت گا بجا بھی لیتا تھا۔ مکرجی نے چنانچہ برسبیل تذکرہ ہیرو کے لئے اس کا نام لیا۔ ہمانسو رائے کی ساری زندگی تجربوں سے دوچار رہی تھی انہوں نے کہا ''دیکھ لیتے ہیں'' جرمن کیمرہ مین ورشنگ نے اشوک کا ٹیسٹ لیا۔ ہمانسو رائے نے دیکھا اور پاس کر دیا۔ جرمن فلم ڈائریکٹر فرانز اوسٹن کی رائے ان کے برعکس تھی۔ مگر بمبئی ٹاکیز میں کس کی مجال کہ ہمانسو رائے کی رائے کے خلاف اظہارِ خیال کر سکے۔ چنانچہ اشوک کمار گانگولی جو ان دنوں بمشکل ۲۲ برس کا ہوگا، دیویکا رانی کا ہیرو منتخب ہو گیا۔

ایک فلم بنی، دو فلم بنی.....کئی فلم بنیں اور دیویکا رانی اور اشوک کمار کا نہ جدا ہونے والا فلمی جوڑا بن گیا۔ ان فلموں میں سے اکثر بہت کامیاب ہوئیں۔ گڑیا سی دیویکا رانی اور بڑا ہی بے ضرر اشوک کمار، دونوں سلولائڈ پر شیر و شکر ہو کر آتے تو بہت ہی پیارے لگتے۔ معصوم ادائیں۔ الھڑ غمزے.....بڑا ہنسائی قسم کا عشق.......لوگوں کو جو جارحانہ عشق کرنے اور دیکھنے کے شوقین تھے۔ یہ نرم و نازک اور لچکیلا عشق بہت پسند آیا۔ خاص طور پر اس نئے فلمی جوڑے کے گرویدہ ہو گئے۔ اسکولوں اور کالجوں میں طالبات کا (خصوصاً) ان دنوں آئیڈیل ہیرو اشوک کمار تھا اور کالجوں کے لڑکے لمبی اور کھلی آستینوں والے بنگالی کرتے پہن کر گاتے پھرتے تھے۔

تو بن کی چڑیا میں بن کا پنچھی بن بن بولوں رے

میں نے اشوک کے چند فلم دیکھے۔ دیویکا رانی اس کے مقابلے میں جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے میلوں آگے تھی اور ہیرو کے روپ میں اشوک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چوکولیٹ کا بنا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ اس نے پُر پُرزے نکالے اور بنگال کے آدرش افیمی عشق کی پینک سے بیدار ہونے لگا۔

اشوک جب لیباریٹری کی چلمن سے باہر نکل کر نقرئی پردے پر آیا تو اس کی تنخواہ پچھتر روپے مقرر ہوئی۔ اشوک بہت خوش تھا۔ ان دنوں اکیلی جان کے لئے اور وہ بھی شہر سے دور دراز گاؤں ''ملاڈ'' میں اتنے روپے کافی تھے۔ جب اس کی تنخواہ ایک دم دوگنی ہو گئی یعنی ایک

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

سو پچاس روپے ماہوار تو وہ اور بھی زیادہ خوش تھا۔ لیکن جب ڈیڑھ کے ڈھائی مقرر ہوئے تو وہ گھبرا گیا، اس نے مجھے اس وقت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”بائی گوڈ.......میری حالت عجیب وغریب تھی۔ ڈھائی سو روپے.......میں نے کیشیر سے نوٹ لئے تو میرا ہاتھ کانپنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے روپے کہاں رکھوں.......میرا گھر تھا.......ایک چھوٹا سا کوارٹر۔ ایک چارپائی تھی۔ دو تین کرسیاں۔ چاروں طرف جنگل.......رات کو اگر کوئی چور آ جائے...یعنی اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ میرے پاس ڈھائی سو روپے ہیں تو کیا ہو؟....میں ایک عجیب چکر میں پڑ گیا۔ چوری ڈکیتی سے میری جان جاتی ہے۔ گھر آ کر بہت اسکیمیں بنائیں آخر یہ کیا کہ وہ نوٹ چارپائی کے نیچے بچھی ہوئی دری میں چھپا دیئے....ساری رات بڑے ڈراؤنے خواب آتے رہے.....صبح اٹھ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ نوٹ اٹھا کر ڈاک خانے میں جمع کرا دیئے۔“

اشوک مجھے یہ بات اپنے مکان پر سنا رہا تھا کہ کلکتے کا ایک فلم ساز اس سے ملنے آیا۔ کنٹریکٹ تیار تھا مگر اشوک نے اس پر دستخط نہ کئے۔ وہ اسی ہزار روپے دیتا تھا اور اشوک کمار کا مطالبہ پورے ایک لاکھ کا تھا.....کہاں ڈھائی سو روپے اور کہاں ایک لاکھ!

بمبئی ٹاکیز میں اشوک کے ساتھ ساتھ اس کے بہنوئی ایس۔ مکرجی نے بھی ترقی کی۔ آدمی ذہین تھا۔ گرد و پیش جو کچھ بھی ہوتا تھا اس کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ پروڈیوسر بن گیا.......معمولی پروڈیوسر نہیں، بہت بڑا پروڈیوسر جس نے بمبئی ٹاکیز کے جھنڈے تلے کئی سلور اور گولڈن جوبلی فلمیں بنائیں اور منظر نگاری میں ایک خاص اسکول کی بنیاد ڈالی......راقم الحروف اس صنف میں اس کو اپنا استاد مانتا ہے۔

اشوک کی ہردلعزیزی دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ چونکہ وہ باہر بہت ہی کم نکلتا تھا اور الگ تھلگ رہتا تھا۔ اس لئے جب لوگ کہیں اس کی جھلک دیکھ پاتے تو ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ چلتی ٹریفک بند ہو جاتی۔ اس کے چاہنے والوں کے ٹھٹھ لگ جاتے اور اکثر اوقات پولیس کے ڈنڈے کے زور سے اُسے ہجوم کی بے پناہ عقیدت سے نجات دلانا پڑتی۔

اشوک اپنے عقیدت مندوں کے والہانہ اظہار کو وصول اور برداشت کرنے کے معاملے میں بہت ہی ذلیل واقع ہوا ہے، فوراً ہی چڑ جاتا ہے۔ جیسے کسی نے گالی دی ہے۔ میں نے اس سے کئی دفعہ کہا۔ ”دادا منی۔ تمہاری یہ حرکت بڑی واہیات ہے.......خوش ہونے کے بجائے تم ناراض ہوتے ہو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ لوگ تم سے محبت کرتے ہیں۔“ لیکن یہ بات سمجھنے کے لئے شاید اس کے دماغ میں کوئی ایسا خانہ ہی نہیں ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

محبت سے وہ قطعاً ناآشنا ہے، یہ تقسیم سے پہلے تک کی بات ہے، اس عرصے میں اس کے اندر کیا تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سینکڑوں حسین لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں۔ مگر وہ نہایت ہی روکھے انداز میں ان کے ساتھ پیش آیا۔ طبعاً وہ ایک ٹھیٹ جاٹ ہے۔ اس کے کھانے پینے اور رہنے سہنے میں ایک عجیب قسم کا گنوار پن ہے۔

دیویکارانی نے اس سے عشق لڑانا چاہا۔ مگر اس نے بہت ہی غیر صناعانہ انداز میں اس کی حوصلہ شکنی کی۔ ایک اور ایکٹریس نے جرأت سے کام لے کر اس کو اپنے گھر بلایا اور بڑے ہی نرم و نازک طریقے سے اس پر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ مگر جب اشوک نے بڑے بینڈے پن سے اس کا دل توڑا تو اس غریب کو پینترا بدل کر یہ کہنا پڑا "میں آپ کا امتحان لے رہی تھی۔ آپ تو میرے بھائی ہیں۔"

اشوک کو اس ایکٹریس کا جسم پسند تھا۔ ہر وقت دھلی دھلی نکھری رہتی تھی۔ اس کی یہ چیز بھی اشوک کو بہت بھاتی تھی۔ چنانچہ جب اس نے قلابازی لگا کر اس کو اپنا بھائی بنالیا تو اشوک کو کافی کوفت ہوئی۔

اشوک عشق پیشہ نہیں۔ لیکن تاک جھانک کا مرض اس کو عام مردوں کا سا ہے۔ عورتوں کی دعوت طلب چیزوں کو باقاعدہ غور سے دیکھتا ہے اور ان کے متعلق اپنے دوستوں سے باتیں بھی کرتا ہے۔ کبھی کبھار کسی عورت کی جسمانی قربت کی خواہش بھی محسوس کرتا ہے۔ مگر بقول اس کے "منٹو یار......ہمت نہیں پڑتی۔"

ہمت کے معاملے میں وہ واقعی بہت بودا ہے۔ لیکن یہ بوداپن اس کی ازدواجی زندگی کے لئے بہت ہی مبارک ہے۔ اس کی بیوی شوبھا سے اگر اس کی اس کمزوری کا ذکر کیا جائے تو یقیناً وہ یہی کہے گی۔ "خدا کا شکر ہے کہ گانگولی میں ایسی ہمت نہیں اور خدا کرے اس میں یہ ہمت کبھی پیدا نہ ہو۔"

مجھے حیرت ہے کہ اس میں یہ ہمت اور جرأت کیوں پیدا نہ ہوئی جب کہ سینکڑوں لڑکیوں نے جرأت رندانہ سے کام لے کر اس کو عشق کی آگ میں کودنے کی ترغیب دی۔ اس کی ذاتی ڈاک میں بلامبالغہ ہزاروں عورتوں کے عشق و محبت سے لبریز خطوط آئے ہوں گے۔ مگر جہاں تک میں جانتا ہوں۔ خطوط کے اس انبار میں سے اس نے شاید ایک سو بھی خود نہیں پڑھے... خط آتے ہیں، اس کا مریل سکریٹری ڈی سوزا انہیں مزے لے لے کر پڑھتا ہے۔ اور دن بدن مریل ہوتا جاتا ہے۔

تقسیم سے چند ماہ پہلے اشوک فلم "چندر شیکھر" کے سلسلے میں کلکتے میں تھا۔ شاہد سہروردی (اس وقت وزیر اعظم بنگال) کے یہاں سے سولہ ملی میٹر فلم دیکھنے کے بعد اپنے ڈیرے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں دو خوبصورت اینگلو انڈین لڑکیوں نے اس کی موٹر روکی اور لفٹ چاہی۔ اشوک نے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

چند منٹ کی یہ عیاشی تو کرلی۔ مگر اسے اپنے نئے سگریٹ کیس سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ایک لڑکی جو شوخ و شنگ تھی۔ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ کیس بھی لے اڑی۔ اس واقعے کے بعد اشوک نے کئی بار سوچا کہ ان سے رسمی راہ پیدا کی جائے، بات معمولی تھی مگر اس کی ہمت نہ پڑی۔

کولھا پور میں گرز، تلوار اور ڈھال قسم کی بھاری بھرکم ہونق فلم بن رہی تھی اشوک کا تھوڑا سا کام اس میں باقی رہ گیا تھا۔ وہاں سے کئی بلاوے آئے مگر وہ نہ گیا۔ اس کی طبیعت اس رول سے بہت متنفر تھی۔ جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔ مگر کنٹریکٹ تھا۔ آخر ایک روز اسے جانا ہی پڑا۔ ساتھ مجھے لے گیا۔ ان دنوں میں فلمستان کے لئے ''آٹھ دن'' نامی فلم لکھ رہا تھا چونکہ یہ فلم اُسے پروڈیوس اور ڈائریکٹ کرنا تھی۔ اس لئے اس نے کہا۔ ''چلو یار.....وہاں آرام سے کام کریں گے۔

مگر آرام کہاں.....لوگوں کو فوراً معلوم ہوگیا کہ اشوک کمار کولھاپور آیا ہے چنانچہ اس ہوٹل کے اِردگرد جہاں ہم ٹھہرے تھے زائرین جمع ہونے شروع ہوگئے۔ ہوٹل کا مالک ہوشیار تھا، کسی نہ کسی بہانے وہ ان لوگوں کو منتشر کر دیتا لیکن پھر بھی بعض چیکو قسم کے لوگ ہوٹل کا طواف کرتے رہتے اور اپنے محبوب ایکٹر کی زیارت کر ہی لیتے۔ اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ اشوک جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ بہت ہی اکھڑ قسم کا سلوک کرتا رہا۔ مجھے معلوم نہیں ان کا ردِ عمل کیا تھا۔ مگر بحیثیت ایک ناظر کے مجھے سخت کوفت ہوتی تھی۔

ایک شام ہم دونوں سیر کو نکلے۔ اشوک ''کیموفلاز'' کئے تھا۔ آنکھوں پر چوڑا چکلا، گہرے رنگ کا چشمہ.....ایک ہاتھ میں چھڑی، دوسرے ہاتھ میں میرا کندھا تا کہ حسبِ ضرورت مجھے آگے پیچھے کر سکے۔ اسی طرح ایک اسٹور میں پہنچے، اشوک کو کولہاپور کے اسٹوڈیو کے گرد و غبار کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے کوئی دوا خریدنا تھا۔ جب اُس نے اسٹور والے سے یہ طلب کی تو اس نے سرسری نظر سے اپنے گاہک کی طرف دیکھا اور الماری کی طرف بڑھا لیکن فوراً ہی ''ڈی لیڈ ایکشن'' بم کی طرح پھٹا اور مڑ کر اشوک سے مخاطب ہوا۔

''آپ.....آپ کون ہیں؟''

اشوک نے جواب دیا۔ ''میں کون ہوں؟.....میں وہی ہوں جو کہ میں ہوں؟''

اسٹور والے نے غور سے اشوک کے چشمہ اوڑھے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''آپ اشوک کمار ہیں۔''

اشوک نے بڑے دل شکن لہجے میں کہا ''اشوک کمار کوئی اور ہوگا چلو منٹو۔''

یہ کہہ کر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دوا خریدے بغیر ہی ہم دونوں اسٹور

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سے باہر تھے۔ ہوٹل کا موڑ مڑنے لگے تو سامنے تین مرہٹی لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ بہت صاف ستھری۔ گوری چٹی۔ ماتھوں پر کم کم، بالوں میں ونیاں (پھولوں کے گجرے) پیروں میں ہلکے پھلکے چپل۔ ان میں سے ایک جن کے ہاتھوں میں موسمبیاں تھیں۔ اشوک کو دیکھ کر زور سے کانپی، بھنچی ہوئی آواز میں اس نے اپنی سہیلیوں سے کہا "اشوک!" اور اس کے ہاتھوں سے ساری موسمبیاں سڑک پر گر پڑیں۔ اشوک نے میرا کندھا چھوڑا اور بھاگ گیا۔

اشوک سے میری پہلی ملاقات فلمستان میں ہوئی۔ جب ایس مکرجی کی پوری ٹیم نے بمبئی ٹاکیز چھوڑ کر اپنا نیا فلمی ادارہ قائم کر لیا تھا۔ یوں تو میں نے کئی بار اس کی جھلکیاں دیکھی تھیں مگر اس سے مفصل ملاقات فلمستان ہی میں ہوئی جب میں وہاں ملازم ہو گیا۔

فلمی دنیا کی ہر شخصیت پردے پر کچھ اور پردے سے دور کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ اشوک کو چنانچہ جب میں نے پہلی مرتبہ قریب سے دیکھا تو پردے کے اشوک سے بہت مختلف تھا۔ گہرا سانولا رنگ، موٹے اور کھردرے ہاتھ مضبوط کسرتی جسم، نیم گنوار لب ولہجہ، اُکھڑا اُکھڑا غیر فطری تکلف۔ تعارف کرایا گیا تو میں نے اس سے کہا۔ "آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی ہے۔"
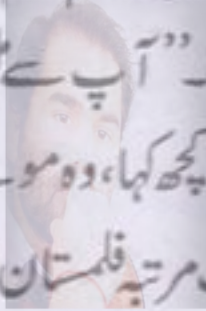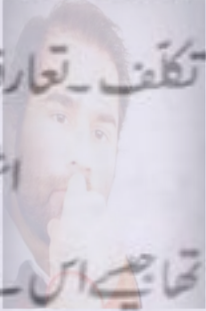
اشوک نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا، وہ موٹے موٹے الفاظ پر مشتمل تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے یہ لفظ رٹے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ فلمستان میں ایک صاحب سیر و تفریح کے لئے آئے۔ آپ نے بڑے پر تکلف انداز میں اشوک سے کہا "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خاکسار کو اس سے پہلے بھی جناب سے شرفِ ملاقات حاصل ہو چکا ہے۔"

اشوک نے گڈمڈ لہجے میں جواب دیا۔ "جی.... جی مجھے کبھی مقابلہ نہیں ہوا۔ مقابلے کا قاف اس نے حلق سے نکالا..... لیکن فوراً ہی اس کو احساس ہوا کہ اس نے یہ لفظ غلط استعمال کیا ہے مگر وہ گول کر گیا۔

اشوک کو اُردو بہت اچھی لگتی ہے۔ شروع شروع میں اس نے اس زبان میں لکھنا پڑھنا شروع کیا مگر قاعدے سے آگے نہ بڑھ سکا، پھر بھی اس کو تھوڑی سی شدبد ہے، ایک دو سطر اردو لکھ لیتا ہے۔ تقسیم کے بعد جب میں اُسے چھوڑ کر بمبئی ٹاکیز سے چلا آیا تو اس نے مجھے اردو میں ایک خط لکھا کہ واپس آ جاؤ۔ مگر افسوس ہے کہ میں چند در چند وجوہ کے باعث اس کا جواب نہ دے سکا۔

میری بیوی بھی دوسری عورتوں کی طرح اشوک کمار کی بہت مداح تھی۔ ایک دن میں اشوک کو اپنے گھر لے آیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے زور سے آواز دی۔ "صفیہ.... آؤ اشوک کمار آیا ہے۔"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

صفیہ اندر روٹی پکا رہی تھی۔ جب میں نے پے در پے آوازیں دیں تو وہ باہر نکلی۔ میں نے اشوک سے اس کا تعارف کرایا۔ ”یہ میری بیوی ہے دادا منی... ہاتھ ملاؤ اس سے۔“

صفیہ اور اشوک دونوں جھینپ گئے۔ میں نے اشوک کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”ہاتھ ملاؤ دادا منی.... شرماتے کیا ہو“۔

مجبوراً اسے ہاتھ ملانا پڑا۔ اتفاق سے اس روز قیمے کی روٹیاں تیار کی جا رہی تھیں۔ اشوک کھا کے آیا تھا مگر جب کھانے پر بیٹھا تو تین ہڑپ کر گیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ بمبئی میں اس کے بعد جب کبھی ہمارے یہاں قیمے کی روٹیاں تیار ہوتیں۔ اشوک کسی نہ کسی طرح آن موجود ہوتا، اس کی توجیہہ میں کر سکتا ہوں نہ اشوک۔ دانے دانے پر مہر والا ہی قصہ معلوم ہوتا ہے۔

میں نے ابھی ابھی اشوک کو دادا منی کہا ہے۔ بنگلہ میں اس کا مطلب ہے بڑا بھائی.... اشوک سے جب میرے مراسم بڑھ گئے تو اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں اسے دادا منی کہا کروں۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم بڑے کیسے ہوئے حساب کر لو۔ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔“

حساب کیا گیا تو وہ مجھ سے عمر میں دو ماہ اور کچھ دن بڑا نکلا چنانچہ اشوک اور مسٹر گانگولی کے بجائے مجھے دادا منی کہنا پڑا۔ یہ مجھے پسند بھی تھا کیونکہ اس میں بنگالیوں کی محبوب مٹھائی ”رس گلے کی مٹھاس اور گولائی تھی۔ وہ مجھے پہلے مسٹر منٹو کہتا تھا جب اس سے دادا منی کہنے کا معاہدہ ہوا تو وہ مجھے صرف منٹو کہنے لگا۔ حالانکہ مجھے یہ ناپسند تھا۔

پردے پر وہ مجھے چاکلیٹ ہیرو معلوم ہوتا تھا مگر جب میں نے اس کو سلولائڈ کے خول سے باہر دیکھا تو وہ ایک کسرتی آدمی تھا۔ اس کے مکے میں اتنی قوت تھی کہ دروازے کی لکڑی میں شگاف پڑ جاتا تھا۔ ہر روز گھر پر باکسنگ کی مشق کرتا تھا۔ شکار کھیلنے کا شوقین تھا۔ سخت سے سخت کام کر سکتا تھا افسوس مجھے صرف اس بات کا ہوا کہ اسے آرائش کا قطعاً ذوق نہیں تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اس کا گھر دلکش سے دلکش ساز و سامان سے آراستہ ہوتا مگر اس طرف وہ کبھی توجہ دیتا ہی نہیں تھا اور اگر دیتا تھا تو اس کے نتائج غیر صناعانہ ہوتے تھے۔ برش اٹھا کر خود ہی سارے فرنیچر پر گہرا نیلا پینٹ تھوپ دیتا یا کسی صوفے کی پشت توڑ کر اسے دیوان کی بھونڈی شکل میں تبدیل کر دیا۔ مکان سمندر کے ایک غلیظ کنارے پر ہے۔ نمکین پانی کے چھینٹے باہر کھڑکیوں کی سلاخوں کو چاٹ رہے ہیں۔ جگہ جگہ لوہے کے کام پر زنگ کی پپڑیاں جمع ہیں، ان سے بڑی اداسی پھیلانے والی بو آ رہی ہے مگر اشوک اس سے قطعاً غافل ہے۔ ریفریجریٹر باہر کوری ڈور میں پڑا جھک مار رہا ہے، اس کے ساتھ لگ کر اس کا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

گرانڈیل السے شین کتا سو رہا ہے۔ پاس کمرے میں بچے اودھم مچا رہے ہیں اور اشوک غسل خانے کے اندر پاٹ پر بیٹھا دیواروں پر حساب لگا کر دیکھ رہا ہے کہ ریس میں کون سا گھوڑا وِن آئے گا یا مکالموں کا پرچہ ہاتھ میں لئے ان کی ادائیگی سوچ رہا ہے۔ اشوک کو فراست الید یعنی پامسٹری اور علمِ نجوم سے خاص شغف ہے۔ موخر الذکر علم اس نے اپنے باپ سے سیکھا ہے۔ متعدد کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ فرصت کے اوقات میں وہ شغل کے طور پر اپنے دوستوں کی جنم پتریاں دیکھا کرتا ہے۔

میرے ستاروں کا مطالعہ کر کے اس نے ایک دن مجھ سے سرسری طور پر پوچھا ''تم شادی شدہ ہو؟''

میں نے اس سے کہا ''تمہیں معلوم نہیں؟''

اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''جانتا ہوں.... لیکن دیکھو منٹو ایک بات بتاؤ ....نہیں....تمہارے تو ابھی اولاد نہیں ہوئی۔''
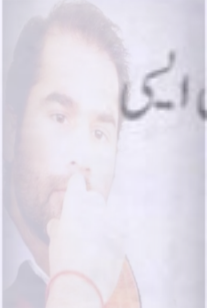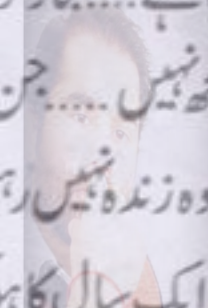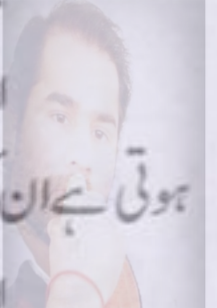
میں نے اس سے پوچھا۔ ''بات کیا ہے....بتاؤ تو سہی۔''

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں.... جن لوگوں کے ستاروں کی پوزیشن ایسی ہوتی ہے ان کی پہلی اولاد لڑکا ہوتی ہے...... مگر وہ زندہ نہیں رہتی۔''

اشوک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا لڑکا ایک سال کا ہو کر مر گیا تھا۔

اشوک نے مجھے بعد میں بتایا کہ اس کا پہلا بچہ جو کہ لڑکا تھا مردہ پیدا ہوا تھا۔

اس نے مجھ سے کہا۔ تمہارے اور میرے ستاروں کی پوزیشن قریب قریب ایک جیسی ہے اور یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ جن لوگوں کے ستاروں کی پوزیشن ایسی ہو، ان کے ہاں پہلی اولاد لڑکا نہ ہو اور وہ نہ مَرے۔

اشوک کو علم نجوم کی صحت پر پورا پورا یقین ہے بشرطیکہ حساب درست ہو۔ وہ کہا کرتا ہے ''جس طرح ایک پائی کی کمی بیشی حساب میں بہت بڑی گڑ بڑ پیدا کر دیتی ہے، اس طرح ستاروں کے حساب میں معمولی سی غلطی ہمیں کہیں کی کہیں لے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وثوق کے ساتھ کوئی نتیجہ قائم نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے ہم سے سہو ہو گیا ہو۔''

ریس کے گھوڑوں کے ٹپ حاصل کرنے میں بھی عام طور پر اشوک اسی علم سے مدد لیتا ہے۔ گھنٹوں باتھ روم میں بیٹھا حساب لگاتا رہتا ہے مگر پوری ریس میں سو روپے سے زیادہ اس نے کبھی نہیں کھیلا اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ ہمیشہ جیتا ہے۔ سو کے ایک سو دس ہو گئے، سو کے سو ہی رہے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس کے سو میں سے ایک پائی کم ہوئی ہو.... وہ ریس جیتنے کے لئے نہیں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

محض تفریح کے لئے کھیلتا ہے۔ اس کی حسین و جمیل بیوی شوبھا تین بچوں کی ماں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ ممبرز انکلوژر میں داخل ہوتے ہی وہ ایک کونے میں الگ تھلگ بیٹھ جاتا ہے۔ ریس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے اپنی بیوی کو روپے دیتا ہے کہ فلاں فلاں نمبر کے ٹکٹ لے آؤ۔ جب ریس ختم ہوتی ہے تو اس کی بیوی ہی کھڑکی پر جا کر جیتنے والے ٹکٹوں کے روپے وصول کرتی ہے۔

شوبھا گھریلو عورت ہے۔ تعلیم واجبی ہے۔ اشوک کہا کرتا ہے کہ ان پڑھ ہے مگر صرف ازراہِ مذاق۔ اس کی ازدواجی زندگی بہت کامیاب ہے۔ شوبھا اتنی دولت ہونے کے باوجود گھر کے کام کاج میں مشغول رہتی ہے۔ ٹھیٹ بنگالیوں کی طرح سُوتی دھوتی پہنے اور اس کے پلّو کے ایک کونے میں چابیوں کا یہ بڑا گچھا اُڑسے وہ مجھے ہمیشہ اپنے گھر میں مصروف کار نظر آئی۔ شام کو جب کبھی وسکی کا ایک دور چلتا تو گزک کی چیزیں شوبھا اپنے ہاتھ سے تیار کرتی تھی۔ کبھی نمکین پارے، کبھی بھنی ہوئی دال۔ کبھی آلوؤں کے قتلے۔

میں ذرا زیادہ پینے کا عادی تھا۔ اس لئے شوبھا اشوک سے کہتی تھی۔ ''دیکھو گانگولی! مسٹر منٹو کو زیادتی مت دینا۔ مسز منٹو ہم کو بولیں گی۔''

مسز منٹو اور مسز گانگولی دونوں سہیلیاں تھیں۔ ان سے ہم دونوں بہت کام نکالتے تھے۔ جنگ کے باعث بڑے اچھے سگریٹ قریب قریب ناپید تھے جتنے بھی باہر سے آتے تھے سب کے سب بلیک مارکیٹ میں چلے جاتے تھے۔ یوں تو ہم عام طور پر اس بلیک مارکٹ ہی سے اپنے لئے سگریٹ حاصل کرتے تھے۔ مگر جب کسی وسیلے سے صحیح قیمت پر کوئی چیز مل جاتی تو ہم عجیب و غریب مسرّت محسوس کرتے۔

مسز گانگولی جب شوپنگ کرنے نکلتی تو میری بیوی صفیہ کو کبھی کبھی اپنے ساتھ لے جاتی۔ قریب قریب ہر بڑے دُکاندار کو معلوم تھا کہ مسز گانگولی مشہور ایکٹر اشوک کمار کی بیوی ہے۔ چنانچہ اس کے طلب کرنے پر بلیک مارکیٹ کی تاریک تہوں میں چھپائی ہوئی چیزیں باہر نکل آتی تھیں یوں بھی بمبئی کے مرد عورتوں کے معاملے میں کافی نرم دل واقع ہوئے ہیں۔

بینک سے روپیہ نکلوانا ہو۔ کوئی رجسٹری کرانا ہے۔ سنیما یا ریل گاڑی کے ٹکٹ لینا ہو۔ مرد بڑا ڈیڑھ گھنٹہ سوکھتا رہے گا لیکن اس کے مقابلے میں عورت کو ایک منٹ بھی انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔

اشوک نے اپنی شہرت اور ہر دلعزیزی سے شاید ہی فائدہ اٹھایا مگر دوسرے بعض اوقات اس کے علم کے بغیر اس کے ذریعے سے اپنا اُلّو سیدھا کر لیتے تھے۔ راجہ مہدی علی خاں نے ایک دفعہ بڑے ہی دلچسپ طریقے سے اپنا اُلّو سیدھا کیا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

راجہ فلمستان میں ملازم تھا۔ میں فلمستان چھوڑ کر ولی صاحب کے لئے ایک کہانی لکھ رہا تھا۔ ایک روز مجھے ٹیلیفون پر اشوک کے سکریٹری نے بتایا کہ راجہ مہدی علی خاں بیمار ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ جناب کی بہت بُری حالت ہے۔ گلا اس قدر خراب ہے کہ آواز ہی نہیں نکلتی۔ نقاہت کا یہ عالم ہے کہ سہارا لے کر بھی اٹھا نہیں جاتا۔ اور آپ نمکین پانی کے غراروں اور ٹنکل بام کی مالش سے اپنا مرض دُور کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

مجھے شبہ سا ہوا۔ کہیں ڈپتھیریا نہ ہو۔ چنانچہ میں نے انہیں فوراً موٹر میں لادا اور اشوک کو ٹیلیفون کیا۔ اس نے مجھے اپنے ایک واقف ڈاکٹر کا نام بتایا کہ وہاں لے جاؤ۔ میں راجہ صاحب کو وہاں لے گیا۔ تشخیص کے بعد معلوم ہوا کہ واقعی وہی موذی مرض ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے مطابق میں نے فوراً ہی متعدی امراض کے ہسپتال میں ان کو داخل کرا دیا۔ ٹیکے وغیرہ دیے گئے دوسرے روز صبح میں نے اشوک کو ٹیلی فون پر راجہ کے مرض کی نوعیت بتائی۔ جب اس نے کوئی تشویش ظاہر نہ کی۔ تو مجھے غصہ آ گیا کہ تم کیسے انسان ہو۔ ایک آدمی ایسے خوفناک مرض میں مبتلا ہے۔ بیچارے کا یہاں کوئی پرسان حال بھی نہیں اور تم کوئی دلچسپی ہی نہیں لے رہے۔

اشوک نے جواباً صرف اس قدر کہا۔ ''آج شام کو چلیں گے اس کے پاس۔'' ٹیلیفون بند کر کے میں ہسپتال پہنچا اور دیکھا کہ راجہ کی حالت پہلے کی نسبت کسی قدر بہتر ہے، ڈاکٹر نے جو ٹیکے کہے تھے وہ میں لے آیا تھا۔ یہ اس کے حوالے کر کے اور دم دلاسا دے کر میں اپنے کام پر چلا گیا۔

شام کو اشوک نے مجھے ولی کے دفتر میں پکڑ لیا۔ میں ناراض تھا مگر اُس نے مجھے منا لیا۔ موٹر میں ہسپتال پہنچے۔ اشوک نے راجہ سے معذرت طلب کی کہ وہ بے حد مصروف تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد اشوک مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔

دوسرے روز ہسپتال پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں۔ راجہ، راجہ بنا بیٹھا ہے۔ بستر کی چادر اجلی، تکیے کا غلاف اُجلا۔ سگریٹ کی ڈبیا، پان، سرہانے کی ونڈو سل پر پھول دان، ٹانگ پر ٹانگ رکھے، ہسپتال کا صاف ستھرا جوڑا پہنے بڑے عیاشانہ طور پر اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں نے حیرت بھرے لہجہ میں اُس سے پوچھا ''کیوں راجہ'' یہ سب کیا۔''

راجہ مسکرایا۔ اس کی یہ بڑی بڑی مونچھیں تھرا آئیں۔ ''یہ تو کچھ بھی نہیں.... ابھی اور دیکھنا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا؟''

''عیاشی کے سامان.... کچھ روز اور میں یہاں رہا تو تم دیکھو گے کہ پاس والے کمرہ میں میری حرم سرائے ہو گی۔ خدا جیتا رکھے میرے اشوک کمار کو... بتاؤ وہ کیوں نہیں آیا۔''

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

تھوڑی دیر کے بعد راجہ نے بتایا کہ وہ سب کچھ اشوک کا نور ظہور ہے.... ہسپتال والوں کو پتہ چل گیا کہ اشوک اس کی بیمار پُرسی کے لئے آیا تھا۔ چنانچہ ہر چھوٹا بڑا راجہ کے پاس آیا ہر ایک نے اس سے ایک ہی قسم کے متعدد سوال کئے۔

"کیا اشوک واقعی اس کی بیمار پُرسی کے لئے آیا تھا؟"

"اشوک سے اس کے کیا تعلقات ہیں؟"

"کیا" "وہ پھر آئے گا؟"

کب اور کس وقت آئے گا؟"

راجہ نے ان کو بتایا کہ اشوک اس کا بہت ہی گہرا دوست ہے اس کے لئے اپنی جان تک دینے کو تیار ہے۔ وہ ہسپتال میں اس کے ساتھ ہی رہنے کو تیار تھا۔ مگر ڈاکٹر نہ مانے۔ صبح شام آتا مگر کنٹریکٹ کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہے، آج شام کو ضرور آئے گا..... اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیراتی ہسپتال کے خیراتی کمرے میں اس کو ہر قسم کی سہولت میسر تھی۔

وقت ختم ہونے پر میں جانے ہی والا تھا کہ میڈیکل اسٹوڈنٹ لڑکیوں کا ایک گروہ کمرے میں داخل ہوا...... راجہ مسکرایا۔

"خواجہ...... حرم سرائے کے لئے یہ ساتھ والا کمرہ میرا خیال ہے چھوٹا رہے گا۔"

اشوک بہت اچھا ایکٹر ہے مگر وہ صرف اپنی جان پہچان کے بے تکلّف لوگوں کے ساتھ مل کر ہی پوری دل جمعی سے کام کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان فلموں میں اس کا کام اطمینان بخش نہیں ہے جو اس کی ٹیم نے نہیں بنائے، اپنے لوگوں میں ہو تو وہ کھل کر کام کر سکتا ہے ٹیکنیشینوں کو مشورے دیتا ہے۔ ان کے مشورے قبول کرتا ہے، اپنی ایکٹینگ کے متعلق لوگوں سے استفسار کرتا ہے۔ ایک سین کو مختلف شکلوں میں ادا کر کے خود پرکھتا ہے اور دوسروں کی رائے لیتا ہے۔ اس فضا سے اگر کوئی اسے باہر لے جاتا ہے تو وہ بہت الجھن محسوس کرتا ہے۔

تعلیم یافتہ ہونے اور بمبئی ٹاکیز جیسے باذوق فلمی ادارے کے ساتھ کئی برسوں تک منسلک رہنے کی وجہ سے اشوک کو فلمی صنعت کے قریب قریب ہر شعبے سے واقفیت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ کیمرے کی باریکیاں جانتا ہے، لیبارٹری کے تمام پیچیدہ مسائل سمجھتا ہے۔ ایڈیٹنگ کا عملی تجربہ رکھتا ہے اور ڈائریکشن کی گہرائیوں کا بھی مطالعہ کر چکا تھا۔ چنانچہ فلمستان میں جب اس سے رائے بہادر چونی لال نے ایک فلم پروڈیوس کرنے کے لئے کہا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔

ان دنوں فلمستان کا پروپیگنڈا اسم "شکاری" مکمل ہو چکا تھا، اس لئے میں کئی مہینوں کی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

لگا تار محنت کے بعد گھر میں چھٹیوں کے مزے اڑا رہا تھا۔ ایک دن ساوک واچا آئے۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگے۔ سعادت.......... ایک کہانی لکھ دو گانگولی کے لئے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ ساوک کا کیا مطلب ہے، میں فلمستان کا ملازم تھا اور میرا کام ہی کہانیاں لکھنا تھا۔ گانگولی کے لئے کہانی لکھوانے کے لئے ساوک کی سفارش کی کیا ضرورت تھی، مجھ سے وہاں فلمستان کا کوئی ذمہ دار کہتا میں کہانی لکھنا شروع کر دیتا۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اشوک چونکہ فلم خود پروڈیوس کرنا چاہتا ہے اس لئے اس کی خواہش ہے کہ میں اس کی خواہش کے مطابق کوئی نہایت ہی اچھوتی کہانی لکھوں۔ وہ خود میرے پاس اس لئے آیا کہ وہ دوسروں سے کئی کہانیاں سُن چکا تھا۔

بہر حال ساوک کے ساتھ وقت مقرر رہوا اور ہم سب ساوک ہی کے صاف ستھرے فلیٹ میں جمع ہوئے۔ اشوک کو کیسی کہانی چاہیے تھی یہ خود اس کو معلوم نہیں تھا۔ ''بس منٹو ایسی کہانی ہو کہ مزا آجائے...... اتنا خیال رکھو کہ یہ میرا پہلا فلم ہوگا۔''

ہم سب نے مل کر گھنٹوں مغز پاشی کی، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا، ان دنوں آغا خاں کی ڈائمنڈ جوبلی ہونے والی تھی۔ جس کے لئے ساوک کے فلیٹ کی پرلی طرف برے بورن اسٹیڈیم میں ایک بہت بڑا پنڈال تعمیر کیا جا رہا ہے۔ میں نے اس سے انسپی ریشن حاصل کرنے کی کوشش کی...... ساوک کے سیٹنگ روم میں صنم تراشی کا ایک نہایت ہی عمدہ نمونہ تھا، اس کو بھی دماغ میں گھمایا پھرایا اپنے پرانے کارناموں پر نظر ڈالی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

دن بھر کی سعی ناکام کی کوفت دور کرنے کے لئے شام کو باہر ٹیرس پر برانڈی کا دور شروع ہوا۔ شراب کے انتخاب میں ساوک واچا بہت ہی عمدہ ذوق کا مالک ہے۔ برانڈی چنانچہ ذائقہ اور قوام کی بہت ہی اچھی تھی۔ حلق سے اترتے ہی لطف آ گیا۔ سامنے چرچ گیٹ اسٹیشن تھا۔ نیچے بازار میں خوب چہل پہل تھی۔ ادھر بازار کے اختتام پر سمندر اوندھے منہ لیٹا ستار رہا تھا بڑی ہی قیمتی کاریں سڑک کی چمکیلی سطح پر تیر رہی تھیں...... تھوڑی دیر کے بعد ایک ناپتا ہوا سڑکیں کوٹنے والا انجن نمودار ہوا...... میں نے ایسے ہی سوچا...... خدا معلوم کہاں سے یہ خیال میرے دماغ میں آن ٹپکا کہ اگر اس ٹیرس سے کوئی خوبصورت لڑکی ایک رقعہ گرائے اس نیت سے کہ وہ جس کے ہاتھ لگے گا وہ اس سے شادی کرے گی تو کیا ہو؟...... ہو سکتا ہے کہ رقعہ کسی پیکارڈ موٹر میں جا گرے...... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اڑتا اڑتا سڑکیں کوٹنے والے انجن کے ڈرائیور کے پاس جا پہنچے...... ہو سکنے کا یہ سلسلہ کتنا دراز تھا اور کتنا دلچسپ!

میں نے اس کا ذکر اشوک اور ساوک سے کیا ان کو مزہ آ گیا اور مزہ لینے کی خاطر ہم نے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

برانڈی کا ایک اور دور چلایا اور بے لگام خیال آرائیاں شروع کر دیں۔ جب محفل برخواست ہوئی تو طے پایا کہ کہانی کی بنیادیں اسی خیال پر استوار کی جائیں۔"

کہانی تیار ہو گئی مگر اس کی شکل کچھ اور ہی تھی۔ حسینہ کا لکھا ہوا رقعہ رہا، نہ سڑکیں کوٹنے والا انجن۔ پہلے پہلے خیال تھا کہ ٹریجڈی ہونی چاہئے مگر اشوک چاہتا تھا کہ کامیڈی ہو اور وہ بھی بہت ہی تیز رفتار، چنانچہ دماغ کی ساری قوتیں اسی طرف صرف ہونے لگیں۔ کہانی مکمل ہو گئی تو اشوک کو پسند آئی۔ شوٹنگ شروع ہو گئی۔ اب فلم کا ایک ایک فریم اشوک کی ہدایات کے ماتحت تیار ہونے لگا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ "آٹھ دن" تمام و کمال اشوک کی ڈائریکشن کا نتیجہ تھی کہ پردے پر ڈائریکٹر کا نام ڈی۔ این۔ پائی تھا جس نے اس فلم کا ایک انچ بھی ڈائریکٹ نہیں کیا تھا۔ بمبئی ٹاکیز میں فلم ڈائرکٹر کو بہت کم اہمیت دی جاتی تھی۔ سب مل کر کام کرتے تھے۔ جب فلم نمائش کے لئے پیش ہوتا تھا تو ایک کارکن کا نام بطور ڈائریکٹر کے پیش کر دیا جاتا تھا۔ یہ طریقۂ کار فلمستان میں بھی رائج تھا۔ ڈی این پائی ایڈیٹر تھا اور اپنے کام میں بہت ہوشیار چنانچہ متفقہ طور پر یہی فیصلہ ہوا تھا کہ بحیثیت ڈائریکٹر کے اس کا نام فلم کے کریڈٹ ٹائٹلز میں پیش کیا جائے۔

اشوک جتنا اچھا اداکار ہے اتنا ہی اچھا ہدایت کار بھی ہے اس کا علم مجھے "آٹھ دن" کی شوٹنگ کے دوران میں ہوا۔ معمولی سے معمولی منظر پر بھی وہ بہت محنت کرتا تھا۔ شوٹنگ سے ایک روز پہلے وہ مجھ سے نظر ثانی کیا ہوا سین لیتا اور غسل خانے میں بیٹھ کر گھنٹوں اس کی نوک پلک پر غور کرتا رہتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ باتھ روم کے علاوہ اور کسی جگہ وہ پوری توجہ سے فکر طلب امور پر غور نہیں کر سکتا۔

اس فلم میں چار نئے آدمی بطور ایکٹر پیش ہوئے۔ راجہ مہدی علی خاں، اوپندر ناتھ اشک، محسن عبداللہ (پراسرار نینا کے سابق شوہر) اور راقم الحروف...... طے یہ ہوا کہ ایس مکر جی کو ایک رول دیا جائے گا۔ مگر وقت آنے پر وہ اپنی بات سے پھر گئے۔ اس لئے کہ ان کے فلم "چل چل رے نوجوان" میں کیمرے کی دہشت کے باعث میں نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مکر جی کو بہانہ ہاتھ آیا۔ اصل میں وہ خود کیمرے سے خوفزدہ تھے۔

ان کا رول ایک "شل شوکڈ" فوجی کا تھا اس لئے لباس وغیرہ سب تیار تھے۔ جب مکر جی نے انکار کیا تو اشوک بہت سٹپٹایا کہ ان کی جگہ اور کسے منتخب کرے۔ کئی دن شوٹنگ بند رہی۔ رائے بہادر چونی لال جب لال پیلے ہونے لگے تو اشوک میرے پاس آیا۔ میں چند مناظر کو دوبارہ لکھ رہا تھا، اس نے میز پر سے میرے کاغذ اٹھا کر ایک طرف رکھے اور کہا "چلو منٹو" میں اس

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کے ساتھ چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے نئے گیت کی دھن سنوانے لے جارہا ہے مگر وہ مجھے سیٹ پر لے گیا اور کہنے لگا "پاگل کا پارٹ تم کرو گے۔"

مجھے معلوم تھا کہ مکرجی انکار کر چکا ہے اور اشوک کو اس خاص رول کے لئے کوئی آدمی نہیں مل رہا۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کہے گا کہ میں یہ رول ادا کروں، چنانچہ میں نے اس سے کہا "پاگل ہوئے ہو؟" اشوک سنجیدہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ نہیں منٹو تمہیں یہ رول لینا ہی پڑے گا۔ راجہ مہدی علی خاں اور اوپندر ناتھ اشک نے بھی اصرار کیا۔ راجہ نے کہا۔ "تم نے مجھ کو اشوک کا بہنوئی بنا دیا حالانکہ میں شریف آدمی ہرگز اس کے لئے تیار نہ تھا کیونکہ میں اشوک کی عزت کرتا ہوں۔ تم پاگل بن جاؤ گے تو کون سی آفت آ جائے گی۔"

اس پر مذاق شروع ہو گیا اور مذاق مذاق میں سعادت حسن منٹو، پاگل فلائٹ لفٹنٹ کرپارام بن گیا...... کیمرے کے سامنے میری جو حالت ہوئی اس کو اللہ بہتر جانتا ہے۔

فلم تیار ہو کر نمائش کے لئے پیش ہوئی تو کامیاب ثابت ہوئی۔ ناقدین نے اسے بہترین کامیڈین قرار دیا۔ میں اور اشوک خاص طور پر بہت ہی مسرور تھے۔ اور ہمارا ارادہ تھا کہ اب کی کوئی بالکل نئے ٹائپ کی فلم بنائیں گے مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔

ساوک واچا "آٹھ دن" کی شوٹنگ کے آغاز ہی میں اپنی والدہ کے علاج کے سلسلہ میں لندن چلا گیا تھا۔ وہ جب واپس آیا تو فلمی صنعت میں ایک انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ کئی اداروں کے دیوالے پٹ گئے تھے۔ بمبئی ٹاکیز کی نہایت ابتر حالت تھی، ہمانسو رائے آنجہانی کے بعد دیویکا رانی چند برسوں کی عدت کے بعد روس کے ایک جلاوطن نواب کے آرٹسٹ لڑکے رورک سے رشتۂ ازدواج قائم کر کے فلمی دنیا تیاگ چکی تھی۔ دیویکا رانی کے بعد بمبئی ٹاکیز پر کئی بیرونی حملہ آوروں نے قبضہ کیا مگر اس کی حالت نہ سدھار سکے۔ آخر ساوک واچا لندن سے واپس آئے اور جرأت رندانہ سے کام لے کر بمبئی ٹاکیز کی عنانِ حکومت اشوک کی مدد سے اپنے ہاتھ میں لے لی۔

اشوک کو فلمستان چھوڑنا پڑا۔ اس دوران میں لاہور سے مسٹر موتی بی گڈوانی نے تار کے ذریعے سے ایک ہزار روپیہ ماہوار کی آفر دی۔ میں چلا گیا ہوتا مگر مجھے ساوک کا انتظار تھا جب اشوک اور وہ دونوں بمبئی ٹاکیز میں اکٹھے ہوئے تو میں ان کے ساتھ تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے لئے انگریز رفتہ کابیوں پر نقشے بنا رہا تھا۔ جس میں جنگی ڈال یہ بی جما لوالگ کھڑی ہو کر تماشا دیکھنے کے لئے جگہ بنا رہی تھی۔

میں نے جب بمبئی ٹاکیز میں قدم رکھا تو ہندو مسلم فسادات شروع تھے جس طرح

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کرکٹ کے میچوں میں وکٹیں اڑتی ہیں، باؤنڈریاں لگتی ہیں اس طرح ان فسادوں میں لوگوں کے سر اڑتے تھے اور بڑی بڑی آگیں لگتی تھیں۔

ساوک واچا نے بمبئی ٹاکیز کی ابتر حالت کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد جب انتظام سنبھالا تو اسے بہت سی مشکلیں درپیش آئیں۔ غیر ضروری عنصر کو جو مذہب کے لحاظ سے ہندو تھا، نکال باہر کیا۔ تو کافی گڑبڑ ہوئی مگر جب اس کی جگہ پر کی گئی تو مجھے محسوس ہوا کہ کلیدی آسامیاں سب مسلمانوں کے پاس ہیں۔ میں تھا۔ شاہد لطیف تھا، عصمت چغتائی تھی، کمال امروہی تھا، حسرت لکھنوی تھا، نذیر اجمیری، ناظم پانی پتی اور میوزک ڈائریکٹر غلام حیدر تھا۔ یہ سب جمع ہوئے تو ہندو کارکنوں میں ساوک واچا اور اشوک کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ میں نے اشوک سے اس کا ذکر کیا تو ہنسنے لگا۔ ’’میں واچا سے کہہ دوں گا کہ وہ ایک ڈانٹ پلا دے۔‘‘

ڈانٹ بتائی گئی تو اس کا اثر الٹا ہوا۔ واچا کو گمنام خط موصول ہونے لگے کہ اگر اس نے اپنے اسٹوڈیو سے مسلمانوں کو باہر نہ نکالا تو اس کو آگ لگا دی جائے گی۔ یہ خط واچا پڑھتا تو آگ بگولا ہو جاتا۔ ’’سالے مجھ سے کہتے ہیں کہ میں غلطی پر ہوں...... میں غلطی پر ہوں...... میں غلطی پر ہوں تو ان کے باوا کا کیا جاتا ہے...... آگ لگائیں تو میں ان سب کو اس پر جھونک دوں گا۔‘‘

اشوک کا دل و دماغ فرقہ وارانہ تعصب سے بالکل پاک ہے۔ وہ کبھی ان خطوط پر سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ جن پر آگ لگانے کی دھمکیاں دینے والے سوچتے تھے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کہتا۔ ’’منٹو یہ سب دیوانگی ہے...... آہستہ آہستہ دور ہو جائے گی۔‘‘

مگر آہستہ آہستہ دور ہونے کے بجائے یہ دیوانگی بڑھتی ہی چلی جارہی تھی...... اور میں خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا، اس لئے کہ اشوک اور واچا میرے دوست تھے۔ وہ مجھ سے مشورے لیتے تھے اس لئے کہ ان کو میرے خلوص پر بھروسہ تھا۔ لیکن میرا یہ خلوص میرے اندر سکڑ رہا تھا...... میں سوچتا تھا اگر بمبئی ٹاکیز کو کچھ ہو گیا تو میں اشوک اور واچا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

فسادات زوروں پر تھے۔ ایک دن میں اور اشوک بمبئی ٹاکیز سے واپس آرہے تھے۔ راستے میں اس کے گھر دیر تک بیٹھے رہے۔ شام کو اس نے کہا۔ چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں...... شورٹ کٹ کی خاطر وہ موٹر کو ایک خالص اسلامی محلے میں لے گیا...... سامنے سے ایک برات آرہی تھی جب میں نے بینڈ کی آواز سنی تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک دم اشوک کا ہاتھ پکڑ کر میں چلایا۔ ’’دادا منی۔ یہ تم کدھر آ نکلے۔‘‘

اشوک میرا مطلب سمجھ گیا۔ مسکرا کر، اس نے کہا۔ ’’کوئی فکر نہ کرو۔‘‘

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں کیونکر فکر نہ کرتا۔ موٹر ایسے اسلامی محلّے میں تھی جہاں کسی ہندو کا گزر ہی نہیں ہو سکتا تھا اور اشوک کو کون نہیں پہچانتا تھا۔ کون نہیں جانتا تھا کہ وہ ہندو ہے...... ایک بہت بڑا ہندو جس کا قتل معرکہ خیز ہوتا...... مجھے عربی زبان میں کوئی دعاء یاد نہیں تھی۔ قرآن کی کوئی موزوں و مناسب آیت بھی نہیں آتی تھی۔ دل ہی دل میں، میں اپنے اوپر لعنتیں بھیج رہا تھا اور دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی زبان میں بے جوڑ سی دعاء مانگ رہا تھا کہ اے خدا مجھے سرخ رو رکھیو...... ایسا نہ ہو کوئی مسلمان اشوک کو مار دے۔ اور میں ساری عمر اس کا خون اپنی گردن پر محسوس کرتا رہوں۔ یہ گردن قوم کی نہیں میری اپنی گردن تھی مگر یہ ایسی ذلیل حرکت کیلئے دوسری قوم کے سامنے ندامت کی وجہ سے جھکنا نہیں چاہتی۔

جب موٹر برات کے جلوس کے پاس پہنچی تو لوگوں نے چلّانا شروع کر دیا...... اشوک کمار...... اشوک کمار،'' میں بالکل یخ ہو گیا۔ اشوک اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے خاموش تھا۔ میں خوف و ہراس کی یخ بستگی سے نکل کر ہجوم سے یہ کہنے والا تھا کہ دیکھو ہوش کرو۔ میں مسلمان ہوں۔ یہ مجھے میرے گھر چھوڑنے جا رہا ہے...... کہ دونوں نوجوانوں نے آگے بڑھ کر بڑے آرام سے کہا۔ ''اشوک بھائی آگے راستہ نہیں ملے گا ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ۔''

اشوک بھائی؟ اشوک ان کا بھائی تھا۔ اور میں کون تھا؟...... میں نے دفعتاً اپنے لباس کی طرف دیکھا جو کھادی کا تھا...... معلوم نہیں انھوں نے مجھے کیا سمجھا ہوگا۔ مگر ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اشوک کی موجودگی میں مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔

موٹر جب اس اسلامی محلّے سے نکلی تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا تو اشوک ہنسا۔ تم خواہ مخواہ گھبرا گئے...... آرٹسٹوں کو یہ لوگ کچھ نہیں کہا کرتے۔''

چند روز بعد بمبئی ٹاکیز میں نذیر اجمیری کی کہانی (جو ''مجبور'' کے نام سے فلم بند ہوئی) پر میں نے جب کڑی نکتہ چینی کی اور اس میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہیں تو نذیر اجمیری نے اشوک اور واچا سے کہا ''منٹو کو آپ ایسے مباحثوں کے دوران میں نہ بٹھایا کریں، وہ چونکہ خود افسانہ نویس ہے اس لئے متعصب ہے۔''

میں نے بہت غور کیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا...... منٹو بھائی...... آگے راستہ نہیں ملے گا...... موٹر روک لو...... ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ۔''

اور میں چپ چاپ باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا جہاں میرے افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' پر مقدمہ چلایا گیا۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# انور کمال پاشا
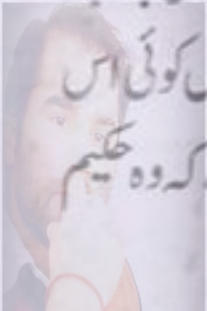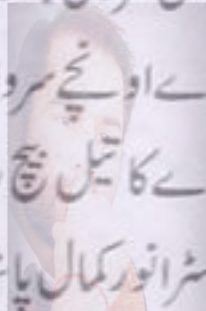
اگر کسی اسٹوڈیو میں آپ کو کسی مرد کی بلند آواز سنائی دے۔ اگر آپ سے کوئی بار بار ہونٹوں پر اپنی زبان پھیرتے ہوئے بڑے اونچے سروں میں بات کرے، یا کسی محفل میں کوئی اس انداز سے بول رہے ہیں جیسے وہ سانڈے کا تیل بیچ رہے ہوں تو آپ سمجھ جائیں گے کہ وہ حکیم احمد شجاع صاحب کے فرزندِ نیک اختر مسٹر انور کمال پاشا ہیں۔

انور کمال پاشا کا نام جب میں نے پہلی مرتبہ کسی اخبار میں دیکھا تو میرا دماغ اس انور پاشا کی طرف چلا گیا جو "ترکیہ" کا ہیرو تھا۔ بچپن میں ہم یہ پنجابی گانا گایا کرتے تھے۔

مصطفیٰ پاشا کمال دے تیریاں دُور بلایاں
کر بکرے یونانی حلال دے بیبا دانگ قصائیاں

نال تیرے ہووے انور دی گھوڑی آگے یاد نہیں رہا کیا تھا۔

مصطفےٰ پاشا کمال اور انور پاشا دونوں نے مل کر ہزاروں یونانی بکرے حلال کئے لیکن بعد میں ان دونوں میں چپقلش شروع ہوگئی اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے۔

میرا خیال ہے انور کمال پاشا نے ان دونوں شخصیتوں کو ذہنی طور پر متحد کرنے کے لئے یہ نام اختیار کیا۔ ہوسکتا ہے، کوئی اور مصلحت پیش نظر رہی ہو۔

لیکن اگر آپ انور کمال پاشا صاحب کو دیکھیں، تو ان میں نہ تو مصطفےٰ کمال پاشا سا بھیڑیا پن (مورخ کمال اتاترک کو "گرے ولف" کہتے تھے) اور نہ انور پاشا کا سا تیکھا حسن ....وہ، میرا مطلب ہے انور کمال پاشا، یا تو بھیڑیے بننے کی کوشش میں بھیڑ بن کر رہ گئے ہیں۔ یا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

حسین بننے کی کوشش میں تھک ہار کر اپنے ہی خدوخال پر قناعت کر گئے ہیں۔

بہر حال کچھ بھی ہو۔ قیاس آرائیوں سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ انور کمال پاشا کی شخصیت منفرد ہے۔ وہ انور پاشا کی آنکھوں کا بھیڑیا پن نہیں تو ان میں ایک ہلکی سی چمک ضرور ہے۔ جو ظاہر کرتی ہے کہ وہ دوسروں پر چھا جانے کی قوت رکھتے ہیں۔

جسمانی قوت تو خیر ان میں اسی قدر ہوگی، جتنی میرے جسم ناتواں میں ہے مگر وہ میری طرح دھونس جما کر اس کمی کو پورا کر ہی لیتے ہیں۔

فلمی دُنیا میں دراصل بلند بانگ دعوے ہی با اثر ثابت ہوتے ہیں۔ ایک محاورہ ہے ''پدرم سلطان بود'' لیکن اس کے برعکس انور کمال پاشا ہمیشہ یہ کہتے سُنے گئے ہیں، کہ میرا باپ سلطان نہیں گذریا تھا۔ سلطان تو میں ہوں۔

نفسیاتی اعتبار سے یہ نفی اکثر اوقات کارگر اور با اثر ثابت ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انور کمال پاشا نفسیات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔

اسی لئے وہ اس گز کو بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ کہیں کہیں ٹھوکر بھی کھائی ہے۔ لیکن ان کا اُلو سیدھا ہوتا رہا ہے۔

وہ اپنے باپ کے ناخلف بیٹے نہیں۔ لیکن دنیوی کاروبار کیلئے دوسروں پر اپنا رُعب جمانے کے لئے شاید وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ حسب ضرورت اپنے والد محترم کے متعلق یہ کہہ دیں کہ وہ تو جاہل مطلق ہیں اور اُن کے والد محترم کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ ہزار پاپڑ بیلنے کے بعد اتنا جان گئے ہیں کہ میرا فرزند نیک اختر مجھے جاہلِ مطلق بنا کر ایک ایسی سیڑھی تعمیر کر رہا ہے، جس کے ذریعے سے اسے بامِ عروج پر پہنچنا ہے۔

ابھی اس سیڑھی کے تمام زینے مکمل نہیں ہوئے۔ لیکن اُمید ہے کہ جلد ہو جائیں گے۔ اس لئے انور کمال پاشا بہت ممکن ہے کسی رستے کو کھڑا کر کے عرش تک پہنچ جائے۔ اور نامکمل سیڑھی کو حیرت زدہ چھوڑ جائے۔

اس میں شعبدہ بازی کے جراثیم موجود ہیں۔ جس طرح مداری اپنے مُنہ سے فٹ بال کی جسامت کے بڑے بڑے گولے نکالتا ہے۔ اسی طرح وہ بھی کوئی اس قسم کا اسٹنٹ کر سکتا ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہے اور یہ حیرت اس لئے کہ وہ چالاک نہیں، عیار نہیں، دغاباز نہیں، پھر بھی جب لوگ اس کے مُنہ سے فٹ بال جتنے گولے باہر نکلتے دیکھتے ہیں تو کچھ عرصے کے لئے اس کی ساحری سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہو سکتا ہے، بعد میں وہ اپنی حماقت پر افسوس کریں کہ یہ تو محض فریب نظر تھا۔ یا گولے نکالنے میں کوئی خاص ترکیب استعمال کی گئی تھی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ انور کمال پاشا اس دوران میں کوئی اور شعبدہ ایجاد کر لیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنا دوسرا فلم بنانے کے لئے سرمایہ داروں سے، بہت ممکن ہے یہ کہہ رہا ہو کہ میں اب کے ایسا فلم بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں، جو ہالی وڈ بھی نہیں بنا سکتا۔ اس میں کوئی ایکٹر ہوگا، نہ ایکٹرس صرف کاٹھ کی پتلیاں ہوں گی جو بولیں گی۔ گانا گائیں گی اور ناچیں گی بھی ــــــ اور کلائمکس اس کا یہ ہوگا کہ وہ گوشت پوست کی بن جائیں گی۔

انور کمال پاشا پڑھا لکھا ہے۔ ایم۔ اے ہے۔ انگریزی ادب سے اُسے کافی شغف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ وہ اپنے فلموں کی کہانی اسی سے مستعار لیتا ہے اور حسب ضرورت یا حسب لیاقت اُردو زبان میں ڈھال دیتا ہے۔ اس کے فلموں کے کردار ہمیشہ ڈرامائی انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ خود ڈرامائی انداز میں گفتگو کرنے کا عادی ہے۔ اس کی وجہ ایک اور بھی ہے کہ اس کے والد محترم جناب حکیم احمد شجاع صاحب کسی زمانے میں اچھے خاصے، ڈرامہ نگار تھے۔ ان کا لکھا ہوا ڈرامہ ''باپ کا گناہ'' بہت مشہور ہے۔

ایک لطیفہ سُنئے۔ انور کمال پاشا کے متعلق کسی جگہ گفتگو ہو رہی تھی۔ اس دوران میں ایک صاحب نے جن کا نام میں نہیں لینا چاہتا کہا ''جی، میں تو انور صاحب کو جانتا ہوں، وہ باپ کا گناہ ہیں۔''

انور کمال پاشا، بہر حال بڑی دلچسپ شخصیت کا مالک ہے۔ وہ اتنا بولتا، اتنا بولتا ہے کہ ان کے مقابلے میں اور کوئی نہیں بول سکتا۔ اصل میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ وہ اپنی آواز خود سُننا چاہتا ہے اور دل ہی دل میں داد دیتا ہے کہ واہ انور کمال، تو نے آج کمال کر دیا۔ تیرے مقابلے میں اور کوئی اتنا زبردست مقرر نہیں ہو سکتا۔

اگر آپ انسانی نفسیات کے متعلق کچھ جانتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض انسانوں کو یہ مرض ہوتا ہے کہ وہ ریکارڈ بن جائیں۔ اور اُسے گراموفون کی سوئی تلے رکھ کر ہر وقت سُنتے رہیں۔ انور کمال پاشا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

اس کے پاس اپنی گفتگوؤں کے کئی ریکارڈ ہیں۔ جو اپنی زبان کی سوئی کے نیچے رکھ کر بجانا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب سارے ریکارڈ بج چکتے ہیں تو وہ ریڈیو کے فرمائشی پروگرام سُننے والے بچوں کے مانند خوش ہو کر محفل سے چلا جاتا ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اس کے خیالات میں ''FIOCOATIAN'' کو بہت زیادہ دخل ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟ یہ کوئی ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے۔ اس کے اکثر فلموں میں دریا ضرور نظر آئے گا۔ اُس میں ضرور کوئی ڈوبے گا۔ اس نے اب تک مندرجہ ذیل فلم بنائے ہیں۔ جن میں سے کچھ کامیاب رہے۔ اور کچھ ناکام۔ ''دو آنسو''۔ ''دلبر''۔ ''غلام''۔ ''گبھرو'' اور ''گمنام''۔

اگر آپ نے یہ فلم دیکھے ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں کتنے فلموں میں دریا آتا ہے، جس میں اس کی کہانیوں کے کردار گرے ہیں۔ لیکن وہ موت کا قائل نہیں۔ وہ ان کو دریا میں گراتا ضرور ہے، مگر بعد میں بتاتا ہے کہ وہ ڈوبا نہیں تھا۔ یعنی مرا نہیں گیا تھا کسی نہ کسی ذریعے سے (انور کمال پاشا کے اپنے دماغ کی عجیب و غریب تخلیق ہوتا ہے) زندہ رہا تھا۔

معلوم نہیں، میں کہاں تک صحیح ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انور کمال پاشا کی زندگی بھی شاید ڈوب ڈوب کر زندہ رہنے سے دوچار رہی ہے۔

اس نے اپنی زندگی میں کئی ندیاں پار کی ہیں۔ ایک تو وہ تھی جو سہرے جلوے کی بیاہی ہوئی تھی۔ اس کو پار کرنے میں تو خیر اس کو کوئی دقت محسوس نہ ہوئی ہوگی۔ مگر جب اس کے سامنے وہ ندی جس کا نام شمیم تھا۔ بمبئی سے بہتی ہوئی لاہور آئی، تو اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ ماہر تیراک کے مانند اسے بھی پار کر گیا۔

اس کو بہت دیر سے فلم بنی کا شوق تھا۔ بعد میں یہ شوق اس دھن میں تبدیل ہو گیا کہ وہ ایک فلم بنائے۔ جب شمیم سے اس کی راہ و رسم ہوئی تو اس نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اور لاؤڈ اسپیکر بن کر ہر طرف گونجنے لگا'' کہ آؤ میں فلم بنانا چاہتا ہوں۔ ہے کوئی سخی ایسا جو مجھے سرمایہ دے۔''

اس کی مسلسل صدا پر آخر کار اسے سرمایہ مل گیا۔ شمیم بمبئی میں ایک ایسی ندی تھی جس کا پانی بہت صاف ستھرا تھا۔ اس میں کئی غواص تیر چکے تھے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ پانی پتھر کی طرح ٹھیر گیا۔ اس لئے تیراکوں کے لئے وہ دلچسپی کا سامان نہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اپنے وطن لاہور میں آنا پڑا۔

خیر اس قصے کو چھوڑیئے، یہ کوئی اصول اور لگا بندھا قاعدہ تو نہیں۔ لیکن عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے۔ فلم ڈائریکٹر، عورت کے ذریعے ہی سے آگے بڑھتے ہیں۔ اور پیچھے بھی اس کی وجہ سے ہٹتے ہیں۔ اور ایسے ہٹتے ہیں، یا ہٹائے جاتے ہیں کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔

پاشا نے تھوڑی دیر کے بعد شمیم سے شادی کر لی جو اپنا تنگ ماتھا، چوڑا کرنے کے لئے قریب قریب ہر روز اپنے بال موچنے سے نوچتی رہتی تھی۔ پاشا نے اس کی خوشنودیٔ خاطر

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کے لئے ضرور مصنوعی طور پر اپنے سارے پر و بال نوچ کے اس کے سامنے پلیٹ میں ڈال کر رکھ دیئے ہوں گے۔

میں اب لمبے مضمون کو مختصر کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ میں انور کمال پاشا کی طرح طوالت پسند ہونا نہیں چاہتا۔ وہ بہت دلچسپ شخصیت کا مالک ہے اور اس شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ ہٹ دھرم بھی ہے۔ اور تلوّن مزاج بھی۔ بکواسی بھی اور بعض اوقات سنجیدہ مزاج بھی ـــــ

اس کے کردار میں جو میں نے خاص بات دیکھی وہ یہ ہے کہ وہ مغلئی ٹھاٹ کا آدمی ہے۔ اس کی طبیعت میں آ جائے تو وہ آپ کا منہ موتیوں سے بھر دے گا اور اگر وہ ''موڈ'' میں نہیں تو وہ آپ سے کوئی بات نہیں کرے گا۔

میں آپ کو اختتامی طور پر ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میں آج سے کچھ عرصہ پہلے شاہ نور اسٹوڈیوز میں تھا۔ جہاں انور کمال پاشا اپنی فلم ''گمنام'' کی شوٹنگ میں مصروف تھا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ میں اپنے کمرے کے باہر کرسی پر بیٹھا ٹائپ رائٹر میز پر رکھے کچھ سوچ رہا تھا کہ پاشا اپنی کار سے اترا اور میرے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ علیک سلیک ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔

''منٹو صاحب میں ایک سخت الجھن میں گرفتار ہوں۔''

میں نے اپنے خیالات جھٹک کر پوچھا۔

''کیا الجھن ہے آپ کو؟''

اس نے کہا۔ ''یہ فلم جو میں بنا رہا ہوں، اس میں ایک مقام پر اٹک گیا ہوں، آپ کی رائے لینا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے آپ مشکل کشائی کر سکیں۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''میں حاضر ہوں۔ فرمایئے! آپ کہاں اٹکے ہوئے ہیں۔''

اس نے مجھے اپنی فلم کی کہانی سنانا شروع کر دی۔ وہ سین تفصیل سے اس انداز میں سنائے۔ جیسے پولیس جیپ میں بیٹھی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے راہ چلتے لوگوں کو ہدایت کر رہی ہے کہ انہیں بائیں ہاتھ چلنا چاہیے۔ میں اپنی زندگی میں ہمیشہ الٹے ہاتھ چلا ہوں، اس لئے میں نے پاشا سے کہا۔ ـــ

''آپ کو ساری کہانی سنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ کس گڑھے میں پھنسے ہوئے ہیں۔''

پاشا نے حیرت آمیز لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کیسے سمجھ گئے۔''

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں نے اس کو سمجھا دیا اور اس کی مشکل کا حل بھی بتا دیا۔ جب اس نے میری تجویز سنی تو اٹھ کر ادھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا۔ ”ہاں کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔“

میں ذرا چڑ سا گیا۔ ”حضرت اس سے بہتر حل آپ کو اور کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ مصیبت یہ ہے کہ میں فوری طور پر سوچنے کا عادی ہوں ___ اگر میں نے یہی حل آپ کو دس یا بارہ روز کے بعد پیش کیا ہوتا تو آپ نے کہا ہوتا کہ سبحان اللہ۔ مگر اب کہ میں نے چند منٹوں میں آپ کی مشکل آسان کر دی ہے تو آپ کہتے ہیں ہاں، کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو شاید اس مشورے کی قیمت معلوم نہیں۔“ پاشا نے فوراً اپنے پروڈکشن منیجر کو بلایا۔ اس سے چیک بک لی اور اس پر کچھ لکھا۔ چیک پھاڑ کر بڑے خلوص سے مجھے دیا۔ ”آپ یہ قبول فرمائیں۔“ اس کے اصرار پر میں نے یہ چیک لے لیا ___ جو پانچ سو روپے کا تھا ___ یہ میری زیادتی تھی۔ اگر میں آسودہ حال ہوتا تو یقیناً میں نے یہ چیک پھاڑ دیا ہوتا۔ لیکن انسان بھی کتنا ذلیل ہے یا اس کے حالاتِ زندگی کتنے افسوس ناک ہیں کہ وہ گراوٹ پر مجبور ہو جاتا ہے ___!

میں اب اس مضمون کو ختم کرتا ہوں ___ انور کمال اپنے سہرے جلوے کی بیاہی بیوی سے بچے پیدا کرتا ہے جن کی نگہداشت شمیم کرتی ہے۔ وہ ریل گاڑی ہے جو مسافروں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے۔ اور انور کمال پاشا انجن ڈرائیور ہے جو اس کے پیٹ میں ایندھن جھونکتا رہتا ہے۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ریل گاڑی کے انجن کی ایسی سیٹی ہے جو رات کی خاموش فضا میں ”فیڈ آؤٹ“ ہو رہی ہے۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# بابوراؤ پٹیل
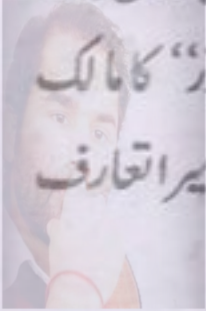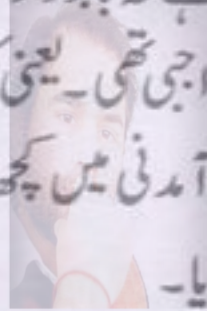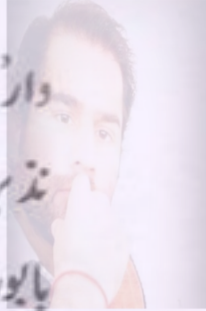
غالباً سن اڑتیس کی بات ہے کہ بابوراؤ سے میری ملاقات ہوئی۔ میں ان دنوں ہفتہ وار ''مصور'' ایڈٹ کیا کرتا تھا، تنخواہ واجبی تھی۔ یعنی کل چالیس روپے ماہوار۔ ''مصور'' کا مالک نذیر لدھیانوی چاہتا تھا کہ میری اس آمدنی میں کچھ اضافہ ہو جائے، چنانچہ اس نے میرا تعارف بابوراؤ پٹیل ایڈیٹر ''فلم انڈیا'' سے کرایا۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی اس ملاقات کا حال بیان کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ بتاؤں کہ ''فلم انڈیا'' معرض وجود میں کیسے آیا۔ آپ کو یاد ہوگا ایک زمانہ تھا جب پونہ کی پربھات فلم کمپنی اپنے پورے عروج پر تھی۔ ''امرت منتھن'' اور ''امرجیوتی'' جیسے امر فلم پیش کر کے اس نے ہندوستان کے اکناف و اطراف میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی، اب وہ ایک معمولی ادارہ نہیں رہا تھا بلکہ ''پربھات نگر'' میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جس کا ہر رکن عزم و اجتہاد کے نشے میں مخمور تھا۔ شانتارام، سیدح لال، دھائبر...... سب کو ایک ہی لگن تھی کہ ان کی کمپنی فن اور تکنیک میں سب کو پیچھے چھوڑ جائے۔

اسی زمانے میں جب کہ پربھات، وسعت اختیار کر رہی تھی اور حاملہ عورت کی طرح خوبصورت اور باوقار تھی۔ اس نے اپنے بطن سے تین بچے پیدا کئے۔

۱۔ فیمس پکچرز، جو پربھات کے فلموں کا واحد تقسیم کار ادارہ مقرر ہوا۔ اس کے مالک بابوراؤ پائی تھے۔

۲۔ بی بی سامنت اینڈ کمپنی۔ اشتہاروں کے تقسیم کار۔ پربھات کے تمام فلموں کی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

نشرواشاعت کا کام اس ادارے کے سپرد ہوا۔

۲۔ نیو جیک پرنٹنگ پریس...... گمنام سا پریس تھا۔ اس کے مالک پارکر تھے۔ ان کو پربھات نے اپنے تمام پوسٹروں، دستی اشتہاروں اور کتابوں کی چھپائی کا کام تفویض کر دیا۔

فلم انڈیا، نیو جیک پرنٹنگ ورکس سے پیدا ہوا۔ پارکر بابوراؤ کا دوست تھا۔ معمولی سا پڑھا لکھا آدمی، ان دونوں نے مل کر پلان بنایا، پریس موجود تھا، کاغذ دستیاب ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ان دنوں بہت سستا تھا۔ بی بی، سامنت کمپنی موجود تھی، اس سے پربھات فلم کمپنی کے علاوہ دوسری فلم کمپنیوں کے اشتہار مل سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ سب لوازم موجود تھے...... اور بابوراؤ بڑا محنتی آدمی ہے، اور دقیقہ رس بھی اس کے علاوہ وہ خواب دیکھنے والا آدمی نہیں انگریزی محاورے کے مطابق وہ کیل کے سر پر چوٹ لگانا جانتا ہے چنانچہ جب ''فلم انڈیا'' کا پہلا پرچہ شائع ہوا، تو یہ واقعہ ہے ہندوستان میں فلمی صحافت کا ایک نیا اور انوکھا دور شروع ہوا۔

بابوراؤ کے قلم میں فصاحت تھی، بلاغت بھی، گنڈوں کی سی بھی تھی اس کے علاوہ اس میں ایک ناقابل نقل طنز اور مزاح تھا۔ ایک زہر تھا جو میں سمجھتا ہوں یہاں ہندوستان میں کسی انگریزی لکھنے والے ادیب کے قلم کو نصیب نہیں ہوا۔

بابوراؤ کے قلم کی جس خوبی نے اس کی دھاک جمائی، وہ اس کا نوکیلا بہت ہی نوکیلا طنز تھا، جس میں ہلکا سا گنڈا پنا بھی شامل تھا۔ اس صنف سے ہندوستانی آنکھیں بالکل نا آشنا تھیں، اس لئے اس کی تحریریں لوگوں کے لئے چاٹ کا مزہ دینے لگیں۔

بابوراؤ بڑے ٹھسے کا آدمی ہے۔ اس نے اپنا دفتر اپالو اسٹریٹ کی مبارک بلڈنگ کے ایک وسیع و عریض فلیٹ میں قائم کیا اور اسے ہر ممکن طریقے سے بارعب بنایا۔

مبارک بلڈنگ کے اسی وسیع و عریض دفتر میں بابوراؤ سے میری پہلی ملاقات ہوئی، اس وقت تک ''فلم انڈیا'' کے غالباً سات آٹھ شمارے نکل چکے تھے۔ جو میں ''مصور'' کے دفتر میں دیکھ چکا تھا اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

میرا خیال تھا ایسی ستھری انگریزی لکھنے والا اور نوکیلے طنز کا مالک، دبلا پتلا اور تیکھے تیکھے نقشوں والا آدمی ہوگا، مگر جب میں نے ایک جاٹ کو ایک جہازی میز کے پاس گھومنے والی کرسی پر بیٹھے، دیکھا تو مجھے سخت نا امیدی ہوئی، اس کے چہرے کا کوئی نقش، کوئی خط ایسا نہیں تھا، جس میں اس کے قلم کا ہلکا سا عکس بھی نظر آسکے، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چوڑا چکلا چہرہ، موٹی ناک بڑا واہیات لب دہان، دانت بدنما...... لیکن پیشانی بڑی۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جب وہ مجھ سے ہاتھ ملانے کے لئے اٹھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے اونچا ہے۔ یعنی کافی دراز قد ہے۔ مضبوط ڈیل ڈول، لیکن جب اس نے ہاتھ ملایا تو گرفت بڑی ڈھیلی اور جب اس نے اردو میں بات چیت شروع کی تو میرا سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ گنواروں کا سالب ولہجہ، بات بات میں بمبئی کے موالیوں کی طرح ''سالا'' کہتا تھا اور گالیاں بکتا تھا۔

میں نے خیال کیا، شاید اس لئے کہ اس کو اردو نہیں آتی، لیکن جب اس نے ٹیلی فون پر کسی سے انگریزی میں گفتگو شروع کی تو خدا کی قسم میرے دل میں شک پیدا ہوا کہ یہ شخص ہرگز ہرگز وہ بابوراؤ پٹیل نہیں جو ''فلم انڈیا'' کا اداریہ لکھتا ہے ''بمبئی کالنگ'' رقم کرتا ہے اور سوالوں کے جواب دیتا ہے۔ معاذ اللہ کیا لب ولہجہ تھا، ایسا لگتا تھا کہ انگریزی، مرہٹی میں اور مرہٹی بمبئی کی گنوار بولی میں بول رہا ہے۔ یہاں بھی ہر فل اسٹاپ کے بعد یا اس سے پہلے ایک ''سالا'' ضرور آتا تھا۔

میں نے دل میں کہا۔ ''اگر یہی سالا بابوراؤ پاٹیل ہے تو سالا میں سعادت حسن منٹو نہیں ہوں۔''

تھوڑی دیر گفتگو ہوئی، نذیر لدھیانوی نے میری بہت تعریف کی اس پر بابوراؤ نے کہا ''مجھے مالوم ہے۔ وہ سالا عابد گل ریز ہر ہفتے مجھ کو مصور پڑھ کے سنا جاتا ہے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ سالا منٹو کیا ہوا؟''

میں نے اس کو اس کا مطلب سمجھا دیا۔

معاملہ صرف اتنا تھا کہ پربھات کے کسی فلم کی ''چوپڑی'' یعنی کتابچے میں جو کہانی کا خلاصہ تھا اور جسے بابوراؤ نے لکھا تھا۔ مجھے اس کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔ میں نے یہ خلاصہ لے لیا اور ترجمہ کر کے نذیر لدھیانوی کے ہاتھ اسے بھجوا دیا۔ جو اس نے بہت پسند کیا۔

اس کے بعد دیر تک میری اس کی ملاقات نہ ہوئی، میں دفتر سے بہت کم باہر نکلتا تھا۔ فلم کمپنیوں میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے دربدر مارے پھرنا، یہ اس وقت بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔

بابوراؤ نے کسی نہ کسی طرح شانتارام کو اکسایا کہ وہ ''پربھات'' کا ایک ماہانہ پرچہ شائع کرے، جس میں وہ بالکل نئے انداز سے ان کی فلم کمپنی کی اور ان کے فلموں کی پبلسٹی کرے گا۔ شانتارام کوان پڑھ تھا۔ مگر آرٹسٹ تھا اور بہت اعلیٰ پائے کا۔ طبیعت میں اُپج تھی فوراً مان گیا، بس پھر کیا دیر تھی ''پربھات'' نکل آیا اور بڑی شان سے، بابوراؤ نے واقعی بڑے انوکھے اور پیارے انداز میں پربھات والوں اور ان کے فلموں کی پبلسٹی کی۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نذیر لدھیانوی بڑا وقت شناس اور مطلب نکالنے والا آدمی تھا۔ فوراً بابوراؤ کے پاس پہنچا۔ یہ اسکیم لے کر کہ پربھات کے ہر شمارے کے کچھ حصے ''مصور'' میں بھی شائع ہونے چاہئیں۔

میں یہاں ایک بات عرض کر دوں کہ بابوراؤ نے چونکہ مفلسی کے دن دیکھے ہیں، اس لئے وہ حاجت مندوں پر ہمیشہ مہربان ہو جاتا ہے، اس کو معلوم تھا کہ نذیر کی مالی حالت کوئی زیادہ اچھی نہیں، اس لئے وہ فوراً اس کی تجویز مان گیا۔ لیکن اس کو شبہ تھا کہ جو کچھ اس نے انگریزی میں لکھا ہے۔ اردو میں منتقل نہ ہو سکے گا۔ نذیر نے میرا نام لیا تو وہ کسی قدر مطمئن ہو گیا۔

ایمان کی بات ہے میرا انگریزی کا علم بہت محدود ہے۔ بابوراؤ نے جو کچھ لکھا تھا، وہ میری سمجھ سے بالاتر تو نہ تھا۔ مگر اس کا اردو میں من وعن ترجمہ کرنا بہت ہی دشوار تھا۔ اس کا ایک خاص طرز تھا۔ الفاظ کی نشست و برخواست ایک خاص ڈھب کی تھی، انگریزی اور امریکی دونوں محاورے تھے۔ بعض الفاظ پر وہ کھیل کھیل گیا تھا، اب بھی کیا کرتا۔ بہت سوچ بچار کے بعد یہی بات سمجھ میں آئی کہ مضمون سامنے رکھ لوں اور اس کے مفہوم کو اپنے انداز اور اپنی زبان میں منتقل کر دوں، چنانچہ میں نے یہی کیا۔

جب یہ خرافات چھپ گئی تو نذیر، پرچہ لے کر اس کے پاس گیا۔

میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''سالا تو بھی بابوراؤ بننے کی کوشش کرتا ہے۔''

میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کو ساری بات سمجھا دی کہ تمہاری تحریر کو اردو میں لانے کی صرف ایک یہی صورت تھی...... میں سمجھتا ہوں میں نے جو کیا جائز ہے۔

دائیں ہاتھ کی آخری انگلیوں میں سگریٹ دبائے ٹھیٹ دیہاتیوں اور موالیوں کی طرح اس نے مٹھی بند کر کے زور کا کش لیا اور کہنے لگا ''سالا ہم نے عابد گل ریز سے سب سنا۔ بہت مزا آئی -- میں نے اس کو کہا (گالی) تو تو کہتا تھا کہ اردو کا بہت بڑا رائٹر ہے۔''

میں اس داد سے بہت خوش ہوا، چنانچہ طے ہو گیا کہ آئندہ پرچے کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔ مگر دو ہی پرچوں کے بعد بند ہو گیا، کیونکہ پربھات فلم کمپنی اتنے زائد شاہانہ خرچ کی کفیل نہیں ہو سکتی تھی۔

میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا کہ وہ مجھے کھینچ کر اور موضوعات کی طرف لے جائیں گی۔ جو اس داستان کے ریشوں کے اندر چھپے ہوئے ہیں، مجھے اصل میں بابوراؤ پٹیل کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنا ہیں۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

چند ایسے واقعات ہوئے کہ نذیر سے میرے......نہ نہ نہ.....ابھی نہیں، یہ بعد کی بات ہے، جی ہاں۔ میں نے شادی کا ارادہ کرلیا۔ ان دنوں میں امپیریل فلم کمپنی میں اسی روپے ماہوار پر نوکر ہوا تھا۔ یہاں ایک برس ملازمت کی۔ مگر تنخواہ صرف آٹھ مہینے کی ملی۔ چار مہینے کی باقی تھی کہ اس کمپنی کا دیوالہ پٹ گیا۔

یہاں سے میں سروج فلم کمپنی میں چلا گیا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ کمپنی نے بند ہونے کا ارادہ کرلیا تھا، مجھے یقین ہونے والا تھا کہ میں سبز قدم ہوں کہ اس کمپنی کے بند ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے سیٹھ نے ہاتھ پاؤں مار کر اسی چار دیواری میں ایک نئی کمپنی کھڑی کردی، یہاں میں سو روپے ماہوار پر ملازم ہوا۔ ایک کہانی لکھی۔ یہ تین چوتھائی فلمائی بھی گئی۔ اس دوران میں میرا نکاح ہو چکا تھا۔ اب صرف رخصتی باقی تھی۔ جس کے لئے مجھے روپے کی ضرورت تھی تا کہ کوئی معمولی سا فلیٹ کرائے پر لے کر اسے گھر میں تبدیل کرسکوں۔ جب روپیہ مانگنے کا وقت آیا تو سیٹھ نانو بھائی نے صاف جواب دے دیا۔ اور کہا میری حالت سخت خراب ہے۔ اس کی حالت تو جو خراب تھی سو تھی، لیکن یہ غور فرمائیے میری حالت کتنی خراب ہوگی۔ میں نے سیٹھ کو سارے واقعات سے آگاہ کیا۔ مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ معاملہ بڑھ گیا، تو تو میں میں شروع ہوئی تو اس نے مجھے کمپنی سے نکال باہر کیا۔ میری عزت پر یہ صاف حملہ تھا، میرا وقار بالکل مٹی میں مل گیا تھا۔ چنانچہ میں نے تہیہ کرلیا کہ وہیں باہر صدر دروازے پر بیٹھ کر بھوک ہڑتال شروع کردوں گا۔

اس معاملے کی خبر کسی نہ کسی طریقے سے بابوراؤ تک پہنچ گئی۔ اس نے پہلے تو نانو بھائی ڈیسائی کو فون پر بہت گالیاں دیں۔ جب اس کا کچھ اثر نہ ہوا تو وہ سیدھا اسٹوڈیو پہنچا اور بارہ سو روپے کا فیصلہ آٹھ سو روپے میں کرادیا ____ میں نے کہا چلو بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی۔

میرا گھر بس گیا۔

ہاں میں آپ سے یہ کہنا بھول گیا، میں جس زمانے میں امپیریل فلم کمپنی میں تھا، ان دنوں وہاں ایک بہت ہی شریف الطبع ایکٹریس پدما دیوی کے نام سے تھی، میرے پہلے فلم "کسان کنیا" (رنگین) کی ہیروئن یہی تھی۔ میرے اس کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے، لیکن اس کا صحیح یعنی جسمانی تعلق بابوراؤ پٹیل سے تھا جو اس پر بڑی کڑی نگرانی رکھتا تھا۔

یہاں آپ کو یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بابوراؤ پٹیل کی اس وقت دو بیویاں تھیں، ان میں سے ایک کو میں نے دیکھا ہے، جو ڈاکٹر تھی۔

خیر چند ایسے واقعات ہوئے کہ نذیر نے میری بے لوث خدمت اور دوستی ٹھکرادی___

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہم دونوں الگ ہو گئے، اس کا مجھے افسوس نہ تھا، میں نے اس سے لیا ہی کیا تھا، لیکن پھر بھی وہ میرے مکان کا کرایہ جو پچیس روپے بنتا تھا، ادا کر دیا کرتا تھا، ان دنوں میں نے ریڈیو میں بھی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اب چونکہ میری اکیلی جان کا سوال نہیں تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ بابوراؤ سے ملنا چاہیے — لیکن ٹھہریئے — میں آگے چلا آیا۔ درمیان میں مجھے آپ سے کچھ اور بھی کہنا تھا۔

میری شادی عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی، کچھ ایسے قصے تھے کہ میرے گھر میں سوائے میری والدہ کے اور کوئی نہیں تھا، فلم انڈسٹری کے تمام آدمی آ رہے تھے۔ ان کی خاطر داری کون کرتا، ایک ضعیف عورت بیچاری کیا کر سکتی تھی۔

بابوراؤ کو کہیں سے معلوم ہوا کہ منٹو پریشان ہے تو اس نے اپنی چہیتی رنگین ملکہ پدما دیوی کو بھیج دیا کہ جاؤ، اس کی والدہ کا ہاتھ بٹاؤ، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پدما نے میری بیوی کو شاید کوئی زیور وغیرہ بھی دیا تھا۔

چلئے، اب چلتے ہیں ___ جی ہاں میں بابوراؤ کے پاس پہنچا، اس لئے کہ وہ اردو کا ایک ہفتہ وار اخبار ''کارواں'' بھی نکالتا تھا، صرف اس غرض سے کہ عابد گل ریز کے لئے جو اس کا دوست تھا، روزی کا ایک وسیلا بن جائے۔ مگر وہ ایک لاابالی طبیعت کا شاعر آدمی تھا۔ اور ان دنوں اخبار سے علیحدہ ہو کر مکالمہ نویسی، گیت نگاری اور فلم سازی کے چکر میں پڑا تھا۔

میں نے بابوراؤ کو برطرفی کا وہ نوٹس دکھایا۔ جو مجھے نذیر نے بھیجا تھا، اسے دیکھ کر بابوراؤ ایک لحظہ کے لئے چکرا گیا۔ بہت بڑی گالی دے کر اس نے صرف اتنا کہا۔ ''ایسا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بابوراؤ نے فوراً ہی کہا۔ ''تو سالا تم ادھر کیوں نہیں آ جاتا — اپنا کارواں ہے — سالے کو پوچھنے والا ہی کوئی نہیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو میں تیار ہوں۔''

بابوراؤ نے زور سے آواز دیا۔ ''ریٹا''۔

دروازہ کھلا۔ ایک مضبوط پنڈلیوں اور سخت چھاتیوں والی گہرے سانولے رنگ کی کرسچین لڑکی اندر داخل ہوئی۔

بابوراؤ نے اسے آنکھ ماری۔ ''ادھر آؤ۔''

وہ اس کی کرسی کے پاس چلی گئی۔

بابوراؤ نے کہا۔ ''منہ ادھر کرو۔''

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری بس بک گروپ کتابیں پڑھئے 0314 .595. 1212

اس نے حکم کی تعمیل کی۔

بابوراؤ نے ایک ایسا دھپا اس کے چوتڑوں پر مارا کہ اس کے کولہوں کا سارا گوشت ہل گیا۔ ''جاؤ کاغذ پینسل لاؤ۔'' لڑکی جس کا نام ریٹا کارلائل تھا اور جو بابوراؤ کی بیک وقت سکریٹری، اسٹینو اور داشتہ تھی، چلی گئی اور فوراً ہی شارٹ ہینڈ کی کاپی اور پینسل لے آئی۔ بابوراؤ میرے نام کا اپائنٹ منٹ لیٹر لکھوانے لگا، تنخواہ کے پاس پہنچا تو رک گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ کیوں منٹو کتنا چلے گا۔''

پھر خود ہی کہا۔ ''ایک سو پچاس ٹھیک ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں''۔

بابوراؤ سنجیدہ ہو گیا۔ ''دیکھو منٹو — یہ سالا'' کارواں'' زیادہ افورڈ نہیں کر سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''تم میرا مطلب غلط سمجھے ہو — میں ساٹھ روپے ماہوار پر کام کروں گا۔ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔''

بابوراؤ سمجھا، میں اس سے مذاق کر رہا ہوں، پر جب میں نے اسے یقین دلایا کہ میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تو وہ اپنے مخصوص گنوار لہجے میں بولا۔ ''سالا میڈ ملا۔''

میں نے اس سے کہا۔ میں میڈ ملا یعنی پاگل ملا ہی سہی۔ لیکن میں نے یہ ساٹھ روپے اس لئے کہے ہیں کہ میں وقت کا پابند نہیں رہنا چاہتا۔ جب چاہوں گا آؤں گا۔ جب چاہوں گا، چلا جاؤں گا۔ لیکن'' کارواں'' وقت پر نکلتا رہے گا۔

بات طئے ہو گئی۔

میں نے بابوراؤ کے دفتر میں غالباً چھ سات مہینے کام کیا، اس دوران میں مجھے اس کی عجیب وغریب شخصیت کے متعلق کئی باتیں معلوم ہوئیں۔

اس کو ریٹا کارلائل سے عشق تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں اور کوئی لڑکی اس کے حسن و جمال کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ریٹا کارلائل جیسا کہ عام کرسچین لڑکیوں کا دستور ہے۔ جس راستہ پر تھی، چلی جا رہی تھی لیکن بابوراؤ کی وجہ سے اس کا بھاؤ بڑھ گیا۔

مجھے یقین ہے اگر ریٹا اُردو بول سکتی تو وہ اسے چند دنوں میں فلمی آسمان پر پہنچا دیتا۔ اس کو اپنے قلم اور اس کے زور پر بہت ناز ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اگر لکڑی کا ایک ٹکڑا لے لوں اور کہنا شروع کر دوں کہ نرتے سمراٹ ہے تو یقیناً وہ بے حرکت نرتے سمراٹ بن جائے گی۔ اور لوگ اس پر ایمان لائیں گے۔ پدما دیوی گمنامی کے گوشے میں پڑی تھی۔ مگر جب اس کے آغوش میں آئی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تو اس نے اسے "کلر کوئین" یعنی رنگوں کی ملکہ بنادیا۔ ان دنوں "فلم انڈیا" کے ہر شمارے میں اس کے درجنوں فوٹو ہوتے تھے۔ جن کے نیچے وہ بڑے چست فقرے اور جملے لکھتا تھا۔

بابوراؤ خود ساختہ آدمی ہے۔ جو کچھ بھی وہ اس وقت تھا اور جو کچھ وہ اس وقت ہے اس کے بنانے میں کسی کا ہاتھ نہیں۔ جوانی ہی میں اس کی اپنے باپ سے کسی بات پر ان بن ہوگئی تھی۔ چنانچہ دونوں کے تعلقات منقطع ہو گئے۔ بابوراؤ سے میں نے جب بھی بڈھے پٹیل کے بارے میں سُنا کہ "وہ سالا پکا حرامی ہے"۔

معلوم نہیں ان دونوں میں سے حرامی کون ہے اگر بڈھا پٹیل حرامی ہے (بابوراؤ کے معنوں میں) تو خود بابوراؤ بھی اس بڈھے سے حرامی پن میں جہاں تک جوتوں کا تعلق ہے، کئی جوتے آگے ہے اپنے اور اپنے باپ کے ملا کر۔

بابوراؤ کے قلم میں جس نوکیلے طنز کا میں نے ذکر کیا ہے اگر اس کے اسباب تلاش کیے جائیں تو اس کی اوائل کی زندگی میں مل سکتے ہیں۔ وہ غزنوی کا محمود بن کر کیوں بت شکنی کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے کہ بچپن میں اس کے والد نے اس کی فطرت توڑنے اور اپنے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس کی شادی کی۔ مگر اس کی مرضی کے خلاف ___ دوسری شادی، اس نے خود کی۔ مگر اس مرتبہ وہ خود دھوکہ کھا گیا۔ اور چڑ گیا۔ اپنے آپ سے ____ ہر ایک سے۔ بابوراؤ کے کردار کے شہ نشینوں میں کئی بت اوندھے اور شکستہ پڑے ہیں۔ کئی بڈھے حرامی ہیں۔ سینکڑوں بازاری نکھیائیاں ہیں۔ لیکن ان بتوں کو توڑ پھوڑ کر اسے وہ لذّت حاصل ہوئی جو سومنات کا مندر ڈھا کر غزنی کے محمود کو ہوئی تھی۔

وہ اونچے استھان پر کسی کو بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، لیکن جو زمین پر گرا ہوگا۔ اس کو اٹھانے کے لئے وہ کئی کوس چل کے آئے گا۔ اس کو اونچا کرنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیگا۔ اور جب وہ افتادہ شخص اس کی مدد سے اور اپنی محنت سے بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا تو وہ اس کو گرانے کی کوشش کرے گا۔

بابوراؤ مجموعۂ اضداد ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ شانتارام اس کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا ڈائریکٹر تھا۔ ایک وہ زمانہ آیا کہ اس نے اسی شانتارام کے فلموں میں بلکہ اس کے کردار میں بھی کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ کاردار کے وہ سخت خلاف تھا لیکن بعد میں بابوراؤ کو اس کی ہر ادا پسند آنے لگی۔ بٹوارہ ہوا تو وہ پھر اس کے خلاف ہو گیا۔ اس کا اسٹوڈیو اور اس کی جائداد ضبط کرانے کے لئے اس نے ایڑی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

چوٹی کا زور لگا دیا لیکن غریب کی قسمت اچھی تھی کہ بال بال بچ گیا۔ بیچ میں ایک زمانہ آیا کہ اس نے ببانگ دہل اعلان کر دیا کہ فلم سازی صرف میاں بھائی (مسلمان) جانتے ہیں جو رکھ رکھاؤ، جو سلیقہ اور قرینہ مسلمان فلم ڈائریکٹروں کو ودیعت ہوا، ہے وہ کسی ہندو فلم ساز کے حصّے میں نہیں آسکتا۔ میں وہ دن بھی جانتا ہوں جب پرتھوی راج کو وہ ایک حقیر کیڑا سمجھتا تھا اور وہ دن بھی یاد ہیں جب کشور ساہو اسے بہت کھلتا تھا۔

بابوراؤ پر دورے پڑتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر اس کا دماغ بالکل درست نہیں۔ وہ ایک بہکی ہوئی بھٹکی ہوئی طاقت ہے۔ ایک اندھی طاقت جو کبھی اِدھر اپنا سر پھوڑتی کبھی اُدھر — وہ ایک ایسا آرٹسٹ ہے جو اپنے زعم میں گمراہ ہو گیا ہے۔

میں جب ''کارواں'' میں تھا تو ''فلم انڈیا'' میں میری ذہانت و ذکاوت کے چرچے عام ہوتے تھے وہاں سے نکلا تو میں ''یہ منٹو کون ہے ___ جانے کون بلا ہے'' ہو گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب میرا فلم ''آٹھ دن'' پیش ہوا تو اس نے اس کے ریویو میں اپنی ٹوپی اتار کر مجھے سلام کیا اور کہا کہ منٹو ہمارے ملک کا منفرد ذہین افسانہ نگار ہے۔

جب بابوراؤ پربھات فلم کمپنی سے منسلک تھا تو شانتا آپٹے ہندوستان کی خوبصورت ترین ایکٹریس تھی۔ وہاں سے علیحدہ ہوا تو ایک دم بدصورت ہو گئی۔ اس کے خلاف اس نے کافی زہر ''فلم انڈیا'' میں اُگلا مگر وہ بھی مرہٹے کی بچی ہے ایک روز سواری کا لباس پہنے بابوراؤ کے دفتر میں گھس گئی اور سڑاپ سڑاپ چھ سات ہنٹر اس کے جڑ دیئے۔

سنا تھا کہ اونٹ کی کل سیدھی نہیں ہوتی تھی۔ اونٹ کے بعد درجہ بابوراؤ پٹیل کا آتا ہے۔ اس کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں ___ عرصہ ہوا بمبئی کی انگریزی صحافت کے باوا مسٹر بی۔ جی ہارنی مین (مرحوم) نے ''بمبئی سٹی نال'' کے خاص کالموں میں چند فقرے بابوراؤ پر چست کر دیئے۔ بابوراؤ کو بڑا تاؤ آیا اس نے جھٹ ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اسّی برس کا گرگ جہاں دیدہ ہارنی مین بہت ہنسا۔ اس نے ایک دوست کے ذریعے سے بابوراؤ کو یہ پیغام پہنچایا کہ دیکھو اگر تم چاہتے ہو کہ میں لڑوں تو میں تیار ہوں۔ لیکن اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو دو ہزار کی رقم داہنے ہاتھ سے بھجوا دو تاکہ میں خاموش رہوں۔

بابوراؤ کو اور تاؤ آیا، پر جب اس نے ٹھنڈے دل سے غور کیا اور بڈھے ہارنی مین کے کارناموں پر نظر ڈالی تو دو ہزار روپے اس کی نذر کر دیئے۔ وہ بے وقوف ہے۔ پرلے درجے کا احمق ہے، ورنہ اس کے دل میں انسانیت کی رمق موجود ہے۔ وہ نرا کھرا حیوان نہیں۔ غریبوں کا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہمدرد ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک مرتبہ اس نے ایک بات پر طوفان برپا کر دیا تھا۔

بمبئی میں جو اونچی عمارتیں ہیں ان میں لفٹ لگی ہے۔ سیڑھیاں بھی ہوتی ہیں۔ سب کو یہ لفٹیں استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن غریب ڈاکیوں کو نہیں اگر صرف پانچویں منزل کے لئے ایک خط ہو تو اسے پورا قطب صاحب چڑھنا اور اترنا پڑے گا۔ بابوراؤ نے بہت طوفان مچایا اور اس خلاف انسانیت حکم کے خلاف بہت دیر تک صدائے احتجاج بلند کی اور آخر اسے منسوخ کرا کے رہا۔

اس نے ہندوستانی صنعتِ فلم سازی کی سطح بلند کرنے میں قابل ستائش خدمات سرانجام دی ہیں۔ غیر ملکی فلم سازوں سے جو ہندوستان، ہندوستانی روایات اور خود ہندوستانیوں کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔ اس کا اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ یورپ کا دورہ کیا اور ان لوگوں کو ان کی حماقتوں سے آگاہ کیا۔

وہ کئی بچوں کا باپ ہے۔ درجنوں تو نہیں ہوں گے، لیکن ایک درجن کے قریب ضرور ہوں گے۔ کیونکہ ایک دن جب میں اس کے گھر گیا تھا تو اس نے اپنے تمام بچوں کو 'فال ان' کا حکم دیا۔ بابوراؤ ان سب کا شفیق باپ ہے۔ مگر۔۔۔۔۔

بس اسی مگر کے بعد وہ بابوراؤ شروع ہوتا ہے جس کا آغاز اور اس کے بعد کا کچھ حصہ میں نے دیکھا۔ تعمیر و تاسیس، عظمت و بزرگی کے خلاف جو ہلکی سی کد اس کی تحریروں میں جھلکیاں لیتی تھی اور آہستہ آہستہ نمایاں ہو رہی تھی۔ اب اپنے پورے بھیانک لباس میں جلوہ گر ہے۔

محمود غزنوی کی بت شکنی کا وہ ہلکا سا پرتو، جو اس کے دل و دماغ میں موجود تھا۔ اب نہایت بھونڈی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

درمیان میں اس نے جواہر لال نہرو کی ہردلعزیزی اور عظمت سے چڑھ کر اس کو گاندھی کا لے پالک اور ساری قوم کے سر کا درد، کہا تھا۔ یہی چیز اب بگڑ کر پاکستان کی دشمن بن گئی ہے۔ اس لئے کہ پاکستان حقیقت بن گیا ہے، اور دنیا کے نقشے پر اپنے لئے ایک اہم جگہ پیدا کر رہا ہے۔ یہ اس کی کج رو طبیعت کے خلاف ہے۔

''فلم انڈیا'' میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ صرف فلم سے متعلق مضامین ہونے چاہئیں۔ اور ہوا کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس میں سیاسیات نے بھی سر نکالنا شروع کر دیا۔ اور اب تو یہ حالت ہے کہ سیاسیات، فلمیات اور جنسیات کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ بالکل بابوراؤ کی موجود پر ورندہ ذہنیت کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ایک ہی جگہ پر آپ کو پاکستان،

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مرار جی ڈیسائی، عورتوں کے ایام اور رویرا کے پپیتا نما چہرے کا ذکر ملے گا۔

لیاقت کا مکہ ہوگا، ساتھ ہی بابوراؤ کی تنومندی اور مردی، اس کے ساتھ اچاریہ کشور سا ہوا اور آخر میں وہ گاندھی ٹوپی کو اپنی پھونکوں سے اڑانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔

سیاسیات میں قدم رکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ یہ بھی کوئی ریتا ہے، سوشیلا ہے، پدما ہے جسے وہ ڈگڈگی بجا کر بانس پر چڑھا دے گا۔ اور خود تماشا دیکھے گا حالانکہ وہ اندرونی طور پر جانتا ہے کہ فلم سازی کے میدان میں وہ بہت بری طرح ناکام رہ چکا ہے اور اس میدان میں اس سے بھی زیادہ ناکام رہے گا۔ مگر چھیڑ چھاڑ اس کی سرشت میں داخل ہے۔

مجھ سے آپ پوچھئے تو بابوراؤ کو ہندوستان سے غرض ہے، نہ پاکستان سے، وہ دراصل عظمت اور بزرگی کا دشمن ہے۔ ورنہ وہ اپنے اس بنگلے میں خوش ہے جو اس نے ایک بڑی رقم دے کر عمر پارک میں خریدا ہے۔ اپنی سکریٹری سوشیلا رانی سے خوش ہے جس کو آسمانوں پر چڑھانے کے لئے اس نے "فلم انڈیا" دو برس تک وقف کیے رکھا۔ اس کو ایک فلم میں بھی پیش کیا۔ اس خیال سے کہ دوسرے کا ہاتھ رانی کو نہ لگے۔ اس نے یہ فلم خود ڈائریکٹ کیا۔ لیکن نتیجہ صفر۔

اس کی بابوراؤ کو کوئی پرواہ نہیں۔ اس کے پاس رانی ہے، اس کے پاس ریس کے گھوڑے ہیں۔ اس کے پاس بہترین دفتر ہے۔ اس کے پیٹ میں سرطان ہے۔ لیکن اس کی تجوری میں کافی دولت ہے۔ وہ اڑ کر امریکہ جا سکتا ہے اور اس کا علاج کرا سکتا ہے۔ لیکن اس کو ایک بہت بڑا دکھ ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اس کو یہ دکھ ہے کہ مسلمان کیوں اتنے بے وفا ہوتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں، اس کے کئی مسلمان دوستوں نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ ہندو دوستوں نے بھی کی ہے لیکن مسلمان اسے زیادہ عزیز تھے۔ وہ ان کی خو بو پسند کرتا تھا۔ ان کا رہن سہن پسند کرتا تھا۔ اس کو ان کی خوبصورتی پسند تھی۔ سب سے زیادہ اس کو ان کے کھانے پسند تھے۔

بابوراؤ عقائد کے لحاظ سے بہت روشن خیال ہے۔ اس کی ایک لڑکی پریس کے ایک مسلمان ملازم کے عشق میں گرفتار ہو گئی، مسلمان قریب قریب ان پڑھ تھا۔ اور بابوراؤ کی لڑکی ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ تھی۔ ۔ ۔ لیکن عشق ایسی چیزیں کب دیکھتا ہے۔ دونوں بھاگ گئے۔

بابوراؤ ان دونوں کو پکڑ کر لے آیا۔ لڑکی کو لعنت ملامت کی اور چاہا کہ یہ قصہ ختم ہو جائے۔ لیکن لڑکی نہ مانی۔ ۔ ۔ بابوراؤ نے اس سے پوچھا "تو کیا چاہتی ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا "میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں"

بابوراؤ نے اپنی لڑکی کی شادی پریس میں کام کرنے والے مسلمان سے کر دی۔ کچھ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

عرصے کے بعد جب اس سے میری ملاقات ہوئی تو وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے کہنے لگا۔ ''یہ تم سالا مسلمان کیسا ہے۔۔۔ایک ہم سے چھوکری لیتا ہے۔۔۔پھر کہتا ہے کھانے کے لئے بھی دو۔''

اس پس منظر میں بھی بابوراؤ کی موجودہ زہریلی تحریروں کو دیکھنے کی ضرورت ہے لیکن یہ کتنی بڑی حماقت ہے کہ وہ ایک فرد کا یا دو تین افراد کا بدلہ ایک پوری قوم سے لینا چاہتا ہے۔۔۔ایک مذہب سے لینا چاہتا ہے۔ بابوراؤ تاریخ کا طالب علم ہے۔ کیا اس پر یہ حقیقت آشکارا نہیں کہ یہ قوم اور یہ مذہب سراب نہیں، ایک ٹھوس حقیقت ہے۔

اسلام اور ہادیٔ اسلام کے خلاف لوگ دریدہ دہنی کرتے رہے ہیں، لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پاکستان کے خلاف بھی لوگ ایک عرصے تک زہر اگلتے رہیں گے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ حالات نے کتنا شاندار قلم غلاظت اور گندگی میں ڈبو دیا۔ کوئی آرٹسٹ کسی کی مذہبی دل آزاری کا باعث نہیں ہو سکتا، وہ آرٹسٹ تھا۔ لیکن افسوس کہ عام آدمی بن گیا۔

خدا کی قسم ''فلم انڈیا'' کے چند پچھلے شمارے دیکھے، مجھے گھن آنے لگی۔۔۔ بابوراؤ اور ایسی گراوٹ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آرٹسٹ جو اس میں تھا، یا تو سرطان بن کے اس کے پیٹ میں چلا گیا ہے یا اس کی دو بیویوں کی بددعاؤں، ریٹا کارلائل کے بریدہ گیسوؤں۔۔۔اور پدما دیوی اور سوشیلا رانی کے بستروں میں دفن ہو گیا ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# باری صاحب
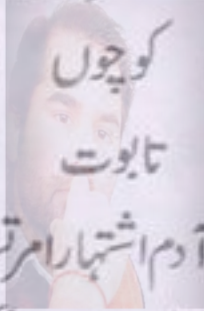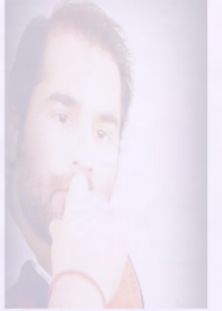
مستبد اور جابر حکمرانوں کا عبرتناک انجام
روس کے گلی کوچوں میں صدائے انتقام
زاریت کے تابوت میں آخری کیل

ان تین جلی سرخیوں کے قدِ آدم اشتہار امرتسر کی متعدّد دیواروں پر چسپاں تھے۔ لوگ زیادہ تر صرف یہ سرخیاں ہی پڑھتے تھے۔ اور آپس میں چہ میگوئیاں کرتے چلے جاتے تھے۔ معلوم نہیں سن کون سا تھا۔ مگر موسم گرفتاریوں کا تھا اور ایسے موسم امرتسر میں آتے ہی رہتے تھے۔ غالباً ان دنوں بموں کی وارداتیں بھی ہوتی تھیں۔ خط ڈالنے والے لال لال بھبکوں میں آگ لگانے والی چیزیں ڈالنے کا شغل بھی جاری تھا۔ فضا خاصی سہمی ہوئی تھی۔ اس لئے یہ اشتہار جو امرتسر کی دیواروں پر جابجا چسپاں تھے، پاس سے گزرنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے تو تھے، مگر وہ جلدی جلدی نظروں سے اشتہار کی عبارت کے چند ٹکڑے اٹھا کر اپنا رستہ پکڑتے تھے کہ کہیں اسی جرم میں نہ دھر لئے جائیں۔

یہ اشتہار آسکر وائلڈ کے ایک گھٹیا سے ڈرامے "ویرا" کے اردو ترجمے کا تھا جو میں نے اور میرے لنگوٹیے حسن عباس نے مل کر کیا تھا۔ اور اصلاح اختر شیرانی سے لی تھی۔ باری صاحب نے جو میرے اور حسن عباس دونوں کے گرو تھے، اس ترجمے میں ہماری بڑی مدد کی تھی۔ کتاب ہم نے خود ثنائی برقی پریس میں چھپوائی تھی۔ باری صاحب اس کے تمام فرمے خود اپنے کندھوں پر لاد لاد کر گھر لائے تھے تا کہ محفوظ رہیں۔ ان کو خطرہ تھا کہ پولیس چھاپہ مار کر پریس میں سے ساری کتاب اٹھا لے جائے گی۔ میرے اور حسن عباس کے لئے یہ سب سلسلہ بڑا دلچسپ اور حرارت بخش تھا۔ جیل میں کیا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کیا صعوبتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ تھانوں میں کیا درگت ہوتی ہے۔ اس کے متعلق ہمارے پُر جوش اور کھلنڈرے دماغ کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر قید ہو گئے تو یہ وطن کے لئے بڑی قربانی ہوگی۔ رہا ہو کر آئیں گے تو لوگ ہار پہنائیں گے اور جلوس نکالیں گے۔

ڈرامہ، روس کے دہشت پسندوں اور نراجیوں کی سرگرمیوں کے متعلق تھا۔ جن کے پاس ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ امرتسر میں اُن دنوں اگر کوئی ہوائی بندوق سے بھی مسلح ہونا چاہتا تو یقیناً اسے توپ دم کر دیا جاتا۔ کہاں ماسکو، کہاں امرتسر، مگر میں اور حسن عباس نئے نئے باغی نہیں تھے۔ دسویں جماعت میں دنیا کا نقشہ نکال کر ہم کئی بار خشکی کے رستے روس پہنچنے کی اسکیمیں بنا چکے تھے۔ حالانکہ ان دنوں فیروز الدین منصور بھی کامریڈ ایف۔ ڈی۔ منصور نہیں بنے تھے۔ اور کامریڈ سجاد ظہیر شاید بنے میاں ہی تھے۔ ہم نے امرتسر ہی کو ماسکو تصور کر لیا تھا۔ اور اسی کے گلی کوچوں میں مستبد اور جابر حکمرانوں کا انجام دیکھنا چاہتے تھے۔ کٹرہ جیمل سنگھ، کرموں ڈیوڑھی، یا چوک فرید میں زاریت کا تابوت گھسیٹ کر اس میں آخری کیل ٹھوکنا چاہتے تھے۔ کیل ٹیڑھی ہو جاتی یا ہتھوڑے کی ضرب اس کے بجائے ہماری کسی انگلی کو زخمی کر دیتی۔ اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ باری صاحب۔ ”اشتراکی ادیب باری“ ہمارے گرو تھے۔ سوچنا ان کا کام تھا۔ لیکن مجھے بار بار محسوس ہوتا تھا کہ یہ آدمی جس کو ہم نے اپنا رہنما بنایا ہے۔ بڑے کمزور دل کا آدمی ہے۔ ذرا سا پتا کھڑکتا تھا تو وہ چونک پڑتے تھے۔ پر ہماری پر خلوص گرمجوشی ان کے متزلزل قدموں کو ہمیشہ مضبوط بنا دیتی تھی۔

اب سوچا جائے تو اس زمانے کی سب حرکتیں چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت یہ کھلونے ہی ”عظیم الجثہ“ اور قوی ہیکل تھے۔ ان سے پنجہ لڑانا گویا کسی دیو سے زور آزمائی کرنا تھا۔ ہمارے خلیفہ صاحب یعنی باری اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم چاروں (کچھ عرصے کے بعد ابو سعید قریشی بھی ہمارے ٹکڑے میں شامل ہو گیا تھا) اسی زمانے میں ان کھلونوں سے اپنا جی بہلانے کے جرم میں پھانسی پا گئے ہوتے اور امرتسر کی پوری تاریخ میں ایسے شہیدوں کے نام کا اضافہ ہو گیا ہوتا جو اب خلوص دل سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس وقت اپنے اس جوش کے رخ کا بھی صحیح علم نہیں تھا۔

میں نے باری صاحب کو بزدل کہا ہے۔ ان کی شخصیت پر کسی حملے کی غرض سے نہیں۔ اصل میں ان کی شخصیت کی ترتیب و تدوین میں اس بزدلی کا بہت نمایاں حصہ تھا۔ اگر کسی وجہ سے ان کے دماغی اور جسمانی نظام سے یہ کمزوری نکل جاتی تو وہ، وہ باری نہ ہوتے جو وہ تھے۔ ان کا تشخص بالکل جدا قسم کا ہوتا۔ ہو سکتا ہے وہ ہاکی کے مشہور عالم کھلاڑی ہوتے اور دوسرے نامور

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کھلاڑیوں کی طرح ان کی عمر کسی ریاست کی نوکری میں گزرتی، یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ پرائمری اسکول کے استاد سے ترقی کرتے کرتے کسی یونیورسٹی کے ریڈر ہوجاتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بھگت سنگھ کی طرح بمباز ہوتے۔ بھگت سنگھ ان ہی کے ضلع یعنی لائلپور کا رہنے والا تھا۔ اور باری صاحب اس کو اچھی طرح جانتے تھے---- یہ صرف بزدلی ہی کا باعث ہے کہ وہ ہمیشہ ادھر کے رہے نہ، اُدھر کے، ساری عمر جہاں رہے معلق رہے اور میں تو سمجھتا ہوں اس دوران میں ان کے بلا کے تیز دماغ میں جو خیال بھی پیدا ہوا، بزدلی کی کھونٹی سے لٹکا رہا۔

باری صاحب بڑی بڑی نرالی باتیں اور اسکیمیں سوچتے رہے ایسی جو کسی اور کے ذہن میں آسانی کے ساتھ نہیں آسکتیں۔ مگر یہ اتنی سرعت سے غائب ہوجاتی تھیں کہ ان کے آثار تک بھی نہ رہتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ انھوں نے زندگی کے سمندر میں اچانک کسی دلچسپ ٹاپو کی موجودگی کا انکشاف کیا، اس کو سر کرنے کے لیے کیا کیا تدابیر عمل میں لائی جانی چاہئیں، سب کی سب سمجھا دیں۔ وہاں پہنچ کر جو نعمتیں اور گڑی ہوئی دولتیں میسر آئیں گی، ان کی تصویر کشی بھی کردی۔ سننے والے کمر باندھ کر اس مہم کے لئے تیار ہوگئے۔ ان میں سے کچھ رخت سفر باندھ کر روانہ بھی ہوگئے لیکن جب مڑ کے دیکھا تو باری صاحب غائب...... واپس آکر ان سے استفسار کرنا چاہا تو انھوں نے کسی اور دلچسپ جزیرے کا ذکر چھیڑ دیا۔ جو وہ اس دوران میں دریافت کر چکے تھے۔

متذکرہ صدر اشتہار چسپاں کرنے کے بعد چنانچہ یہی ہوا۔ میں اور عباس دونوں رات بھر گرفتار ہوجانے کی سنسنی کے ساتھ آدھے سوئے، آدھے جاگتے رہے۔ دوسرے روز نئے نویلے دولہوں کی طرح ہم تجربہ کار باری کو ڈھونڈتے رہے کہ ان سے پوچھیں۔ آگے کیا ہوگا، مگر وہ غائب تھے۔ دو تین جگہیں تھیں، جہاں وہ جاتے تھے، مگر ان میں سے کسی ایک پر بھی وہ موجود نہیں تھے۔

پندرہ روز کے بعد اچانک نمودار ہوئے تو انھوں نے ایک ہفتہ وار پرچہ جاری کرنے کی اسکیم سے ہمیں اپنے مخصوص انداز میں مطلع کیا۔ ''میں آپ کی طرح بیکار نہیں تھا۔ سارے انتظامات مکمل کرلئے ہیں۔ بس ڈیکلریشن داخل کرنا ہے۔ مضمون میں آج ہی سے لکھنا شروع کردوں گا۔''

امرتسر کی دیواروں پر زاریت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے والے اشتہار کچھ تو اکھڑ گئے اور کچھ قوت مردمی کی دواؤں کے پوسٹروں تلے دب گئے اور ہمارا جوش اُدھر سے منتقل ہوکر ہفتہ وار پرچے کی ابتدائی کارروائیوں میں داخل ہوگیا۔

''ویرا'' ناقص کتابت اور واہیات طباعت کے باعث میرے گھر میں مقفل پڑی رہی۔ لیکن ''خلق'' کے صوری حسن کے لئے ہم نے اپنی پہلی فروگذاشتوں سے فائدہ اٹھایا۔ جب

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اس پرچے کا پہلا شمارہ ثنائی برقی پریس سے میں اور باری صاحب کندھوں پر اٹھا کر گھر لائے تو اس کی گوارا کتابت وطباعت سے ہم بہت مطمئن تھے۔

باری صاحب کے ایک کرم فرما تھے، میں ان کا نام بھول گیا ہوں، لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ سیاہ داڑھی والے ایک صاحب تھے۔ جو غالباً چمڑے کے سوداگر تھے۔ "خلق" کے اجراء میں مالی ہاتھ ان کا تھا۔ وہ اور بھی سرمایہ لگانے کے لئے تیار تھے، مگر باری صاحب میدان چھوڑ کے بھاگ گئے۔

پہلے شمارے میں سرورق پر ان کا ایک مضمون تھا، "ہیگل سے لے کر کارل مارکس تک"۔ ایک مختصر سا خاکہ تھا۔ اشتراکی فلسفے کے ارتقاء کے بارے میں جو میری اور حسن عباس کی فہم سے بالاتر تھا۔ اصل میں ہم ہیگل سے واقف تھے، نہ کارل مارکس سے۔ آخرالذکر کا نام باری صاحب سے کئی مرتبہ سنا تھا۔ جس سے ہم کو اتنا معلوم تھا کہ وہ مزدوروں کا بہت بڑا حامی تھا۔ اس کا فلسفہ کیا تھا۔ اور اس کے ڈانڈے حکیم ہیگل سے کہاں اور کیونکر ملتے تھے۔ ایمان کی بات ہے۔ اس کے متعلق ہماری معلومات صفر تھیں۔

اپنے افسانوں کے قارئین کی دلچسپی کے لئے ایک بات بتانا چاہتا ہوں کہ میرا سب سے پہلا طبع زاد افسانہ "تماشا" کے عنوان سے "خلق" کے اسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اس پر اپنا نام نہیں دیا تھا۔ اس ڈر سے کہ لوگ مذاق اڑائیں گے۔ ان دنوں میرے جاننے والے ازراہِ تمسخر میری سقیم تحریروں پر خوب ہنسا کرتے تھے لیکن عجیب بات ہے کہ باری صاحب نے جن کو میری محدود علمیت کا پتہ تھا، میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ یہاں تک کہ مجھے میری اغلاط سے بھی کبھی روشناس نہ کیا وہ کہا کرتے تھے "سب ٹھیک ہے۔"

بات میں سے بات نکل آتی ہے۔ مجھے باری صاحب کے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کے متعلق کچھ کہنا تھا۔ "خلق" کا پہلا شمارہ شائع ہوا، تو چند روز بڑے جوش وخروش میں گزرے، میں اور عباس یوں محسوس کرتے تھے، جیسے ہم سے کوئی بڑا کارنامہ سرزد ہو گیا ہے۔ کٹرہ جیمل سنگھ اور ہال بازار میں ہم ایک نئی شان سے چلتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ہمیں محسوس ہوا کہ امرتسر کی نظروں میں ہم ویسے کے ویسے آوارہ گرد ہیں۔ پان سگریٹ والے بدستور اپنے پیسوں کا تقاضا کرتے اور خاندان کے بزرگ برابر اپنا وہی فیصلہ سناتے تھے کہ ہمارے لچھن اچھے نہیں۔۔۔۔ لچھن واقعی کچھ اچھے نہیں تھے۔ اس لئے کہ خفیہ پولیس نے پوچھ گچھ شروع کر دی اور اسی سلسلے میں کوچہ وکیلاں تک پہنچ گئی۔ میرے بہنوئی خواجہ عبدالحمید صاحب ان دنوں نئے نئے ریٹائر ہوئے تھے۔ آپ ایک عرصے تک پھلور کے پولیس اسکول میں استاد رہ چکے تھے۔ اس لئے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

پنجاب پولیس کے قریب قریب تمام آدمیوں کو جانتے تھے۔ خفیہ پولیس کے سپاہی جب باری صاحب کا اتا پتہ معلوم کرنے کے لئے کوچہ وکیلاں میں پہنچے تو ان کی خواجہ صاحب سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ باری صاحب کا وہ خطرناک مضمون ''ہیگل سے کارل مارکس تک'' پڑھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ باری صاحب کو بھی اچھی طرح جانتے تھے اور تاریخ سے جو ان کو دلچسپی تھی، اس کی قدر کرتے تھے۔ ان کا انداز بیان جو خطیبانہ ہوا کرتا تھا۔ انھیں پسند تھا۔ اس لئے انھوں نے خفیہ پولیس کے سپاہیوں سے کہا ''جاؤ'' کوئی اور کام کرو۔ ہیگل اور کارل مارکس تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا---- غریب باری بھی ابھی تک ان کے فلسفے کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔''

خواجہ صاحب نے جب ان کو یقین دلایا کہ مضمون میں کوئی بغاوت انگیز چیز نہیں جس سے سرکار برطانیہ کا تختہ الٹنے کا اندیشہ ہو تو وہ چلے گئے۔ لیکن جب باری صاحب کو اس کا پتہ چلا کہ حکومت کی مشینری حرکت میں آ گئی ہے تو انھوں نے ''خلق'' کا صرف دوسرا پرچہ نکالا اور اسے میرے پاس چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے۔ اور بہت دیر تک معلوم نہیں کہاں کہاں گھومتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کا ایک کارڈ ملتان سے آیا تھا۔ جس میں کچھ اس قسم کا مضمون تھا۔ ''ملتان کی رصدگاہوں میں اپنے ستاروں کا مطالعہ کر رہا ہوں۔''

یہ عجیب بات ہے کہ گردش کے دوران میں جب کبھی ان کا خط کسی شہر سے آتا تھا تو اس میں یہ اطلاع ان ہی الفاظ میں ضرور ہوتی کہ وہ اس کی رصدگاہوں میں اپنے ستاروں یا نجوم کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ مطالعہ میرا خیال ہے، وہ ہر اس گلی، ہر اس کوچے کی رصدگاہ میں کرتے رہے جہاں انھوں نے کچھ عرصے کے لئے قیام کیا۔ قبر کی تاریک رصدگاہوں میں بھی وہ یقیناً ان ہی ستاروں کے مطالعے میں مصروف ہوں گے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ یہاں سے مجھے کوئی ڈاک کارڈ نہیں بھیج سکتے۔

مرحوم کو ڈاک کارڈ بہت پسند تھے۔ اس لئے کہ لفافوں کے مقابلے میں ان پر خرچ کم ہوتا ہے۔ اس کا جواب دینے کے معاملے میں وہ بہت سست تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک بار میں نے انھیں امرتسر سے پے درپے کئی خط لکھے---- جب کوئی جواب نہ آیا تو میں نے پانچ پانچ پیسے کے دو ٹکٹ ان کو روانہ کئے اور یہ تاکید کی کہ وہ اب جواب ضرور دیں۔ ان کا جواب آیا۔ مگر ڈاک کارڈ پر، لکھا تھا تمہارے بھیجے ہوئے ٹکٹ میں نے بیچ ڈالے۔ ایک کارڈ خرید کر تمہیں لکھ رہا ہوں کہ تمہارے سب خط مجھے مل چکے ہیں۔

مجھے بہت غصہ آیا، فوراً لاہور پہنچا، ارادہ تھا کہ ان کی طبیعت صاف کر دوں گا۔ مگر جب ہم عرب ہوٹل میں بیٹھے اور میں نے ان کی ذلیل حرکت کے متعلق بات کرنی چاہی تو انھوں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نے لاہور کی رصد گاہوں میں میرے ستاروں کا مطالعہ شروع کر دیا اور آخر میں فیصلہ ہوا "تم گھر کے معاملات ٹھیک ٹھاک کر کے لاہور چلے آؤ اور کسی اخبار میں ملازمت کر لو۔"

ایسے کئی موقعے آئے کہ میں نے بڑی سنجیدگی سے باری صاحب پر اپنی خفگی و ناراضگی کا اظہار کیا اور وہ بھی اس ارادے کے ساتھ کہ انکی میری کُٹی ہو جائے مگر ان کی باتیں کچھ ایسی تھیں کہ مجھے غیر مسلح کر دیتی تھیں۔ موٹا موٹا گول چہرہ، سیاہی مائل گندمی رنگ، بہت بڑا سر، قد متوسط، کالے کالے ہونٹ، مسوڑھے بھی کالے مگر جب ان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوتی تھی تو آس پاس کے تمام خط و خال اپنی سیاہ قبا اتار پھینکتے جو عدالتوں کی ہی خشک سنجیدگی اور متانت کا باعث ہوتی تھی۔ صرف ان مسکراتے ہوئے لمحات کی رصد گاہوں میں وہ اپنے ستاروں کا مطالعہ نہیں کرتے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ صرف انہی لمحات میں ان کے مسلسل مطالعے سے اکتائے ہوئے یہ ستارے بھی تھوڑی دیر کے لئے مسکرا لیتے تھے۔

باری صاحب بزدل تھے۔ خدا کی قسم بہت بزدل تھے۔ زیادہ کھالیتے تو ڈرتے رہتے تھے کہ ان کی توند نکل آئے گی۔ حالانکہ فاقوں کے زمانے میں بھی ان کے جسم کا یہ حصہ بڑھتا رہا۔ زیادہ تیز بھاگتے نہیں تھے کہ ان کے دل پر اس کا اثر پڑے گا ___ حالانکہ ان کے جسم کے اسی رئیس عضو نے ان کا ساتھ چھوڑا۔ بڑی بڑی سرخ بغاوتوں کے نیلے نقشے تیار کرتے تھے اور پٹاخے کی آواز سن کر زرد ہو جاتے تھے۔ ان کو ایک لڑکی سے محبت تھی۔ لیکن ماں باپ کسی اور سے ان کا رشتہ پکا کر چکے تھے جب اُن کو معلوم ہوا کہ عشق فرما رہے ہیں تو انہوں نے شادی کی تاریخ پکی کر دی۔ باری صاحب ان دنوں میرے ساتھ رہتے تھے۔ جب تاریخ نزدیک آئی تو غائب ہو گئے۔ لیکن بکرے کی ماں زیادہ دیر تک خیر نہ منا سکی۔ ان کی ہونے والی دولہن نے ایک بڑا معرکے کا خط لکھا، جس میں یہ دھمکی درج تھی کہ اگر انہوں نے اس سے شادی نہ کی تو وہ ان کے پیٹ میں چھری بھونک دے گی ___ باری صاحب ڈر گئے اور شادی کر لی۔

برما کی رصد گاہوں میں اپنے ستاروں کا مطالعہ کرنے کیلئے پہنچے تو وہاں ایک برمی لڑکی کا ستارہ ان کے ستاروں سے ٹکرا کر ان میں اُلجھ گیا۔ آپ نے اپنی بیوی کو وہاں بُلا لیا۔ لیکن ستاروں کا الجھاؤ بدستور قائم رہا۔ آخر جنگ چھڑنے پر ان کو ایک موقعہ ملا اور وہاں سے بھاگ آئے۔

بڑے رن چھوڑ قسم کے آدمی تھے۔ اقبال کی خودی کا فلسفہ ان کو اس قدر پسند آ گیا تھا کہ اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ مگر سردیوں میں معلوم ہوا کہ یہ کام نہیں دے سکتا۔ اقبال کے ارشاد کے مطابق انہوں نے اپنی خودی کو مقدور بھر اونچا کرنے کی کوشش کی۔ مگر باری تعالیٰ نے ان سے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کبھی یہ پوچھنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ اے باری بتا تیری رضا کیا ہے۔ آخر ایک دن وہ خود ہی اقبال سے پوچھنے گئے کہ یہ گڑبڑ کیا ہے۔

ان دنوں باری صاحب کی اپنے اخبار کے دفتر میں رات پالی ہوتی تھی۔ آخری کاپی پریس بھیج کر جب فارغ ہوتے تو علامہ اقبال مرحوم کی قبر پر چلے جاتے اور دیر تک ان کی روح سے فلسفہ خودی پر بات چیت کرتے رہتے۔ بہت تنگ حال تھے۔ تنخواہ کبھی کبھی ملتی تھی۔ اور وہ بھی قسطوں کی صورت میں۔ اخباروں کے مالک یہ سمجھتے تھے کہ ان کے عملے کے آدمی بار بردار حیوان ہیں جس کو جو کچھ دے دیا جائے وہی بہت ہوتا ہے۔ باری صاحب حساس آدمی تھے۔ قرض لیتے تھے مگر بوجھ محسوس کرتے تھے۔ خودی کو وہ کافی بلندی پر لے گئے تھے۔ مگر اب اس میں اور زیادہ بلندی تک پہنچنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ بھنا کر علامہ کی قبر پر گئے اور ان کی روح سے بڑے باغیانہ سوال کرنے شروع کر دیئے۔ میرا خیال ہے اگر علامہ زندہ ہوتے تو انہیں ان سوالوں کا جواب دیتے وقت بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔

بغاوت کا یہ جوش بھی ان کے دل و دماغ میں ٹھنڈا ہو گیا۔ اگر بزدل نہ ہوتے تو میرا خیال ہے کہ عام انسانی زندگی پر اقبال کے فلسفہ خودی کے تطبیق و اطلاق کے مسئلے پر یقیناً بصیرت افروز روشنی ڈال سکتے۔ مگر وہ تمام کونپلیں جو ان کے حساس دل و دماغ کی شاخوں سے جوش کے باعث پھوٹی تھیں، اس بزدلی کے باعث مرجھا گئیں۔ معلوم نہیں، ان کے دوسرے دوست مجھ سے اتفاق کریں یا نہ کریں، لیکن میں سمجھتا ہوں اگر وہ ثابت قدم ہوتے اور گرد و پیش کی مخالف قوتوں کا مقابلہ ڈٹ کر کرتے تو ان کے قلم سے ''انقلابِ فرانس'' کے بجائے ''انقلابِ ہندوستان'' نکلتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اٹھارہ سو ستاون کا تانتیا ٹوپے ان کے قالب میں دوسرا جنم لیتا۔

اقبال کی طرح وہ بھی خدا سے یہ کہتے رہے۔ ''کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر'' ___ مگر اس وقت جب کہ ان کو خدا کی طرف سے کوئی بلاوا نہیں آتا تھا۔ لیکن جب بلاوا آیا تو وہ کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر نہ کہہ سکے، اور اقبال کے مانند چل دیے۔ وہ گنجشکِ فرومایہ کو شاہین سے لڑانے کے لئے تیار کرتے رہتے۔ مگر جب اسے پالی میں اتارنے کا مرحلہ آتا تو پنجرہ وہیں چھوڑ کے بھاگ جاتے، اس غریب کو دو دو چونچیں لینے اور شکست کھانے کا بھی موقعہ نہ ملتا۔

باری صاحب خیالی پلاؤ پکانے کے معاملے میں اوّل درجے کے بکاول تھے۔ ایسے ایسے لذیذ پلاؤ اور بریانیاں تیار کرتے تھے کہ ان کا ذائقہ دیر تک دوسروں کے دل و دماغ سے محو نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب ''خلق'' دو اشاعتوں کے بعد انہوں نے بند کر دیا۔ اور چند

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اخباروں میں کام کرنے کے بعد انہیں کچھ حاصل وصول نہ ہوا تو انہوں نے ایک ہفتہ وار اخبار "موچنا" نکالنے کا ارادہ کیا۔ اس کی سرخیاں کیسی ہوں گی، مضامین کس نوعیت کے ہوں گے۔ اس کے متعلق انہوں نے لفظوں کے ذریعے سے ایسی تصویر کشی کی کہ اس مجوزہ پرچے کے کئی شمارے آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے اور دیر تک فضائے آسمانی سے ہم پر جوش سے بھرے ہوئے موچنوں کی بارش ہوتی رہی۔ ایک بار اور صحافت کے پیشے سے تنگ آئے تو جنگ کا یہ رستہ نکالا کہ وہ اسے چھوڑ چھاڑ کے چارہ کاٹنے کی مشین لگا لیں گے اور مزے کی زندگی بسر کریں گے۔ اس مزے کی زندگی کو انہوں نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنا شروع کر دیا جو میرے ذہن پر مرتسم ہو گیا۔ چنانچہ بہت بعد میں جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا، میں نے ایک ریڈیائی ڈرامہ "جرنلسٹ" کے عنوان سے لکھا۔ اس کے مرکزی کردار کا نام باری ہی تھا جب نشر ہوا تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہندوستان کے قریب قریب ہر اردو اخبار نے اس کے خلاف نوٹ لکھے اس لئے کہ اس سے اخبار کے مالکوں کی توہین ہوتی تھی لیکن ٹریجڈی یہ تھی کہ اُن صحافیوں سے اس کے خلاف لکھوایا گیا جن کی ناگفتہ بہ حالت کی عکاسی اس میں کی گئی تھی۔

یہاں پر اس ڈرامے کے چند اقتباس نقل کرنے شاید بے محل نہیں ہوں گے۔ جرنلسٹ باری صحافت چھوڑ کر چارہ کاٹنے کی مشین لگا لیتا ہے اور بہت خوش ہے۔ اس کی خود کلامی ملاحظہ ہو۔

باری: روز ڈیڑھ دو روپے کی آمدن ہو جاتی ہے۔ سارا دن یہاں دکان پر گزارتا ہوں۔ شام کو ٹھیکے پر چلا جاتا ہوں اور گپیں ہانک کر پھر ٹہلتا ٹہلتا یہاں آ جاتا ہوں — خبریں ترجمہ کرنا پڑتی ہیں، نہ کاپی جوڑنا پڑتی، ہے ٹیلیفون کی بک بک، نہ مراسلوں کی بکواس۔ کاتب نہ رائیٹر کی سروس۔ واللہ کیا گر بتایا ہے میرے دوست نے۔ سردیاں آئیں گی تو اندر گھاس کے پاس چارپائی بچھا لیا کروں گا۔ کتنی اچھی زندگی ہے — میری تو یہ مرضی ہے کہ سب ایڈیٹروں کو جو اخباروں میں اپنی زندگی تباہ کر رہے ہیں، یہ گر بتا دوں۔ اپنے اپنے شہر میں ایسی مشین لگوا لیں اور مجھے دعائیں دیں۔"

زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی کہ اچانک دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اس کی اطلاع باری کو شراب خانے میں ملتی ہے اور اس کے دل و دماغ میں سویا ہوا صحافی جاگ پڑتا ہے۔ اس کو بہت کوفت ہوتی ہے۔ جب وہ آس پاس بیٹھے ہوئے شرابیوں کی گفتگو سنتا ہے جو بٹیروں سے متعلق ہے تنگ آ کر وہ چلا اٹھتا ہے۔

باری: خاموش۔ یہ تم نے کیا بکواس شروع کر دی ہے۔ تم لوگ واقعی بالکل جاہل ہو۔ یورپ میں ایک ایسی جنگ شروع ہوئی ہے جو کئی ملکوں کو دنیا کے نقشے سے ہمیشہ کے لئے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مٹا دیگی۔ لاکھوں کروڑوں آدمی ہلاک ہو جائیں گے۔ دنیا میں ایک طوفان مچ جائے گا اور تم لوگ بٹیروں کی لڑائی کا حال بیان کر رہے ہو آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

ایک شرابی: کیا بکتا ہے یہ۔

دوسرا شرابی: (قہقہہ لگا کر) میں تو کچھ نہ سمجھا ___ (باری سے) باری ___ یہ تو آج کیسی باتیں لے بیٹھا ہے۔

پہلا شرابی: زیادہ پی گیا ہے۔

دوسرا شرابی: بڑی نامراد چیز ہے۔

باری: تم بکواس کرتے ہو۔ میں بالکل ہوش میں ہوں۔ تم بے ہوش ہو رہے ہو۔ جو کچھ میں اس وقت سوچ رہا ہوں تمہارا ملک بھی نہیں سوچ سکتا۔

پہلا شرابی: ارے واہ رے میرے مولوی۔

باری: تم میری باتوں کا مضحکہ نہ اڑاؤ (ہنستا ہے) مگر یہ تمہارا قصور نہیں، میرا اپنا ہے۔ میں نے اب تک اپنی اصلیت تم سے چھپائے رکھی ہے۔ ___ تم نہیں جانتے میں کون ہوں اور سیاسی دنیا میں میری کس قدر اہمیت ہے۔

پہلا شرابی: میاں تم رستم ہو، لے بس، اب جانے دو۔ کوئی اور بات کرو۔

باری: تمہیں جب تک میری اصل شخصیت معلوم نہیں ہو گی، تم میرا مضحکہ اڑاتے رہو گے۔ جانتے ہو میں کون ہوں۔ میرا نام عبدالباری ہے ــــ مولانا عبدالباری روزنامہ "خلق" کا ایڈیٹر۔

اس آخری جملے میں جو المیہ پوشیدہ ہے وہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ باری مرحوم نے بالآخر صحافت چھوڑ دی تھی اور چارہ کاٹنے کی مشین لگالی تھی گو یہ مشین ان کی نہیں سرکارِ برطانیہ کی ملکیت تھی (وہ آخری دنوں میں برٹش انفورمیشن ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے تھے) لوگ اکثر ان کا مضحکہ اڑاتے تھے اس لئے کہ ساری عمر انگریز کو گالیاں دینے کے بعد انہوں نے اسی کی نوکری قبول کر لی تھی۔ لیکن وہ یقیناً دل ہی دل میں یہ ضرور پکارتے رہے ہوں گے۔ "تمہیں جب تک میری اصلی شخصیت معلوم ہو گی تم میرا مضحکہ اڑاتے رہو گے۔ مگر یہ تمہارا قصور نہیں میرا اپنا ہے۔ میں نے اب تک اپنی اصلیت تم سے چھپائے رکھی۔"

یہ میری اپنی تاویل و تعبیر ہے۔ باری صاحب نے اپنی زندگی میں ہمیشہ فرار کے راستے اختیار کئے اور ان راستوں پر بھی انہوں نے ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم رکھا۔ یہی وجہ ہے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کہ ان کی روح لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہی اور اس میں قصور سرا سر ان کا اپنا تھا۔ وہ بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکر لینے کے لئے آگے بڑھتے تھے۔ لیکن ان کا رخ کسی اور طرف ہو جاتا تھا اور یہ سب کچھ ان کے اپنے زعم میں ہوتا تھا۔
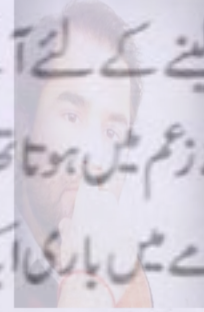
اس ڈرامے میں باری ایک جگہ اپنی رَو میں یہ کہتا ہے۔

باری: پہلی جنگ سے لے کر اس جنگ کے آغاز تک کے واقعات کو اگر ہم پیشِ نظر رکھیں تو یہ معلوم کر کے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ مہذب دنیا ذلت کی دلدل میں دھنس گئی۔ سائنس کی ترقی جاری رہی ہے لیکن اخلاقی ذمہ داری کا احساس کم ہوتا چلا گیا ہے۔ نوعِ انسانی جہاں تھی، وہیں کی وہیں کھڑی ہے۔ نسلی امتیاز اور مذہبی عداوت بڑھتی گئی ہے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ پہلے جنگ نما صلح پھر صلح نما جنگ ___ میں پوچھتا ہوں آخر یہ ہماری مہذب دنیا کدھر جا رہی ہے۔ کیا ہم پھر جہالت کے زمانے میں جا رہے ہیں ___ کیا ایک بار پھر انسان کا خون پانی سے بھی ارزاں بکے گا ___ کیا پھر ہمارا گوشت پوست دوسری اجناس کی طرح بازاروں میں بیچا جائے گا ___؟ ___ کیا ہونے والا ہے؟ کوئی مجھے بتائے کیا ہونے والا ہے، بے اصولی نے سینکڑوں اصول اور تفرقہ پردازی نے ہزاروں جماعتیں پیدا کر دی ہیں۔ انسان انسان کے خلاف۔ ملت ملت سے نبرد آزما ___ ملک ملک سے ستیزہ کار ___ یہ ہے انیسویں صدی کی داستان۔"
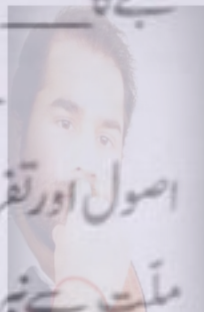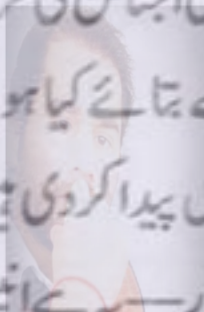
یہ خیالات برٹرینڈ رسل کے ہیں جو میں نے باری صاحب کے مخصوص خطیبانہ انداز میں مکالمے کی شکل میں تبدیل کر دیئے تھے۔ باری صاحب کا دماغ برٹرینڈ رسل کے دماغ سے کم نہیں تھا لیکن وہ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جس کے اخباروں کے مالکوں سے تنگ آ کر انہیں کئی بار یہ کہنا پڑا تھا۔

باری: ـ آپ قوم کی خدمت کرتے ہیں، میں قوم کی اور اخبار کی خدمت کرتا ہوں لیکن اس خدمت کا معاوضہ مجھے وقت پر کبھی نہیں ملتا بلکہ یوں کہیے کہ ملتا ہی نہیں۔ چار مہینے میں آپ نے صرف سولہ روپے دیئے ہیں۔ خدا کا خوف کیجئے۔ میں انسان ہوں، پتھر نہیں ہوں۔ مجھے بھوک بھی لگتی ہے۔ کبھی کبھی مٹھائی کھانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ مجھے آپ نے اس اخبار کا ایڈیٹر بنایا تھا۔ سنیاسی یا سادھو نہیں بنایا تھا جو میں نے دنیا تیاگ دی ہو۔"
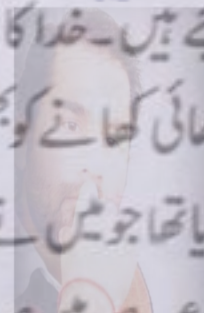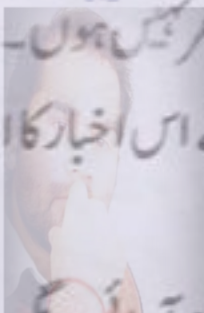
چار ماہ کے عرصے میں صرف سولہ روپے! ممکن ہے یہ مبالغہ آرائی ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ جب روزنامہ "احسان" میں کام کرتے تھے تو انہیں دفتر سے ردی چرا کر اپنے اخراجات پورے کرنے پڑتے تھے۔ ان دنوں راجہ مہدی علی خاں بھی وہیں ملازم تھے۔ باری صاحب آدمی بڑے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مخلص تھے جب انہوں نے دیکھا کہ ردّی بیچ کر کچھ نہ کچھ وصول ہو جاتا ہے تو انہوں نے راجہ کو بھی اس وسیلے سے آگاہ کر دیا۔ باری صاحب طبعاً اعتدال پسند اور محتاط تھے لیکن راجہ دھڑلے کا آدمی تھا۔ اس نے ایک دو بار تو صرف بنڈل چرائے اس کے بعد اس نے باری صاحب سے کہا۔ ”یہ خوردہ فروشی غلط ہے مولانا ___ میں کل دو بوریاں لاؤں گا انہیں بھر کر لے جائیں گے!“

باری صاحب ڈر گئے، لیکن راجہ صاحب نے ان کو اس بڑی ڈکیتی پر آمادہ کر لیا۔ باری صاحب پہرہ دیتے رہے اور راجہ بوریوں میں ردّی بھرتا رہا۔ مزدور بلوائے گئے اور انہیں اٹھوا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ راجہ کا بیان ہے کہ اس دن دونوں نے سینما دیکھا تھا۔

راجہ مہدی علی خاں سے روایت ہے کہ ان دونوں کو ایک دفعہ بازاروں میں بھیک مانگنی بھی پڑی تھی۔ اسکیم باری صاحب نے بنائی تھی، لوگوں کے آگے دستِ سوال کیوں کر دراز کیا جائے گا۔ مسکین اور قابلِ رحم شکل و صورت کیسے بنائی جائے گی۔ اپنا دکھڑا کس انداز سے اور کن الفاظ میں سنایا جائے گا، یہ سب باری صاحب نے خود سوچا اور مرتب کیا تھا۔ لیکن بھیک کے جھولی پھیلانے کا موقعہ آیا تو باری صاحب جھینپ گئے اور بمشکل دو ڈھائی آنے جمع کر سکے۔ اس کے برعکس راجہ نے پونے تین روپے اکھٹے کیے۔

یہاں راجہ کے بیان کیے ہوئے ایک لطیفے کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

غالباً انارکلی میں راجہ بھیک مانگ رہا تھا، سامنے سے ایک گوجر سر پہ دودھ کا بہت بڑا ولٹوہا اٹھائے چلا آرہا تھا۔ راجہ نے جو باری صاحب سے انسانی نفسیات پر کچھ لیکچر سُن چکا تھا اندازہ لگایا کہ اسامی مالدار ہے اگر میں اس سے اپنی حالتِ زار بیان کروں گا تو اس کا دل ضرور پسیج جائے گا۔ راجہ کا خیال تھا کہ اس سے کم از کم ایک روپیہ تو ضرور مل جائے گا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھا۔ باری صاحب نے جو کچھ بتایا تھا بڑے خلوص کے ساتھ گوجر کو سنایا اس نے راجہ سے کہا۔ ”ذرا ہاتھ دینا میرے ولٹوہے کو۔“ راجہ نے کافی زور صرف کر کے اس کے سر کا بوجھ اتارنے میں مدد دی۔ جب ولٹوہا اتر گیا تو گوجر نے اپنے تہمد کا ڈب کھولا۔ اس میں کئی نوٹ اور بہت سا کریانہ تھا لیکن اس نے ان میں سے صرف ایک پیسہ نکالا اور راجہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور ستم بالائے ستم اس سے یہ کہا ”لو“ جوان اب ولٹوہا رکھوا دو میرے سر پر۔“

اور یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ باری صاحب اور حسن عباس، مفلسی کے زمانے میں پیٹ میں کچھ ڈالنے کے لئے اس پھلوں کی دوکان سے رات کے وقت اکثر کیلے اور سیب چرایا کرتے تھے جس کے اوپر انہوں نے ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس میں بجلی کا کنکشن نہیں تھا مگر باری

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

صاحب نے حسن عباس کو اپنا "بجلی گھر" بنانے کی ترکیب سمجھا دی تھی، چنانچہ وہ ایک زمانے تک میونسپلٹی کے تار سے اپنا تار جوڑ کر یہ کمرہ روشن کرتے رہے۔

مجھے ایک اور لطیفہ یاد آگیا جو پرانی انارکلی کے اسی کمرے سے متعلق ہے جہاں باری صاحب اور حسن عباس اکھٹے رہتے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں غالباً سات برس کے بعد بمبئی سے آیا تھا۔ اس دوران میں معمولی خط و کتابت رہی تھی۔ حسن عباس مجھے امرتسر کے اسٹیشن پر مل گیا تھا۔ ان دنوں شراب پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اسپنسر والے ربڑ ٹائر گاڑیوں پر اسے عام بیچتے پھرتے تھے۔ عباس سے بڑی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی، چنانچہ اس خوشی میں ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ صبح ہی سے شروع کر دینی چاہئے تاکہ جذبات گھٹے گھٹے نہ رہیں، جو بات کی جائے کھل کے کی جائے۔ یہ فیصلہ ہوتے ہی ہم نے اپنے دل کی چابیاں جونی واکر کے حوالے کر دیں۔

خیال تھا کہ باری صاحب اسٹیشن پر موجود ہوں گے مگر بقول حسن عباس، وہ حسب معمول ذیل الدہر نکلے۔ تانگہ لے کر ہم نے انہیں ادھر اُدھر تلاش کیا اور آخر ڈھونڈ نکالا۔ وہ اس لئے چھپ گئے تھے کہ انہوں نے میری آمد کے ساتھ ہی شراب کا سیلاب دیکھ لیا تھا اور بند باندھنے میں مصروف تھے۔ میں نے اور عباس نے انہیں بہت لعن طعن کی اور پرانی صحبتوں کا حوالہ دے کر ان کے عارضی زہد کی خوب مٹی پلید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک دم خم کے خُم انڈیلنے پر آمادہ ہو گئے۔

معلوم نہیں ان دنوں ابو سعید قریشی، بی۔ اے کا قلعہ سر کرنے کے لئے اپنے آخری حملے کی تیاری کر رہا تھا یا اس قلعے کو فتح کرنے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ بہر حال وہ ہمیں کسی نہ کسی طرح مل گیا — اس میں اور پرانے سعید قریشی کے باپ میں کوئی فرق نہیں تھا، اسی طرح وہ اب بھی عمرِ خیام کی رباعیاں خریدتا تھا اور نہر کے کنارے، چاندنی رات اور گل عذار معشوق کے خواب دیکھتا تھا۔ باری صاحب نے تجویز پیش کی کہ اس جرم کی سزا اس کو یہ دی جائے کہ وہ ایک عدد جونی واکر خرید لے۔ مجرم نے یہ سزا قبول کی اور فوراً بھگت لی۔

پرانی انارکلی کے اس تاریخی کمرے میں ہم سب جمع تھے۔ میں، باری صاحب، ابو سعید قریشی، حسن عباس اور عبداللہ ملک (جو آج کل زیادہ خوبصورت ہے) تھوڑے عرصے کے لئے راجندر سنگھ بیدی بھی آیا۔

باری صاحب حسب توفیق صفائی پسند تھے۔ اپنے میز کی جھاڑ پونچھ اور اس کے بناؤ سنگھار میں کافی وقت صرف کرتے تھے لیکن اس معاملے میں وہ بالکل بچوں کے مانند تھے۔ ناخن کاٹنے کی چھوٹی سی قینچی ہے۔ وہ بھی اپنے قلمدان کے ساتھ سجاوٹ کے طور پر وہاں رکھ دی ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ساتھ ہی شیو کرنے کا استرا پڑا ہے کہیں سے گول بٹہ مل گیا ہے تو اسے آپ نے پیپر ویٹ بنالیا ہے۔ کتابوں کے اوپر کاغذ کے گرد پوش چڑھے ہوئے ہیں، ان کے اوپر سوئی دھاگہ رکھا ہے، ایک فائل ہے اس میں مختلف رسالوں سے کاٹی ہوئی تصویریں جمع ہیں ___ باری صاحب کو قینچی استعمال کرنے کا بہت شوق تھا۔ معلوم نہیں کیوں۔ ہوسکتا ہے اس لئے کہ وہ اخبار کی کاپی خود ہی جوڑا کرتے تھے۔ یہ کام نیوز ایڈیٹروں کے فرائض میں اب بھی داخل ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اخبار کی کاپی جوڑنے سے پہلے ان کو اس اوزار سے کیوں اتنی رغبت تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ امرتسر میں روزنامہ ''مساوات'' کے دفتر میں وہ انگلیوں میں قینچی پھنسا کر جب کاپی جوڑنے بیٹھتے تھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کوئی بہت دل پسند کام شروع کرنے والے ہیں۔

انکا میز عام طور پر دیوار کے ساتھ لگا ہوتا ہے اس طرح کہ جب باری صاحب لکھنے بیٹھیں تو دیوار اُن کے سامنے ہو۔ لکھتے وقت کوئی روک ان کی آنکھوں کے سامنے ہونی ضروری تھی۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں نے گھر میں اپنے میز کا رخ بدل دیا۔ باری صاحب کو کچھ لکھنا تھا کرسی پر بیٹھے تو بے چینی محسوس کرنے لگے۔ میں نے وجہ دریافت کی تو کہا۔ ''جب تک میری آنکھوں کے سامنے کوئی روک نہ ہو۔ میں نہیں لکھ سکتا۔ اور یہ کہہ کر ورلڈ اٹلس اٹھائی اور اپنے سامنے رکھ لی۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے، لیکن میں مجبور ہوں، پرانی انارکلی کے کمرے سے نکل کر خدا معلوم کہاں جارہا ہوں۔ لیکن آپ مجھے معاف کردیجئے جو بات ذہن میں اُبھرتی ہے، میں اسی وقت قلم بند کر دیتا ہوں کہ بھول نہ جاؤں۔

ابھی ابھی جب میں نے تصور میں انہیں لکھتے دیکھا تو وہ اپنے دانت رگڑ رہے تھے۔ یہ باری صاحب کی عادت تھی۔ لکھنے کے دوران میں وہ اپنے دانت ضرور کٹکٹاتے تھے، جیسے غصے میں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گول گول حروف لکھتے تھے ___ اتنے گول کہ بعض اوقات میرے لئے ان کی عبارت کے اکثر لفظ ایک دوسرے کے توام ہوتے تھے۔

پرانی انارکلی کے اس تاریخی کمرے میں ان کے میز کے ساتھ والی دیوار پر وہ تاریخی گروپ بھی آویزاں تھا جو ہم نے امرتسر میں اتروایا تھا۔ اس میں عباس ہے، میں ہوں، باری صاحب ہیں اور ابوسعید قریشی بھی موجود ہے۔ باری صاحب نے اس فوٹو کے نیچے شاید ''امرتسر اسکول آف تھاٹ'' لکھا ہوا تھا۔ یہ باری مرحوم کو بہت عزیز تھا۔ ''ملاپ'' یا ''پرتاپ'' کے دفتر میں کام کرتے ہوئے اپنا کوٹ کھونٹی سے لٹکا کر جب آپ سگریٹ لینے کے لئے باہر نکلے تھے اور سیدھے برما جا پہنچے تھے تو اپنے ساتھ یہ گروپ لیتے گئے تھے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں جب اس کمرے میں جو عباس اور باری صاحب کا گھر تھا، داخل ہوا تو سب سے پہلے باری صاحب نے مجھے یہ گروپ دکھایا اور اپنے مخصوص انداز میں جس میں بچوں کی بالیاں پہننے والی خوشی گھلی ہوئی تھی۔ کہا۔ "خواجہ صاحب یہ دیکھئے ____" اس کے آگے وہ اور کچھ نہ کر سکے۔ لیکن ان کے چہرے کے تمام خدو خال اپنی سیاہ قبا اتار چکے تھے اور مسکرا رہے تھے۔

مرحوم کو مجھ سے بہت محبت تھی۔ ان کو مجھ پر ناز بھی تھا مگر اس کا اظہار انہوں نے میرے سامنے کبھی نہیں کیا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے کبھی کسی سے اس انداز سے کہا ہو کہ منٹو میرا بنایا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ مجھے تحریر و تصنیف کے راستے پر ڈالنے والے وہی تھے۔ اگر امرتسر میں ان سے میری ملاقات نہ ہوتی تو ہوسکتا ہے کہ میں ایک غیر معروف آدمی کی حیثیت میں مر کھپ گیا ہوتا۔ یا چوری ڈکیتی کے جرم میں لمبی قید کاٹ رہا ہوتا۔

میں اور عباس بقول باری صاحب کافی "گٹ" تھے ایک شراب کا، دوسرا اتنی طویل مدت کے بعد ملنے کا نشہ، ہم سب جھوم رہے تھے ____ ابو سعید قریشی کی بوتل کھولی گئی اور دور شروع ہوگئے۔ باری صاحب پی کر بہت دلچسپ ہوجاتے تھے۔ وہ کپڑوں کے جزدان میں لپٹے اور کرسی کے بجائے رحل پر بیٹھے ہونے کی تصویر پیش کیا کرتے تھے۔ شراب کے چند گھونٹوں کے بعد ایک مختلف شکل اختیار کرلیا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں وہ مزاحیہ اور فرحیہ عنصر جو اکثر شرعی پیجامہ پہنے، رہتا تھا، بے ریش و بروت ہوکر سامنے آجاتا تھا۔ اس وقت جی چاہتا تھا کہ وہ بولتے رہیں اور ہم سنتے رہیں اور یہ واقعہ ہے کہ ایسے وقتوں میں کسی اور کو بولنے کا موقع بھی وہ شاذ و نادر ہی دیتے تھے۔

راجندر سنگھ بیدی، روسی ناول نویس شولوخوف کے "اینڈ کوئیٹ فلوز دی ڈون" کے متعلق بات چیت کر رہا تھا۔ یہ ناول ہم میں سے کسی نے بھی نہیں پڑھا تھا لیکن بیدی کچھ اس انداز سے گفتگو کر رہا تھا کہ مجھے خواہ مخواہ اس میں شریک ہونا اور یہ ظاہر کرنا پڑا کہ ناول میرا پڑھا ہوا ہے جب میں نے اس کا اظہار کیا تو بیدی بوکھلا سا گیا۔ باری صاحب تاڑ گئے کہ معاملہ کیا ہے اور شولوخوف کی ناول نویسی پر ایک لیکچر شروع کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیدی کو تھوڑی دیر کے بعد بڑے بینڈے پن سے اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ اس نے شولوخوف کا زیر تبصرہ ناول نہیں پڑھا۔ میں نے بھی حقیقت کا اظہار کردیا۔ باری صاحب خوب ہنسے اور آخر میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں حاضرین کو بتایا کہ شولوخوف کا نام انہوں نے پہلی مرتبہ بیدی صاحب کے منہ سے سنا ہے اور اس کی ناول نویسی پر جو لیکچر انہوں نے پلایا ہے، ان کی دماغی اختراع ہے ___ راجندر سنگھ بیدی کو بہت دور جانا تھا اس لئے وہ اجازت لے کر چلا گیا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

غالباً دسمبر کے دن تھے۔ سخت سردی تھی۔ میں چونکہ ایک مدت تک باہر رہا تھا اس لئے یہ سردی خاص طور پر مجھے بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ لوہے کی انگیٹھی موجود تھی۔ باری صاحب نے فوراً آگ کا انتظام کر دیا، دروازہ کھول کر باہر گئے اور تھوڑی سی لکڑیاں لے آئے۔ ان کو انگیٹھی میں قرینے سے رکھ کر انہوں نے جونی واکر کی بوتل کھولی اور کچھ چھینٹے لکڑیوں پر مارے پھر ''زرتشت، زرتشت'' کہتے ہوئے ان کو ماچس دکھائی جب آگ سلگ اٹھی تو سجدے میں چلے گئے۔

سجدے کا ذکر آیا تو مجھے یاد آ گیا کہ وہ بڑے سجدہ گزار تھے، ایک زمانہ تھا کہ وہ امرتسر میں پانچ کے بجائے کبھی آٹھ، کبھی دس وقت نماز پڑھا کرتے تھے۔ وہ بیٹھک جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے اس کا نام انہوں نے ''دارالاحمر'' رکھا ہوا تھا۔ یہاں جب بھی ان کو نماز ادا کرنے کی حاجت محسوس ہوتی، بی بی جان (میری والدہ مرحومہ) کو آواز دیتے اور پانی کا لوٹا اور جاء نماز منگوا لیتے، یہ تو ان کے من کی موج کا قصہ ہے لیکن جب کبھی ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو میں یا عباس اس کو پکڑ لیتے تو وہ فوراً اپنے کان اینٹھنا شروع کر دیتے تھے۔ اور سہو کے لئے ایک دو سجدے بڑے خلوص کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

مجھے ایک اپنا سجدہ یاد آ گیا جو ابھی تک میرے ماتھے میں لٹک رہا ہے۔ یہ بھی امرتسر ہی کی بات ہے باری صاحب کو میری شراب نوشی پسند نہیں تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ بنتے ہیں ایک شام کو وہ میرے ساتھ سیر کرتے کرتے ریلوے اسٹیشن کے ریفریشمینٹ روم میں پہنچ گئے۔ میں نے بیرے کو سمجھا دیا کہ وہ میرے لئے وسکی لائے اور باری صاحب کے لئے جنجر جس میں ایک پیگ ''جن'' کا شامل ہو۔

باری صاحب کو کوئی نہ کوئی اور خاص طور پر پیٹ کا عارضہ ضرور لاحق رہتا تھا۔ میں نے ان سے کچھ پینے کے لئے پوچھا تو کہنے لگے، نہیں میں کچھ نہیں پیوں گا۔ میرا معدہ خراب ہے۔ باری صاحب ضدی نہیں تھے۔ تھوڑی سی لیکچر بازی کے بعد انہیں کسی بات پر بھی آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ادرک کے فائدے بتائے اور کہا کہ جنجر کا پانی ان کے معدے کی تمام خرابیاں دور کر دے گا۔ آپ راضی ہو گئے بیرے نے ان کے سامنے بوتل گلاس میں انڈیلی۔ میں نے وسکی پینا شروع کر دی اور باری صاحب نے جنجر جس میں 'جن' شامل تھی۔ یہ محلول جب ان کے حلق سے اترا تو ان کو فرحت حاصل ہوئی، میں نے اپنی وسکی ختم کر کے جب دوسرا پیگ طلب کیا تو انہوں نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ ایک جنجر اور پئیں گے۔ بیرا اُسی قسم کا ایک اور مشروب تیار کر کے لے آیا۔

باری صاحب کو بہت لطف آیا مجھ سے کہا۔ ''ادرک کے فائدے میں نے طب کی کسی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کتاب میں پڑھے تھے، واقعی بڑے معرکے کی چیز ہے۔ وہ بوجھ سا وہ اُلجھن سی جو میں صبح سے محسوس کر رہا تھا، بالکل غائب ہے۔

میں ہنس پڑا۔ اس کے بعد مجھے ان کو بتانا پڑا کہ معرکے کی چیز کون سی تھی۔ وہ بہت خفا ہوئے بلکہ یوں کہئے کہ ان کو بہت دُکھ ہوا۔ میری طفلانہ حرکت انہوں نے معاف تو کر دی مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ انہیں سخت روحانی کوفت ہوئی ہے چنانچہ میں نے ان سے صدق دل سے وعدہ کیا کہ میں آئندہ کبھی شراب نہیں پیوں گا بیرا ابھی لایا تو باری صاحب نے پنسل سے اس پر اقبال کا یہ مصرعہ لکھ دیا۔

یارب درونِ سینہ دل باخبر بدہ

مجھ پر اس واقعے کا بہت اثر ہوا۔ اتنا اثر کہ جب میں رات کو گھر لوٹا تو گلی کے فرش پر میں نے سجدہ کیا اور خدا سے دعاء مانگی وہ مجھے اپنے ارادے میں ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس گناہ کو جو مجھ سے سرزد ہوا ہے معاف کر دے، اس سجدے سے طبیعت کا بوجھ تو ہلکا ہو گیا مگر ایک اور بوجھ اس پر لد گیا کہ اب میں پی نہیں سکتا تھا۔ کئی دن گزر گئے ہر وقت اداسی چھائی رہتی تھی۔ لیکن دل کو پرچانے کے لئے یہ بات موجود تھی کہ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں اور ایک لعنت سے بچنے کی کامیاب کوشش کر رہا ہوں۔

ایک دن شام کو باری صاحب آئے۔ میں کھڑکی میں بیٹھا تھا، انہوں نے باہر گلی میں کھڑے کھڑے میرا مزاج پوچھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”کیا پوچھتے ہیں۔

بس ٹھیک ہے!

باری صاحب نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“

جب وہ آئے تو ان کے پیجامے میں شراب کا ادھا اڑسا ہوا تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ میں نے ان سے کچھ کہنا چاہا۔ مگر انہوں نے سننے سے انکار کر دیا۔ اور بوتل کھولنا شروع کر دی۔ اتنے میں عباس آ گیا۔ باری صاحب کے کہنے پر سب دروازے بند کر دئے گئے۔ اندر سے روٹی منگوائی گئی۔ جو کسی نے بھی نہ کھائی سالن وغیرہ الگ رکھ لئے گئے۔ اور گلاس چھوڑ کر باقی برتن واپس بھیج دئے گئے۔ عباس کنویں سے لوٹے میں پانی لایا اور ہم سب نے پی۔ وہ سجدہ جو میں نے گلی کے ٹھنڈے فرش پر اس رات خدا کے حضور ادا کیا تھا میری پیشانی میں تڑپتا رہا۔

ہم پی رہے تھے تو حسن عباس نے چھیڑنے کی خاطر باری صاحب سے کہا —— ”آپ کی یہاں سب عزت کرتے ہیں۔ بی بی جان آپ کو نمازی اور پرہیزگار کی حیثیت سے جانتی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہیں۔ ان کے دل میں آپ کا اتنا احترام ہے ۔___ اگر وہ یہاں آجائیں تو کیا ہو؟''

باری صاحب نے کہا۔'' میں کھڑکی کھول کر باہر کود جاؤں گا۔ اور پھر کبھی ان کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔''

باری صاحب ہمیشہ اپنی زندگی کی کوئی نہ کوئی کھڑکی کھول کر باہر کود جاتے رہے، یہ کھڑکی کھلی رہتی۔ مگر وہ پھر کبھی اس کو اپنی شکل نہ دکھاتے۔

کھڑکی کھول کر باہر کود جانے سے کسی تضحیک کا ناتا نہیں جوڑ رہا۔ اصل میں وہ نظام جو انگریزوں سے متعلق تھا۔ اور جس میں باری مرحوم نے انگوٹھا چوسنے سے لے کر قلم چوسنے تک، اور قلم چوسنے سے لیکر اپنا خون چُسانے تک کے تمام مراحل افتاں وخیزاں طے کئے اور اس کے بعد وہ نظام جس میں انہوں نے اقبال مرحوم کی ان تینوں لاکے سائے میں جو ریڈیو پاکستان نے اپنے پروگراموں میں بے نیام کی تھیں، اپنی زندگی کی شام کے آخری دھندلکوں کو سنوارنے کی کوشش کی، ایسی بے شمار کھڑکیوں سے پُر تھا، جن کے کھٹکے باہر کود جانے کی ہلکی سی خواہش پر بھی خود بخود کھل جاتے تھے۔

پھر دیکھئے، میں کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔ بات پرانی انارکلی کے اس کمرے کی ہو رہی تھی جہاں دسمبر کی خون منجمد کر دینے والی سردی میں ہم پی رہے تھے اور باری صاحب تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد باہر جاتے اور انگیٹھی کی آگ برقرار رکھنے کے لئے کہیں سے ایندھن لے آتے تھے۔ بہت دیر کے بعد ملنا ہوا تھا۔ اس لئے وقت گزرنے کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ باری صاحب زرتشت کی'' اگیاری'' کے لئے کتنی مرتبہ ایندھن لائے، یہ بھی یاد نہیں، لیکن ابھی تک یہ ضرور یاد ہے کہ جب میں صبح کمرے سے باہر نکلا تو بازار کی طرف لکڑی کا جو شکستہ سا جنگلہ تھا۔ بالکل غائب تھا۔ اس کی راکھ البتہ کمرے میں انگیٹھی کے اندر موجود تھی۔ عباس نے باری صاحب کو دھڑکایا، کہ اگر مالکِ مکان کو علم ہو گیا کہ وہ جنگلہ جلا جلا کر آگ تاپتے رہتے ہیں تو وہ '' کباب'' ہو جائے گا۔ اور بیک بنی و دو گوش ان کو نکال باہر کرے گا۔ باری صاحب جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں بہت ڈرپوک تھے۔ عباس نے جب ان کو اس غیر واجب حرکت سے آگاہ کیا تو وہ کھسیانے سے ہو گئے۔ بات کو ہنسی میں اڑانے کی بھونڈی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ آخر میں نے عباس سے کہا۔ ہم اس کو خبر ہونے سے پہلے ہی نکل جائیں گے۔''

لیکن مصیبت یہ ہے کہ نکل جانے سے پہلے ان کے علاوہ ہر ایک کو خبر ہو جاتی تھی۔ وہ جب ملاپ یا پرتاپ کے دفتر سے کھونٹی سے اپنا کوٹ لٹکا کر سگریٹ لینے کے لئے باہر نکلے اور برما پہنچ گئے۔ تو ان کا یہی خیال تھا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوگی، مگر جاننے والے جانتے تھے کہ وہ کدھر کا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

رُخ کیے ہیں۔

باری صاحب نے مختلف چھوٹے بڑے شہروں کی رصدگاہوں میں اپنی قسمت کے ستاروں کا مطالعہ کیا۔ لیکن گھوم پھر کر آخر انہیں لاہور ہی کی رصدگاہ میں آنا پڑا جو کسی زمانے میں عرب ہوٹل میں تھی۔ اور بعد میں نگینہ بیکری میں اپنے جملہ سازو سامان کے ساتھ اُٹھ آئی تھی۔ یہاں اور وہاں بڑے بڑے مہندس اور ستارہ شناس جمع ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ ان کی زندگی میں اپنے ستاروں سے آگے دوسرے جہانوں میں چلے گئے اور کچھ اپنے بے نور ستاروں کے لئے بلند نشینوں کی چمک دمک بھیک کے طور پر مانگتے رہے۔

باری صاحب کو جب کبھی میں نے ان محفلوں میں دیکھا، مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ گرم گرم کالی کوفی کا پیالہ ہیں۔ جس میں سے بھاپ کا دھواں اُٹھ رہا ہے، جو صرف چند لمحوں کے لئے فضا میں لہراتا بل کھاتا ہے اور پھر اس کی نمی آغوش میں سو جاتا ہے ___ ان محفلوں میں، ان کنکنی، گرم و سرد، صحبتوں میں ان کے وزنی سر کی ہنڈیا سے طرح طرح کے ذہنی ماکولات کی خوشبودار بھاپ اٹھتی مگر ان ہوٹلوں اور بیکریوں کی کثیف فضا میں تھوڑی دیر اپنی نزاکت اور ندرت پر اترا اترا کر وہیں سو جاتی۔

باری صاحب باتوں کے بادشاہ تھے۔ کوچہ وکیلاں کے ''دارالاحمر'' میں جب وہ ولی اللہ (گاؤ تکیئے کو وہ ولی اللہ کہا کرتے تھے۔) کا سہارا لیکر بیٹھتے تو دلچسپ باتوں کے دریا بہنے شروع ہو جاتے تھے۔ اُن دنوں سرور صاحب (آفاق کے مُدیر) بھی کبھی کبھی تشریف لاتے تھے۔ آپ میری حرکات و سکنات میں گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ باری صاحب کی طرح وہ بھی میری حوصلہ افزائی فرمایا کرتے اور باتوں باتوں میں مجھے یقین دلاتے تھے کہ میں بہت جلد تحریر و تصنیف کے قابل ہو جاؤں گا۔

امرتسر کا ذکر آیا تو مجھے ایک دلچسپ لطیفہ یاد آ گیا۔ میں، باری صاحب، حسن عباس اور ابو سعید قریشی اپنی محفل میں کسی اور کی شمولیت پسند نہیں کرتے تھے۔ کامریڈ فیروز الدین منصور سے ہم سب کی صاحب سلامت تھی۔ کبھی کبھی وہ بھی ''دارالاحمر'' تشریف لے آتے تھے، مگر ان کی تشریف آوری ہم سب کو ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ باری صاحب ازراہِ مذاق کہا کرتے تھے کہ کامریڈ صاحب پوٹاشیم پرمینگنیٹ سے بم بناتے ہیں۔ عباس ان کو فراڈ الدین منصور کہتے تھے۔ کچھ دیر ہم ان کا آنا جانا برداشت کرتے رہے، آخر باری صاحب کو ایک ترکیب سوجھی۔ کامریڈ ایف ڈی منصور کمرے میں داخل ہوئے تو باری صاحب نے بڑے بھونڈے طریقے سے آنکھ مار کر عباس

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سے کہا "خواجہ صاحب ــــ چلئے پھر کہیں دیر نہ ہو جائے" اور اٹھ کر کھڑکیاں بند کرنا شروع کر دیں ــــ منصور صاحب جو بیٹھنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے، ہمارے ساتھ چل پڑے، بازار میں نکل کر باری صاحب نے ان سے معذرت طلب کی اور ہم ایک چکر کاٹ کر پھر "دارالاحمر" واپس آ گئے ــــ باری صاحب بہت خوش تھے۔ اتنے خوش کہ وہ دیر تک ہنس ہنس کر دوہرے ہوتے رہے۔

باری صاحب بہت معمولی معمولی باتوں پر خوش ہو جایا کرتے تھے۔ ان کی خوشی جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں، بالکل بچوں کی سی خوشی ہوتی تھی، اس میں تالیاں پیٹنے کا شور ہوتا تھا۔ ان کی توند بڑھی ہوئی تھی (جس کے متعلق وہ ہمیشہ فکر مند رہتے تھے) جب وہ ہنستے تھے تو یہ بھی ہنسا کرتی تھی۔

بہت مخلص آدمی تھے اتنے مخلص کہ انہوں نے اپنی آنے والی موت سے بھی کوئی لڑائی جھگڑا نہ کیا۔ اصل میں وہ لڑائی بھڑائی سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔ ان کی طبیعت صلح کن تھی۔ یہ دل کا عارضہ ان کو بہت دیر سے تھا۔ مگر اس کا علاج انہوں نے جب بھی کیا مصالحت آمیز طریقے سے کیا۔ اس کی مدافعت میں ان سے کبھی جارحانہ قدم نہ اٹھا۔

مجھے یاد ہے مرنے سے دو روز پہلے میری ان سے مڈبھیڑ میو روڈ پر ہوئی۔ بوہڑ والے چوک سے دائیں ہاتھ کو ان کا تانگہ جا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو اُسے رکوالیا۔ میں ان سے ناراض تھا۔ سخت ناراض، اس لئے کہ وہ دُور دُور رہتے تھے۔ انگریزوں کے ہائی کمیشنر کے دفتر میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد وہ کچھ ایسے بُجھ گئے کہ اپنے بے تکلف دوستوں سے اگر ان کی ملاقات محض اتفاقیہ طور پر ہو جاتی، تو عجیب و غریب سا حجاب محسوس کرتے۔

میں ان کے پاس پہنچا تو وہ تانگہ سے اترے، مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور میری خیریت دریافت کی۔ یہ رسوم مجھے بہت بُری معلوم ہوئیں۔ میں نے ان سے کہا ــــ باری صاحب آپ بہت ذلیل ہو گئے ہیں۔ اتنے ذلیل کہ آپ نے مجھ سے ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا ہے ــــ آپ نے انگریز کی نوکری کیا کی ہے، اپنا سارا کریکٹر تباہ کر لیا ہے۔"

میری لعن طعن کے جواب میں گھٹی گھٹی، بیمار بیمار سی مسکراہٹیں۔ ان کے اودے ہونٹوں پر بکھرتی رہیں۔ ان کے چہرے کا رنگ کسی قدر زرد تھا اور آواز نحیف تھی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "خیر چھوڑیئے اس قصے کو۔ یہ بتایئے آپ کا مزاج کیسا ہے؟"

میرے اس سوال کے جواب میں انہوں نے بڑی سنجیدگی سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ ایک عرصے سے دل کے عارضے میں مبتلا ہیں۔ سینکڑوں علاج کر چکے ہیں۔ مگر کوئی افاقہ نہیں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ میوروڈ پر کوئی ہومیو پیتھ ہے، اب وہ اس سے رجوع کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے ازراہِ مذاق کہا۔ "یہ رصد گاہ باقی رہ گئی تھی۔ جہاں آپ اپنے ستاروں کا مطالعہ فرمانے جارہے ہیں ___ چھوڑیے باری صاحب آپ کو کوئی عارضہ وارضہ نہیں۔ آپ کو صرف وہم کی بیماری ہے۔ جس کا علاج، سنا ہے لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا ___ آپ زیادہ کھاتے ہیں۔ اس لیے آپ کا معدہ خراب رہتا ہے۔ تبخیر کے باعث جو بخارات اٹھتے ہیں آپ کے دل پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے جسے آپ نے بتنگڑ بنا رکھا ہے۔"

میری بات ان کے دل کو لگی۔ (اُن کے دل کو ہر بات لگ جاتی تھی) کہنے لگے۔ "میرا خیال ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ تبخیر کی شکایت تو مجھے ہے......اور بعض ڈاکٹروں کی تشخیص بھی یہی کہتی ہے۔"

بہت دیر تک میری ان کی باتیں ہوئیں۔ مجھے انہوں نے بتایا کہ وہ تاریخ عالم (کئی جلدوں میں ایک مبسوط کتاب جو مرحوم مکمل نہ کر سکے) دوبارہ پھیلا کر لکھ رہے ہیں اور ترکی زبان میں پنجابی الفاظ تلاش کر رہے ہیں۔

مرحوم کو پنجابی زبان سے بہت محبت تھی، ایک زمانہ تھا کہ وہ پنجابی کو پنجاب کی قومی زبان بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ اُن دنوں وہ غالباً سکھوں کے اخبار "اجیت" کے ایڈیٹر تھے۔ جہاں بیٹھتے تھے اپنی نت نئی اسکیموں کا ذکر چھیڑ دیتے تھے۔ جن کے ذریعے سے وہ اردو کے بجائے پنجابی رائج کرنا چاہتے تھے۔ ہر ملنے والے کو تلقین کرتے کہ اُردو کی بجائے اپنی مادری زبان پنجابی میں لکھا کرے۔ ان کا کہنا تھا کہ صرف وہی زبان جاندار ہوتی ہے۔ جس میں دی ہوئی گالی وزن دار ہو اور انفرادیت رکھتی ہو۔ ان کا ایمان تھا کہ دنیا کی کوئی زبان گالیوں کے معاملے میں پنجابی کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے اور پُر لطف بات یہ ہے کہ خود باری صاحب نے اپنی زندگی میں ایک سطر بھی پنجابی زبان میں نہ لکھی۔

تقسیم سے پہلے انارکلی میں ایک کیلاش ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس میں "بار" بھی تھی۔ مقدمات کے سلسلے میں جب لاہور آتا تو چوہدری نذیر کے ساتھ اس ہوٹل میں دو تین محفلیں ضرور جمتی تھیں۔ جن میں باری صاحب کو شریک ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ہم بالائی منزل پر چلے جاتے اور وسکی کے دور شروع ہو جاتے۔ ایک سکھ بیرا تھا۔ باری صاحب جب دو پیگ پی لیتے تو اس سے ٹھیٹ پنجابی میں گفتگو شروع کر دیتے۔ اس وقت ان کے دل و دماغ میں صرف پنجابی زبان کی ترویج کا خیال ہوتا لیکن چار پیگ کے بعد وہ کا تبادلہ کر اُردو کی طرف آجاتے اور اس کی عالمگیر،

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کے متعلق تقریر شروع کر دیتے اور کہتے کہ پنجابی غنڈوں اور لفنگوں کی زبان ہے، بہت غیر مہذب ہے۔ جو سماعت پر گراں گزرتی ہے۔ پانچویں اور چھٹے پیگ کے دوران میں اُردو سے ان کی والہانہ محبت سکڑتی رہتی۔ جب پانچواں پیگ اپنا کام کر جاتا تو وہ فارسی کی مٹھاس کے گرویدہ نظر آتے۔ ٹھیٹ ایرانی لہجے میں فارسی بولنے کی کوشش کرتے۔ مگر چھٹا اور ساتواں پیگ انہیں پشتوں کے پتھروں میں لڑھکانا شروع کر دیتا۔ آٹھویں اور نویں پیگ میں پنجابی، اردو، فارسی، پشتو اور عربی ان کے دماغ میں، کاک ٹیل، بن کر چھلکنے لگتی۔

مرحوم بولنے اور اپنی آواز آپ سننے کے بہت شائق تھے۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی جلسے میں تقریر کرتے، لیکن یار دوستوں کی محفل میں اپنا شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔ دہلی مسلم ہوٹل میں سے ایک دفعہ آپ ایک چمچہ اُڑا لائے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ جب ہم انار کلی کے وسط میں پہنچے تو آپ نے یہ چمچہ نکال کر بیلچے کے مانند اپنے کاندھے پر رکھ لیا اور چپ راست، چپ راست کرتے ایک دکان کے تھڑے پر چڑھ گئے۔ اور خاک ساروں کی تحریک پر ایک عدد تقریر اُگل کر رکھ دی۔ بے شمار آدمی جمع ہو گئے۔ لیکن باری صاحب جوش و خروش کے ساتھ بولتے رہے۔ اس کے بعد ہم نے چوک میں کھڑے ہو کر علامہ مشرقی زندہ باد کے نعرے لگائے پھر موتیے کے ہار خریدے اور اپنے اپنے گلے میں ڈال لئے۔ باری صاحب نے ایک ہار اپنی کلائی کے گرد لپیٹ لیا اور مجھ سے کہا۔ ”خواجہ صاحب، چلو ہیرا منڈی چلیں، موتیے کے ان پھولوں کی خوشبو کا رخ اسی طرف ہے۔“

ہم سب ہیرا منڈی پہنچے۔ باری صاحب کے سرور خوب گٹھے ہوئے تھے بہت دیر تک ہم اس منڈی کی تنگ و تاریک گلیوں میں گھومتے رہے۔ اس دوران میں باری صاحب نے کئی پٹھان ٹکھیائیوں سے پشتو میں بات چیت کی۔ ایک ایسی ٹکھیائی سے مصروف گفتگو تھے کہ ان کی جان پہچان کا ایک آدمی ادھر سے گزرا۔ باری صاحب نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ اس آدمی نے پوچھا۔ ”مولانا یہاں کیا ہو رہا ہے۔“ باری صاحب نے پٹھان کسبی کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ اس لڑکی سے سیاسیاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات کر رہا تھا۔“

صبح عباس نے باری صاحب کو رات کے تمام واقعات سنائے خوب مرچ لگا کر۔ اس انداز میں کہ وہ ندامت محسوس کریں۔ باری صاحب نے مجھ سے تصدیق چاہی تو میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔ ”باری صاحب، یہ واقع ہے کہ آپ نے کل رات بڑی ذلیل حرکتیں کیں۔ یہ آپ کی شایانِ شان نہیں تھیں۔“

باری صاحب بہت نادم ہوئے۔ اس قدر نادم کہ آپ نے فوراً وضو کر کے نماز پڑھنا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

شروع کر دی۔

باری صاحب کو مصلح بننے کا شوق تھا، ان کی دلی آرزو تھی کہ وہ ایک بہت بڑے رہنما بن جائیں۔ ہر چوک میں ان کا بُت نصب ہو۔ وہ کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دیں کہ آنے والی تمام نسلیں انہیں یاد رکھیں۔ مگر اس کے لئے جرأت اور بے باکی کی ضرورت تھی۔ اس قسم کی جرأت اور بے باکی جس کا مظاہرہ وہ کبھی کبھی پی کر ہیرا منڈی کی گلیوں میں پٹھان ٹکھیائیوں سے سیاست حاضرہ پر تبادلۂ خیالات کے دوران میں کیا کرتے تھے۔ لیکن جب کبھی ان سے ایسی جرأت اور بے باکی سرزد ہو جاتی تو وہ وضو کر کے نماز پڑھنا شروع کر دیتے اور اس کی آلائشوں سے خود کو پاک صاف کر لیتے۔

وہ قینچی کو انگلیوں میں پھنسا کر اپنے خیالات و افکار کے زرد زرد کتابت شدہ کاغذوں کو کاٹ کاٹ کر ساری عمر اپنی زندگی کی کاپی جوڑتے رہے مگر اسے پتھروں پر کبھی منتقل نہ کر سکے شاید اس خیال سے کہ وہ ان کے بوجھ تلے پس جائیں گے۔ ان کو ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کے پس جانے کا خدشہ لاحق رہتا تھا حالانکہ وہ تمام کو پیس کر سفوف بنا دینا چاہتے تھے اور اس سفوف کو نسوار کے طور پر استعمال کرنے کے خواہش مند تھے۔

وہ انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔ لیکن یہ طرفہ تماشا ہے کہ جب انگریز چلا گیا تو وہ ان کے نوکر ہو گئے۔ انہوں نے ''کمپنی کی حکومت'' جیسی باغیانہ کتاب لکھی لیکن اس کمپنی کے سابق ٹھیکہ داروں کی ملازمت میں انہوں نے اپنی زندگی کے چند آخری اور بڑے قیمتی برس گزارے۔

باری مرحوم سے میں اپنی آخری ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔ جب وہ کسی ہومیو پیتھ سے اپنے دل کے عارضے کا علاج پوچھنے جا رہے تھے۔ اس دل کا جو خلوص سے معمور تھا ___ جو اس قدر شریف تھا کہ اس نے باری صاحب کی بزدلی کا ساتھ دیا اور دھڑکنا بند کر دیا۔

میں نے انہی دنوں آغا حشر کے متعلق ایک مضمون لکھا تھا۔ (جو اس کتاب میں شامل ہے) اس میں جیجے کے ہوٹل میں باری صاحب سے پہلی بار ملاقات کرنے کا ذکر بھی تھا۔ باری صاحب نے یہ مضمون پڑھ کر مجھے ایک خط لکھا تھا۔ جس میں امرتسر کے ان ایام کی یاد تازہ کی تھی جب میں، ابوسعید، عباس، عاشق فوٹو گرافر اور باری صاحب مل کر بالکل خبطیوں کی طرح بازاروں میں گھوما کرتے تھے ___ بے مطلب بے مقصد ___ جب ہم نے ''فری تھنکرز'' جیسی اوٹ پٹانگ جماعت کی بنا ڈالی تھی۔ اس کے قواعد و ضوابط میں نمبر ایک پر یہ چیز تھی کہ فری تھنکر جو بھی چاہے کہے۔ کسی کو اس کا استحقاق حاصل نہیں ہو گا کہ وہ اس سے اس کے کسی فعل کے متعلق استفسار

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کرے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ہم چاروں جا رہے ہیں کہ اچانک باری صاحب موڑ مڑے اور ہم سے جدا ہو گئے۔ بڑی گرما گرم باتیں ہو رہی ہیں کہ اچانک عباس خاموش ہو گیا اور واپس چلا گیا۔

اس خط کے بارے میں باری صاحب سے مختصری گفتگو ہوئی۔ میں نے باری صاحب سے کہا کہ یوں تو انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کا حافظہ بہت تیز ہے لیکن وہ ان ایام کی بہت سی باتوں کا تذکرہ بھول گئے ہیں۔ باری صاحب نے نحیف آواز میں معذرت چاہی اور کہا کہ انہوں نے یہ خط بڑی رواداری میں لکھا ہے۔ حکایت بہت دراز تھی، لیکن انہیں سکون قلب میسّر نہیں تھا۔

انہوں نے سکونِ قلب کا ذکر کیا تو میں پھر ان کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ کیوں اپنے قلب کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں جو اچھا بھلا ہے ـــــ لیکن تیسرے روز صبح چھ بجے چائے کی پہلی پیالی پی کر میں نے سگریٹ سلگایا اور تازہ ''امروز'' کھولا تو پہلے صفحے پر یہ سُرخی نظر آئی کہ اشتراکی ادیب باری کا انتقال ہو گیا ـــــ کچھ عرصے کے لئے میں بالکل گم سم ہو گیا۔ میں نے پھر خبر کی طرف دیکھا۔ تین کالمی سرخی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کاپی جوڑتے وقت یہ سُرخی باری صاحب نے قینچی سے کاٹ کر خود اپنے ہاتھوں سے بڑے قرینے کے ساتھ جمائی ہے۔

اشتراکی ادیب باری، میرا دوست، میرا رہ نما، تمام عمر اپنی زندگی کی جلی اور خفی سرخیاں جماتا رہا۔ لیکن افسوس کہ وہ ان کے نیچے وہ مضمون نہ لکھ سکا۔ جو اس کے وزنی سر میں پرورش پاتے تھے۔ اور بھاپ بن کر لاہور کی بیکریوں اور ہوٹلوں کی کثیف فضا میں جذب ہو جاتے تھے۔

باری صاحب قبر میں ہیں۔ معلوم نہیں اس میں بھی کوئی ایسی کھڑکی ہے جس سے وہ کود کر باہر نکل سکیں۔

☆☆

# پارو دیوی
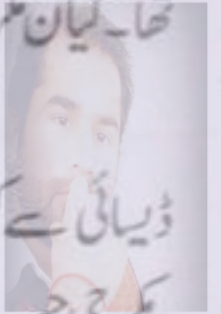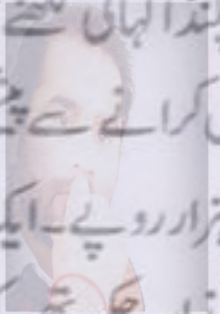
"چل چل رے نوجوان" کی ناکامی کا صدمہ دل و دماغ سے قریب قریب مندمل ہو چکا تھا۔ گیان مکرجی، فلمستان کے لئے ایک پروپگنڈا کہانی لکھنے میں ایک عرصے سے مصروف تھے۔

کہانی لکھنے لکھانے اور اسے پاس کرانے سے پیشتر نلنی جیونت اور اس کے شوہر ویریندر ڈیسائی سے کنٹریکٹ ہو چکا تھا۔ غالباً پچیس ہزار روپے۔ ایک سال اس کی میعاد تھی۔ مسٹر ششودھر مکرجی حسبِ عادت سوچ بچار میں دس مہینے گزار چکے تھے۔ کہانی کا ڈھانچہ تھا کہ تیار ہونے ہی نہیں آتا تھا۔ بصد مشکل جوں توں کر کے ایک خاکہ معرضِ وجود میں آیا جسے گیان مکرجی اپنی جیب میں ڈال کر دہلی روانہ ہو گئے تاکہ زبانی طور پر اس میں کچھ اور چیزیں ڈال کر حکومت سے پاس کرا لیں۔

خاکہ پاس ہو گیا، جب شوٹنگ کا مرحلہ آیا تو ویریندر ڈیسائی نے یہ مطالبہ کیا کہ اس کے ساتھ ایک برس کا اور کنٹریکٹ کیا جائے۔ اس لئے کہ پہلے معاہدے کی میعاد ختم ہونے والی ہے۔ رائے بہادر چونی لال منیجنگ ڈائریکٹر بڑے اکھڑ قسم کے آدمی تھے چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمہ بازی ہوئی۔ فیصلہ ویریندر ڈیسائی اور ان کی خوبرو بیوی نلنی کے حق میں ہوا۔ اس طرح پروپگنڈہ فلم جس کی کہانی کا ابھی صرف غیر مکمل خاکہ ہی تیار ہوا تھا پچیس ہزار روپوں کے بوجھ تلے آ گئی۔

رائے بہادر کو بہت عجلت تھی کہ فلم جلد تیار ہو، کیونکہ بہت وقت ضائع ہو چکا تھا، چنانچہ جلدی جلدی میں ولی صاحب کو بلا کر ان کی بیوی ممتاز شانتی سے کنٹریکٹ کر لیا گیا اور اس کو دو ہزار روپے بطور پیشگی ادا کر دیئے گئے۔ (بلیک میں یعنی بغیر رسید)

دو دن شوٹنگ ہوئی۔ ممتاز شانتی اور اشوک کمار کے درمیان مختصر سا مکالمہ تھا جو بڑی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مین میخ کے بعد فلمایا گیا، مگر جب اسے پردے پر دیکھا گیا تو سب نے ممتاز شانتی کو ناپسند کیا۔ اس ناپسندیدگی میں اس بات کا بھی بڑا دخل تھا کہ ممتاز برقع پہن کر آتی تھی اور ولی صاحب نے صاف طور پر مکر جی سے کہہ دیا تھا کہ اس کے جسم کو کوئی ہاتھ واتھ نہیں لگائے گا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ممتاز شانتی کو فلم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس بہانے سے کہ جو کردار اسے اس کہانی میں ادا کرنا ہے، اس کے لئے مناسب و موزوں نہیں ___ کیونکہ اس میں ایسے کئی مقام آئیں گے جہاں ہیروئن کو اپنے جسم کے بعض حصّوں کی عُریاں نمائش کرنی پڑے گی ___ قصہ مختصر کہ یہ چودہ ہزار بھی گئے۔

اب کہانی کا نامکمل ڈھانچہ اُنتالیس ہزار روپے کے نیچے دبا پڑا تھا ___ رائے بہادر چونی لال، لال پیلے ہو رہے تھے۔ ''چل چل رے نوجوان'' کی ناکامی نے کمپنی کی حالت بہت پتلی کر دی تھی۔ مارواڑیوں سے قرض لے لے کر گذارہ بصد مشکل ہو رہا تھا۔ رائے بہادر کی خفگی اور پریشانی بجا تھی۔

ایک دن میں، واچا، پائی اور اشوک اسٹوڈیو کے باہر کرسیوں پر بیٹھے کمپنی کی انہی حماقتوں کا ذکر کر رہے تھے جن کے باعث اتنا وقت اور اتنا روپیہ ضائع ہوا، کہ اشوک نے انکشاف کیا کہ جو چودہ ہزار رائے بہادر نے ممتاز شانتی کو دیئے تھے وہ انہوں نے اس سے قرض لئے تھے۔ اشوک نے یہ انکشاف اپنی کالی پنڈلی کو کھجلاتے ہوئے کچھ اس انداز سے کیا کہ ہم سب بے اختیار ہنس پڑے۔ لیکن فوراً ہی ہم چپ ہو گئے۔

سامنے بجری بچھی روش پر ایک اجنبی عورت ہماری بھاری بھرکم ہیئر ڈریسر کے ساتھ میک اپ روم کی طرف جا رہی تھی۔

دتا رام پائی نے اپنے کالے، موٹے اور بدشکل ہونٹ وا کئے اور خوفناک طور پر آگے بڑھے ہوئے اوندھے سیدھے میلے دانتوں کی نمائش کی۔ اور واچا کو کہنی کا ٹھوکا دے کر اشوک سے مخاطب ہوا۔ ''یہ ___ یہ کون ہے؟''

واچا نے پائی کے سر پر ایک دھول جمائی۔ ''سالے تو کیوں پوچھتا ہے ___؟''

پائی بدلہ لینے کے لئے اٹھا تو واچا نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ''بیٹھ جا سالے، مت جا ادھر ___ تیری تو شکل دیکھتے ہی بھاگ جائے گی۔''

پائی اپنے اوندھے سیدھے دانت پیستا رہ گیا۔ اشوک جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا، بولا ''شکل صورت سے تو اچھی خاصی ہے۔''

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں نے ایک لحظے کے لئے غور کیا اور کہا "ہاں ___ نظر دل پر گراں نہیں گزرتی۔"

اشوک میرا مطلب نہ سمجھا۔ کہاں سے نہیں گذرتی۔

میں مسکرایا۔ "میرا مطلب یہ تھا کہ جو عورت یہاں سے گذر گئی ہے، اسے دیکھ کر آنکھوں پر بوجھ نہیں پڑتا ___ بڑی صاف ستھری ہے لیکن قد کی ذرا چھوٹی ہے۔"

پائی نے پھر اپنے دانتوں کی نمائش کی۔ "ارے ___ چلے گی ___ کیوں واچا؟"

واچا، پائی کے بجائے اشوک سے مخاطب ہوا۔ "دادا منی تم جانتے ہو یہ کون ہے؟"

اشوک نے جواب دیا۔ "زیادہ نہیں جانتا، مکرجی سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ ایک عورت ٹیسٹ کے لئے آج آنے والی ہے۔"

کیمرہ اور ساؤنڈ ٹسٹ لیا گیا جسے ہم سب نے پردے پر دیکھا اور اپنی اپنی رائے دی۔

مجھے اشوک اور واچا کو وہ بالکل پسند نہ آئی۔ اس لئے کہ اس کی جسمانی حرکات "چوبی" تھیں اس کے اعضاء کی ہر جنبش میں تصنع تھا۔ مکالمہ ادا کرتے وقت اس کے ابرو پیشہ ور رقاصاؤں کی طرح ناچتے تھے۔ مسکراہٹ بھی غیر دلکش تھی ___ لیکن پائی اس پر لٹو ہو گیا۔ چنانچہ اس نے کئی مرتبہ اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کی اور مکرجی سے کہا کہ "ونڈرفل اسکرین فیس" ہے۔

دتا رام پائی، فلم ایڈیٹر تھا۔ اپنے کام کا ماہر، فلمستان چونکہ ایک ایسا ادارہ تھا جہاں ہر شعبے کے آدمی کو اظہار رائے کی آزادی تھی۔ اس لئے دتا رام پائی وقت بے وقت اپنی رائے سے ہم لوگوں کو مستفید کرتا رہتا تھا اور خاص طور پر میرے تمسخر سے دو چار ہوتا تھا۔

ہم لوگوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ لیکن ایس مکرجی نے اس عورت کو جس کا نام پارو تھا، پروپگنڈہ فلم کے ایک رول کے لئے منتخب کر لیا۔ چنانچہ رائے بہادر چونی لال نے فوراً اس سے ایک فلم کا کنٹریکٹ معمولی سی ماہانہ تنخواہ پر کر لیا۔

اب پارو ہر روز اسٹوڈیو آنے لگی۔ بہت ہنس مکھ اور گھلو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ میرٹھ اس کا وطن تھا۔ جہاں وہ شہر کے قریب قریب تمام رنگین مزاج رئیسوں کی منظور نظر تھی۔ ہزاروں میں کھیلتی تھی، پر اسے فلموں میں آنے کا شوق تھا۔ چنانچہ یہ شوق اسے کھینچ کر فلمستان میں لے آیا۔

جب اس سے کھل کے باتیں کرنے کا موقعہ ملا تو معلوم ہوا کہ حضرت جوشؔ ملیح آبادی اور مسٹر ساغر نظامی بھی اکثر اس کے ہاں آیا جایا کرتے تھے اور اس کا مجرا سنتے تھے۔

اس کی زبان بہت صاف تھی، اور جلد بھی، جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ چھوٹی آستینوں والے پھنسے پھنسے بلاؤز میں سے اس کی ننگی باہیں ہاتھی کے دانتوں کی طرح دکھائی دیتی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تھیں ـــــ سفید، سڈول، متناسب اور خوبصورت جلد میں ایسی چکنی چمک تھی جو دیودار لکڑی پر رندہ پھیرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ صبح اسٹوڈیو آتی۔ نہائی دھوئی صاف ستھری، اُجلی، سفید یا ہلکے رنگ کی ساڑی میں ملبوس۔ شام کو جب گھر روانہ ہوتی تو دن گذرنے کی گرد و غبار کا ایک ذرہ تک اس پر نظر نہ آتا۔ ویسی ہی تروتازہ، ہوتی جیسی صبح کو تھی۔

دتا رام پائی اس پر اور زیادہ لٹو ہو گیا۔ شوٹنگ شروع ہوئی نہیں تھی، اس لئے اسے فراغت ہی فراغت تھی، چنانچہ اکثر پارو کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول رہتا ـــــ معلوم نہیں وہ اس کے بھونڈے اور کرخت لہجے، اس کے اوندھے سیدھے میلے دانتوں اور اس کے ان کٹے میل بھرے ناخنوں کو کیسے برداشت کرتی تھی ـــــ صرف ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ طوائف اگر برداشت کرنا چاہے تو بہت کچھ برداشت کر سکتی ہے۔

پروپگنڈہ فلم کی کہانی کا ڈھانچہ میرے حوالے کیا گیا کہ میں اس کا بغور مطالعہ کروں اور جو ترمیم و تنسیخ میری سمجھ آئے بیان کر دوں۔ میں نے اس ڈھانچے کے تمام جوڑ دیکھے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا بے جوڑ ڈھانچہ شاید ہی کسی سے تیار ہو سکے۔ کوئی سر تھا نہ پیر، لیکن چونکہ میری قابلیت اور ذہانت کا امتحان تھا۔ اس لئے میں نے اپنا ڈھانچہ تیار کیا۔ بڑے خلوص اور بڑی محنت سے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ڈائرکشن کے فرائض ساوک واچا کو سونپے جانے والے تھے جو میرا اعزیز دوست تھا۔

نیا ڈھانچہ جب فلمستان کی 'فل بنچ' کے سامنے پیش ہوا تو میری وہ حالت تھی جو کسی مجرم کی ہو سکتی ہے۔

ایس مکرجی نے اپنا فیصلہ ان چند الفاظ میں دیا۔ ''ٹھیک ہے، مگر اس میں اصلاح کی ابھی کافی گنجائش ہے۔''

گیان مکرجی سے پوچھا گیا تو انھوں نے اپنی عادت کے مطابق منہ سکوڑ کر صرف اتنا کہا ''آل موسٹ ٹھیک ہے'' ـــــ یہ وہ حضرت تھے جو ایس مکرجی کے ڈائریکٹ کئے ہوئے تمام فلموں کے ڈائریکٹر تھے، حالانکہ انھوں نے اپنی زندگی میں ایک فٹ فلم بھی ڈائریکٹ نہیں کی تھی۔

اصل میں فلمستان میں کام کرنے کا ڈھب ہی نرالا تھا۔ سارا فلم آپ نے ڈائرکٹ کیا لیکن پردے پر نام میرا دیا جا رہا ہے۔ کہانی میں نے لکھی ہے، لیکن اس کا مصنف آپ کو بنا دیا گیا ہے۔ بات یہ تھی کہ وہاں سب مل جل کر کام کرتے تھے۔ آپ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ دتا رام پائی جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ فلمی کہانی کیا ہوتی ہے۔ مجھے مشورے دیا کرتا تھا۔

پروپگنڈہ فلم کی کہانی لکھنے کی دشواریاں کچھ وہی سمجھ سکتا ہے جس نے کبھی ایسی کہانی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

لکھی ہو۔ سب سے زیادہ مشکل میرے لئے یہ تھی کہ مجھے پارو کو اس کی شکل و صورت، اس کے قد اور اس کی فنی کمزوریوں کے پیش نظر اس کہانی میں داخل کرنا تھا۔ بہر حال بڑی مغز پاشیوں کے بعد تمام مراحل طے ہو گئے اور کہانی کی نوک پلک نکل آئی اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔

ہم نے باہم مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ جن مناظر میں پارو کا کام ہے وہ سب سے آخر میں فلمائے جائیں تاکہ پارو فلمی فضا سے اور زیادہ مانوس ہو جائے اور اس کے دل و دماغ سے کیمرے کی جھجک نکل جائے۔

کسی منظر کی بھی شوٹنگ ہو، وہ برابر ہمارے درمیان ہوتی۔ دتا رام پائی اب اس سے اتنا کھل گیا تھا کہ باہم مذاق بھی ہونے لگے تھے۔ پائی کی یہ چھیڑ چھاڑ مجھے بہت بھونڈی معلوم ہوتی۔ چنانچہ میں پارو کی عدم موجودگی میں اس کا تمسخر اڑاتا۔ کم بخت بڑی ڈھٹائی سے کہتا "سالے تو کیوں جلتا ہے؟"

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں، پارو بہت ہنس مکھ اور گھلو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ اسٹوڈیو کے ہر کارکن سے وہ اونچ نیچ سے بے پرواہ بڑے تپاک سے ملتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت تھوڑے عرصے میں مقبول ہو گئی۔ نچلے طبقے نے اسے احتراماً پارو دیوی کہنا شروع کر دیا۔ یہ اتنا عام ہوا کہ فلم کے عنوانات میں پارو کے بجائے پارو دیوی لکھا گیا۔

دتا رام پائی نے ایک قدم اور بڑھایا۔ مجھے اس نے ٹپس لڑائی کہ ایک دن اس کے گھر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا، پارو سے اپنی خاطر مدارت کرائی اور چلا آیا۔ اس کے بعد اس نے ہفتے میں ایک دو مرتبہ باقاعدگی کے ساتھ پارو کے یہاں جا دھمکنا شروع کر دیا۔

پارو اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ادھیڑ عمر کا ایک مرد رہتا تھا جو قد و قامت میں اس سے دوگنا تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ اسے پارو کے ساتھ دیکھا ___ وہ اس کا پتی دیو کم اور "تھامو" زیادہ نظر آتا تھا۔

پائی اپنے فخر و ابتہاج سے کینٹین میں پارو سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر نیم عاشقانہ انداز میں کرتا کہ ہنسی آ جاتی۔ میں اور ساوک واچا اس کا خوب مذاق اڑاتے۔ مگر وہ کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی پارو بھی موجود ہوتی۔ میں اس کی موجودگی میں بھی پائی کے خام اور بھونڈے عشق کا مذاق اڑاتا۔ پارو برا نہ مانتی اور مسکراتی رہتی۔ اس مسکراہٹ سے اس نے میرٹھ میں جانے کتنے دلوں کو غلط فہمی میں مبتلا کیا ہو گا۔

پارو میں عام طوائفوں ایسا بھڑکیلا یا چھچھورا پن نہیں تھا۔ وہ مہذب محفلوں میں بیٹھ کر

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

بڑی شائستگی سے گفتگو کر سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ میرٹھ میں اس کے یہاں آنے جانے والے ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان کا تعلق سوسائٹی کے اس طبقے سے تھا جو کبھی کبھی ناشائستگی کی طرف محض تفریح کے طور پر مائل ہوا کرتا ہے۔

پارو اب اسٹوڈیو کی فضا میں بہت اچھی طرح گھل مل گئی تھی۔ فلمی دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی عورت یا لڑکی نئی نئی ایکٹریس بنتی ہے تو اس کو کوئی نہ کوئی فوراً دبوچ لیتا ہے۔ لیکن پارو کے ساتھ ایسا نہ ہوا۔ شاید اس لئے کہ فلمستان دوسرے نگار خانوں کے مقابلے میں بہت حد تک ''پاکباز'' تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پارو کو کوئی اتنی زیادہ جلدی نہیں تھی۔

محسن عبداللہ (پراسرار نینا کا خاوند) اپنی یک آہنگ، خشک مجرّد زندگی سے اکتا کر، پارسی لڑکی ویرا کو جس کی زندگی اسی کی زندگی کے مانند سپاٹ تھی شریکِ حیات بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے اسے ہمارے ساتھ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا چھوڑنا پڑا، کیونکہ ویرا فرسٹ کلاس میں آتی جاتی تھی۔ اس کے بعد اس کو ''ایٹی کیٹ'' کے مطابق آتے جاتے اس کی کتیا کی زنجیر تھامنا پڑی۔

___ عاشقوں کے امام میاں مجنوں کو بھی تو لیلیٰ کی کتیا عزیز تھی۔

واچا کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بڑی مشکلوں سے تازہ تازہ اپنی بدکار فرانسیسی بیوی سے نجات حاصل کی تھی، ایس مکرجی، پری چہرہ نسیم بانو کے چکر میں تھا۔ گیان مکرجی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ___ اپنے متعلق میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس کی جلد بہت پسند تھی۔ ایک دن میں نے شاہد لطیف سے اس کا ذکر کیا تو اس نے مسکرا کر کہا ''جلد پسند ہے، ٹھیک ہے، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ اندر کتاب کیسی ہے، مضمون کیسا ہے۔''

بابی کی حالت اب بہت زیادہ مضحکہ خیز ہو گئی تھی اس لئے کہ پارو نے ایک روز اسے اپنے گھر مدعو کیا تھا اور اپنے ہاتھ سے اسے دو پیگ جونی واکر وسکی کے پلائے تھے۔ جب اس کو بہت زیادہ نشہ ہو گیا تھا تو پارو نے اس کو بڑے پیار سے اپنے صوفے پر لٹا دیا تھا ___ اب اس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس پر مرتی ہے اور ہم لوگ چونکہ ناکام رہے ہیں اس لئے حسد کی آگ میں جلتے ہیں ___ اس بارے میں پارو کا ردِ عمل کیا تھا، یہ مجھے معلوم نہیں۔

شوٹنگ جاری تھی۔ ویرا فلم کی ہیروئن تھی۔ سائڈ ہیروئن کا رول پارو کو ادا کرنا تھا۔ اسے برما کے کسی آزاد جنگلی قبیلے کی ایک شوخ و شنگ، تیز و طرار لڑکی کا روپ دھارنا تھا۔ جوں جوں اس کے مناظر کے فلمائے جانے کا وقت قریب آ گیا میرے اندیشے بڑھتے گئے مجھے ڈر تھا کہ وہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

امتحان میں پوری نہیں اترے گی اور ہم سب کی کوفت کا موجب ہوگی۔

آخر وہ دن آ گیا جب اس کا پہلا ''شوٹنگ ڈے'' تھا۔ میک اپ اور کسٹیوم سے مزین ہوکر اسے کیمرے کے سامنے لایا گیا۔ عجیب وغریب تراش کے بھڑکیلے رنگوں والی پھنسی پھنسی چولی، ناف سے اوپر پیٹ کی ہلکی سی جھلک، گھٹنوں سے بالشت بھر اوپر لہنگا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کیمرے، مائک اور خیرہ کن روشنیوں سے قطعاً مرعوب یا خائف نہیں۔ مکالمہ اس کو اچھی طرح یاد کرا دیا گیا تھا۔ امید تھی کہ بول جائے گی۔ مگر جب ''ٹیک'' کا وقت آیا تو اس کا سارا وجود لکڑی ہو گیا۔ منہ کھولا تو مکالمہ سپاٹ، کئی ریہرسلیں کرائی گئیں مگر اس لکڑی میں جان کے آثار پیدا نہ ہوئے۔ پیشہ ور رقاصاؤں کی طرح اپنے ابرو نچاتی تھی جیسے بھاؤ بتا رہی ہے۔ تین چار ری ٹیک ہوئے تو میں بالکل مایوس ہو گیا۔ واچا طبعاً بہت جلد گھبرا جانے والا ہے کہ اس اونٹنی کی کوئی کل سیدھی نہیں تو اس نے ایس مکرجی سے کہا کہ وہی اس کو ٹھیک کرے۔

مکرجی اس کو کیا ٹھیک کرتا۔ وہ بنی ہی کچھ ایسے آب وگل سے تھی جس میں بناؤ، بھاؤ کوٹ کوٹ کے بھرے تھے۔ چنانچہ ایک ری ٹیک، میں اس نے کسی قدر گوارا ایکٹنگ کیا تو مکرجی نے غنیمت سمجھ کر صاد کر دیا۔

ہم سب نے بڑی کوشش کی کہ اس کا تصنع اور چوبی پن، کسی نہ کسی حیلے دور ہو جائے، مگر ناکام رہے، شوٹنگ جاری رہی اور وہ بالکل نہ سدھری، اس کو کیمرے اور مائک کا کوئی خوف نہیں تھا۔ مگر سیٹ پر وہ حسبِ منشا اداکاری کے جوہر دکھانے سے قاصر تھی۔

___ اس کی وجہ میرٹھ کے مجروں کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ بہرحال ہمیں اتنی امید ضرور تھی کہ وہ کسی نہ کسی روز منجھ جائے گی۔

چونکہ مجھے اس کی طرف سے بہت مایوسی ہوئی تھی اس لئے میں نے اس کے 'رول' میں کتر بیونت شروع کر دی تھی۔ میری اس 'چالاکی' کا علم اسے پائی کے ذریعے سے ہو گیا۔ چنانچہ اس نے خالی اوقات میں میرے پاس آنا شروع کر دیا۔ گھنٹوں بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی۔ بڑے شائستہ انداز میں، مناسب وموزوں الفاظوں میں جن میں چاپلوسی کا رنگ نہیں ہوتا، میری تعریف کرتی۔

ایک دو مرتبہ اس نے مجھے اپنے گھر پر مدعو بھی کیا۔ میں شاید چلا جاتا، لیکن ان دنوں بہت مصروف تھا۔ ہر وقت میرے اعصاب پر پروپگنڈہ فلم کا منظر نامہ سوار رہتا تھا۔ یوں تو میرا ہاتھ بٹانے کے لئے تین آدمی موجود تھے۔ راجہ مہدی علی خاں ___ محسن عبداللہ اور دکشت ___

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

راجہ مہدی علی خان نے تعاون سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ ہر وقت اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو خط لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ محسن عبداللہ ویرا سے اپنے تعلقات مستحکم کرنے میں مشغول اور مسٹر دکشت پارو کو مکالمے یاد کراتے رہتے تھے۔

میں کچھ عرصے سے نوٹ کر رہا تھا کہ پارو اور اشوک سیٹ پر جب آمنے سامنے آتے ہیں اور پارو کو اپنے جارحانہ عشق کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں اشوک کی آنکھوں میں گڑ جانا چاہتی ہیں ___ جیسے اس کو یہ بتانا مقصود ہے کہ دیکھو جو کچھ یہ ہو رہا ہے، جھوٹ نہیں سچ ہے۔

اشوک طبعاً بہت جھینپو قسم کا آدمی ہے۔ وہ کسی عورت کے کھلم کھلا اظہار عشق کو برداشت نہیں کر سکتا ___ یہ مجھے معلوم تھا کہ اشوک کو پارو پسند ہے، لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس سے جسمانی تعلق پیدا کر لیتا ___ اس کی زندگی میں سینکڑوں نہیں، ہزاروں لڑکیاں آئیں ___ وہ لارڈ بائرن بن سکتا تھا مگر شرمیلی طبیعت کے باعث ان آسانی سے پھنس جانے والی تتلیوں سے اپنا دامن چھڑا کے بھاگ جاتا رہا۔

اشوک کمار کا یہ وہ زمانہ تھا جب وہ کسی بھی ایکٹریس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا، بڑی آسانی سے، کئی ایکٹریسیں اپنا دل اس کے قدموں میں ڈالنے کے لئے تیار تھیں۔ میں نے سوچا اگر پارو کے دل میں بھی کھد بد ہو رہی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ___ پھر پارو نوارد تھی۔ خود کو اشوک کے ساتھ منسلک کر کے وہ بام شہرت پر بڑی جلدی پہنچ سکتی تھی۔

فلم میں پارو کا رول ایک آزاد قبیلے کی نیم جنگلی، خودسر اور جارحانہ قسم کا عشق کرنے والی لڑکی کا تھا۔ وہ اشوک سے محبت کرتی تھی۔ مگر وہ ویرا کے عشق میں گرفتار تھا۔ یہ فلمی تثلیث پارو کے اندرونی جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے کافی سامان بہم پہنچا رہی تھی۔

شوٹنگ جاری تھی۔ ان ڈور، آؤٹ ڈور ___ ایک دن کشتیوں کا سین فلمایا جانے والا تھا۔ اس کے لئے بہت دور ایک کھاڑی منتخب کی گئی۔ دو کشتیاں تھیں۔ ایک میں اشوک کو سوار ہونا تھا، دوسری میں پارو کو ___ اسے یہ ہدایت تھی کہ جب اس کی کشتی، اشوک کی کشتی کے پاس پہنچے تو وہ اس میں کود جائے۔

پانی بہت گہرا تھا۔ حسب ہدایت پارو، اشوک کی کشتی میں کودی۔ مگر ایسا کرتے ہوئے دونوں کشتیوں میں فاصلہ کچھ زیادہ ہو گیا اور وہ پانی میں گر پڑی، واچا مدد کے لئے چلایا، فوراً ساحل پر سے دو تین مچھیرے پانی کے اندر گھسے اور پارو کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے۔

عورت ذات، مگر حیرت ہے کہ اس حادثے نے اسے بالکل خوفزدہ نہیں کیا تھا ___

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

کپڑے خشک ہوئے تو وہ فوراً دوسرے ٹیک کے لئے تیار تھی۔

جب وہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑے نچوڑ رہی تھی تو میں نے اور اشوک نے اس کی ٹانگ کی ایک جھلک دیکھی جو کافی دلچسپ اور شریر تھی۔ جب ہم ''لوکیشن'' سے فارغ ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں اشوک نے مجھ سے کہا ''منٹو ___ ٹانگ بڑی اچھی تھی، جی چاہتا تھا روسٹ بنا کے کھا جاؤں۔

عجیب بات ہے کہ اشوک جیسا ڈرپوک اور جھینپو اندرونی طور پر سادیّت پسند تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ چونکہ اپنے جذبات دبا دینے کا عادی تھا۔ اس لیے ردِ عمل کی صورت میں سادیّت پیدا ہو گئی تھی۔

ٹوسیٹر ایم جی کار میں اشوک اور میں دونوں اسٹوڈیو سے گھر واپس جایا کرتے تھے اور راستے میں اِدھر اُدھر کی مختلف باتیں کیا کرتے تھے ___ موٹر اس سڑک پر سے بھی گزرتی تھی جس سے ملحقہ گلی میں پارو کا فلیٹ تھا۔ ایک شام جب ہم وہاں سے گزرے تو تھوڑی دور آگے نکل کر اشوک نے موٹر روک لی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

مڑ کر اشوک نے اس گلی کی طرف دیکھا اور کہا ''آج ہولی کی خوشی میں پارو نے دعوت دی ہے ___ جاؤں یا نہ جاؤں؟''

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ''جاؤ''

''تو چلو، تم بھی چلو!''

میں نے کہا ''میں کیوں چلوں ___ مجھے اس نے مدعو نہیں کیا۔''

''کوئی بات نہیں ___!'' یہ کہہ کر اس نے تیزی سے موٹر گھمائی اور پارو کے فلیٹ کے پاس بریک لگائی۔ ہارن بجایا تو بالکنی میں واچا اور پائی نمودار ہوئے۔

پائی نے مجھے دیکھا تو اپنے مکروہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

''ارے ___ تم بھی آ گئے!''

واچا نے اشوک سے کہا ''آؤ دادا منی آؤ ___ تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔''

پارو خلافِ معمول بنارسی ساڑی میں ملبوس دلہن سی بنی بیٹھی تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے اٹھ کر استقبال کیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بڑے مناسب و موزوں الفاظ میں معذرت کی کہ وہ مجھے مدعو کرنا بھول گئی۔

فوراً شراب کا دور شروع ہو گیا۔ پہلا پیگ ختم ہوا تو پائی جھومنے لگا۔ واچا نے فرمائش کی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کہ ایک آدھ گانا ہو جائے۔ پارو نے چغلیاں کھانے والی نگاہوں سے اشوک کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیوں اشوک صاحب! آپ کچھ سنیں گے؟"

اشوک جھینپ گیا اور اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں صرف اتنا کہہ سکا۔ آپ گائیں گی تو میں سنوں گا۔"

گانا شروع ہوا! بازاری قسم کی ٹھمری تھی۔ اس کے بعد ایک غزل ہوئی۔ پھر کوئی فلمی گیت۔ اس دوران میں پارو کا شوہر، یا جو کوئی بھی وہ تھا گلاسوں میں شراب اور سوڈا انڈیلتا رہا۔ دوسرے پیگ کے بعد پائی کی آنکھیں مندنے لگیں۔ اشوک زیادہ پینے کا عادی نہیں، اس لئے وہ ڈیڑھ پیگ سے آگے نہ بڑھا۔ واچا نے تیسرے پر اپنے گلاس کا منہ بند کر دیا۔

ٹھمریاں، غزلیں، گیت، بہت دیر تک ہوتے رہے۔ آخر میں جب اس نے بھجن سنایا تو اس نے میری موجودگی کا احساس کر کے ایک نعت شروع کی، لیکن میں نے فوراً اس کو روک دیا۔ "پارو دیوی! یہ محفلِ نشاط ہے ــــ شراب کے دور چل رہے ہیں۔ یہاں کالی کملی والے کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔"

اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور مجھ سے معافی کی طلبگار ہوئی۔ کھانا بہت اچھا تھا ــــ اشوک جلدی فارغ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ دھلوانے کے لئے پارو اٹھی ــــ جب اشوک واپس آیا تو وہ گھبرایا ہوا تھا۔ جلدی جلدی اس نے رخصت چاہی اور مجھے ساتھ لے کر وہاں سے چل دیا۔

راستے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ اس نے مجھے میرے گھر چھوڑا اور چلا گیا۔

کئی دن گذر گئے۔ شوٹنگ بڑی باقاعدگی سے ہو رہی تھی ــــ ایک شام جب میں اور اشوک واپس گھر جا رہے تھے تو شیواجی پارک کے پاس جہاں پارو کا فلیٹ تھا، اشوک نے موٹر کی رفتار کم کی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "منٹو! تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں؟"

اس کے لہجے میں کسی قدر کپکپاہٹ تھی۔

میں نے ایک لحظے کے لئے سوچا کہ یہ دلچسپ بات کیا ہو سکتی ہے۔ "بتاؤ!"

اشوک ہنسنے لگا۔ "تمہیں یاد ہے، اس روز جب ہم پارو کے ہاں کھانا کھا رہے تھے، تو وہ میرے ہاتھ دھلوانے کے لئے اٹھی تھی ــــ؟"

اشوک نے یہ کہا تو مجھے اس کی گھبراہٹ یاد آ گئی "ہاں ہاں!"

"جب غسلخانے میں اس نے مجھے تولیہ دیا تو مجھ سے آہستہ سے کہا، کل آپ اکیلے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

آیئے ___ شام کو ساڑھے چھ بجے ___ میں گھبرا گیا اور تولیہ پھینک کر باہر نکل آیا۔" اشوک نے موٹر سڑک کے کنارے ٹھہرا لی۔
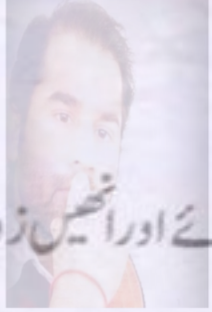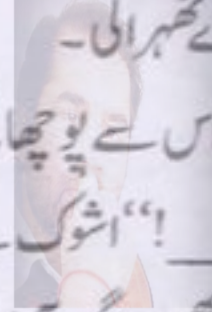
میں نے اس سے پوچھا۔ "تم گئے؟"

"ہاں ___!" اشوک نے اسٹیرنگ وھیل سے ہاتھ ہٹائے اور انھیں زور زور سے ملنے لگا۔ "لیکن وہاں سے بھی بھاگ آیا۔"

میں تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ "ہوا کیا ___ پورا اسٹیریو بتاؤ!"

"میں بڑا ڈرپوک ہوں ___ جانے مجھے ایسے موقعوں پر کیا ہو جاتا ہے ___ اس نے مجھے صوفے پر بٹھایا۔ آپ قالین پر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ دو پیگ مجھے پلائے۔ خود بھی تھوڑی سی پی اور پھر ___ پھر وہ لگی اپنی محبت دکھانے ___ میں سنتا رہا اور کانپتا رہا۔ جب اس نے میرا ہاتھ دبایا تو میں نے اسے بڑے زور سے جھٹک دیا ___ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن فوراً کہیں غائب ہو گئے ___ وہ مسکرانے لگی۔ بھیا اشوک! میں تو آپ کا امتحان لے رہی تھی ___ میں نے یہ سنا تو چکرا گیا۔ اٹھا تو اس نے پھر کہا، اشوک صاحب! میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں ___ میں نے کچھ نہ کہا اور نیچے اتر گیا ___ کار میں بیٹھا ___ گھر پہنچ کر میں نے آدھا پیگ پی کر سوچا تو مجھے بڑا افسوس ہوا!

___ کیا ہرج تھا اگر میں ___" اشوک کے لہجے میں تاسف تھا۔

میں نے کہا۔ "ہاں کوئی ہرج نہیں تھا۔"

اشوک کے لہجے میں تاسف اور زیادہ ہو گیا۔ "اور ___ مجھے وہ پسند بھی تھی!"

یہ سن کر میرے سامنے وہ منظر آ گیا جو اس وقوعے کے روز رات کو نو بجے اسٹوڈیو کے باہر سخت سردی میں فلمایا جا رہا تھا۔ جشنِ مسرت میں لوگ ناچ گا رہے تھے ___ اشوک اپنی ہیروئن ویرا کی بانہوں میں بانہیں ڈالے محوِ رقص تھا اور پارو ایک طرف مجسمۂ افسردگی بنی اکیلی کھڑی تھی ___!

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# پُراسرار نینا

شاہدہ جو کہ محسن عبداللہ کی فرماں بردار بیوی تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی۔ اس لئے کہ علی گڑھ میں میاں بیوی کی محبت ہوئی تھی۔ اور یہ محبت ان دونوں کے دلوں میں ایک عرصے تک برقرار رہی۔

شاہدہ اس قسم کی لڑکی تھی جو اپنے خاوند کے سوا اور کسی مرد کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ لیکن محسن عبداللہ ایسا نوجوان تھا جو مختلف میوے چکھنے کا عادی تھا۔ شاہدہ کو اس کی اس عادت کا علم نہیں تھا۔ ویسے وہ جانتی تھی کہ اس کے خاوند کی بہنیں بڑی آزاد خیال ہیں مردوں سے بڑی بے باکی سے ملتی ہیں۔ ان سے جنسیات کے بارے میں گفتگو کرنے سے بھی نہیں جھجکتیں۔ مگر اسے ان کے یہ انداز پسند نہیں تھے۔

محسن کی ایک بہن (ڈاکٹر رشید جہاں) نے تو ایسے پر پُرزے نکالے تھے کہ حد ہی کر دی تھی ــــــ میں ان دنوں ایم۔ اے۔ او کالج، امرتسر میں پڑھتا تھا۔ اس میں ایک نئے پروفیسر صاحبزادہ محمود الظفر آئے۔ یہ ڈاکٹر رشید جہاں کے خاوند تھے۔

میں بہت پیچھے چلا گیا ہوں۔ لیکن واقعات کیونکہ اچانک میرے دماغ میں آرہے ہیں اس لئے میں مجبور ہوں کہ اس مضمون کا تسلسل قائم نہیں رہ سکے گا۔ بہر حال آپ پڑھیں گے تو آپ کڑیاں ملا سکیں گے۔

پروفیسر صاحبزادہ محمود الظفر بڑے خوش شکل نوجوان تھے۔ ان کے خیالات اشتراکی تھے۔ اسی کالج میں فیض احمد فیض صاحب جو بڑے افیمی قسم کے آدمی تھے ــــــ پڑھایا کرتے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تھے، ان سے میرے بڑے اچھے مراسم تھے۔

ایک ہفتے کی شام کو انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ڈیرہ دون جارہے ہیں۔ چند چیزیں انھوں نے مجھے بتائیں کہ میں خرید کرلے آؤں۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد ہر ہفتے ان کے حکم کی تعمیل کرنا میرا معمول ہوگیا۔

وہ دراصل ڈیرہ دون میں ڈاکٹر رشید جہاں سے ملنے جاتے تھے۔ ان سے غالباً ان کو عشق کی قسم کا کوئی لگاؤ تھا۔ معلوم نہیں اس لگاؤ کا کیا حشر ہوا۔ مگر فیض صاحب نے ان دنوں اپنی فیمگی کے باوجود بڑی خوبصورت غزلیں لکھیں۔

یہ تمام عقبی مناظر ہیں۔ محسن عبداللہ کو کسی دوست کی وساطت سے بمبئی ٹاکیز میں ملازمت مل گئی۔ ان دنوں یہ فلمی ادارہ بڑا وقار رکھتا تھا اس کے روحِ رواں ہمانسو رائے تھے۔ وہ تنظیم اور اچھی فضا کے بہت قائل تھے۔ ان کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کو اپنے اسٹوڈیو میں جگہ دیں۔

محسن عبداللہ کو لیبارٹری میں جگہ مل گئی۔ ہمانسو رائے آنجہانی کے احکام کے مطابق اسٹوڈیو کے کسی اعلیٰ اور متوسط کارکن کو ملاڈ (جہاں کہ یہ نگار خانہ تھا) سے دور رہائش اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ قریب قریب سب اسٹوڈیو کے آس پاس ہی رہتے تھے۔ محسن عبداللہ اپنی بیوی شاہدہ کے ساتھ قریب ہی ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی کوٹھی میں مقیم تھا۔

محسن لیبارٹری میں بڑی توجہ سے کام کرتا تھا۔ ہمانسو رائے اس سے بہت خوش تھے۔ اس کی تنخواہ اتنی ہی تھی جتنی اشوک کمار کی تھی جب وہ اس لیبارٹری میں ملازم ہوا تھا۔ مگر وہ اب کامیاب ایکٹر بن رہا تھا۔ اُن دنوں آزوری اور ممتاز بھی وہیں تھے۔ مسٹر مکرجی جو اس وقت مسٹر واچا ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے اسسٹنٹ تھے۔ سب خوش باش آدمی تھے۔

ہر سال ہولی کے موقع پر بڑا دلکش ہنگامہ برپا ہوتا سب ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے۔ اور بڑی پیاری رنگ رلیاں مچتیں۔

''بنر ملن'' کی شوٹنگ شروع ہوئی تو ہمانسو رائے نے سنیہہ پر بھا پردھان کو جو خاصی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اپنے اس فلم کے لئے ہیروئن منتخب کیا ان دنوں خواجہ احمد عباس وہاں پبلیسٹی کا کام کرتے تھے۔ محسن اور عباس دونوں اس لڑکی پر عاشق ہو گئے جو سندھ کی رہنے والی تھی اور بمبئی میں نرسنگ کا کورس مکمل کرچکی تھی۔ محسن اور عباس دونوں چاہتے تھے پر بھا کہ ان کے جذبات کی نرسنگ کرے۔ مگر وہ بڑی تیز نشتر تھی۔ وہ دونوں کو چرکے لگاتی تھی۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے میں پھر کسی وقت لکھوں گا۔

محسن اس کے عشق میں کچھ ایسا مبتلا ہوا کہ اس نے بے تحاشا جوا کھیلنا شروع کر دیا۔ اسے جتنی تنخواہ ملتی سب قمار بازی کی نذر ہو جاتی۔ شاہدہ سخت پریشان تھی۔ اس کو اپنے گھر سے ہر مہینے کچھ نہ کچھ منگوانا پڑتا تھا۔ اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا جو آئے دن بیمار رہتا۔ اس کے علاج پر کافی خرچ کرنا پڑتا تھا۔

شاہدہ نے ایک دن اس سے بڑے شریفانہ انداز میں کہا۔ ''محسن تم میرا خیال نہیں کرتے ___ کم از کم اپنے بچے کا تو کرو'' وہ اس پر بہت برسا۔ اس لئے کہ اس کے سر پر جوئے اور سنیہہ پر بھا پردھان کا عشق سوار تھا۔

میں ان دنوں نانو بھائی ڈیسائی کی ہندوستان سنے ٹون اسٹوڈیو میں ملازم تھا۔ شانتا رام نے جو پربھات فلم کمپنی میں کئی شاندار فلم تیار کر چکے تھے۔ مجھے دعوت دی کہ تم پونہ آؤ۔ کئی صحافی اور افسانہ نویس وہاں جا رہے تھے۔ یہ خیر سگالی قسم کی دعوت تھی۔ مدعو کئے گئے لوگوں میں ایک صاحب ڈبلو۔ زیڈ احمد بھی تھے۔ جو غالباً سادھنا بوس کی ٹیم میں کام کرتا تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے احمد نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بنگالی کے مکالمے اُردو میں ترجمہ کرتا ہے۔

ہم پونہ میں دو روز رہے۔ اس دوران میں مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ وہ اپنے چہرے پر خول چڑھائے رکھتا تھا۔ اس کی ہنسی، اس کی گفتگو، اس کا ہر انداز مصنوعی سا دکھائی دیتا تھا۔ ایک اور بات جو میں نے نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ وہ مشہور یہودی ڈائریکٹر ارنسٹ بھوشن کی طرح ہر وقت منہ میں ایک لمبا سا سگار دبائے رکھتا تھا۔ اس کے بعد میری اور اس کی ملاقات راما شکل ایکٹر کے مکان پر ہوئی۔ وہ میرا دوست تھا۔ میں جب اس کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں ڈبلو زیڈ۔ احمد بیٹھا راما کی محبوب شراب رم پی رہا ہے۔

اس سے علیک سلیک ہوئی، بڑی رسمی قسم کی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی سے کھل کر بات کرنے کا عادی نہیں۔ وہ ایک کچھوا ہے جو اپنی گردن جب چاہے اپنے سخت خول کے اندر چھپا لیتا ہے۔ آپ ڈھونڈتے رہیں مگر نہ ملے۔

میں نے اس سے کہا۔ ''احمد صاحب آپ کچھ بات تو کیجئے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔ ''آپ راما شکل سے باتیں کر رہے ہیں۔ کیا یہی آپ کے لئے کافی نہیں ہیں۔''

یہ جواب سُن کر مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی سیاستدان سے ہم کلام ہوں۔ سیاست سے مجھے سخت نفرت ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

احمد سے راما شکل کے فلیٹ پر متعدد مرتبہ ملاقات ہوئی۔ لیکن وہ کھل کر پھر بھی نہ بولا ___ وہ کونے میں کرسی پر بیٹھا رم پیتا رہتا تھا۔ میں اور راما شکل اپنی بکواس میں مشغول رہتے۔

قریب قریب دو سال گزر گئے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ ڈبلو۔ زیڈ احمد کوئی فلم کمپنی قائم کر رہے ہیں ___ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ بنگالی کے مکالمے ترجمے کرنے والا یہ شخص کیسے فلم کمپنی بنائے گا؟

مگر اس نے بنالی ___ پُونہ میں اس کا نام شالیمار اسٹوڈیو رکھا گیا۔ اشتہار بازی فوراً شروع ہوگئی۔

میں نے یہ اشتہار دیکھے۔ ان میں خاص زور ایک ایکٹرس ''نینا'' پر دیا جاتا تھا۔ جس کو بار بار پُراسرار کہا جاتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی ایکٹرس میں اسرار کیا ہو سکتا ہے؟ جب کہ اسے اسکرین پر آنا ہے، اس کے تو سارے بھید وہیں کھل جائیں گے۔

مگر دو برس تک برابر یہی پبلسٹی ہوتی رہی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ پُراسرار نینا کون ہے؟ مگر کسی کو اس نئے چہرے کے متعلق علم نہیں تھا۔

بابوراؤ پٹیل ایڈیٹر ''فلم انڈیا'' کے ساتھ مجھے اتفاقاً کام کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا۔ ''سالا تم جانتا نہیں ___ کیسا ایڈیٹر بنا پھرتا ہے وہ ___ تم محسن عبداللہ کو جانتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں نام سُنا ہے ___ کچھ کچھ ان کے متعلق جانتا ہوں۔''

''نینا، اس کی بیوی ہے ___ اب سمجھا؟''

''میں نہیں سمجھا۔''

''اس کا نام شاہدہ ہے۔''

میں نے جب بابوراؤ سے مزید استفسار کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ شاہدہ رینوکا دیوی کی بھاوج ہے۔ میں نے اسے بمبئی ٹاکیز کی فلم ''بھابی'' میں ہیروئن کے رول میں دیکھا تھا اور اس کی کردار نگاری سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اب میرے دماغ میں دو بھابیاں تھیں۔ ایک بمبئی ٹاکیز کی ''بھابی'' دوسری شاہدہ عرف نینا۔ رینوکا دیوی کی بھابی۔

مجھے ڈبلو۔ زیڈ احمد سے مزید ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے سوچا کہ وہ بڑا اندازہ گیر ہے۔ وہ مہمیں طے کرنے والا انسان ہے۔ سویت روس کے آمروں کی طرح کئی کئی برسوں کی اسکیمیں بناتا ہے اور بڑے اطمینان سے ان کے نتائج کا انتظار کرتا ہے۔

الحمد لائبریری 0314.595.1212
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں بڑا جلد باز ہوں۔ اس لئے فطری طور پر مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں بڑبولا تھا۔ وہ نہایت کم گو۔ اس میں تصنع ہی تصنع تھا اور میں اس بناوٹ کا سخت مخالف۔ وہ باتیں کرتا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کوئی مشین بول رہی ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ جب بھی بولتا بڑی پتی تلی بات کہتا، چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ وہ کئی زبانیں بولتا تھا۔ مرہٹی، گجراتی، اُردو، انگریزی اور پنجابی۔ اصل میں وہ پنجابی ہے۔ اس کے خاندان کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ مولانا صلاح الدین احمد (ایڈیٹر ادبی دنیا) اس کے بھائی ہیں۔ اس کے ایک بھائی ریاض احمد بھی ہیں جو کسی اچھے سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔

یہ مضمون پڑھنے والے مشکل سے یقین کریں گے کہ مولانا صلاح الدین احمد، ڈبلو۔ زیڈ احمد (وحید) کے بھائی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے، مجھے معلوم نہیں یہ دو بھائی ایک دوسرے سے ملتے ہیں یا کہ نہیں۔ لیکن ان دونوں میں ایک مماثلت ضرور ہے کہ خوشامد پسند ہیں۔

بات شالیمار اسٹوڈیوز کے قیام کی ہو رہی تھی۔ لیکن میں یہاں آپ سے ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں جو بہت ضروری ہے کہ احمد (ڈبلو زیڈ) سندھ کے مشہور وزیر اعظم غلام حسین ہدایت اللہ کی لڑکی سے بیاہے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں ان کا رشتہ وہاں کیسے ہوا۔ ان تفصیلات کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔

آج سے ایک ماہ پہلے احمد جب ہال روڈ پر اپنے بال کٹوانے آیا تو میری اس سے ملاقات ہوئی۔ میں اس حجام کے قریب ہی رہتا ہوں میں اس کو زبردستی اپنے مکان میں لے آیا اور اس سے کہا "میں نینا کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اس کی اجازت دیتے ہو۔"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "میں آپ کو ایک دو روز میں بتا دوں گا۔"

کئی روز گزر گئے۔ اس کے بعد احمد سے میری ملاقات "ڈائریکٹر" کے دفتر میں ہوئی۔ میں نے پھر اس سے پوچھا کہ اب اجازت دینے میں کتنے روز چاہئیں۔ اس کے پائپ لگے ہونٹوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ نیم گنجا سر ذرا چمکنے لگا۔ اور اس نے کہا۔ "میں آج کل بہت مصروف ہوں ___ بس ایک ہفتے کی مہلت چاہتا ہوں۔"

چوہدری فضل حق صاحب (ڈائریکٹر کے مالک) اور شباب صاحب (ڈائریکٹر کے مدیر) بیٹھے تھے۔ میں نے کہا "بہت بہتر ہے۔ ایک ہفتہ گزرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔"

دو ہفتے گزر چکے مگر مجھے احمد سے اجازت نہیں ملی۔ میں نے سوچا کہ ایسے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہر ایکٹر، ایکٹرس لکھنے والا اور لکھنے والی عوام کی ملکیت ہوتی ہے اگر تم ان کے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

متعلق لکھنا چاہو تو بغیر اجازت لکھ سکتے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے یہ مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ شالیمار اسٹوڈیو قائم ہو گیا۔ نینا یعنی شاہدہ کا خاوند وہاں کی لیبارٹری کا انچارج بنا دیا گیا۔ اب جو کچھ میرے علم میں ہے آپ سے بیان کرتا ہوں۔ شاہدہ کو ایکٹرس بننے کی کوئی خواہش نہیں تھی، وہ بڑی گھریلو قسم کی عورت تھی۔ اس کو کسی قسم کا ہنگامہ پسند نہیں تھا۔

اچھا اب آپ یہ بھی سُن لیجئے۔ احمد جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں بڑا اندازہ گیر تھا۔ اس نے روسیوں کی طرح ایک پنج سالہ اسکیم بنائی اور اس کے ماتحت کام کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں اس نے اپنے مخصوص چھوٹے پن سے کام لیا۔ یہ بڑی لمبی داستان ہے۔ میں اسے بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے کہ اس مضمون میں اس سے کوئی زیادہ اثر پیدا نہیں ہو سکے گا۔

محسن، ستیہ پر بھا پردھان کے عشق میں مصروف تھا، جب مالی مشکلات پیدا ہوئیں تو اس نے اپنی بیوی شاہدہ سے کہا۔ تم بڑی بیک ورڈ ہو۔ میری بہنوں کی طرف دیکھو کتنی روشن خیال ہیں۔"

شاہدہ نے غالباً اس سے کہا" مجھے معاف کیجئے۔ میں اتنی روشن خیال نہیں ہو سکتی۔"

ان کے درمیان کئی چپقلیں ہوئیں۔ محسن چاہتا تھا کہ وہ فلم لائن میں داخل ہو جائے۔ مگر اس کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔

عصمت چغتائی نے (اب عصمت شاہد لطیف جو ضدی، آرزو، اور بُزدل جیسے کامیاب فلموں کی کہانی لکھ چکی ہے) میری بیوی سے کہا کہ شاہدہ علی گڑھ میں اس کی ہم جماعت رہ چکی ہے۔ بڑی اُوت ہے۔ بہت سادہ لوح۔"

"میری بیوی بڑی حیران ہوئی۔ اس نے عصمت سے پوچھا" یہ رائے تم نے کیسے قائم کی؟
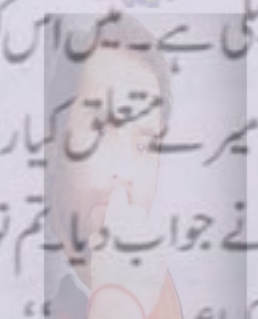
"میری سہیلی ہے۔ میں اس کو اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"تمہاری میرے متعلق کیا رائے ہے۔"

عصمت نے جواب دیا۔ تم تو نری کھری عورت ہو۔"

"اس میں کیا عیب ہے۔"

"کچھ بھی نہیں ___ لیکن تم شاہدہ سے بہت زیادہ مختلف ہو۔"

"کس لحاظ سے"؟

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

"وہ بیوقوف ہے۔ تم بیوقوف نہیں ہو۔ تم اپنے خاوند کو سنبھالنا جانتی ہو۔ اس کو اپنے خاوند کو سنبھالنا نہیں آتا۔"

"یہ تم کیسے کہتی ہو؟"

"میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس کے سارے گھرانے سے واقف ہوں۔ بہت سیدھی سادی سی لڑکی تھی۔ ہم کالج میں اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ وہ جھینپ جھینپ جایا کرتی تھی۔"

عصمت نے میری بیوی کو بتایا کہ اسے عشق و محبت کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کو حیرت تھی کہ وہ کیسے محسن کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ محسن کچھ زیادہ ہی اس کے پیچھے پڑ گیا ہو گا کہ وہ رضامند ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ طبیعت کے لحاظ سے بہت نرم ہے، اسے اس بات کا کوئی خیال نہیں ہوتا کہ آگے چل کر کیا ہو گا۔

محسن نے جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا شاہدہ کو مجبور کیا کہ وہ فلم ایکٹریس بن جائے۔ وہ بادل ناخواستہ رضامند ہو گئی۔ چنانچہ اس کے ناتواں کاندھوں پر شالیمار اسٹوڈیوز تعمیر کر دیا گیا۔ اور (ڈبلو زیڈ) ایک پروڈیوسر بن گیا اور اس نے شاہدہ کو پُراسرار نینا بنا دیا۔ معلوم نہیں یہ نام احمد نے اس کے لئے تجویز کیا تھا یا اس کے شوہر محسن نے؟

احمد نے فلم بنانے سے پہلے اس پُراسرار نینا کی بڑی تشہیر کی۔ ہر پرچے میں یہ نام دیکھنے میں آتا۔ لوگوں کے دلوں میں بڑا اشتیاق پیدا ہو گیا کہ یہ کون سی آفت جان ہے۔ چنانچہ اس فلم کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جانے لگا۔ اس کا نام "ایک رات" تھا۔ معلوم نہیں اس کی تکمیل میں کتنی راتیں اس نے کاٹی ہوں گی بہر حال وہ بن گئی۔

اس فلم کی کہانی مشہور ناول "ٹیس" کا چربہ تھا۔ اس میں شاہدہ (پُراسرار نینا) کو گوالن کا رول دیا گیا تھا۔ ایک شخص اس کی عصمت لوٹ لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کی باقاعدہ شادی ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی بھولی بھالی ہے۔ اپنے خاوند سے اپنی گزشتہ زندگی کے اس حادثے کو بیان کر دیتی ہے۔ وہ اس کو دھتکار دیتا ہے۔

احمد (ڈبلیو۔ زیڈ) اپنی پنج سالہ اسکیم کے ماتحت شاہدہ سے کچھ اس طرح مل رہا تھا۔ جس طرح ایک ملک کا سفیر کسی دوسرے سفیر سے مل رہا ہے۔

شاہدہ کا خاوند محسن اپنی سرگرمیوں میں مشغول تھا۔ اس کے ناکام عشق کا سلسلہ ستیہ پربھا پردھان سے بدستور تھا۔ شاہدہ سے اس کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ یہ میں اس زمانے کی بات کر رہا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

ہوں جب شالیمار اسٹوڈیو قائم نہیں ہوا تھا۔

اس زمانے میں (مجھے افسوس ہے کہ میں یہ مضمون غیر مسلسل لکھ رہا ہوں۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ اس لئے کہ خیالات جیسے دماغ میں آتے ہیں۔ میں قلم بند کئے جاتا ہوں) احمد جو محسن کے دوست بن گئے تھے۔ شاہدہ کو بیگم کہتا۔ اس کی ضرورت سے زیادہ تعظیم کرتا۔ جب وہ آتی تو اٹھ کھڑا ہوتا۔ اور اسے تسلیمات عرض کرتا۔ احمد نے یہ رویہ سوچ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ اس لئے کہ وہ محسن کی بے پروائی کا تقابل بنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا ____ وہ بڑا دقیقہ شناس تھا کہ وہ شاہدہ کو ایک دو برس میں نہیں تو کم از کم پانچ برسوں میں ضرور حاصل کرے گا۔

اب میں آپ سے عرض کروں کہ فلمی دُنیا میں اکثر و بیشتر حضرات عورتوں کے ذریعے سے کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر بھی غالباً یہی نسخہ تھا۔ احمد نے اس پر چھا جانے کے لئے کافی وقت صرف کیا۔ اس کے خاوند محسن عبداللہ کو ہر صورت سے خوش کرنے کی کوشش کی، مگر وہ طبعاً اوباش تھا۔

شالیمار اسٹوڈیوز میں جب محسن کو لیبارٹری انچارج بنا دیا گیا اور اس کی معقول تنخواہ مقرر کردی گئی تو اس نے اپنے شغل اور زیادہ زور شور سے جاری رکھے۔ شاہدہ یہ سب کچھ ایک گھریلو عورت کے مانند دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی گلہ شکوہ کرتی، مگر اس کے خاوند پر جو تن آسان تھا، کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کو بمبئی ٹاکیز کی گھٹی گھٹی فضا سے باہر نکل کر شالیمار اسٹوڈیو میں ایک بہت بڑا میدان مل گیا تھا۔ جس میں وہ اپنے اشغال میں بڑی بے تکلفی سے مصروف رہ سکتا تھا۔ شاہدہ گو ایکٹریس بن گئی تھی۔ اسے اس گوالن کا رول ادا کرنا تھا۔ جس کی عصمت لوٹ لی گئی تھی۔ لیکن اسے اپنے شوہر سے پیار تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ فلمی دنیا سے نکل کر گھریلو دنیا میں چلی جائے۔ اُسے پُراسرار کہلانا پسند نہیں تھا۔

لیکن جب اس کے متعلق اشتہار بازی ہوتے دو برس ہوئے تو اس کے تھکے سے گھروندے میں جس کو دل کہتے ہیں، عجیب عجیب سی دھڑکنیں پیدا ہونے لگیں۔ جن سے وہ پہلے نا آشنا تھی۔

اس کے سامنے جو تقابل احمد نے پیش کیا۔ وہ اس کے متعلق اب سوچنے لگی۔ وہ آداب کا مجسمہ تھا۔ اس کے خلاف محسن بہت تکلیف دہ قسم کا بے ادب۔ وہ اس سے بہت بُرا سلوک کرتا۔ اس کے علاوہ شاہدہ کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ اسٹوڈیو میں دوسری عورتوں سے عشق لڑاتا پھرتا تھا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

احمد نے محسن کو جس عہدے پر مقرر کیا تھا۔ وہ اسے اس کی اسکیم کے مطابق سنبھال نہ سکا۔ اس نے محسن کو کبھی ٹوکا نہیں تھا کہ وہ جوا کیوں کھیلتا ہے۔ ریس میں روپیہ کیوں ہارتا ہے۔ اسٹوڈیو کی لڑکیوں سے کیوں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ بُری طرح وہ ان خرابیوں میں گرفتار ہو جائے۔ اس لیے کہ وہ خود ایک بہت بڑی خرابی کے درپے تھا۔

احمد کی اسکیم میں جو کچھ تھا وہ تو ظاہر ہے۔ لیکن بھولی بھالی شاہدہ اسے نہ سمجھ سکی۔ وہ اپنے دل کی عجیب و غریب دھڑکنوں کو بھی نہیں سمجھتی تھی۔ میک اپ کرتی۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھتی اور شرما جاتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ گالزوردی کے ناول "ٹیس" کی گوالن ہے۔ جس کی عصمت لوٹی جانے والی ہے۔

اس نے جب فلم میں اپنا رول ادا کرنا شروع کیا تو اس کا حجاب کسی قدر دُور ہو گیا— محسن اسی قدر اس سے دور ہوتا گیا۔ وہ یوں محسوس کرنے لگی کہ اس کے کچے مٹکے تڑخ رہے ہیں— وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ قیمتی مٹکے ٹوٹیں۔ لیکن احمد نے ان کی تریڑوں کو یقین دلایا کہ وہ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔

تریڑیں آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے لگیں۔ اس لئے کہ احمد ایسے معاملوں میں بڑا ماہر کاریگر ہے۔ اس نے ان میں اپنی سیاست کا سیمنٹ بھرنا شروع کر دیا— اس کے ساتھ ساتھ وہ محسن کے بھی چونا لگا رہا تھا۔

احمد بڑا اچھا معمار ہے۔ اس نے اپنا کام بہت آہستہ، مگر بڑی صفائی سے کیا۔ آخر وہ محسن کی اینٹ کو اپنی عمارت سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے اس دوران میں شاہدہ کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کا شوہر ایک اوباش اور ناکارہ آدمی ہے۔ اس نے اس کو محض اس لئے اپنے کاروبار میں شریک کیا تھا کہ اس کی عادت سدھر جائیں گی۔ مگر وہ اس قابل ثابت نہیں ہوا۔ شاہدہ یہ سب باتیں سنتی رہی اور اس کو یقین سا آنے لگا کہ شاید یہ درست ہیں۔ لیبارٹری کا کام بہت سُست رفتار تھا۔ خود احمد بھی چیونٹی کی چال چلنے کا عادی ہے لیکن ایک دن اس نے محسن سے بڑی نرمی سے کہا "دیکھئے، آپ سے کام نہیں ہوتا۔ شاید اس لئے کہ آپ اسے اپنے رتبے کے مطابق نہیں سمجھتے۔ میں لیبارٹری کسی اور کے حوالے کر دیتا ہوں۔ جو تنخواہ آپ کی مقرر کی گئی تھی برابر آپ کو ملتی رہے گی۔"

محسن پہلے تو سخت طیش میں آ گیا۔ لیکن اس کی یہ آگ فوراً احمد نے بجھا دی اس لئے کہ وہ بڑا اچھا فائر بریگیڈ ہے۔ چنانچہ شاہدہ کا خاوند ملازمت سے علیحدہ ہو گیا اور اسے پنشن ملنے لگی۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں محسن کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ بیک وقت ذکی الحس اور بے حس ہے، اس وقت شاید اس پر بے حسی طاری تھی کہ اس نے احمد کا یہ فیصلہ قبول کر لیا۔

اس کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اس کی بیوی جس سے وہ غفلت برت رہا ہے اور جس کو اس نے مجبور کیا ہے کہ وہ اس کی بہنوں کی طرح آزاد ہو۔ اس کی مانگ میں کوئی اور ہولے ہولے نیا سیندور ڈال رہا ہے۔ وہ قطعاً غافل تھا ___ اس کو دراصل اپنی بیوی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس کو بمبئی اور پُونہ کے گھوڑوں، تاش کے پتوں اور پُونے کے کاشتوں سے شغف تھا۔

فلم بن رہا تھا۔ شاہدہ گوالن بنی پُراسرار نینا کے نام سے اس میں کام کرنے میں دن رات مصروف تھی اور احمد ڈائریکٹر کی حیثیت سے اس کو ایسی ڈائریکشن دے رہا تھا جو اس کے مقصد کو پُورا کر سکے۔

محسن عبداللہ کافی وجیہہ مرد ہے۔ لمبا تڑنگا۔ مضبوط جسم۔ تعلیم یافتہ مگر ضرورت سے زیادہ روشن خیال۔ اس نے شالیمار اسٹوڈیوز سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنی بیوی کی مفارقت کے متعلق جس سے اس نے عشق کے ماتحت شادی کی تھی کچھ زیادہ خیال نہ کیا۔ اسے شاہدہ پر کامل اعتبار تھا لیکن اس کے باوجود اسے اس کی کوئی پرواہ بھی نہیں تھی۔ وہ اب آزاد تھا اور اس آزادی سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔

ڈبلو۔ زیڈ احمد بڑا وضعدار آدمی ہے۔ وہ اپنے عملے کے دوسرے آدمیوں کو اگر وقت پر تنخواہ نہ دے سکتا تو محسن کو اس کی پینشن مقرّرہ وقت پر ضرور ادا کر دیتا۔ یہ اس کے کیریکٹر کا ایک خاص پہلو ہے۔ وہ چھچھورا یا کمینہ نہیں۔ اس میں ایک اعلیٰ خاندان کے فرد کی تمام خصوصیات موجود ہیں لیکن سوئے اتفاق سے وہ چونکہ فلمی دُنیا میں داخل ہو گیا تھا۔ اور اس کی طبیعت سراسر سیاسی تھی۔ اس لئے اسے اس ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑا۔ اس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں تھا لیکن اس نے لاکھوں روپے سمیٹے۔ ان کو اس نے کسی عیاشی میں تباہ نہیں کیا۔ دراصل وہ بڑا اہل انگار اور سُست رفتار ہے۔ اس کے علاوہ وہ خوشامد پسند بھی، وہ بڑے چھوٹے پیمانے پر ایک مغل بادشاہ ہے جو اپنے اردگرد شاعروں، بھانڈوں اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کا جمگھٹا لگائے رکھتے تھے۔

جیسا کہ میں شاید اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں۔ اس کے ہاں ساغر نظامی، جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر، کرشن چندر ایم اے اور بھرت ویاس ملازم تھے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور میرا بھانجہ مسعود پرویز بھی تھے۔ یہ سب احمد کے مکان کے ایک کمرے میں بیٹھتے۔ کہانی کے مکالموں پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ ساری رات گذر جاتی اور کوئی فیصلہ نہ ہوتا اس لئے کہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

درباری ماحول ہوتا تھا۔ کوئی بات شروع ہوئی تو جوش ملیح آبادی نے موقع محل کے مطابق اشعار سنانے شروع کر دیئے۔ واہ واہ ہو رہی ہے۔ مسعود پرویز جس کا دماغ اس زمانے میں حاضر تھا۔ فوراً اسی زمین میں چند شعر کھود ڈالے۔ ساغر نظامی کو تاؤ آیا تو اس نے ایک لمبی نظم ترنم میں پڑھ دی۔ کرشن چندر اُلو بنا بیٹھا رہتا۔ افسانہ نگار تھا۔ اس کو شعروں سے بھلا کیا واسطہ۔

ان نشستوں میں کام بہت کم ہوتا۔ باتیں بہت زیادہ ہوتیں۔ بھرت ویاس کو یہ احساسِ کمتری تھا کہ وہ اردو زبان نہیں جانتا۔ اس لئے وہ اپنی سنسکرت آمیز ہندی بگھارنا شروع کر دیتا۔

کبھی کبھی احمد جب کوئی موزوں فقرہ بولتے تو جوش ملیح آبادی عش عش کرتے اور کہتے۔ ''احمد صاحب آپ تو شاعر ہیں۔'' بس احمد صاحب اس وقت اپنا کام بھول جاتے اور شعر فکر کرنے لگتے۔ محفل برخواست کر دی جاتی اور وہ ساری رات غزل کی تکمیل میں مصروف ہوتے اور جو میرا خیال ہے آج تک ایک بھی مکمل نہیں ہوئی۔

یہ سب لوگ احمد کے خوشامدی تھے۔ جوش ملیح آبادی کو ہر شام رم کا اَدھا مل جاتا تھا۔ شروع شروع میں شالیمار اسٹوڈیو میں چند مہینوں تک باقاعدہ تنخواہیں ملتی رہیں۔ اس کے بعد بے قاعدگی شروع ہو گئی۔ عملے کے آدمی صرف ایڈوانس لیتے تھے۔

وہاں کی فضا عجیب و غریب تھی۔ ڈائریکٹر ایک تھا۔ مگر اس کے اسسٹنٹ دس بارہ کے قریب تھے۔ اسسٹنٹ کے اسسٹنٹ اور در اسسٹنٹ۔ معلوم نہیں یہ لوگ گذارہ کیسے کرتے تھے اس لئے کہ تنخواہ تو وقت پر ملتی ہی نہیں تھی۔

بہر حال یہ احمد کا معجزہ ہے کہ اس نے شالیمار اسٹوڈیو کا بھرم کسی نہ کسی طرح قائم رکھا ہوا تھا۔ وہ بڑا اکائیاں انسان ہے۔ اس کو مشکل سے مشکل وقت بھی پریشان نہیں کر سکتا۔ بڑے اطمینان سے چاندی کی ڈبیا میں سے پان نکالے گا۔ بٹوے میں سے چھالیا اور تمبا کو نکال کر کلّے میں دبائے گا اور مسکرانا شروع کر دے گا۔

اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو کسی پرکار سیاست دان میں ہو سکتی ہیں۔ اس نے اسی سیاست کی بدولت شالیمار اسٹوڈیو بنایا اور آہستہ آہستہ اپنا راستہ ناپ کر شاہدہ پر قبضہ کر لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو شاہدہ میں ایسی کیا کشش دکھائی دی کہ اس نے اس کے سپاٹ جسم پر ایک نگار خانہ تعمیر کر دیا۔ وہ ایسی عورت ہی نہیں تھی جو ایکٹریس بننے کے قابل ہو مگر شاید احمد کو اس وقت کوئی اور لڑکی میسر نہیں تھی یا آسانی سے ہاتھ نہیں لگ سکتی تھی کہ اس نے اپنے دوست محسن کی بیوی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور بعد میں وہ اس کے گھریلوپن سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

محبت میں گرفتار ہو گیا۔

لیکن یہ امر بھی مشتبہ ہے، ہو سکتا ہے احمد کو شاہدہ سے بھی محبت نہ ہوئی ہو۔ محض اپنے مفاد کی خاطر جب وہ اس پر لگاتار اپنی شرافت کا بوجھ ڈالتا رہا تو وہ اپنے خاوند محسن عبداللہ کو بھولتی گئی۔ مگر یہ نظریہ بھی درست نہیں، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ طلاق ہونے تک وہ اپنے شوہر سے جدا ہونا پسند نہیں کرتی تھی۔ میں اس کے متعلق آگے چل کر کچھ عرض کروں گا۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ شاہدہ، احمد کے ساتھ کیوں رہتی تھی۔ ٹھہرئے۔ میں بھول گیا۔ شروع شروع میں وہ دونوں الگ الگ رہتے تھے۔ لیکن بعد میں ایک ہی کوٹھی میں رہنے لگے۔

جانے کون سا سن تھا۔ میں فلمستان میں ملازم تھا۔ ایس مکرجی وہاں کے پروڈکشن کنٹرولر تھے۔ انھوں نے ایک روز مجھ سے کہا کہ تم کہانی کیوں نہیں لکھتے ہو۔ میں نے چنانچہ پانچ دن میں چار کہانیاں لکھیں۔ مکرجی صاحب نے مجھ سے کہا کہ مجھے سناؤ۔ میں نے صاف انکار کر دیا اور چاروں کہانیاں اپنے بھانجے مسعود پرویز کو بھیج دیں جو شالیمار اسٹوڈیو میں ملازم تھا۔

پہلی کہانی ''کنٹرولستان'' تھی۔ مجھے چوتھے روز مسعود کا تار ملا کہ تمھاری یہ کہانی بہت پسند کی گئی ہے۔ بہتر ہے کہ تم پونہ چلے آؤ تاکہ احمد صاحب سے جملہ معاملات طے ہو جائیں۔

میں پونہ گیا۔ اب یہ ایک لمبی حکایت ہے کہ میں وہاں کس طرح پہنچا۔ میں نے شالیمار اسٹوڈیو میں کیا کچھ دیکھا۔ صرف ایک دلچسپ بات بتائے دیتا ہوں کہ سب سے پہلے میں اس اسٹوڈیو کی موتری (پیشاب خانے) میں گیا۔ کیونکہ یہ ایسی جگہ ہے جہاں سے متعلقہ فضا کے اکثر و بیشتر حالات معلوم ہو جایا کرتے ہیں۔

میں جب اندر داخل ہوا تو سامنے دیوار پر اُردو زبان میں جملہ لکھا تھا۔ ''اور تو سب ٹھیک ہے پر یہاں پگار (تنخواہ) نہیں ملتی۔'' میں بڑا بددل ہوا — میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں۔ لیکن مسعود نے مجبور کیا کہ احمد سے مل لوں۔ شام کو اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ دفتر میں — یہ بڑا سگار سلگائے اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ایک طرف شاہدہ تھی۔ دوسری طرف جوشؔ ملیح آبادی۔

جوشؔ سے علیک سلیک ہوئی۔ ان کے پاس ان کھلا رم کا اَدھا تھا جو غالباً احمد نے احتراماً منگوا کر دیا تھا۔ احمد سے میں نے پنجابی میں گفتگو شروع کی۔ لیکن فوراً مجھے احساس ہوا کہ پاس جوشؔ اور شاہدہ بیٹھے ہیں جو یہ زبان نہیں سمجھتے اس لئے میں نے اُردو میں بات چیت شروع کر دی۔

میں نے جب اسے پربھات فلم کمپنی میں دیکھا تھا تو وہ تر و تازہ نوجوان تھا۔ پر اب اس میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ لُو چلنے کے باعث جھلس سا گیا ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اس نے اپنے مخصوص رسمی انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا تھا اور شاہدہ عرف پُراسرار نینا سے بھی متعارف کیا تھا۔ وہ اس وقت وہیں دفتر میں موجود تھی۔

اس کی شکل و صورت میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس میں کوئی اسرار پوشیدہ ہو۔ معمولی خدوخال کی عورت تھی۔ میں نے جب اسے پہلی مرتبہ احمد کے دفتر میں دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ آبی رنگوں کی ایسی تصویر ہے جو بارش میں چھت ٹپکنے کے باعث اپنے رنگ کھو چکی ہے۔

اس میں ایکٹریسوں کی ایکٹرسیت نہیں تھی۔ خاموش ایک کُرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں کون ہوں۔ وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ میں اس کے شوہر محسن عبداللہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

تھوڑی دیر جوش ملیح آبادی سے گفتگو ہوتی رہی۔ وہ اپنا شام کا کوٹا یعنی رم کا اڑھا ہاتھ میں تھامے بیٹھے تھے اور احمد مشہور جرمن فلم ڈائریکٹر کی نقل اتار رہا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ ایک لمبا سگار ہونٹوں میں دبائے بیٹھا تھا۔

میں وہاں اپنی ایک کہانی بیچنے کے سلسلے میں گیا تھا۔ اس کے متعلق اس دن کوئی بات نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ میں نے پُراسرار نینا کو دیکھ لیا تھا۔

فلمستان میں، میں نے محسن عبداللہ کو بھی ملازم رکھوایا تھا۔ اس کی حالت بہت پتلی تھی۔ ایک دن میں نے پروڈکشن کنٹرولر مسٹر مکرجی سے کہا کہ وہ بمبئی ٹاکیز کے زمانے میں اس کا دوست رہ چکا ہے۔ اس کو شرم آنی چاہئے کہ وہ غریب کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

مکرجی نے دوسرے روز ہی اسے بُلایا۔ آپس میں دوستانہ گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد مکرجی نے دوستانہ طور پر اس سے کہا کہ وہ فلمستان میں کیوں نہیں آجاتا۔ وہ راضی ہو گیا۔ اس کی تنخواہ چار سو روپے ماہوار مقرر ہو گئی۔

محسن عبداللہ بڑا کام چور ہے۔ اس کو کام کرنے کی عادت ہی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ دوسرا اس کے لئے کمائے اور وہ کھائے۔

ان دنوں ''آٹھ دن'' بن رہا تھا۔ جس کی کہانی میری لکھی ہوئی تھی۔ اس کا منظر نامہ میں جب لکھنے لگا، تو محسن نے مجھ پر بڑے احسان کئے۔ مجھے کئی مشورے دئے۔ جو فلمی نقطۂ نظر سے بالکل غلط تھے۔ میں نے ان کو نظر انداز کر دیا۔

اس دوران میں وہ مجھے بتا چکا تھا کہ اس کو شاہدہ کی محبت اب بھی ستاتی ہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ ایک لڑکی سے (جو عورت بن چکی تھی) جس کا نام ویرا تھا۔ اور جسے ہم نے ''آٹھ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری بس بک گروپ

دن'' کی ہیروئن منتخب کیا تھا اپنا ٹانکہ ملا رہا ہے۔

شروع شروع میں وہ سیکنڈ کلاس میں سفر کیا کرتا تھا۔ برقی ٹرین میں تین درجے ہوتے ہیں تھرڈ، سیکنڈ اور فرسٹ، فلمستان شہر سے کافی دور تھا۔ غالباً اُنیس میل۔ یہ مسافت طئے کرنے میں کم از کم پون گھنٹہ لگتا تھا۔ لیکن جب رائے بہادر چونی لال نے فلم ''آٹھ دن'' کے لئے ویرا کے ساتھ کنٹریکٹ کیا تو اس نے فرسٹ کلاس میں آنا جانا شروع کردیا۔

میرا خیال ہے کہ اب اس سلسلۂ خیال کو یہیں بند کر دینا چاہئے اور اصل موضوع کی طرف آنا چاہئے۔

میں احمد کے دفتر میں بیٹھا ایک ابوالہول کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ پُراسرار نینا بیٹھی تھی لیکن میرے نزدیک ان دونوں میں کوئی پُرانی ''مصریت'' نہیں تھی۔

یوں تو پُراسرار نینا میرے لئے بالکل اجنبی اور نئی تھی لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا تھا کہ میں اس کو اس کی پیدائش سے جانتا ہوں جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کرچکا ہوں۔ وہ بڑی گھریلو قسم کی عورت ہے۔ یاد کھائی دیتی ہے۔

میرے دل و دماغ میں بے شمار خیالات تھے اس لئے کہ میں محسن عبداللہ کا دوست بن گیا تھا۔ اس نے مجھ سے اپنی زندگی کے واقعات کچھ اس انداز میں بتائے تھے کہ میں ایک سادہ لوح ہونے کی وجہ سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کی بیوی شاہدہ کو اس سے بتدریج چھینا گیا ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک خاوند سے اس کی موجودگی میں بتدریج یا نا تدریج کیسے چھینا جاسکتا ہے۔

اصل میں وہ اس سے غافل تھا۔ اور سنیہہ پربھا پردھان کے عشق میں مبتلا تھا۔ اس کے علاوہ اس کو جوئے بازی کا بھی شوق تھا۔ فلش کھیلتا اور اکثر ہارتا۔

اس کو اپنی بیوی سے ہمیشہ یہ گلہ رہتا کہ وہ اس کی بہنوں کی طرح آزاد نہیں ہے۔ وہ غریب فلمی ماحول سے قطعاً آشنا ہونا نہیں چاہتی تھی۔ دل ہی دل میں کڑھتی تھی کہ اس کا خاوند جو فلم لیبارٹری میں کام کرتا ہے کیوں اسے مجبور کررہا ہے کہ وہ فلم ایکٹریس بن جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہدہ ایک اونچے روشن خیال اور بیباک خاندان کی فرد تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس میں حجاب بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اس نے شروع شروع میں اپنے خاوند محسن عبداللہ سے یہ شکایت کی کہ وہ کیوں ایک ایکٹریس سے عشق لڑا رہا ہے۔ کیوں جوا کھیلتا ہے۔ اور بیکار روپیہ ضائع کرتا ہے۔ مگر محسن عبداللہ نے اپنی بیوی کی کوئی بات نہ سُنی۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ڈبلو۔ زیڈ۔ احمد ان کے گھر بدستور آتا رہا۔ وہ اس کا اتنا احترام کرتا تھا کہ وہ سمجھتی تھی کہ وہ اس احترام کے قابل نہیں۔ اس کو آہستہ آہستہ یہ محسوس ہونے لگا کہ احمد جس کے ساتھ ڈبلو۔ زیڈ چپکا ہوا ہے۔ کوئی ایسا مرد ہے جو محسن کے مقابلے میں اس پر زیادہ جنسی احسان کر سکتا ہے۔

محسن مس پردھان کے چکر میں پڑا تھا۔ میں آپ کو یہاں بتادوں کہ مس پردھان بڑی قبضہ گیر قسم کی عورت ہے اور محسن جو اپنی بیوی کو قریب قریب چھوڑ چکا تھا۔ اس کے پیشِ نظر وہ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کر سکتی تھی؟ ظاہر ہے کہ ان کے رومان کا انجام ناکام رہا۔

معاف کیجئے گا کہ میں بہک گیا۔ اور باتوں ہی باتوں میں خدا معلوم کہاں پہنچ گیا۔ ویسے آپ سے یہ عرض کرنا تھا کہ احمد کے دفتر میں جب نینا سے میری ملاقات ہوئی تو میں حسبِ معمول پئے تھا اور جب میں پئے ہوتا ہوں تو مجھے تکلف برتنا نہیں آتا۔ چنانچہ میں نے پُراسرار نینا سے کہا کہ ''آپ کا اسرار تو میں نہیں جانتا۔ اس لئے کہ وہ ڈبلو۔ زیڈ۔ احمد کے پاس محفوظ ہے۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔''

یہ سُن کر ڈبلو۔ زیڈ۔ احمد نے میری طرف دیکھا اور یہ معذرت کر کے کہ اسے کسی سے باہر ملنا ہے چلا گیا اور ساتھ میں جوش ملیح آبادی کو بھی لے گیا۔ ایسے معاملوں میں ڈبلو۔ زیڈ۔ احمد کا کوئی جواب نہیں۔ وہ ہر رمز اور ہر کنایہ پہچانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی پنج سالہ اسکیم کے ماتحت نینا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس کو اس نے پُراسرار بنادیا۔ اصل میں اسرار سارا احمد کا ہے۔ جس نے اسے ایک لوٹن کبوتری بنا کر رکھ دیا ہے جو صرف اسی کے گھر میں انڈے دیتی ہے۔

ایک انڈا اس نے محسن کے گھر میں بھی دیا تھا۔ جس کا چوزہ صحت مند نہیں تھا۔ ڈبلو۔ زیڈ۔ احمد کی کاریگری ہے یا آپ اسے کوئی اور نام دے دیجئے' کہ وہ اب تک اسے پالتا پوستا ہے۔

میں نے احمد کے چلے جانے کے بعد نینا سے سلسلہ گفتگو کا آغاز کیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ تمہاری یاد میں اکثر آنسو بہاتا ہے۔ یہ سُن کر اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب سی طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ منٹو صاحب آپ اس شخص کو نہیں جانتے اس کا ہر آنسو انگریزی کے محاورے کے مطابق مگر مچھ کا آنسو ہوتا ہے وہ آنسو نہیں بہاتا بلکہ آنسو اس کو بہاتے ہیں۔''

یہ جملہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ بہر حال شاہدہ عرف پُراسرار نینا کی بے اسرار سنجیدگی یہ ظاہر کئے دیتی تھی کہ جو کچھ اس نے کہا ہے اس میں دروغ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ان دنوں ''میرا بائی'' کی تیاریاں ہو رہی تھیں اس کے علاوہ ''کرشن بھگوان'' کے لئے احمد نے حسبِ دستور اپنی پنج سالہ اسکیم کے ماتحت بھارت بھوشن کو کرشن بھگوان کا پارٹ ادا کرنے کے لئے زیر معاہدہ کر رکھا تھا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

بھارت بھوشن کو ہر روز باقاعدگی کے ساتھ مکھن اور دوسری طاقتور غذائیں کھلائی جاتی تھیں کہ وہ بہت دُبلا تھا اور اس قابل نہیں تھا کہ مکھن چور بن سکے۔

بھارت بھوشن کو مکھن کھلانے کے ساتھ ساتھ احمد، شاہدہ کے اسرار میں اضافہ کرتا گیا، جو اس کے پروگرام کے عین مطابق تھا۔

اب میں احمد کی سہرے جلوے کی بیاہی بیوی کی طرف آتا ہوں جس کا نام صفیہ ہے۔ غلام حسین ہدایت اللہ (مرحوم) وزیراعظم سندھ کی دخترِ نیک اختر۔

ظاہر ہے کہ جب خاوند کسی دوسری عورت کے ساتھ مصروف ہوگا تو اس کی اپنی عورت جو روشن خیال اور آزاد ہو۔ یقیناً کسی نہ کسی سے رابطہ پیدا کرلے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مشہور کمیونسٹ لیڈر سبط حسن سے اس کا معاشقہ ہوگیا۔

مجھے اس رومان کے متعلق پوری معلومات حاصل نہیں تھیں۔ اس لئے میں نے سبط حسن سے یہاں لاہور میں کئی ملاقاتیں کیں۔ لیکن اس سے کھل کر بات نہ کرسکا۔ ہر روز یہی سوچتا کہ دوسرے روز جب وہ آئیگا یا جب میں اس سے ملوں گا تو احمد کی بیوی کے بارے میں دریافت کروں گا کہ یہ سلسلہ کیسے ہوا۔ کیونکہ میں نے سُنا تھا کہ صفیہ جو کافی پڑھی لکھی عورت ہے امریکہ کی کسی علمی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے گئی اور سبط حسن بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ اور ان دونوں کی شادی ہوگئی۔

میں یہ مضمون ضرور مکمل کرتا جو کسی لحاظ سے بھی تشنہ نہ رہتا، لیکن اچانک حکومت کی مشینری حرکت میں آئی اور سبط حسن گرفتار کرلئے گئے۔ اس لئے کہ وہ کمیونسٹ ہیں۔

گرفتاری سے پہلے ایک شام جب ان سے ملاقات ہوئی تو وہ اپنے پائپ میں جہاں کا گرد بھرا تمبا کو پی رہے تھے۔ میری یہ خواہش تھی کہ ان سے کرید کرید کر احمد کی سابقہ بیوی صفیہ کے متعلق پوچھوں کہ اس سے ان کا معاشقہ کیسے ہوا۔ اب وہ کہاں ہے سبط حسن تین برس جیل میں رہنے کے بعد آئے تھے۔

احمد اور سبط حسن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ احمد سیاسی آدمی ہے، سبط حسن اس کے برعکس جذباتی۔ اس کو پنج سالہ اسکیمیں پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ جو کام ہو "فاٹ فٹ" ہو ___ یوں دیکھنے میں بڑے تیکھے ہیں وہ۔ لیکن اندرونی طور پر بہت ملائم۔ گرفتاری کے چند روز پہلے، وہ میرے یہاں تشریف لائے۔ مصیبت یہ تھی کہ میرے اور کئی ملاقاتی موجود تھے۔ ان کی موجودگی میں سبط حسن سے کھل کر باتیں نہیں کرسکتا تھا باتوں باتوں میں ان سے میں نے پوچھا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
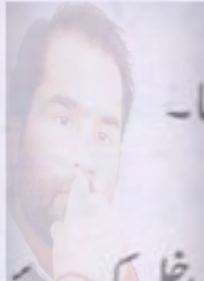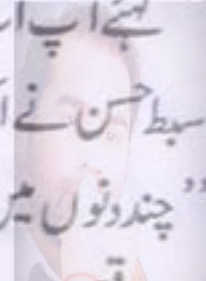
''کہئے آپ اب کب جیل جائیں گے؟''

سبط حسن نے ایک پائپ کا کش لگایا اور مسکرا کر کہا۔

''چند دنوں میں۔''

اور واقعی وہ پندرہ بیس روز کے بعد جیل میں داخل کر دیئے گئے اور میرا یہ مضمون نامکمل رہ گیا۔

میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ لیکن کیا کروں، یہ موضوع ہی ایسا ہے، جو ہزار پہلو ہے۔

شاہدہ (نینا) کے شوہر محسن عبداللہ ایک بڑی خطرناک لڑکی سنیہہ پربھا پردھان سے عشق فرما رہے تھے۔ ان کی بیوی پر احمد صاحب بڑے سلیقے سے اپنی اسکیم کے ماتحت آہستہ آہستہ ڈورے ڈال رہے تھے۔
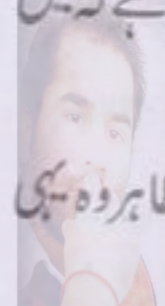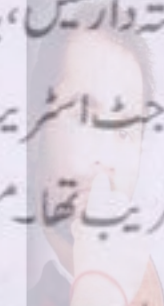
اِدھر اُدھر اور بہت کچھ ہو رہا تھا۔ کوئی مسز نورانی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک پنجابی لونڈا عشق لڑا رہا تھا۔ یہ مسز نورانی، احمد کی رشتہ دار تھیں، یا مسٹر نورانی کی ____ بہرحال کہنا یہ ہے کہ میں نے کئی مرتبہ اس کو ان کے گھر میں جو فورجٹ اسٹریٹ پر تھا، دیکھا۔

وہ پنجابی لونڈا بھی عجیب و غریب تھا۔ معلوم نہیں اسے کوئی عارضہ تھا، لیکن ظاہر وہ یہی کرتا کہ اس کو دل کے دورے پڑتے ہیں۔

مسٹر نورانی خاموش کرسی پر سگار سلگائے بیٹھے رہتے اور ان کی بیگم پنجابی نوجوان کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی رہتی۔ کبھی کبھی بوس و کنار بھی ہو جاتا۔ مگر مسٹر نورانی کے سگار کی راکھ ویسی کی ویسی اس پر ثابت و سالم رہی۔

عجیب سلسلہ تھا کہ محسن عبداللہ، سنیہہ پربھا پردھان کے عشق کے چکر میں تھے۔ ان کی بیوی پر احمد اپنا سکہ جما رہے تھے۔ ادھر احمد کی بیوی صفیہ، سبط حسن سے رومان لڑا رہی تھی۔ اور ان کے جاننے پہچاننے والوں میں بھی اسی قسم کا سلسلہ جاری تھا۔

میں نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو بخدا چکرا گیا کہ یہ ہو کیا رہا ہے میاں یہاں بیٹھے ہیں، اور ان کی بیوی کسی غیر مرد سے چوما چاٹی کر رہی ہے۔ ایک شوہر اپنی سہرے جلوے کی بیاہی بیوی کو چھوڑ کر کسی ایکٹریس کے پیچھے مارا مارا پھر رہا ہے۔

میرا خیال ہے دنیا میں ایسے واقعات کی کمی نہیں۔ عورتیں اور مرد ہمیشہ ایسے ہی سلسلے کرتے آئے ہیں ____!

ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی سے بے اعتنائی برتے اور کسی اور عورت

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کے عشق میں گرفتار ہو جائے تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ ہزاروں میں صرف چند عورتیں ایسی نکلیں گی جو کسی اور مرد سے ناتا نہ جوڑیں۔ پُونا میں احمد اور نینا (شاہدہ) اکھٹے رہتے تھے۔ ایک بنگلہ تھا۔ بہت اچھا۔ لیکن احمد اس میں کبھی کبھار آتا۔ بیگم صاحبہ کی مزاج پُرسی کرتا اور چلا جاتا۔ آہستہ آہستہ اس نے وہاں مستقل طور پر قیام کر لیا۔ اب وہ دونوں ایک ساتھ صبح کو ناشتہ کرتے، دوپہر کو لنچ کھاتے اور رات کو ڈنر پر بھی ایک ساتھ ہوتے۔

اسٹوڈیو میں تو خیر ان کا ایک ایک لمحہ ایک دوسرے کے ساتھ گزرتا۔ عجیب بات ہے کہ اس دوران میں احمد نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ شاہدہ کو اپنے قبضے میں لانا چاہتا ہے۔

شاہدہ کے خاوند محسن عبداللہ کو تو احمد اپنی حکمت عملی کے ذریعے سے اپنے اسٹوڈیو سے یوں نکال چکا تھا جیسے مکھن سے بال۔ وہ بمبئی میں سڑکوں پر پیدل چلتا تھا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ وہ اپنی بیوی کی وجہ سے پُونہ سے بمبئی کار میں آیا تھا۔ پر اب اُسے کوئی لفٹ دینے والا نہیں تھا۔

میں ایک روز ٹیکسی پر لیمنگٹن روڈ سے گزر رہا تھا کہ محسن مجھے نظر آیا۔ میں نے ٹیکسی رُکوائی اور اس کی خیر خیریت پوچھی۔

"سُنائیے محسن صاحب۔ آپ کہاں ہوتے ہیں آج کل؟"

اس کے چوڑے چکلے چہرے پر مسکراہٹ ____ عجیب قسم کی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "آجکل میرا کام سڑکیں ناپنا ہے۔"

میں نے ازراہِ مذاق اس سے پوچھا۔ "لیمنگٹن روڈ کی لمبائی اور چوڑائی کتنی ہے۔"

اس نے بھی میرے ہی انداز میں جواب دیا۔ "آپ جتنی لمبی ___ مجھ ایسی چوڑی۔"

میں نے اس سے کہا کہ آؤ، ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ جہاں تمہیں جانا ہے وہیں چھوڑ دوں گا۔ مگر اس نے میری یہ دعوت قبول نہ کی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بہت مضطرب تھا۔

اور اس اضطراب کی وجوہ کئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی بیوی کو قریب قریب کھو چکا تھا۔ سنیہہ پربھا پردھان اس سے سخت بے اعتنائی برت رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ جوئے میں اپنی ساری جمع پونجی ہار چکا تھا اور کوئی ملازمت بھی نہیں تھی۔ جس کا آسرا ہوتا۔

میں نے اس سے پوچھا "سناؤ یار مس پردھان کا کیا حال ہے؟"

اس نے زہر خند کے ساتھ جواب دیا "ٹھیک ٹھاک ہے۔ اب اس سے خواجہ احمد عباس عشق لڑا رہا ہے۔"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

محسن نے مسکرا کر کہا۔ ''دو تین مہینوں کے اندر اندر گنجا ہو جائے گا۔'' میں نے پوچھا ''کیوں؟'' اس نے جواب دیا ______

اس عورت کو آپ نہیں جانتے، وہ عورت نہیں سیفٹی ریزر ہے۔ اور وہ بھی ایسا کہ اس کے مونڈے ہوئے بال پھر کبھی نہیں اُگتے۔'' میرے جسم پر بے شمار بال ہیں۔ میں نے سوچا اگر یہ سیفٹی ریزر میرے ہاتھ آجائے تو میں کتنی جلدی اس لعنت سے نجات پا جاؤں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میں نے کوشش نہ کی۔ ورنہ میرا بھی حشر وہی ہوتا جو محسن عبداللہ اور خواجہ احمد عباس کا ہوا۔ خواجہ گنجا ہو گیا اور محسن کے بال بھی جھڑنے لگے۔

مدّت کے بعد جب میں فلمستان میں بحیثیت افسانہ نگار اور منظر نویس ملازم ہوا تو محسن سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کی حالت بہت دردناک تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مسٹر ایس مکرجی کا دوست ہے۔ اس لئے کہ وہ دونوں بمبئی ٹاکیز میں ایک ساتھ کام کر چکے تھے۔ اور وہاں کا ماحول بہت دوستانہ تھا۔

احمد بمبئی ٹاکیز سے کبھی وابستہ نہیں رہا۔ وہ صرف سادھنا بوس کے ساتھ ایک دو برس رہا، معلوم نہیں، اس کے ساتھ اس کے کیا تعلقات تھے۔ بہر حال وہاں سے نکل کر اس نے اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی اور اس کا کرتا دھرتا بن گیا۔

میں اس سے پیشتر اس مضمون کی پہلی قسط میں کہہ چکا ہوں کہ احمد بہت سیانا اور ذہین آدمی ہے۔ اس نے بڑے بڑے مارواڑیوں کو غچہ دیا۔ کچھ ایسے طور پر کہ ان کو خبر تک نہ ہوئی۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# پری چہرہ نسیم بانو
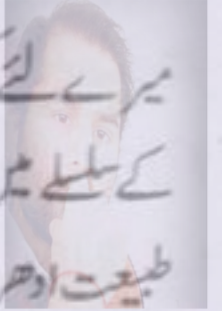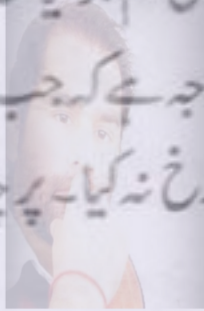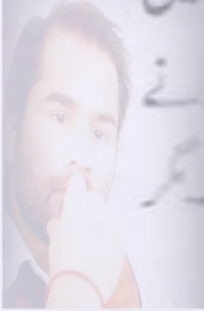
میرا فلم دیکھنے کا شوق امرتسر میں ہی ختم ہو گیا تھا اس قدر فلم دیکھے تھے کہ اب ان میں میرے لیے کشش ہی نہ رہی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب میں ہفتہ وار ''مصور'' کو ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں بمبئی پہنچا تو مہینوں کسی سینما کا رخ نہ کیا۔ پرچہ فلمی تھا۔ ہر فلم کا پاس مل سکتا تھا۔ مگر طبیعت ادھر راغب نہ تھی۔

بمبئی ٹاکیز کا ایک فلم ''اچھوت کنیا'' ان دنوں ایک سینما میں ہفتوں سے چل رہا تھا جب اس کی نمائش کا بائیسواں ہفتہ شروع ہوا تو میں نے سوچا اس فلم میں کیا ہے جو اتنی دیر سے چل رہا ہے۔ دیکھنا چاہیے۔

بمبئی میں یہ میرا پہلا فلم تھا۔ میں نے اس میں پہلی مرتبہ اشوک کمار اور دیویکا رانی کو دیکھا۔ اشوک کمار کا ایکٹنگ خام تھا مگر دیویکا رانی کا کام بہت منجھا ہوا تھا۔ فلم مجموعی طور پر کامیاب تھا۔ ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی یہ تھی کہ اس میں سوقیانہ پن نہیں تھا۔ ایک سیدھی سادی کہانی تھی جو بڑے صاف ستھرے انداز میں پیش کی گئی تھی۔ میں نے اب گاہے گاہے فلم دیکھنے شروع کر دیئے۔

ان دنوں ایکٹریسوں میں ایک ایکٹریس نسیم بانو خاص مشہور تھی۔ اس کی خوبصورتی کا بہت چرچا تھا۔ اشتہاروں میں اسے پری چہرہ نسیم کہا جاتا تھا۔ میں نے اپنے کئی اخبار میں اس کے کئی فوٹو دیکھے تھے۔ خوش شکل تھی۔ جوان تھی۔ خاص طور پر آنکھیں بڑی پُرکشش تھیں اور جب آنکھیں پرکشش ہوں تو سارا چہرہ پُرکشش بن جاتا ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نسیم کے غالباً دو فلم تیار ہو چکے تھے جو سہراب مودی نے بنائے تھے اور عوام میں کافی مقبول ہوئے تھے۔ یہ فلم میں نہیں دیکھ سکا معلوم نہیں کیوں؟ عرصہ گزر گیا اب منروا مووی ٹون کی طرف سے اس کے شاندار تاریخی فلم ''پکار'' کا اشتہار بڑے زوروں پر ہو رہا تھا۔ پری چہرہ نسیم اس میں نور جہاں کے روپ میں پیش کی جا رہی تھی۔ اور سہراب مودی خود اس میں ایک بڑا اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

فلم کی تیاری میں کافی وقت صرف ہوا۔ اس دوران میں اخباروں اور رسالوں میں ''اسٹل'' شائع ہوئے بڑے شاندار تھے۔ نسیم نور جہاں کے لباس فاخرہ میں بڑی پُر وقار دکھائی دیتی تھی۔

''پکار'' کی نمائش عظمیٰ پر میں مدعو تھا۔ جہانگیر کے عدل و انصاف کا ایک من گھڑت قصہ تھا۔ جو بڑے جذباتی اور تھیٹری انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ فلم میں دو باتوں پر بہت زور تھا۔ مکالموں پر اور ملبوسات پر۔ مکالے گو غیر فطری اور تھیٹری تھے لیکن بہت زوردار اور پُرشکوہ تھے جو سننے والوں پر اثر انداز ہوتے تھے چونکہ ایسا فلم اس سے پہلے نہیں بنا تھا اس لئے سہراب مودی کا ''پکار'' سونے کی کان ثابت ہونے کے علاوہ ہندوستانی صنعت فلم سازی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا موجب ہوا۔

نسیم کی اداکاری کمزور تھی۔ لیکن اس کمزوری کو اس کے خداداد حسن اور نور جہاں کے لباس نے جو اس پر خوب بجتا تھا اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا خیال ہے کہ ''پکار'' کے بعد نسیم غالباً دو تین فلموں میں پیش ہوئی مگر یہ فلم کامیابی کے لحاظ سے ''پکار'' کا مقابلہ نہ کر سکے۔

اس دوران میں نسیم کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں فلمی دنیا میں اسکینڈل عام ہوتے ہیں۔ کبھی یہ سننے میں آتا تھا کہ سہراب مودی نسیم بانو سے شادی کرنے والا ہے۔ کبھی اخباروں میں یہ خبر شائع ہوتی تھی کہ نظام حیدر آباد کے صاحبزادے معظم جاہ صاحب نسیم بانو پر ڈورے ڈال رہے ہیں اور عنقریب اسے لے اُڑیں گے۔ یہ خبر درست تھی۔ کیونکہ شہزادے کا قیام ان دنوں اکثر بمبئی میں ہوتا تھا اور وہ کئی بار نسیم کے مکان واقع میرن ڈرائیو میں دیکھے گئے تھے۔ شہزادے نے لاکھوں روپے خرچ کئے بعد میں جن کا حساب دینے کے سلسلے میں انہیں بڑی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ آپ روپے کے زور سے نسیم کی والدہ شمشاد عرف چھمیاں کو رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے چنانچہ پری چہرہ نسیم کا التفات خرید کر آپ اسے اس کی والدہ سمیت حیدر آباد لے گئے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد جہاں دیدہ چھمیاں نے یہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

محسوس کیا کہ حیدر آباد ایک قید خانہ ہے۔ جس میں اس کی بچی کا دم گھٹ رہا ہے۔ آرام و آسائش کے تمام سامان موجود تھے۔ مگر فضا میں گھٹن سی تھی۔ پھر کیا پتا تھا کہ شہزادے کی لاابالی طبیعت میں ایکا ایکی انقلاب آجاتا اور نسیم بانو اِدھر کی رہتی نہ اُدھر کی چنانچہ چھمیاں نے حکمت عملی سے کام لیا۔ حیدر آباد سے نکلنا بہت مشکل تھا مگر وہ اپنی بچی نسیم کے ساتھ واپس بمبئی آنے میں کامیاب ہوگئی۔

اس کی آمد پر کافی شور مچا۔ بڑی پوسٹر بازی ہوئی۔ دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک شہزادہ معظم جاہ کے کاسہ لیسوں کی۔ دوسری نسیم بانو کے ہمدردوں کی بہت دیر تک کیچڑ اچھالی گئی اس کے بعد یہ معاملہ خاموش ہوگیا۔

میں اب فلمی دنیا میں داخل ہو چکا تھا۔ کچھ دیر ''منشی'' کی حیثیت سے امپیریل فلم کمپنی میں کام کیا۔ یعنی ڈائریکٹروں کے حکم کے مطابق الٹی سیدھی زبان میں فلموں کے مکالمے لکھتا رہا۔ ساٹھ روپے ماہوار پر۔ ترقی کی تو ہندوستان سنے ٹون میں سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی کے یہاں سو روپے ماہوار پر ملازم ہوگیا۔ یہاں میں نے اپنی پہلی فلمی کہانی ''مڈ'' کے عنوان سے لکھی اس کا عرف ''اپنی نگریا'' تھا۔ کہنا یہ ہے کہ فلمی حلقے اب میرے نام سے واقف ہو چکے تھے۔

اس دوران میں ایک اعلان نظروں سے گزرا کہ کوئی صاحب احسان ہیں انہوں نے ایک فلم کمپنی تاج پکچرز کے نام سے قائم کی ہے، پہلا فلم ''اجالا'' ہوگا جس کی ہیروئن پری چہرہ نسیم بانو ہے۔

اس فلم کے بنانے والوں میں دو مشہور ہستیاں ہیں۔ ''پکار'' کا مصنف کمال امروہی اور پکار ہی کا پبلسٹی منیجر ایم۔ اے۔ مغنی۔ فلم کی تیاری کے دوران میں کئی جھگڑے کھڑے ہوئے۔ امیر حیدر کمال امروہی اور ایم اے مغنی کی کئی بار آپس میں چخ ہوئی۔ یہ دونوں حضرات غالباً عدالت تک بھی پہنچے مگر ''اجالا'' انجام کار مکمل ہو ہی گیا۔

کہانی معمولی تھی۔ موسیقی کمزور تھی۔ ڈائریکشن میں کوئی دم نہیں تھا۔ چنانچہ یہ فلم کامیاب نہ ہوا اور احسان صاحب کو کافی خسارہ اٹھانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اپنا کاروبار بند کرنا پڑا۔

مگر اس کاروبار میں وہ اپنا دل نسیم بانو کو دے بیٹھے۔ احسان صاحب کے لئے نسیم اجنبی نہیں تھی۔ ان کے والد خان بہادر محمد سلیمان چیف انجینئر نسیم کی والدہ عرف چھمیاں کے پرستار تھے۔ بلکہ یوں کہیے کہ ایک لحاظ سے وہ ان کی دوسری بیوی تھی۔ احسان صاحب کو یقیناً نسیم سے ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ فلم کی تیاری کے دوران میں تو خیر وہ نسیم کے بالکل قریب رہے تھے۔ لیکن لوگوں کا بیان ہے کہ احسان اپنی جھینپوں اور شرمیلی طبیعت کے باعث نسیم سے پوری طرح کھل نہیں سکے تھے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سیٹ پر آتے تو خاموش ایک کونے میں بیٹھے رہتے۔ نسیم سے بہت کم بات کرتے۔ کچھ بھی ہو آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے کیوں کہ ایک دن ہم نے سنا کر پری چہرہ نسیم نے مسٹر احسان سے دلی میں شادی کر لی ہے اور یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ وہ اب فلموں میں کام نہیں کرے گی۔

نسیم بانو کے پرستاروں کے لئے یہ خبر بڑی افسوس ناک تھی۔ اس کے حسن کا جلوہ کیونکہ صرف ایک آدمی کے لئے وقف ہو گیا تھا۔

احسان اور نسیم کا عشق تمام مراحل طے کر کے شادی کی منزل تک کیسے پہنچا مجھے اس کا علم نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں اشوک کمار کا بیان بہت دلچسپ ہے، اشوک ایک صاحب کیپٹن صدیقی کا دوست تھا۔ یہ مسٹر احسان کے قریبی عزیز تھے ''اجالا'' میں انہوں نے کافی روپیہ لگایا تھا۔

اشوک قریب قریب ہر روز کیپٹن صدیقی کے یہاں جایا کرتا تھا کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ کیپٹن صاحب کے گھر کی فضا بدلی ہوئی ہے شروع شروع میں تو وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ لیکن ایک دن اس کی ناک نے محسوس کیا کہ ہوا میں بہت ہی عمدہ سینٹ کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ اشوک نے ازراہ مذاق کیپٹن صدیقی سے اس خوشبو کے ماخذ کے بارے میں پوچھا۔ لیکن وہ گول کر گئے۔

ایک دن جب اشوک، صدیقی صاحب کے گھر گیا۔ تو وہ موجود نہیں تھے۔ لیکن وہ خوشبو موجود تھی۔ بڑی لطیف لیکن بڑی شریر۔ اشوک نے سُونگھ سُونگھ کر ناک کے ذریعے سے معلوم کر لیا کہ یہ اوپر کی منزل سے آ رہی ہے۔ سیڑھیاں طے کر کے وہ اوپر پہنچا۔ کمرے کے کواڑ تھوڑے سے کھلے تھے۔ اشوک نے جھانک کر دیکھا نسیم بانو پلنگ پر لیٹی تھی اور اس کے پہلو میں ایک صاحب بیٹھے اس سے ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے۔ اشوک نے پہچان لیا۔ مسٹر احسان تھے جن سے اس کا تعارف ہو چکا تھا۔

اشوک نے جب کیپٹن صدیقی سے اس معاملے کے متعلق بات کی تو وہ مسکرائے۔ یہ سلسلہ دیر سے جاری ہے۔''

اشوک کے اس بیان سے نسیم اور احسان کے اس معاشقے پر جو روشنی پڑتی ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ عشق و محبت میں جو کچھ ہوتا ہے ہوا ہو گا مجھے اتنا علم ہے کہ احسان کی والدہ اور بہنیں سخت خلاف تھیں کہ وہ نسیم سے شادی کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بہت جھگڑے ہوئے۔ مگر خان بہادر محمد سلیمان صاحب کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس لئے یہ شادی عمل میں آ گئی اور نسیم فلمی دنیا سے دور دلی میں رہنے لگی۔ جہاں اس نے اپنے بچپن کے دن گزارے تھے۔

شادی پر اور شادی کے بعد کچھ دیر اخباروں میں ہنگامہ رہا۔ مگر پھر نسیم فلمی حلقوں سے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اوجھل ہو گئی۔ اس دوران میں فلمی دنیا میں کئی انقلاب آئے کئی فلم کمپنیاں بنیں۔ کئی ٹوٹیں۔ کئی ستارے ابھرے کئی ڈوبے۔ ہمانسو رائے کی افسوسناک موت کے بعد بمبئی ٹاکیز میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ دیویکا رانی (مسز ہمانسو رائے) اور رائے بہادر چونی لال (جنرل مینیجر) میں بات بات پر چلتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ رائے بہادر اپنے گروپ کے ساتھ بمبئی ٹاکیز سے علیحدہ ہو گئے۔ اس گروپ میں پروڈیوسر ایس مکرجی، افسانہ نگار اور ڈائریکٹر گیان مکرجی، مشہور ہیرو اشوک کمار، کوی پردیپ ساؤنڈ ریکارڈسٹ ایس واچا، کامیڈین وی ایچ ڈیسائی، مکالمہ نگار شاہد لطیف اور سنتوشی شامل تھے بمبئی ٹاکیز سے نکلتے ہی اس گروپ نے ایک نئی فلم کمپنی ''فلمستان'' کے نام سے قائم کی۔ پروڈکشن کنٹرولر ایس مکرجی مقرر ہوئے۔ جو سلور جوبلی فلم بنا کر بہت شہرت حاصل کر چکے تھے۔ کہانی وہانی لکھی گئی۔ اسٹوڈیو نئے سازوسامان سے آراستہ ہو گیا۔ سب ٹھیک ٹھاک تھا مگر پروڈیوسر ایس مکرجی سخت پریشان تھے۔

بمبئی ٹاکیز سے علیحدہ ہو کر وہ دیویکا رانی کو خار دینے کے لئے کوئی سنسنی پھیلانے والی بات پیدا کرنا چاہتے تھے اور یہ بات ہیروئن کے انتخاب کے متعلق تھی۔

بیٹھے بیٹھے ایک دن ایس مکرجی کو یہ سوجھی کہ نسیم بانو کو واپس کھینچ کر لایا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُسے اپنے اوپر پورا اعتماد تھا۔ پے درپے کئی کامرانیوں کے بعد اس کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالے گا پورا کرلے گا چنانچہ فوراً ہی نسیم بانو تک پہنچنے کے راستے سوچ لئے گئے۔

اشوک کی وجہ سے ایس مکرجی کے بھی کیپٹن صدیقی سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ لال بہادر چونی لال کے احسان کے والد خان بہادر محمد سلیمان سے بہت بے تکلف مراسم تھے۔ چنانچہ دلّی میں نسیم تک رسائی حاصل کرنے میں ایس مکرجی کو کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ لیکن سب سے بڑا مرحلہ پہلے احسان کو اور پھر نسیم کو رضامند کرنا پڑا تھا۔

مکرجی کی خود اعتمادی کام آئی۔ احسان نے پہلے تو صاف جواب دے دیا لیکن آخر کار رضامند ہو گیا۔ فتح مند ہو کر جب وہ واپس بمبئی آیا تو اخباروں میں یہ خبر بڑے ٹھاٹ سے شائع کرائی کہ فلمستان کے پہلی فلم ''چل چل رے نوجوان'' کی ہیروئن پری چہرہ نسیم بانو ہو گی۔ فلمی حلقوں میں سنسنی پھیل گئی کیونکہ نسیم فلمی دنیا سے ہمیشہ کے لئے علیحدگی اختیار کر چکی تھی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں ڈیڑھ برس آل انڈیا ریڈیو دلّی کے ساتھ منسلک رہ کر واپس بمبئی آیا تھا۔ اور سید شوکت حسین رضوی کے لئے ایک کہانی لکھنے میں مصروف تھا۔ یہ کہانی لکھی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

گئی۔ چند اور کہانیاں بھی لکھی گئیں اس دوران میں گھر سے نکلنا بہت کم ہوتا تھا۔ میری بیوی میرے اس ''گھریلو پنے'' سے تنگ آ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں یوں اپنی صحت خراب کر رہا ہوں۔

شاہد لطیف سے میرے مراسم علی گڑھ یونیورسٹی سے چلے آ رہے تھے۔ فلمستان کے کاموں سے جب بھی فراغت ملتی میرے یہاں ضرور آتا۔ ایک دن آیا تو میری بیوی نے اس سے کہا۔ '' شاہد بھائی ان سے کہئے کہیں ملازمت کریں گھر بیٹھ کر ان کا کام مجھے اچھا نہیں لگتا۔ صحت خراب کر رہے ہیں کہیں ملازمت کریں تو گھر سے باہر تو قدم رکھا کریں گے۔''

چند روز کے بعد'' ملاڈ'' سے شاہد لطیف کا فون آیا کہ پروڈیوسر ایس مکرجی مجھ سے انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ سینیر یوڈیپارٹمنٹ کے لئے انہیں ایک آدمی کی ضرورت ہے۔

ملازمت کی مجھے کوئی خواہش نہیں تھی صرف اسٹوڈیو دیکھنے کے لئے میں فلمستان چلا گیا۔ فضا بڑی اچھی تھی جیسے کسی یونیورسٹی کی، اس نے مجھے بہت متاثر کیا، مکرجی سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے بے حد پسند آئے چنانچہ وہیں کنٹریکٹ پر دستخط کر دیئے۔ تنخواہ بہت تھوڑی تھی۔ کل تین سو روپے ماہوار اور فاصلہ بھی کافی تھا۔ الیکٹرک ٹرین سے ایک گھنٹہ کے قریب لگتا تھا'' گورے گاؤں'' پہنچنے میں۔ لیکن میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ تنخواہ تھوڑی ہے لیکن میں ادھر ادھر سے کما لیا کروں گا۔

شروع شروع میں تو فلمستان میں میری حالت اجنبی کی سی تھی لیکن بہت جلدی میں اسٹاف کے ساتھ گھل مل گیا۔ ایس مکرجی سے تو میرے تعلقات دوستانہ حد تک پہنچ گئے تھے۔ اس دوران میں نسیم بانو کی صرف چند جھلکیاں دیکھنے کا اتفاق ہوا چونکہ سنیر یو لکھا جا رہا تھا اس لئے وہ چند لمحات کے لئے موٹر میں آتی اور واپس چلی جاتی تھی۔

ایس مکرجی بڑا مشکل پسند واقع ہوا ہے مہینوں کہانی کی نوک پلک درست کرنے میں لگ گئے۔ خدا خدا کر کے فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی مگر یہ وہ سین تھے جن میں نسیم بانو نہیں تھی۔ بالآخر اس سے ایک روز ملاقات ہوئی۔ اسٹوڈیو کے باہر فولڈنگ کرسی پر بیٹھی تھی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے تھرمس سے چائے پی رہی تھی اشوک نے میرا اس سے تعارف کرایا۔ خندہ پیشانی سے پیش آئی اور بڑی باریک آواز میں کہا۔'' میں نے ان کے مضامین اور افسانے پڑھے ہیں۔''

تھوڑی دیر رسمی گفتگو ہوئی اور یہ پہلی ملاقات ختم ہوئی چونکہ وہ میک اپ میں تھی اس لئے میں اس کے اصلی حسن کا اندازہ نہ کر سکا۔ ایک بات جو میں نے خاص طور پر نوٹ کی وہ یہ تھی کہ بولتے وقت اسے کوشش سی کرنی پڑتی تھی۔ یوں کہئے کہ جب وہ بولتی تھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ تھوڑی سی مشقت کر رہی ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

''پکار'' کی نسیم میں اور '' چل چل رے نوجوان'' کی نسیم میں زمین و آسمان کا فرق تھا ادھر وہ ملکہ نور جہاں کے لباس فاخرہ میں ملبوس اور ادھر بھارت سیوادل کی ایک رضا کار کی وردی میں نسیم بانو کو تین مرتبہ میک اپ کے بغیر دیکھا تو میں نے سوچا آرائش محفل کے لئے اس سے بہتر عورت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہ جگہ وہ کونہ جہاں وہ بیٹھی یا کھڑی ہوتی ایک دم سج جاتا۔ لباس کے انتخاب میں وہ بہت محتاط ہے اور رنگ چننے کے معاملے میں جو سلیقہ اور قرینہ میں نے اس کے یہاں دیکھا ہے اور کہیں نہیں دیکھا۔ زرد رنگ بڑا خطرناک ہے کیونکہ زرد رنگ کے کپڑے آدمی کو اکثر زرد مریض بنا دیتے ہیں مگر نسیم کچھ اس بے پرواہ بے تکلفی سے یہ رنگ استعمال کرتی تھی کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔

نسیم کا محبوب لباس ساڑی ہے۔ غرارہ بھی پہنتی ہے مگر گاہے گاہے شلوار قمیض پہنتی ہے۔ مگر صرف گھر میں وہ کپڑے پہنتی ہے استعمال نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پاس برسوں پرانے کپڑے بڑی اچھی حالت میں موجود ہیں۔
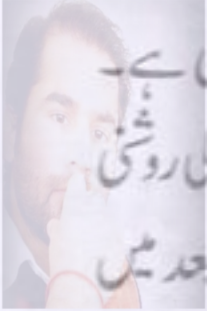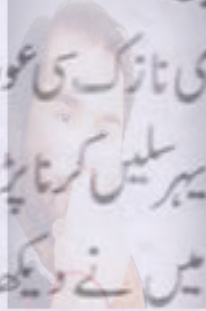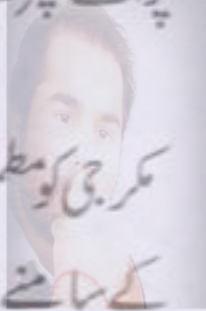
نسیم کو میں نے بہت محنتی پایا۔ بڑی نازک سی عورت ہے مگر سیٹ پر برابر ڈٹی رہتی ہے۔ مکرجی کو مطمئن کرنا آسان کام نہیں، کئی کئی ریہرسلیں کرنا پڑتی تھیں، گھنٹوں جھلسا دینے والی روشنی کے سامنے اٹھک بیٹھک کرنا پڑتی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ نسیم اکتائی نہیں ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کو اداکاری کا بہت شوق ہے، ہم شوٹنگ کے ساتھ ساتھ رشز دیکھتے تھے۔ نسیم بانو کا کام بس گوارا تھا اس میں چمک نہیں تھی۔ وہ سنجیدہ ادائیں مہیا کر سکتی ہے اپنے مغلئی خدوخال کی حسین جھلکیاں پیش کر سکتی ہے۔ لیکن ناقدانہ نگاہوں کے لئے اداکاری کا جوہر پیش نہیں کر سکتی۔ لیکن پھر بھی '' چل چل رے نوجوان'' میں اس کا ایکٹنگ پہلے فلموں کے مقابلے میں کچھ بہتر ہی تھا۔

مکرجی اس میں کرختگی اور درشتگی پیدا کرنا چاہتا ہے مگر یہ کیسے پیدا ہوتی، نسیم بے حد سرد مزاج ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ '' چل چل رے نوجوان'' میں نسیم کا کریکٹر گڈمڈ ہو کر رہ گیا۔

فلم ریلیز ہوا۔ رات کو تاج میں ایک شاندار پارٹی دی گئی۔ فلم میں نسیم جیسی بھی تھی ٹھیک ہے مگر تاج میں وہ سب سے الگ نظر آتی تھی، پُر وقار، باعظمت مغلیہ شہزادیوں کی سی شان اور انفرادیت لئے۔

'' چل چل رے نوجوان'' کی تیاری میں دو برس، دو لمبے کٹا دینے والے برس لگ گئے تھے۔ جب فلم توقعات کے مطابق کامیاب اور مقبول نہ ہوا تو ہم سب پر افسردگی طاری ہو گئی۔ مکرجی بہت بیدل ہوا۔ مگر کنٹریکٹ کے مطابق چونکہ اسے تاج محل پکچرز کے ایک فلم کی نگرانی کرنا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تھی، اس لئے کمر بستہ ہو کر کام شروع کرنا پڑا۔ فلم ''چل چل رے نوجوان'' کی تیاری کے دوران میں احسان سے مکرجی کے تعلقات بہت بڑھ گئے تھے۔ جب تاج محل پکچرز کے فلم کا سوال آیا تو احسان نے اس کی پروڈکشن کا سارا بوجھ مکرجی کے کاندھوں پر ڈال دیا۔ مکرجی نے مجھ سے مشورہ کیا۔ آخر یہ طے ہوا کہ ''بیگم'' کے عنوان سے میں ایک ایسی کہانی لکھوں جس میں نسیم کی خوبصورتی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جا سکے۔

میں نے ایک خاکہ تیار کیا۔ مکرجی نے اس میں کچھ تبدیلیاں کرائیں۔ جب فلم تیار ہوا تو میں نے بڑی حیرت سے یہ محسوس کیا کہ جو کہانی میں نے سوچی تھی وہ تو ردی کاغذوں پر ہے اور جو پردے پر چل پھر رہی ہے وہ محض اس کا ہلکا سا سایہ ہے۔

کہانی کا قصہ چھوڑیئے مجھے کہنا یہ ہے کہ ''بیگم'' لکھنے کے دوران میں مجھے نسیم بانو کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ میں اور مکرجی دوپہر کا کھانا ان کے گھر پر کھاتے تھے۔ اور ہر روز رات کو دیر تک کہانی میں ترمیم و تنسیخ کرنے میں مصروف رہتے تھے۔

میرا خیال تھا نسیم بڑے عالیشان مکان میں رہتی ہے لیکن جب گھوڑ بندر روڈ پر اس کے بنگلے میں داخل ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بنگلہ انتہائی شکستہ حالت میں تھا۔ بڑا معمولی قسم کا فرنیچر جو غالباً کرائے پر لایا گیا تھا۔ گھسا ہوا قالین، دیواریں اور فرش سیل زدہ۔

اس پس منظر کے ساتھ میں نے پری چہرہ نسیم بانو کو دیکھا۔ بنگلے کے برآمدے میں وہ گوالے سے دودھ کے کوپوں کے متعلق بات چیت کر رہی تھی۔ اس کی دبی دبی آواز، جو ایسا معلوم ہوتا تھا کوشش کے ساتھ حلق سے نکالی جا رہی ہے گوالے سے قبلوا رہی تھی کہ اس نے آدھ سیر دودھ کا ہیر پھیر کیا ہے۔ آدھ سیر دودھ اور پری چہرہ نسیم بانو، جس کے لئے کئی فرہاد دودھ کی نہریں نکالنے کے لئے تیار تھے.........میں چکرا گیا۔

آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ ''پکار'' کی نور جہاں بڑی گھریلو قسم کی عورت ہے اور اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک غایت درجہ گھریلو قسم کی عورت میں ہوتی ہے۔ اس کی پکچر ''بیگم'' کی پروڈکشن شروع ہوئی تو ملبوسات کا سارا کام اس نے سنبھال لیا۔ اندازہ تھا کہ دس بارہ ہزار روپے اس مد پر اُٹھ جائیں گے مگر نسیم نے درزی گھر میں بٹھا کر اپنی پرانی ساڑیوں، قمیضوں اور غراروں سے تمام لباس تیار کروا لئے۔

نسیم کے پاس بے شمار کپڑے ہیں۔ میں اس سے قبل کہہ چکا ہوں کہ وہ لباس پہنتی ہے استعمال نہیں کرتی۔ اس پر ہر لباس سجتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''بیگم'' میں ایس مکرجی نے اس کو کشمیر کے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

دیہات کی الہڑ لڑکی کے روپ میں پیش کیا، اس کو قلوپطرہ بنایا۔ ہیر کا لمبا کرتہ اور لاچا پہنایا۔ ماڈرن لباس میں بھی پیش کیا۔
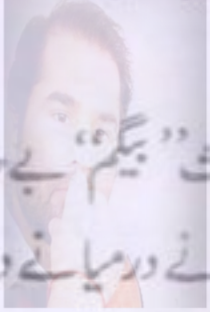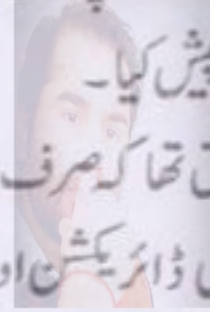
یقین واثق تھا کہ صرف ملبوسات کے تنوع ہی کے باعث ''بیگم'' بے حد مقبول ثابت ہوگی۔ مگر افسوس کہ نکمی ڈائریکشن اور کمزور میوزک کی وجہ سے اس نے درمیانے درجے کی فلموں کی بزنس کی۔

ہم سب نے اس فلم کی تیاری پر بہت محنت کی تھی۔ خاص طور پر مکرجی نے۔ ہم سب دیر تک (بعض اوقات رات کے تین تین بجے تک) بیٹھے کام کرتے رہتے۔ اور مکرجی کہانی کی نوک پلک درست کرتے رہتے اور نسیم اور احسان جاگنے کی کوشش کرتے رہتے۔ جب تک احسان صاحب کی ٹانگ ہلتی رہتی وہ میری اور مکرجی کی باتیں سنتے رہتے لیکن جونہی ان کی ٹانگ ہلنا بند ہو جاتی ہم سب سمجھ جاتے کہ وہ گہری نیند سو گئے ہیں۔
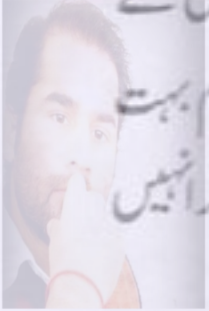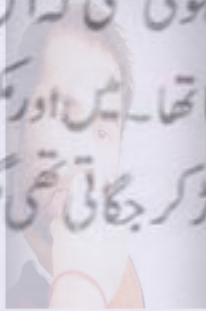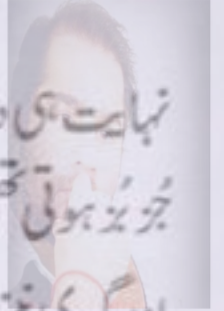
نسیم کو اس سے بڑی جھنجلاہٹ ہوتی تھی کہ اس کا شوہر نیند کا ایسا ماتا ہے کہ کہانی کے نہایت ہی دشوار گزار موڑ پر لمبی تان کر سو جاتا تھا۔ میں اور مکرجی احسان کو چھیڑتے تھے تو نسیم بہت جُز بُز ہوتی تھی۔ وہ ان کو اپنی طرف سے جھنجھوڑ کر جگاتی تھی مگر ایسا معلوم ہوتا کہ لوری دے کر انہیں اور گہری نیند سلا رہی ہے۔

جب نسیم کی آنکھیں بھی مندنے لگتیں تو مکرجی رخصت چاہتے اور چلے جاتے۔ میرا گھر گھوڑ بندر سے بہت دور تھا۔ برقی ٹرین قریب پون گھنٹے میں مجھے وہاں پہنچاتی تھی۔ ہر روز نصف شب کے بعد گھر پہنچنا۔ ایک اچھا خاصا عذاب تھا۔ میں نے جب اس کا ذکر مکرجی سے کیا تو یہ طے ہوا کہ میں کچھ عرصے کے لئے نسیم ہی کے یہاں اٹھ آؤں۔

احسان بے حد جھینپو ہے۔ کوئی بات کہنا ہو تو برسوں لگا دیتے ہیں۔ انہیں میری آسائش کا خیال تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جس چیز کی مجھے ضرورت ہو میں ان سے بلا تکلف کہہ دیا کروں۔ مگر تکلف کی یہ حد تھی کہ وہ حرف مدعا زبان پر لا ہی نہیں پاتے تھے۔ آخر ایک روز ان کے اصرار پر نسیم نے مجھ سے کہا۔ ''تہانوں جس چیز دی ضرورت ہووے دس دیا کرو۔''

نسیم فرسٹ کلاس پنجابی بولتی تھی ''چل چل رے نوجوان'' کے زمانے میں جب میں نے رفیق غزنوی سے جو اس پکچر میں ایک اہم رول ادا کر رہا تھا۔ ذکر کیا کہ نسیم پنجابی بولتی ہے تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے کہا کہ تم بکتے ہو۔ میں نے اس کو یقین دلانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ایک روز شوٹنگ کے دوران میں جب نسیم اور رفیق دونوں موجود تھے۔ اور اشوک انگریزی کے "زبان مروڑ فقرے نسیم سے کہلوانے کی کوشش کر رہا تھا تو میں نے رفیق سے پوچھا۔

"لالے! اُدھڑ دنجا کسے کہتے ہیں؟"
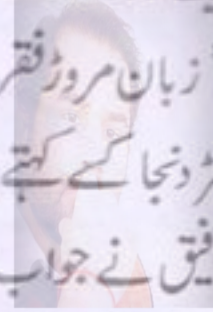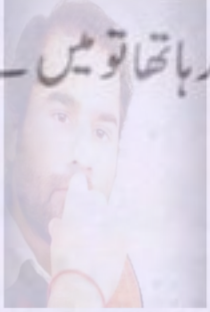
رفیق نے جواب دیا۔ "یہ کس زبان کا لفظ ہے۔"

میں نے کہا۔ "پنجابی زبان کا؟......... بتاؤ اس کا کیا مطلب ہے؟"

رفیق نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "مینوں معلوم نہیں"۔ اوادھڑ دنجے دے پُتر۔"

نسیم نے گردن میں ہلکا سا خم دے کر رفیق کی طرف دیکھا اور مسکرا کر پنجابی میں اس سے پوچھا "سچی۔ تہانوں معلوم نہیں۔"

رفیق نے جب نسیم کے منہ سے پنجابی سُنی۔ تو بقول شخصے وہ اپنی پشتو بھول گیا۔ لکنت بھرے لہجہ میں اس نے نسیم سے اُردو میں کہا "آپ پنجابی جانتی ہیں۔"

نسیم نے اسی طرح مسکرا کر کہا "جی ہاں۔"
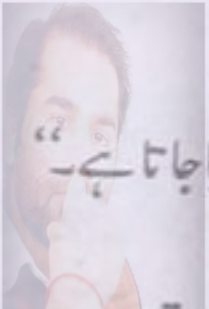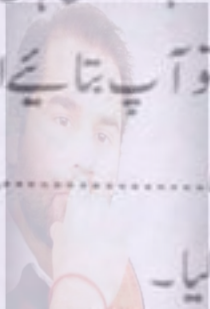
میں نسیم سے مخاطب ہوا۔ تو آپ بتائیے ادھڑ دنجے کا مطلب کیا ہے؟

نسیم نے کچھ دیر سوچا "وہ............ وہ لباس جو گھر میں استعمال کیا جاتا ہے۔"

رفیق غزنوی اپنی پشتو اور زیادہ بھول گیا۔

نسیم کی نانی امرت سر کی کشمیرن تھی۔ پنجابی زبان اس نے غالباً اسی سے سیکھی تھی۔ اردو اس لئے بہت شستہ و رفتہ بولتی ہے کہ دلّی میں اپنی ماں کے ساتھ رہی۔ انگریزی جانتی ہے اس لئے کہ کنونٹ میں پڑھتی تھی۔ موسیقی سے شغف رکھتی ہے اس کی تعلیم ماں ہی سے پائی۔ مگر ماں جیسا سُریلا گلا نہ پایا۔ فلموں میں اپنے گانے خود ہی گاتی ہے مگر ان میں رس نہیں ہوتا۔ لیکن اب میں نے سنا ہے کہ اس نے خود گانا ترک کر دیا ہے۔

نسیم کے اردگرد جو ایک خیرہ کن ہالہ تھا آہستہ آہستہ غائب ہو گیا۔ مجھے ان کے بنگلے کے غسل خانے میں پہلی بار نہانے کا اتفاق ہوا تو مجھے بڑی ناامیدی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جدید ساز و سامان سے آراستہ ہو گا۔ متعدد قسم کے نہانے والے نمک ہوں گے۔ نایاب صابن ہو گا۔ ٹب ہو گا۔ وہ تمام اوٹ پٹانگ چیزیں ہوں گی جو حسین عورتیں اور ایکٹریسیں اپنے حُسن کی افزائش کے لئے استعمال کرتی ہیں مگر وہاں صرف ایک جست کی بالٹی تھی۔ المونیم کا ایک ڈونگا اور ملاڈ کے کنوئیں کا بھاری پانی کہ صابن گھستے رہو اور جھاگ پیدا نہ ہو۔

لیکن نسیم کو جب بھی دیکھو تر و تازہ اور نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ میک اپ کرتی تھی مگر

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

ہلکا...... شوخ رنگوں سے اُسے نفرت ہے۔ وہ صرف وہی رنگ استعمال کرتی جو اس کے مزاج کے موافق ہوں یعنی معتدل۔
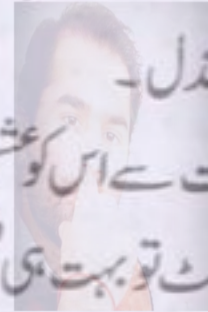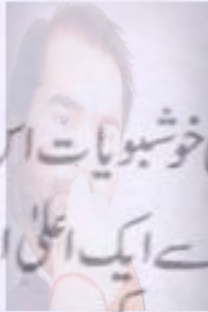
عطریات سے اس کو عشق ہے۔ چنانچہ انواع و اقسام کی خوشبویات اس کے پاس موجود رہتی ہیں۔ بعض سینٹ تو بہت ہی قیمتی اور نایاب ہیں۔ زیور ایک سے ایک اعلیٰ اور بیش قیمت ہے مگر ان میں لدی پھندی نہیں ہوتی۔ کبھی ہیرے کا ایک کنگن پہن لیا۔ کبھی جڑاؤ چوڑیاں اور کبھی موتیوں کا ہار۔

ان کا دستر خوان میں نے کبھی پُر تکلف نہیں دیکھا۔ احسان کو دمّے کی شکایت رہتی ہے اور نسیم کو زکام کی۔ دونوں پرہیز کی کوشش کیا کرتے تھے۔ نسیم میری ہری مرچیں لے اڑتی تھی۔ اور احسان نسیم کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کر دیتے تھے۔ دونوں میں کھانے پر قریب قریب ہر روز ایک عجیب بچکانہ قسم کی چخ ہوتی تھی۔ دونوں کی نگاہیں جب اس دوران میں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو دیکھنے والوں کو صاف لگ جاتا کہ وہ محبت آشنا ہیں۔

نسیم کو جب میری بیوی نے اپنے یہاں مدعو کیا تو اُسے سالنوں میں استعمال کیا ہوا گھی بہت پسند آیا۔ کھانے کی میز ہی پر اس نے پوچھا۔ "یہ گھی آپ کہاں سے منگواتی ہیں؟"

میری بیوی نے جواب دیا۔ "بازار سے...... پولسن کا گھی ہے...... عام ملتا ہے۔"

نسیم نے کہا۔ "دو ڈبّے مجھے منگوا دیجئے۔" میں نے نوکر سے کہا۔ وہ فوراً پاس والے اسٹور سے جس کے ساتھ میرا حساب چلتا ہے۔ دو ڈبّے لے آیا۔

اسی طرح وہ کُل آٹھ ٹین لے گئی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی۔ "آپ وہ گھی کا حساب تو کر لیجئے۔"

میں نے کہا۔ "اس کی کیا ضرورت ہے؟"

لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے کہا کل آٹھ ٹین ہوتے ہیں...... آپ حساب کر لیجئے۔"

نسیم نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "آٹھ؟ میرا خیال ہے سات ٹین آئے ہیں۔" سات ہی ہوں گے"۔

"ہوں گے کیا...... آپ کہتے ہیں تو آٹھ ہی ہوں گے۔"

" آپ نے بھی ہوں گے ہی کہا۔"

کافی دیر تک سات اور آٹھ کا ہیر پھیر رہا۔ نسیم کے حساب کے مطابق ٹین سات تھے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اور میرے اور اسٹور والے کے حساب کے مطابق آٹھ۔ فیصلہ یوں ہی ہو سکتا تھا کہ ہم میں سے ایک دوسرے کا حساب مان لے مگر جب بات حساب کی تھی تو کون مانتا۔ آخر نسیم نے اپنے ملازم سے کہا کہ خالی ٹین اکھٹے کرے، جب یہ اکھٹے کر کے نسیم کے روبرو پیش کیے گئے تو ان کی تعداد سات تھی نسیم نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''گن لیجئے۔ سات ہیں۔''

میں نے پھر کہا۔ ''سات ہی ہوں گے......لیکن میرے حساب کے مطابق آٹھ ہوتے ہیں۔

ملازم نسیم سے مخاطب ہوا۔ ''جی ہاں! آٹھ ہی ہوتے ہیں۔ ایک بھنگن لے گئی تھی۔''

میں ان سے پانچ سو روپے ماہوار لیتا تھا، ہر مہینے اس کی پائی پائی کا حساب ہوتا تھا۔ لیکن اس میں کبھی سات اور آٹھ کا ہیر پھیر نہ ہوا۔ میاں بیوی دونوں میرے کام سے مطمئن تھے۔ لیکن مسٹر احسان کسی حد تک میری تیز طبیعت سے نالاں تھے۔ مگر اس کا اظہار وہ اپنی حد سے بڑھی پر تکلف طبیعت کے باعث مجھ پر کبھی نہ کر سکے۔

بظاہر مسٹر احسان بہت ڈھیل قسم کے انسان ہیں مگر اپنی بیوی کے معاملے میں بہت سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ نسیم کو صرف خاص خاص لوگوں سے ملنے کی اجازت ہے۔ عام ایکٹروں اور ایکٹریسوں سے نسیم کو بات چیت کی ممانعت ہے۔ ویسے نسیم بھی چھچھوروں سے نفرت کرتی ہے۔ شور و غل برپا کرنے والی پارٹیوں سے وہ خود بھی دور رہتی ہے۔ ایک دفعہ اسے ایک بہت بڑے ہنگامے میں حصہ لینا پڑا۔

یہ ہنگامہ ہولی کا ہنگامہ تھا۔ جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک ''ٹریڈیشن'' برکھا کے آغاز پر ''مڈ پارٹی'' ۔ اسی طرح بمبئی ٹاکیز کی ایک ٹریڈیشن ہولی کی رنگ پارٹی تھی۔ چونکہ فلمستان کے قریب قریب تمام کارکن بمبئی ٹاکیز کے مہاجر تھے اس لئے یہ ٹریڈیشن یہاں بھی قائم رہی۔

ایس مکر جی اس رنگ پارٹی کے رنگ لیڈر تھے۔ عورتوں کی کمان ان کی موٹی اور ہنس مکھ بیوی (اشوک کی بہن) کے سپرد تھی۔ میں شام لطیف کے یہاں بیٹھا تھا۔ شاہد کی بیوی عصمت (چغتائی) اور میری بیوی (صفیہ) دونوں خدا معلوم کیا باتیں کر رہی تھیں۔ ایک دم شور برپا ہوا۔ عصمت چغتائی۔ ''لو صفیہ وہ آ گئے......لیکن میں بھی۔''

عصمت اس بات پر اڑ گئی کہ وہ کسی کو اپنے اوپر رنگ پھینکنے نہیں دے گی۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کی یہ ضد کہیں دوسرا رنگ اختیار نہ کر لے۔ کیونکہ رنگ پارٹی والے سب ''ہولی ڈے موڈ'' میں تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ عصمت کا موڈ خود بخود بدل گیا۔ اور وہ چند لمحات ہی میں رنگوں میں لت پت

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

بھتنی بن کر دوسری بھتنیوں میں شامل ہو گئی۔ میرا اور شاہد لطیف کا حلیہ بھی وہی تھا جو ہولی کے دوسرے بھتنوں کا تھا۔

پارٹی میں جب کچھ اور لوگ شامل ہوئے تو شاہد لطیف نے با آواز بلند کہا۔ چلو پری چہرہ نسیم کے گھر کا رخ کرو۔"

رنگوں سے مسلح گروہ گھوڑ بندر روڈ کی اونچی نیچی تارکول لگی سطح پر بے ڈھنگے بیل بوٹے بناتا اور شور مچاتا نسیم کے بنگلے کی طرف روانہ ہوا۔ چند منٹوں ہی میں ہم سب وہاں تھے۔ شور سن کر نسیم اور احسان باہر نکلے۔ نسیم ہلکے رنگ کی جارجٹ کی ساڑی میں ملبوس میک اپ کی نوک پلک نکالے۔ جب ہجوم کے سامنے برآمدے میں نمودار ہوئی تو شاہد نے بزن کا حکم دیا۔ مگر میں نے اسے روکا۔ "ٹھہرو! پہلے ان سے کہو کپڑے بدل آئیں۔"

نسیم سے کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کہا گیا تو وہ ایک ادا کے ساتھ مسکرائی۔ "یہی ٹھیک ہیں۔"

ابھی یہ الفاظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ہولی کی پچکاریاں برس پڑیں۔ چند لمحات ہی میں پری چہرہ نسیم بانو ایک عجیب و غریب قسم کی خوفناک چڑیل میں تبدیل ہو گئی۔ نیلے پیلے رنگوں کی تہوں میں سے جب اس کے سفید اور چمکیلے دانت اور بڑی بڑی آنکھیں نظر آتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ بہزاد اور مانی کی مصوری پر کسی بچے نے سیاہی انڈیل دی ہے۔

رنگ بازی ختم ہونے پر کبڈی شروع ہوئی۔ پہلے مردوں کا میچ شروع ہوا۔ پھر عورتوں کا۔ یہ سب دلچسپ تھا۔ مسٹر مکرجی کی فربہ بیوی جب بھی گرتی۔ قہقہوں کا طوفان برپا ہو جاتا۔ میری بیوی عینک پوش تھی۔ شیشے رنگ آلود ہونے کے باعث اسے بہت کم نظر آتا تھا۔ چنانچہ وہ، اکثر غلط سمت دوڑنے لگتی۔ نسیم سے بھاگا نہیں جاتا تھا یا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس مشقت کی عادی نہیں بہر حال وہ برابر کھیل میں دلچسپی لیتی رہی۔

نسیم اور اس کے میاں بڑے مذہبی قسم کے آدمی ہیں۔ میرا مطلب اس قسم کے مذہبی آدمیوں سے ہے۔ جو اردو کے اخباروں کے پرزے زمین سے اٹھا کر چومتے ہیں اور سر آنکھوں پر لگاتے ہیں۔ شام کو ایک ستارہ دیکھتے ہیں۔ تو اور دو دیکھنے کے لئے سارا آسمان کھنگالنا شروع کر دیتے ہیں۔ دونوں وہم پرست ہیں۔ خاص طور پر میاں احسان۔ ریس کورس پر ان کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ پاس بہت اچھی ٹپ ہے۔ قریب ہے کہ اس پر روپیہ لگا دیں کہ ایک کانا آدمی پاس سے گزر گیا۔ بس وہیں رک جائیں گے۔ ٹپ کا گھوڑا ون آ جائے گا تو نسیم سے الجھ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

پڑیں گے "تم نے کیوں کہا تھا کہ اس گھوڑے پر نہ لگانا.... نہیں آئے گا۔"

ایسی ہلکی ہلکی چخ چخ ان میں عام ہوتی رہتی ہے۔ جو ان کی ازدواجی زندگی میں رنگ بھرتی رہتی ہے۔

نسیم کے دو بچے ہیں جو اکثر نانی کے پاس رہتے ہیں۔ وہ ان کو اسٹوڈیو کی فضا سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ اس کو اپنے مرحوم باپ سے بہت پیار ہے۔ ان کا فوٹو ہر وقت اس کے وینٹی بیگ میں موجود رہتا ہے۔ مجھے عورتوں کے بیگ چوری چوری دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ایک روز میں حسب عادت نسیم کا بیگ کھول کر یہ فوٹو دیکھ رہا تھا کہ وہ آگئی۔ میں نے اس سے کہا۔ "معاف کیجئے گا۔ یہ میری بہت بُری عادت ہے.........بتائیے یہ کس کا فوٹو ہے۔"

نسیم نے فوٹو ہاتھ میں لیکر اس کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کہا..... "میرے اباجی کا۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ جو مجھ سے یوں کہہ رہی ہے۔

"میرے اباجی کا اور کس کا۔"

میں نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟.........کیا یہی کافی نہ تھا کہ وہ اس کے باپ ہیں......نہیں......اس کے اباجی ہیں۔

ذیل کا یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد میں یہ مضمون ختم کروں گا۔

"بیگم" لکھنے کے دوران میں مسٹر مکرجی کے ساتھ ایک منظر پر بحث و تمحیص کرتے کرتے بہت دیر ہوگئی۔ رات کے دو بجے تھے۔ صبح کی پہلی گاڑی ساڑھے تین بجے ملتی تھی۔ میری بیوی ساتھ تھی۔ جب ہم نے رخصت چاہی تو نسیم نے کہا۔ "نہیں صفیہ یہیں ٹھہر جاؤ۔ یہ بھی کوئی وقت ہے جانے کا۔

ہم نے بہت کہا کوئی بات نہیں۔ موسم اچھا ہے کچھ دیر پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے۔ اتنے میں گاڑی آجائے گی۔ مگر نسیم اور احسان نے بہت اصرار کیا کہ ہم ٹھہر جائیں۔ مکرجی چلے گئے۔ اس لئے کہ ان کے پاس موٹر تھی۔ اور انہیں بہت دور نہیں جانا تھا۔ میں باہر برآمدے میں سوگیا۔ احسان وہیں کمرے میں صوفے پر لیٹ گئے۔

صبح ناشتہ کرکے جب میں اور صفیہ گھر چلے تو راستے میں اس نے مجھے یہ بات سُنائی جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

جب صفیہ اور نسیم کمرے میں سونے کے لئے کمرے داخل ہوئیں تو وہاں ایک پلنگ تھا۔ صفیہ نے ادھر اُدھر دیکھا اور نسیم سے کہا۔ "آپ سو جائیے۔"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نسیم مسکرائی اور پلنگ پر نئی چادر بچھا کر کہنے لگی۔ ''کپڑے تو بدل لیں۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک نیا سلیپنگ سوٹ نکالا۔ ''یہ تم پہن لو..... بالکل نیا ہے۔''

''بالکل نیا'' پر زور تھا۔ جس کا مطلب میری بیوی سمجھ گئی اور لباس تبدیل کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ نسیم نے اطمینان سے آہستہ آہستہ شب خوابی کا لباس پہنا۔ چہرے کا میک اپ اتارا تو صفیہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ''ہائے تم کتنی پیلی ہو نسیم۔''

نسیم کے پھیکے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''یہ سب میک اپ کی کارستانی ہے۔''

میک اپ اتارنے کے بعد اس نے چہرے پر مختلف روغنیات ملے اور ہاتھ دھو کر قرآن اٹھایا اور تلاوت شروع کر دی۔ میری بیوی بے حد متاثر ہوئی۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''نسیم...... قسم سے، تم تو ہم لوگوں سے کہیں اچھی ہو......''

اس احساس سے کہ یہ بات اس نے ڈھنگ سے نہیں کہی۔ صفیہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ قرآن کی تلاوت کرنے کے بعد نسیم سو گئی۔

پری چہرہ نسیم.... ''پکار'' کی نور جہاں... ملکہ حسن....... احسان کی روشن....... چھمیاں کی بیٹی اور دو بچوں کی ماں!
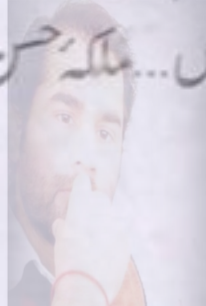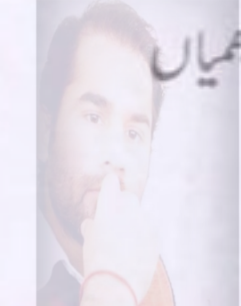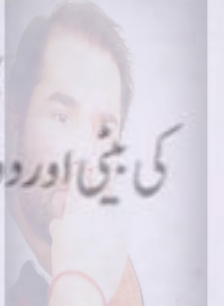
☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
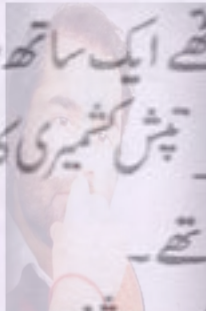
# تپش کشمیری

مجھے ان کا اصل نام ابھی تک معلوم نہیں ___ حالانکہ میں ان کو بارہ برس سے جانتا ہوں ___ سات برس تو ہم اکٹھے ایک ساتھ رہے ___ دراصل ان کا نام پوچھنے کی مجھے کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی ___ تپش کشمیری کافی تھا ___ وہ اس نام سے مشہور تھے۔

تپش کشمیری عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ جب وہ لاہور میں تھے تو ضلع کچہری کی ایک عدالت میں اہلمد تھے۔ آپ نے ترقی کی طرف قدم بڑھایا تو آپ پیادہ ہو گئے ___ اس ترقی معکوس کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اور وہ ہر حالت میں خوش رہتے تھے۔

جس مجسٹریٹ سے وہ منسلک تھے، اس کی روز ہجو لکھتے اور کاغذ اسی کے میز پر رکھ آتے ___ وہ چیختا چلاتا ___ مگر تپش صاحب خاموش رہتے۔ جیسے ان کو کسی بات کا علم ہی نہیں ___ فی البدیہہ شعر کہنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، بمبئی میں ایک ناگوری شاعر نے جو بزعم خود فی البدیہہ شعر کہنے میں ___ ظفر علی خان سے کئی مصرعے آگے تھے، تپش صاحب سے کہا:

"حضرت! چلو، آج گفتگو شعروں ہی میں ہو ___"

تپش صاحب نے بڑی انکساری کے ساتھ کہا:

"جیسے آپ کی مرضی ___"

اور ساتھ ہی گفتگو کا آغاز ایک شعر سے کر دیا ___ ناگوری شاعر سٹ پٹا گئے اور

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ذہن پر زور دے کر تپش صاحب کے اس شعر کا جواب شعر میں فکر کرنے لگے۔

تپش صاحب نے فوراً ایک اور شعر گھڑ کر ان سے پوچھا کہ جناب دیر کیوں لگا رہے ہیں ____ جلدی گفتگو شروع کیجیے۔

ناگپوری شاعر بوکھلا گیا۔

میرا خیال ہے ان کے اس استفسار سے اس کے دماغ سے وہ سب کچھ نکل گیا جو اس نے بڑی محنت سے سوچا تھا۔

تپش صاحب نے اس پر تین چار شعر اور چست کر دیئے اور وہ بیچارہ ناگپوری چاروں خانے چت ہو گیا۔ میں یہاں پر عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تپش صاحب کی شاعری میں کوئی جان نہیں ____ یوں تو ان کا ہر شعر بڑا، اچھا تلا ہوتا ہے، عروض کی کوئی خامی نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھرم کانٹے میں تل کر آیا ہے، بڑی سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور قریب قریب ہر روز دو تین غزلیں یا نظمیں فی البدیہہ لکھتے ہیں، لیکن شاذ و نادر ان کے قلم سے کوئی ایسا شعر نکلتا ہے، جو صحیح معنوں میں شعر کہلانے کا مستحق ہو۔

انہوں نے بلا مبالغہ دس بارہ لاکھ شعر لکھے ہوں گے مگر اس کو وہ باعث افتخار نہیں سمجھتے۔ وہ خود کو بھی شاعر کہلانا پسند نہیں کرتے، ان کو اپنی شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بیشتر اس کے کہ میں کچھ اور بیان کروں، میں تپش صاحب کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں چند اور باتیں بھی بتانا چاہتا ہوں جو بہت دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں۔

ایک زمانہ تھا وہ لاہور کے ضلع کچہری میں ملازم تھے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ان کو اسلامیہ اسکول کے ایک لڑکے سے عشق ہو گیا۔ بڑا افلاطونی قسم کا۔ ان کو معلوم ہوا کہ یہ لڑکا نماز پڑھتا ہے۔ صبح سویرے اپنے محلّے کی مسجد میں فجر کی نماز ادا کرنے جاتا ہے، یہ معلومات حاصل ہوتے ہی آپ صبح تین بجے اٹھتے۔

سخت سردیوں کا موسم تھا۔ مسجد میں جا کر جھاڑو دیتے۔ پھر ٹھنڈے یخ پانی سے غسل کرتے اور اذان دینا شروع کر دیتے۔ مسجد کا مُلّا جو بہت ہی بڈّھا اور سُست تھا، اپنے حجرے میں چونک پڑتا کہ یہ اذان کون دے رہا ہے۔ جب تک وہ اٹھ کر باہر نکلتا تپش صاحب نے امامت شروع کر دی ہوتی تھی۔ وہ لڑکا ان کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہوتا۔ اس سے ان کو بڑی روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔

ایک مرتبہ اس لڑکے کی سائیکل خراب ہو گئی۔ اس نے اپنے نوکر کو دی کہ ٹھیک کرا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

لائے ___ تپش صاحب نے دیکھ لیا ___ اور سائیکل نوکر سے لے کر ایک دوکان پر لے گئے۔ اس کے تمام پرزے علیحدہ کروئیے۔ مٹی کے تیل میں ڈبو کر ان کو صاف کیا ___ دکاندار سے جو ان کا دوست تھا کپڑا مانگا کہ وہ انہیں خشک کریں ___ مگر اس کے پاس نہیں تھا۔ چنانچہ تپش صاحب نے اپنی نئی بوسکی کی قمیض اتاری، اس کو پھاڑا اور تمام پرزوں پر سے تیل خشک کر کے ان کو خوب چمکایا ___ جب سائیکل ٹھیک ہو گئی تو اس لڑکے کے نوکر کے حوالے کر دی اور کہا:

''دیکھو ــــ بابو جی سے مت کہنا کہ میں نے ٹھیک کی ہے۔'' اس لڑکے کی دوستی اسی دوران میں اپنے ایک ہم جماعت سے ہو گئی۔ تپش صاحب کو اس کا اتنا دکھ ہوا کہ نیم پاگل سے ہو گئے۔ داڑھی بڑھالی۔ سخت گرمیاں تھیں ــــ مگر آپ اوور کوٹ پہنتے تھے ــــ سر پر پانامہ ہیٹ اور چھینٹ کی نیکر میں ــــ پاؤں میں فل بوٹ ــــ لیکن ان کی باتیں جب بھی غیر متوازن نہیں ہوتی تھیں۔

اس زمانے میں انہوں نے اس لڑکے کے بارے میں بے شمار شعر کہے جو شعر کہلانے کے مستحق ہیں، اس لئے کہ ان میں تپش صاحب کے دل کو جو ٹھیس پہنچی تھی، اس کا صاف پتہ چلتا ہے۔ ان میں درد ہے، کسک ہے اور افلاطونی عشق کی تمام گہرائیاں بھی موجود ہیں۔

یوں بھی تپش صاحب کو دنیوی معاملات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن اس حادثے کے بعد وہ بالکل بے نیاز ہو گئے ــــ کھانا ملا ہے تو کھا لیا ہے، نہیں ملا تو کوئی پروا نہیں۔

مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا ___

ہم لاہور کے حاجی ہوٹل میں بیٹھے تھے، تپش صاحب کھانا کھا چکے تھے، لیکن مجھے کھانا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھے تھے کہ اتنے میں ان کے چند دوست آئے جو پاس والے میز پر بیٹھ گئے ان میں سے ایک نے تپش صاحب سے علیک سلیک کرنے کے بعد کہا۔ ''آئیے کھانا تناول فرمائیے۔''

تپش صاحب نے شکریہ ادا کیا:

''خدا آپ کو بہت بہت دے ___ میں گھر سے کھا کر آیا ہوں۔''

ان کے دوست نے بڑا اصرار کیا کہ وہ ضرور کھائیں۔ آخر تنگ آ کر وہ ان کے پاس بیٹھ گئے اور بارہ روٹیاں اور سالن منگوائی۔ اس کے بعد فرنی کی چار پلیٹیں کھائیں اور خدا کا شکر ادا کر کے وہاں سے اٹھے اور میرے پاس چلے آئے ___ ان کے اس دوست کی حالت قابل رحم تھی۔ جس نے از راہ تکلف ان کو دعوت دی تھی۔ وہ بالکل مبہوت تھا۔ وہ شاید اس لمحے پر لعنتیں در لعنتیں بھیج رہا تھا ___ جب اس نے تپش صاحب سے کہا:

''آئیے! کھانا تناول فرمائیے ___''

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

میرا خیال ہے کہ تپش صاحب میں ذائقے کی حس موجود نہیں تھی۔ وہ ہر چیز کھا سکتے تھے۔ تھوہڑ اور کیلے میں ان کے نزدیک کوئی فرق نہیں تھا۔ کچے چاول ہوں یا اُبلے ہوئے ____ تازہ ہوں یا پانچ چھ روز کے باسی ان کے لئے ایک جیسے تھے۔

میں نے کبھی ان کو کسی چیز کے بارے میں شکایت کرتے نہیں سنا ____ جو مل جائے ٹھیک ہے ____ لیکن حیرت ہے کہ اس قسم کی تنگ طبیعت کا مالک [illegible] میں کھیر نمکین چائے اور نیلوفر کا شربت ملا کر پی جاتا۔ تمام سبزیاں پتوں اور ڈنٹھلوں سمیت کھاتا ہے، ایک ایک پاؤ سرخ مرچیں پھانک جاتا ہے، اپنی صحت کیسے برقرار رکھ سکتا ہے!

ان کی صحت قابلِ رشک حد تک اچھی تھی ____ سرخ رنگت، سر کا ایک بال بھی سفید نہیں ہوا تھا ____ حالانکہ وہ مجھ سے عمر میں سات آٹھ برس بڑے تھے۔ یعنی چھیالیس سینتالیس برس کے لگ بھگ تھے، مگر ان کے مقابلے میں، میں بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ میرے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔

تپش صاحب کو عورتوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ صنف نازک سے کرختگی کو کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئے۔ شیشے کا رشتہ پتھر سے غیر فطری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو جس کو انہوں نے کبھی گھر میں بسایا ہی نہیں تھا۔ آخر اسے طلاق دے کر آزاد کر دیا۔

جب میرے بلانے پر بمبئی آئے تو وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر آئے تھے۔ مجھ سے انہوں نے اس بات کا ذکر بہت دیر بعد میں کیا ____ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی۔

لیکن اس کا ردِعمل ان پر اس صورت میں نمودار ہوا کہ انہوں نے باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی ____ مگر ان کی تلاوت کا طریقہ بھی عجیب و غریب ہے۔

میں نے ایک روز دیکھا کہ وہ صبح سویرے اُٹھے غسل کیا۔ اور الف ننگے بدن خشک کیے بغیر کرسی پر بیٹھ گئے۔ حمائل شریف نکالی اور تلاوت شروع کر دی ____ ایک پارہ پڑھا ____ کپڑے پہنے اور باہر نکلے۔ میں حیرت میں گم تھا کہ آخر یہ سلسلہ کیا ہے۔

کہیں ان کا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا باہر نکل کر انہوں نے ٹرام کے ایک ٹکٹ پر نظم لکھی۔ مجھ سے بڑی پر مغز گفتگو کی۔ میری زبان کی چند غلطیوں کی طرف میری توجہ دلائی۔ میرے دماغ میں چونکہ بڑی کھد بد ہو رہی تھی، اس لئے میں ان سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"تپش صاحب ____ آپ ننگے ____ ننگے بدن قرآن مجید کی تلاوت کیوں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری
نیس بک گروپ
کتابیں پڑھے
0314 .595. 1212

کرتے ہیں؟ کیا یہ معیوب نہیں ____"

تپش صاحب مسکرائے ____

"قرآن میں کہیں بھی یہ حکم صادر نہیں کیا گیا کہ آدمی تینوں کپڑے پہن کر اس کی تلاوت کرے ____ میں اس لئے کپڑے نہیں پہنتا کہ مبادا ان میں کوئی گندگی کی آلائش ہو ____ نہانے کے بعد میں تولیے سے اپنا بدن بھی اسی لئے خشک نہیں کرتا۔"

عجب منطق تھی۔

بہر حال، میں خاموش رہا کیونکہ ان سے بات کرنا ایک اچھی خاصی طویل بحث کا آغاز کرنا تھا۔

اسی دوران میں انہیں تپ محرقہ ہوگیا ____ میں نے ڈاکٹر کو بلایا۔ سولہ روپے اس کی فیس ادا کی ____ مگر تپش صاحب نے اس ڈاکٹر سے بڑے کرخت لہجے میں کہا:

"صاحب! آپ کو یہاں کس نے بلایا ہے ____ مجھے معلوم ہے میرا عارضہ کیا ہے اور مجھے اس کا علاج بھی معلوم ہے ____ آپ تشریف لے جائیں تو بہتر ہے"

ڈاکٹر صاحب تشریف لے گئے ____ تپش صاحب نے اکیس دن فاقہ کشی کی کچھ کھایا نہ پیا ____ اس کے بعد انہوں نے مجھے بلایا اور کہا۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوگیا ہوں ____ نوکر کو چوپاٹی بھیجو اور آٹھ آنے کا رگڑا منگواؤ ____ ڈھیر ساری مرچیں ہوں۔"

'رگڑا' بمبئی کی زبان میں چاٹ کو کہتے ہیں ____ یعنی آلو چھولے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ خوفناک چیزیں منگواؤں یا نہ منگواؤں، مگر تپش صاحب کے آگے کیا پیش چل سکتی تھی۔ آخر میں نے نوکر کو چوپاٹی بھیجا اور 'رگڑا' منگوایا جو تپش صاحب نے سب کا سب کھالیا۔ میرا خیال ہے کہ اس میں اتنی مرچیں اور اتنی کھٹائی تھی جو بیس یا پچیس آدمیوں کو بھی پیچش یا اسہال معدہ کے مرض میں گرفتار کر دیتی۔ لیکن تعجب ہے کہ دوسرے روز وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں تپ محرقہ کبھی ہوا ہی نہیں تھا ____ میں نے جب اپنی حیرت کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھ سے کہا:

"برادرم ہر بیماری کے لئے علاج ہوتے ہیں ____ ضروری نہیں کہ ہر شخص اپنے مرض کا علاج کسی ڈاکٹر یا حکیم ہی سے کرا۔ ____ خدا نے ہر آدمی کو اپنے عوارض دور کرنے کی ودیعت فرمائی ہے ____ وہ اگر اس سے کام لے تو ڈاکٹروں اور طبیبوں کی ضرورت ہی نہیں۔"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئے ___ ان کا رنگ جو کسی قدر پیلا ہو گیا تھا، چند روز میں رگڑا کھا کھا کر پھر وہی سرخی اختیار کر گیا۔ آپ نے پھر اسی طرح ہر روز نظمیں اور غزلیں کہنا شروع کر دیں ___ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کبھی بیمار ہی نہیں ہوئے۔

بہت دن گزر گئے۔

میرا مطلب ہے قریب قریب ڈھائی مہینے کا عرصہ بیت گیا ___ اس کے بعد ایک دن اچانک تپش صاحب نے مجھ سے کہا:

"میں آپکے یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

میں نے حیرت سے پوچھا:

"کیوں؟"

"کسی دوست کو زیادہ دیر تک تکلیف نہیں دینا چاہیے۔"

میں نے ان سے کہا:

"مجھے کوئی تکلیف نہیں ___ آپ محض تکلف کر رہے ہیں۔"

تپش صاحب جس بات کا تہیہ کر لیں ___ بالآخر وہ پوری ہوتی ہے چنانچہ وہ اپنا چھوٹا سا ٹین کا بکس اٹھا کر میرے گھر سے چلے گئے۔

معلوم نہیں کہاں ___

اگر انہوں نے اپنے ٹھکانے کے متعلق مجھے کچھ بتایا ہوتا تو میں یقیناً ہر روز نہیں تو دوسرے تیسرے روز ضرور جاتا ___ مگر وہ اس افراتفری میں گئے کہ میں ان سے کچھ پوچھ نہ سکا۔

ایک دن وہ خود آئے ___ خلاف معمول نیا سوٹ پہنا ہوا تھا ___ بالوں میں تیل بھی تھا ___ مجھ سے ملتے ہی کہنے لگے:

"برادرم ___ مجھے عشق ہو گیا تھا، دراصل۔"

میں چکرا گیا ___ تپش صاحب اور عشق ___ کیا اس لاہوری لڑکے کا کوئی نعم البدل بمبئی میں پیدا ہو گیا ہے۔

تپش صاحب نے مجھے زیادہ دیر تذبذب میں نہ رکھا اور اپنے عشق کی روداد سنادی۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ انہیں ایک لڑکی سے عشق ہوا تھا۔

یہ لڑکی ایک مجاور کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ تپش صاحب وکٹوریہ گارڈن میں اس کو اپنے ساتھ لائے اور مجھے مجبور کیا کہ اس کا فوٹو اتارا جائے۔ چنانچہ ان کے احکام کے مطابق

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں اپنے ایک دوست سے کیمرہ لے کر پہنچا ــــــ

لڑکی خوبصورت تھی ــــــ بڑی البڑ قسم کی ــــــ تپش صاحب سے بہت چھنتی تھی۔ اس سے زیادہ مجھ سے، اور اس سے بھی زیادہ اردگرد کے ماحول سے ــــــ

خیر، میں نے چار پانچ پوز لئے ــــــ اور وکٹوریہ گارڈن میں ان دونوں کو چھوڑ کر گھر چلا آیا ــــــ میرے دل و دماغ بہت مضطرب تھے۔ میرے قیاس میں بھی یہ چیز آ ہی نہیں سکتی تھی کہ تپش کشمیری صاحب کبھی کسی عورت میں دلچسپی لیں گے۔ لیکن جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، وہ اس لڑکی سے جس کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا، والہانہ محبت کرتے تھے۔

میں نے ایک روز ان سے کہا:

"تپش صاحب اتنی دیر ہو گئی ہے آپ اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔"

انہوں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں روپیہ جمع کر رہا ہوں ــــــ اس کے باپ سے تمام باتوں کا فیصلہ ہو چکا ہے ــــــ میں نے اس کے بھائی کے لئے ایک سوٹ بنوا دیا ہے۔ باپ کو بھی کچھ روپے دے چکا ہوں، اس لئے کہ اس کے پاس شادی کے اخراجات کے لئے کچھ ــــــ بھی نہیں ــــــ ایک صوفہ سیٹ ــــــ ایک ڈریسنگ ٹیبل اور چار کرسیاں بھی خرید کر اس کے باپ کے حوالے کر دیں ــــــ میں چاہتا ہوں شادی کے بعد انہیں کے ساتھ رہوں ــــــ وہ اداس نہیں ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"یہ تو بہت اچھا اور نیک خیال ہے۔"

تپش صاحب، ذرا پھول سے گئے۔

"میں حرام کاری کا قائل نہیں ــــــ اس سے باقاعدہ عقد کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے ان سے اس خدشے کا ذکر کیا جو اچانک میرے دماغ میں پیدا ہو گیا تھا ــــــ

"ہو سکتا ہے ــــــ کوئی اور ــــــ میرا مطلب ہے، کوئی اور آپ پر بازی لے جائے ــــــ"

تپش صاحب کے گال اور زیادہ سرخ ہو گئے ــــــ

"کون بازی لے جا سکتا ہے مجھ پر ــــــ میں شاعر ہوں ــــــ لیکن اور ــــــ درّے کا منڈا بھی ہوں ــــــ میں قلم کے علاوہ لٹھ سے بھی کام لینا جانتا ہوں ــــــ"

تپش صاحب گھر بنانے کی فکر میں مصروف تھے کہ اس لڑکی کا معاشقہ ایک نوجوان پہلوان سے ہو گیا ــــــ اسی دوران لڑکی کے باپ کو ہیضہ ہوا اور وہ دو دن کے بعد ہی ملک عدم ہوا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تپش صاحب نے اس کی تجہیز و تکفین کا سامان کیا ___ بڑے احترام سے اس کو دفن کیا۔ چوتھے روز انہیں معلوم ہوا کہ لڑکی اسی پہلوان نوجوان کے ساتھ بھاگ گئی ہے ___ یہ انہیں عین اس وقت معلوم ہوا جب وہ کھیت واڑی اسٹریٹ سے نکلے تھے۔ تپش صاحب نے سائیکل کرائے پر لی اور اس موٹر کا تعاقب کیا جس میں پہلوان اس لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہا تھا۔

تپش صاحب نے ان کو پکڑ لیا ہوتا ___ مگر ان کی سائیکل ایک وکٹوریہ گاڑی کی جھپٹ میں آگئی ___ آپ بہت بری طرح زخمی ہوئے۔ دائیں کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

دوستوں نے انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا۔

چوٹ اتنی اثر انداز ہوئی ___ کہ وہ کئی دن بیہوش رہے۔ ان کا بازو پلاسٹک میں بندھا ہوا تھا ___ ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی۔ پر جب انہیں ذرا سا ہوش آیا تو انہوں نے یہ ٹھانی کہ ہسپتال سے کسی نہ کسی طریقے سے باہر نکلنا چاہیے۔ جنرل وارڈ میں تھے ___ جب دیکھا کہ ڈاکٹر کھانا کھانے گئے ہیں ___ تو وارڈ سے نکل آئے اور سیدھے میرے پاس آئے، اور کہا!۔

"مجھ سے فضول باتیں مت پوچھنا!"

میں نے ان سے کوئی فضول بات نہ پوچھی۔

لیکن ___

ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا:

"میں اب کیا کروں ___"

اب اس کا میرے پاس کیا جواب ہو سکتا تھا ___ میں نے صرف اتنا کہا:

"تپش صاحب ___ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ میں تو کم عقل ہوں ___"

تپش صاحب میرا یہ جواب سن کر چند لمحات خاموش رہے۔

اس کے بعد کہا:

"ٹھیک ہے ہر شخص اپنے معاملات اچھی طرح جانتا ہے"

دوسرے دن سے انہوں نے زنانہ لباس پہننا شروع کر دیا ___ یہ وہی کپڑے تھے جو انہوں نے اس لڑکی کے لئے بنوائے تھے۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
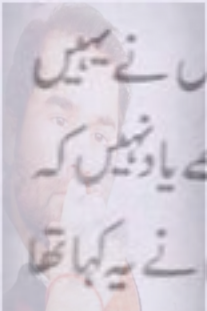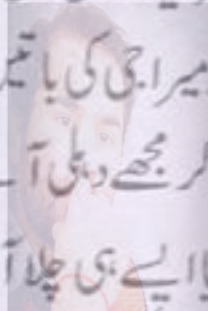
# تین گولے

حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں تین گولے میرے سامنے میز پر پڑے تھے۔ میں غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور میرا جی کی باتیں سن رہا تھا۔ اس شخص کو پہلی بار میں نے یہیں دیکھا غالباً سن چالیس تھا۔ بمبئی چھوڑ کر مجھے دہلی آئے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا مجھے یاد نہیں کہ وہ فلیٹ نمبر ایک والوں کا دوست تھا یا ایسے ہی چلا آیا تھا۔ لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ اس نے یہ کہا تھا کہ اس کو ریڈیو اسٹیشن سے پتہ چلا کہ میں نکلسن روڈ پر سعادت حسن بلڈنگز میں رہتا ہوں۔

اس ملاقات سے قبل میرے اور اس کے درمیان معمولی سی خط و کتابت ہو چکی تھی۔ میں بمبئی میں تھا جب اس نے "ادبی دنیا" کے لئے مجھ سے ایک افسانہ طلب کیا تھا۔ میں نے اس کی خواہش کے مطابق افسانہ بھیج دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اس کا معاوضہ مجھے ضرور ملنا چاہیے۔ اس کے جواب میں اس نے ایک خط لکھا کہ میں افسانہ واپس بھیج رہا ہوں۔ اس لئے کہ "ادبی دنیا" کے مالک مفت خور قسم کے آدمی ہیں۔ افسانے کا نام "موسم کی شرارت" تھا۔ اس پر اس نے اعتراض کیا تھا کہ اس شرارت کا موضوع سے کوئی تعلق نہیں اس لئے اسے تبدیل کر دیا جائے میں نے اس کے جواب میں اس کو لکھا کہ موسم کی شرارت ہی اس افسانے کا موضوع ہے، مجھے حیرت ہے کہ یہ تمہیں کیوں نظر نہ آئی۔ میرا جی کا دوسرا خط آیا۔ جس میں اس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ اور اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ موسم کی شرارت وہ "موسم کی شرارت" میں کیوں دیکھ نہ سکا۔

میرا جی کی لکھائی بہت صاف اور واضح تھی۔ موٹے خط کے نب سے نکلے ہوئے بڑے بڑے صحیح نشست کے حروف تکون کی سی آسانی سے بنے ہوئے ہر جوڑ نمایاں، میں اس سے بہت متاثر ہوا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے اس میں مولانا حامد علی خان مدیر "ہمایوں" کی خطاطی کی جھلک نظر آئی۔ یہ ہلکی سی مگر کافی مرئی مماثلت و مشابہت اپنے اندر کیا گہرائی رکھتی ہے۔ اس کے متعلق میں اب بھی غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا کوئی شوشہ یا نقطہ سجھائی نہیں دیتا۔ جس پر میں کسی مفروضے کی بنیادیں کھڑی کرسکوں۔

حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں تین گولے میرے سامنے میز پر پڑے تھے اور میراجی لم تڑنگے اور گول مٹول شعر کہنے والا شاعر مجھ سے بڑے صحیح قد و قامت اور بڑی صحیح نوک پلک کی باتیں کررہا تھا۔ جو میرے افسانوں کے متعلق تھیں۔ وہ تعریف کررہا تھا نہ تنقیص۔ ایک مختصر سا تبصرہ تھا۔ ایک سرسری سی تنقید تھی۔ مگر اس سے پتا چلتا تھا کہ میراجی کے دماغ میں مکڑی کے جالے نہیں۔ اس کی باتوں میں الجھاؤ نہیں تھا۔ اور یہ چیز میرے لئے باعث حیرت تھی۔ اس لئے کہ اس کی اکثر نظمیں ابہام اور الجھاؤ کی وجہ سے ہمیشہ میری فہم سے بالاتر رہی تھیں۔ لیکن شکل وصورت اور وضع قطع کے اعتبار سے وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا اس کا بے قافیہ مبہم کلام۔ اس کو دیکھ کر اس کی شاعری میرے لئے اور بھی پیچیدہ ہو گئی۔

ن۔ م۔ راشد بے قافیہ شاعری کا امام مانا جاتا ہے۔ اس کو دیکھنے کا اتفاق بھی دہلی ہی میں ہوا تھا۔ اس کا کلام میری سمجھ میں آجاتا تھا، اور اس کو ایک نظر دیکھنے سے اس کی شکل وصورت بھی میری سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ ایک بار میں نے ریڈیو اسٹیشن کے برآمدے میں پڑی ہوئی بغیر مڈگارڈوں کی سائیکل دیکھ کر اس سے ازراہِ مذاق کہا تھا۔ "لو۔ یہ تم ہو اور تمہاری شاعری۔" لیکن میراجی کو دیکھ کر میرے ذہن میں سوائے اس کی مبہم نظموں کے اور کوئی شکل نہیں بنتی تھی۔

میرے سامنے میز پر تین گولے پڑے تھے۔ تین آہنی گولے۔ سگریٹ کی پنیوں میں لپٹے ہوئے۔ دو بڑے۔ ایک چھوٹا۔ میں نے میراجی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ان کے اوپر اس کا بڑا بھورے بالوں سے اٹا ہوا سر......... یہ بھی تین گولے تھے۔ دو چھوٹے اور ایک بڑا۔ میں نے یہ مماثلت محسوس کی تو اس کا ردِعمل میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ میں نمودار ہوا۔ میراجی دوسروں کا ردِعمل تاڑنے میں بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے فوراً اپنی شروع کی ہوئی بات ادھوری چھوڑ کر مجھ سے پوچھا۔ "کیوں بھیا، کس بات پر مسکرائے؟" میں نے میز پر پڑے ہوئے ان تین گولوں کی طرف اشارہ کیا۔ اب میراجی کی باری تھی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ مہین مہین بھوری مونچھوں کے نیچے گول گول انداز میں مسکرائے۔

اس کے گلے میں موٹے موٹے گول منکوں کی مالا تھی۔ جس کا صرف بالائی حصہ قمیض

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کے کھلے ہوئے کالر سے نظر آتا تھا۔ میں نے سوچا۔ ''اس انسان نے اپنی کیا ہیئت کذائی بنا رکھی ہے___ لمبے لمبے غلیظ بال جو گردن سے نیچے لٹکتے تھے___ فرنچ کٹ سی داڑھی۔ میل سے بھرے ہوئے ناخون۔ سردیوں کے دن تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہینوں سے اس کے بدن نے پانی کی شکل نہیں دیکھی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب شاعر، ادیب اور ایڈیٹر عام طور پر لانڈری میں ننگے بیٹھ کر ڈبل ریٹ پر اپنے کپڑے دھلوایا کرتے تھے۔ اور بڑی میلی کچیلی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے سوچا، شاید میراجی بھی اسی قسم کا شاعر اور ایڈیٹر ہے۔ لیکن اس کی غلاظت، اس کے لمبے بال۔ اس کی فرینچ کٹ داڑھی، گلے کی مالا اور وہ تین آہنی گولے___ معاشی حالات کے مظہر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان میں ایک درویشانہ پن تھا۔ ایک قسم کی راہبیت... جب میں نے راہبیت کے متعلق سوچا تو میرا دماغ روس کے دیوانے راہب راسپوٹین کی طرف چلا گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ وہ بہت غلاظت پسند تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غلاظت کا اس کو کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ اس کے ناخنوں میں بھی ہر وقت میل بھرا رہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اس کی انگلیاں لتھڑی ہوتی تھیں۔ جب اُسے ان کی صفائی مطلوب ہوتی تو وہ پاس بیٹھی شہزادیوں اور رئیس زادیوں کی طرف بڑھا دیتا۔ جو ان کی تمام آلودگی اپنی زبان سے چاٹ لیتی تھیں۔

کیا میراجی اسی قسم کا درویش اور راہب تھا___؟ یہ سوال اس وقت اور بعد میں بھی کئی بار میرے دماغ میں پیدا ہوا___ میں امرتسر میں سائیں گھوڑے شاہ کو دیکھ چکا تھا۔ جو الف ننگا رہتا تھا۔ اور کبھی نہاتا نہیں تھا۔ اسی طرح کے اور بھی کئی سائیں اور درویش میری نظر سے گزر چکے تھے جو غلاظت کے پتلے تھے۔ مگر ان سے مجھے گھن آتی تھی۔ میراجی کی غلاظت سے مجھے نفرت کبھی نہیں ہوئی۔ الجھن البتہ بہت ہوتی تھی۔

گھوڑے شاہ کی قبیل کے سائیں عام طور پر بقدر توفیق مغلظات بکتے ہیں۔ مگر میراجی کے منہ سے میں نے کبھی کوئی غلیظ کلمہ نہ سُنا۔ اس قسم کے سائیں بظاہر مجرد مگر درپردہ ہر قسم کے جنسی فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میراجی بھی مجرّد تھا۔ مگر اس نے اپنی جنسی تسکین کے لئے صرف اپنے دل و دماغ کو اپنا شریک کار بنا لیا تھا۔ اس لحاظ سے گو اس میں اور گھوڑے شاہ کی قبیل کے سائیوں میں ایک گونہ مماثلت تھی مگر وہ ان سے بہت مختلف تھا۔ وہ تین گولے تھا.... جن کو لڑھکانے کے لئے اس کو کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ہاتھ کی ذرا سی حرکت اور تخیل کی ہلکی سی جنبش سے وہ ان تین اجسام کو اونچی سے اونچی بلندی اور نیچی سے نیچی گہرائی کی سیر کرا سکتا تھا اور یہ گر

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

اس کو انہی تین گولوں نے بتایا تھا جو غالباً اس کو کہیں پڑے ہوئے ملے تھے۔ ان خارجی اشاروں ہی نے اس پر ایک ازلی وابدی حقیقت کو منکشف کیا تھا۔ حُسن، عشق اور موت......اس تثلیث کے تمام اقلیدسی زاویے صرف ان تین گولوں کی بدولت اس کی سمجھ میں آئے تھے لیکن حُسن اور عشق کے انجام کو چونکہ اس نے شکست خوردہ عینک سے دیکھا تھا۔ جس کے شیشوں میں بال پڑے تھے۔ اس لئے اس کو جس شکل میں اس نے دیکھا تھا۔ صحیح نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سارے وجود میں ایک ناقابلِ بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا۔ جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس طور پر کہ ہر نقطہ اس کا نقطۂ آغاز ہے اور وہی نقطۂ انجام۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ابہام نوکیلا نہیں تھا۔ اس کا رُخ موت کی طرف تھا، نہ زندگی کی طرف، رجائیت کی سمت، نہ قنوطیت کی جانب اس نے آغاز اور انجام کو اپنی مٹھی میں اس زور سے بھینچ رکھا تھا کہ ان دونوں کا لہو نچڑ نچڑ کر اس میں سے ٹپکتا رہتا تھا۔ لیکن سادیت پسندوں کی طرح وہ اس سے مسرور نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں پھر اس کے جذبات گول ہو جاتے تھے۔ ان تین آہنی گولوں کی طرح جن کو میں نے پہلی مرتبہ حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں دیکھا تھا۔

اس کے شعر کا ایک مصرع ہے۔

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا

مسافر کو رستہ بھولنا ہی تھا۔ اس لئے کہ اس نے چلتے وقت نقطۂ آغاز پر کوئی نشان نہیں بنایا تھا۔ اپنے بنائے ہوئے دائرے کے خط کے ساتھ ساتھ گھومتا وہ یقیناً کئی بار ادھر سے گزرا۔ مگر اُسے یاد نہ رہا کہ اس نے اپنا یہ طویل سفر کہاں سے شروع کیا تھا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ میراجی یہ بھول گیا تھا کہ وہ مسافر ہے، سفر ہے یا راستہ، یہ تثلیث بھی اس کے دل و دماغ کے خلیوں میں دائرے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

اس نے ایک لڑکی میرا سے محبت کی۔ اور وہ ثناء اللہ سے میراجی بن گیا۔ اسی میرا کے نام کی رعایت سے اس نے میرا بائی کے کلام کو پسند کرنا شروع کر دیا جب اپنی اس محبوبہ کا جسم میسّر نہ آیا تو کوزہ گر کی طرح چاک گھما کر اپنے تخیل کی مٹی سے شروع میں اسی شکل وصورت کے جسم تیار کرنے شروع کر دیئے لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس جسم کی ساخت کے تمام مرئیات، اس کی نمایاں خصوصیتیں تیز رفتار چاک پر گھوم گھوم کر نئی ہیئت اختیار کرتی گئیں۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ میراجی کے ہاتھ اس کے تخیل کی نرم نرم مٹی اور چاک، متواتر گردش سے بالکل گول ہو گئے۔ کوئی بھی ٹانگ میرا کی ٹانگ ہو سکتی تھی کوئی بھی چیتھڑا میرا کا پیراہن بن سکتا تھا، رہگذر میرا کی رہگذر

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ اور انتہا یہ ہوئی کہ تخیل کی نرم نرم مٹی کی سوندھی سوندھی باس سڑاند بن گئی اور وہ شکل دینے سے پہلے ہی اس کو چاک سے اتارنے لگا۔

پہلے میرا بلند بام محلوں میں رہتی تھی۔ میراجی ایسا بھٹکا کہ راستہ بھول کر اس نے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ اس کو اس گراوٹ کا مطلقاً احساس نہ تھا۔ اس لئے کہ اترائی میں ہر قدم پر میرا کا تخیل اس کے ساتھ تھا۔ جو اس کے جُوتے کے تلووں کی طرح گھستا گیا۔ پہلے میرا عام محبوباؤں کی طرح بڑی خوبصورت تھی۔ لیکن یہ خوبصورتی ہر نسوانی پوشاک میں ملبوس دیکھ دیکھ کر کچھ اس طور پر اس کے دل و دماغ میں مسخ ہو گئی تھی کہ اس کے صحیح تصور کی المناک جدائی کا بھی میراجی کو احساس نہ تھا۔ اگر احساس ہوتا تو اتنے بڑے المیے کے جلوس کے چند غیر مبہم نشانات اس کے کلام میں یقیناً موجود ہوتے۔ جو میرا سے محبت کرتے ہی اس کے دل و دماغ میں نکلنا شروع ہو گیا تھا۔

حُسن، عشق اور موت یہ تکون پچک کر میراجی کے وجود میں گول ہو گئی تھی، صرف یہی نہیں دنیا کی ہر مثلث اس کے دل و دماغ میں مدوّر ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ارکانِ ثلاثہ کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ ان کی ترتیب درہم برہم ہو گئی تھی۔ کبھی موت پہلے حسن آخر، اور عشق درمیان میں کبھی عشق پہلے موت اس کے بعد اور حسن آخر میں۔ اور یہ چکر نامحسوس طور پر چلتا رہتا تھا۔

کسی بھی عورت سے عشق کیا جائے تکڑا ایک ہی قسم کا بنتا ہے۔ حسن، عشق اور موت —— عاشق، معشوق اور وصل۔ میرا سے ثناء اللہ کا وصال جیسا کہ جاننے والوں کو معلوم ہے، نہ ہوا، نہ ہو سکا۔ اس نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کا ردِ عمل میراجی تھا۔ اس نے اس معاشقے میں شکست کھا کر اس تثلیث کے ٹکڑوں کو اس طرح جوڑا تھا کہ ان میں ایک سالمیت تو آ گئی تھی۔ مگر اصلیت مسخ ہو گئی تھی۔ وہ تین نوکیں جن کا رُخ خطِ مستقیم میں ایک دوسرے کی طرف ہوتا ہے دب گئی تھیں۔ وصال محبوب کے لئے اب یہ لازم نہیں تھا کہ محبوب موجود ہو۔ وہ خود ہی عاشق تھا خود ہی معشوق اور خود ہی وصال۔

مجھے معلوم نہیں اس نے لوہے کے یہ گولے کہاں سے لئے تھے۔ خود حاصل کئے تھے۔ یا کہیں پڑے ہوئے مل گئے تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ ان کے متعلق میں نے بمبئی میں اس سے استفسار کیا تھا تو اس نے سرسری طور پر اتنا کہا تھا "میں نے یہ خود پیدا نہیں کئے اپنے آپ پیدا ہو گئے ہیں۔"

پھر اس نے اس گولے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جو سب سے بڑا تھا۔ پہلے یہ وجود میں آیا تھا۔ اس کے بعد یہ دوسرا جو اس سے چھوٹا ہے۔ اس کے پیچھے یہ کو چک۔"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں نے مسکرا کر اس سے کہا تھا۔ ’’بڑے تو باوا آدم علیہ السلام ہوئے خدا ان کو وہ جنت نصیب کرے جس سے وہ نکالے گئے تھے۔ دوسرے کو ہم اماں حوا کہہ لیتے ہیں اور تیسرے کو ان کی اولاد۔!‘‘

میری اس بات پر میرا جی خوب کھل کر ہنسا تھا، اب سوچتا ہوں تو مجھے ان تین گولوں پر ساری دنیا گھومتی نظر آتی ہے۔ تثلیث کیا تخلیق کا دوسرا نام نہیں۔ وہ تمام تثلیثیں جو ہماری زندگی کی تقدیس میں موجود ہیں کیا ان میں انسان کی تخلیقی قوتوں کا نشان نہیں ہے۔

خدا، بیٹا اور روح القدس عیسائیت کے اقانیم ___ ترسول مہادیو کا سہ شاخہ بھالا۔ تین دیوتا برہما، وشنو، ترلوک ___ آسمان، زمین اور پاتال ___ خشکی، تری اور ہوا ___ تین بنیادی رنگ، سرخ، نیلا اور زرد پھر ہمارے رسوم اور مذہبی احکام، یہ تیجے۔ سوئم اور تلینڈیاں، وضو میں تین مرتبہ ہاتھ منہ دھونے کی شرط، تین طلاقیں اور سہ گونہ معانقے۔ اور جوئے میں نرد بازی کے تین پانسوں کے تین نقطے یعنی تین کانے۔ موسیقی کے تیئے ___ حیاتِ انسانی کے ملبے کو اگر کھود کر دیکھا جائے تو میرا خیال ہے ایسی کئی تثلیثیں مل جائیں گی، اس لئے کہ اس کے توالد و تناسل کے افعال کا محور بھی اعضائے ثلاثہ ہے۔

اقلیدس میں مثلث بہت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری اشکال کے مقابلے میں یہ ایک کٹر اور بے لوچ شکل ہے۔ جسے آپ کسی اور شکل میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ لیکن میرا جی نے اپنے دل و دماغ اور جسم میں اس تکون کو جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ کچھ اس طرح دبایا کہ اس کے رکن اپنی جگہوں سے ہٹ گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آس پاس کی دوسری چیزیں بھی اس تکون کے ساتھ مسخ ہو گئیں اور میرا جی کی شاعری ظہور میں آئی۔

پہلی ملاقات ہی میں میری اس کی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے دہلی میں بتایا تھا کہ اس کی جنسی اجابت عام طور پر ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیوز میں ہوتی ہے۔ جب یہ کمرے خالی ہوتے تھے تو وہ بڑے اطمینان سے اپنی حاجت رفع کر لیا کرتا تھا۔ اس کی یہ جنسی ضلالت ہی، جہاں میں سمجھتا ہوں اس کی مبہم منظومات کا باعث ہے۔ ورنہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں عام گفتگو میں وہ بڑا واضح دماغ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس پر بیتی ہے، اشعار میں بیان ہو جائے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ جو مصیبت اس پر ٹوٹی تھی۔ اس کو اس نے بڑے بےڈھنگے طریقے سے جوڑ کر اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا تھا۔ اس کو اس کا علم تھا۔ اس ضمن میں وہ اپنی بے چارگی اچھی طرح محسوس کرتا تھا۔ لیکن عام آدمیوں کی طرح اس نے اپنی اس کمزوری کو اپنا خاص رنگ بنانے کی کوشش

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کی اور آہستہ آہستہ اس میرا کو بھی اپنی گمراہی کی سولی پر چڑھا دیا۔

بحیثیت شاعر کے اس کی حیثیت وہی ہے جو گلے سڑے پتوں کی ہوتی ہے۔ جسے کھاد کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس کا کلام بڑی عمدہ کھاد ہے۔ جس کی افادیت ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہو کے رہے گی۔ اس کی شاعری ایک گمراہ انسان کا کلام ہے۔ جو انسانیت کی عمیق ترین پستیوں سے متعلق ہونے کے باوجود دوسرے انسانوں کے لئے اُونچی فضاؤں میں مرغ بادنما کا کام دے سکتا ہے۔ اس کا کلام ایک ''جگ سا پزل'' ہے۔ جس کے ٹکڑے بڑے اطمینان اور سکون سے جوڑ کر دیکھنے چاہئیں۔

بحیثیت انسان کے وہ بڑا دلچسپ تھا۔ پرلے درجے کا مخلص جس کو اپنی اس قریب قریب نایاب صفت کا مطلقاً احساس نہیں تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اشخاص جو اپنی خواہشات جسمانی کا فیصلہ اپنے ہاتھوں کو سونپ دیتے ہیں، عام طور پر اسی قسم کے مخلص ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود کو صریحاً دھوکا دیتے ہیں مگر اس فریب دہی میں جو خلوص ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔

میرا جی نے شاعری کی بڑے خلوص کے ساتھ، شراب پی بڑے خلوص کے ساتھ، بھنگ پی وہ بھی بڑے خلوص کے ساتھ، لوگوں سے دوستی کی اور اُسے نبھایا۔ اپنی زندگی کی ایک عظیم ترین خواہش کو جُل دینے کے بعد وہ کسی اور سے دھوکا فریب کرنے کا اہل ہی نہیں رہا تھا۔ اس اہلیت کے اخراج کے بعد وہ اس قدر بے ضرر ہو گیا تھا کہ بے مصرف سا معلوم ہوتا تھا۔ ایک بھٹکا ہوا مسافر جو نگری نگری پھر رہا ہے۔ منزلیں قدم قدم پر اپنی آغوش اس کے لئے وا کرتی ہیں۔ مگر وہ ان کی طرف دیکھے بغیر آگے نکلتا جا رہا ہے....... کسی ایسی جگہ، جس کی کوئی سمت ہے نہ رقبہ...... ایک ایسی تکون کی جانب جس کے ارکان اپنی جگہ سے ہٹ کر تین دائروں کی شکل میں اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔

میں نے میرا جی سے اس کے کلام کے متعلق دو تین جملوں سے زیادہ کبھی گفتگو نہیں کی۔ میں اسے بکواس کہا کرتا تھا۔ اور وہ اسے تسلیم کرتا تھا۔ ان تین گولوں اور موٹے موٹے دانوں کی مالا کو میں اس کا فراڈ کہتا تھا۔ اسے بھی وہ تسلیم کرتا تھا۔

حالانکہ ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ چیزیں فراڈ نہیں ہیں۔

ایک دفعہ اس کے ہاتھ میں تین کے بجائے دو گولے دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے جب اس کا اظہار کیا تو میرا جی نے کہا۔ ''برخوردار کا انتقال ہو گیا ہے مگر اپنے وقت پر ایک اور پیدا ہو جائے گا۔''

میں جب تک بمبئی میں رہا۔ یہ دوسرا برخوردار پیدا نہ ہوا۔ یا تو اماں حوا عقیم ہو گئی تھی یا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

باوا آدم مردم خیز نہیں رہے تھے۔ یہ رہی سہی خارجی تثلیث بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اور یہ بُری فال تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میراجی کو اس کا احساس تھا چنانچہ جیسا کہ سننے میں آیا ہے، اس نے اس کے باقی کے وہ اقنوم بھی اپنے ہاتھ سے علیحدہ کر دیئے تھے۔

مجھے معلوم نہیں میراجی گھومتا گھامتا کب بمبئی پہنچا۔ میں ان دنوں فلستان میں تھا۔ جب وہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ بہت خستہ حالت میں تھا۔ ہاتھ میں تین گولے بدستور موجود تھے۔ بوسیدہ سی کاپی بھی تھی۔ جس میں غالباً میرابائی کا کلام اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک عجیب شکل کی بوتل تھی۔ جس کی گردن مڑی ہوئی تھی، اس میں میراجی نے شراب ڈال رکھی تھی۔ بوقتِ طلب وہ اس کا کاگ کھولتا اور ایک گھونٹ چڑھا لیتا تھا۔

داڑھی غائب تھی، سر کے بال بہت ہلکے تھے۔ مگر بدن کی غلاظت بدستور موجود۔ چپل کا ایک پیر درست حالت میں تھا۔ دوسرا مرمت طلب تھا۔ یہ کمی اس نے پاؤں پر رسی باندھ کر دور کر رکھی تھی۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں ان دنوں غالباً ''آٹھ دن'' کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اس کی کہانی میری تھی۔ جس کے لئے دو ایک گانوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اس خیال سے کہ میراجی کو کچھ روپے مل جائیں، اس سے یہ گانے لکھنے کے لئے کہا۔ جو اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لکھ دیئے۔ مگر کھڑے کھڑے قسم کے نہایت واہیات جو یکسر غیر فلمی تھے ___ میں نے جب اس کو اپنا فیصلہ سنایا تو وہ خاموش رہا۔ واپس جاتے ہوئے اس نے مجھ سے سات روپے طلب کئے کہ اسے ایک ادھا لینا تھا۔

اس کے بعد بہت دیر تک اس کو ہر روز ساڑھے سات روپے دینا میرا فرض ہو گیا۔ میں خود بوتل کا رسیا تھا۔ یہ منہ نہ لگے تو جی پر کیا گزرتی ہے۔ اس کا مجھے بخوبی علم تھا۔ اس لئے میں اس رقم کا انتظام کر رکھتا۔ سات روپے میں رم کا ادھا آتا تھا، باقی آٹھ آنے اس کے آنے جانے کے لئے ہوتے تھے۔

بارشوں کا موسم آیا۔ تو اسے بڑی دقت محسوس ہوئی۔ بمبئی میں اتنی شدید بارش ہوتی ہے کہ آدمی کی ہڈیاں تک بھیگ جاتی ہیں۔ اس کے پاس فالتو کپڑے نہیں تھے۔ اس لئے یہ موسم اس کے لئے اور بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اتفاق سے میرے پاس ایک برساتی تھی۔ جو میرا ایک ہٹا کٹا فوجی دوست صرف اس لئے میرے گھر بھول گیا تھا کہ وہ بہت وزنی تھی۔ اور اس کے کندھے شل کر دیتی تھی۔ میں نے اس کا ذکر میراجی سے کیا، اور اس کے وزن سے بھی اس کو آگاہ کر دیا۔ میراجی نے کہا۔ ''کوئی پرواہ نہیں، میرے کندھے اسکا بوجھ برداشت کر لیں گے؟ چنانچہ میں نے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

وہ برساتی اس کے حوالے کر دی۔ جو ساری برسات اس کے کندھوں پر رہی۔

مرحوم کو سمندر سے بہت دلچسپی تھی۔ میرا ایک دور کا رشتہ دار اشرف ہے۔ وہ ان دنوں پائلٹ تھا۔ جوہو میں سمندر کے کنارے رہتا تھا۔ میراجی کا دوست تھا۔ معلوم نہیں ان کی دوستی کی بنا کیا تھی۔ کیونکہ اشرف کو شعر و شاعری سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ بہرحال میراجی اس کے ہاں رہتا تھا۔ اور دن کو اس کے حساب میں پیتا تھا۔

اشرف جب اپنے جھونپڑے میں نہیں ہوتا تھا۔ تو میراجی ساحل کی نرم نرم اور گیلی گیلی ریت پر وہ برساتی بچھا کر لیٹ جاتا اور مبہم شعر فکر کیا کرتا تھا۔

ان دنوں ہر اتوار کو جوہو جانا اور دن بھر پینا میرا معمول سا ہو گیا تھا۔ دو تین دوست اکٹھے ہو کر صبح نکل جاتے اور سارا دن ساحل پر گزارتے۔ میراجی وہیں مل جاتا۔ اوٹ پٹانگ قسم کے مشاغل رہتے۔ ہم نے اس دوران میں شاید ہی کبھی ادب کے بارے میں گفتگو کی ہو۔ مردوں اور عورتوں کے تین چوتھائی ننگے جسم دیکھتے تھے۔ دہی بڑے اور چاٹ کھاتے تھے، ناریل کے پانی کے ساتھ شراب ملا کر پیتے تھے۔ اور میراجی کو وہیں چھوڑ کر واپس گھر چلے آتے تھے۔

اشرف کچھ عرصے کے بعد میراجی کا بوجھ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ خود پیتا تھا مگر اپنی مقررہ حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ لیکن میراجی کے متعلق اُسے شکایت تھی کہ وہ اپنی حد سے گزر کر ایک اور حد قائم کر لیتا ہے۔ جسکی کوئی حد نہیں ہوتی۔

بے ہوش پڑا ہے، مگر اور مانگے جا رہا ہے۔ اپنی اس طلب کا دائرہ بنا لیتا ہے۔ اور بھول جاتا ہے کہ یہ کہاں سے شروع ہوئی تھی اور اسے کہاں ختم ہونا تھا۔

مجھے اس کی شراب نوشی کے اس پہلو کا علم نہیں تھا۔ لیکن ایک دن اس کا تجربہ بھی ہو گیا۔ جس کو اب یاد کر کے میرا دل آج بھی افسردہ ہو جاتا ہے۔

سخت بارش ہو رہی تھی۔ جس کے باعث برقی گاڑیوں کی نقل و حرکت کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا تھا۔ "خشک دن، ہونے کی وجہ سے شہر میں شراب کی دکانیں بند تھیں۔ مضافات میں صرف باندرہ ہی ایک ایسی جگہ تھی۔ جہاں سے مقررہ داموں پر یہ چیز مل سکتی تھی۔ میراجی میرے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ میرا بڑا نالنگوٹیا حسن عباس جو دہلی سے میرے ساتھ چند دن گزارنے کے لئے آیا تھا۔ ہم تینوں باندرہ اُتر گئے۔ اور ڈیڑھ بوتل رم خرید لی۔ واپس اسٹیشن پر آئے تو راجہ مہدی علی خان مل گیا۔ میری بیوی لاہور گئی ہوئی تھی۔ اس لئے پروگرام یہ بنا کہ میراجی اور راجہ رات میرے ہی یہاں رہیں گے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ایک بجے تک رم کے دور چلتے رہے، بڑی بوتل ختم ہوگئی۔ راجہ کے لئے دو پیگ کافی تھے۔ ان کو ختم کر کے وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اور فلمی گیت لکھنے کی پریکٹس کرتا رہا۔ میں، حسن عباس اور میراجی پیتے اور فضول فضول باتیں کرتے رہے۔ جن کا سر تھا نہ پیر۔ کرفیو کے باعث بازار سنسان تھا۔ میں نے کہا اب سونا چاہئے۔ عباس اور راجہ نے میرے اس فیصلے پر صاد کیا۔ میراجی نہ مانا۔ اَدّھے کی موجودگی اس کے علم میں تھی۔ اس لئے وہ اور پینا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، میں اور عباس ضد میں آ گئے اور وہ اَدّھا کھولنے سے انکار کر دیا۔ میراجی نے پہلے منتیں کیں۔ پھر حکم دینے لگا۔ میں اور عباس دونوں انتہا درجے کے سفلے ہو گئے۔ ہم نے اس سے ایسی باتیں کیں کہ ان کی یاد سے مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے۔ لڑ جھگڑ کر ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

میں صبح خیز ہوں سب سے پہلے اٹھا اور ساتھ والے کمرے میں گیا۔ میں نے رات کو راجہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ میراجی کے لئے اسٹریچر بچھا دے۔ اور خود صوفے پر سو جائے۔ راجہ اسٹریچر میں لبالب بھرا تھا۔ مگر صوفے پر میراجی موجود نہیں تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ غسل خانے اور باورچی خانے میں دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ ناراضی کی حالت میں چلا گیا ہے چنانچہ واقعات معلوم کرنے کے لئے میں نے راجہ کو جگایا۔ اس نے بتایا کہ میراجی موجود تھا۔ اس نے خود اُسے صوفے پر لٹایا تھا، ہم یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ میراجی کی آواز آئی۔ ''میں یہاں موجود ہوں''۔

وہ فرش پر راجہ مہدی علی خان کے اسٹریچر کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اسٹریچر اٹھا کر اس کو باہر نکالا گیا۔ رات کی بات ہم سب کے دل و دماغ میں عود کر آئی لیکن کسی نے اس پر تبصرہ نہ کیا۔ میراجی نے مجھ سے آٹھ آنے لئے اور بھاری بھرکم برساتی اٹھا کر چلا گیا۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ اور اپنے پر بہت غصہ۔ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں خود کو بہت لعنت ملامت کی کہ میں رات کو ایک نکمی سی بات پر اس کو دکھ پہنچانے کا باعث بنا۔

اس کے بعد بھی میراجی مجھ سے ملتا رہا۔ فلم انڈسٹری کے حالات منقلب ہو جانے کے باعث میرا ہاتھ تنگ ہو گیا تھا۔ اب میں ہر روز میراجی کی شراب کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا، لیکن اس کو علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک دن مجھے اس سے معلوم ہوا کہ اس نے شراب چھوڑنے کے قصد سے بھنگ کھانی شروع کر دی ہے۔

بھنگ سے مجھے سخت نفرت ہے۔ ایک دو بار استعمال کرنے سے میں اس کی ذلت آفریں نشے اور اس کے ردِعمل کا تجربہ کر چکا ہوں۔ میں نے میراجی سے جب اس کے بارے میں گفتگو کی تو اس نے کہا۔ ''نہیں...... میرا خیال ہے۔ یہ نشہ بھی کوئی بُرا نہیں، اس کا اپنا رنگ ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اپنی کیفیت ہے۔ اپنا مزاج ہے۔"

اس نے بھنگ کے نشے کی خصوصیات پر ایک لیکچر سا شروع کر دیا ____ افسوس ہے کہ مجھے پوری طرح یاد نہیں کہ اس نے کیا کہا تھا۔ اس وقت میں اپنے دفتر میں تھا اور "آٹھ دن" کے ایک مشکل باب کی منظر نویسی میں مشغول تھا۔ اور میرا دماغ ایک وقت میں صرف ایک کام کرنے کا عادی ہے۔ وہ باتیں کرتا رہا اور میں مناظر سوچنے میں مشغول رہا۔

بھنگ پینے کے بعد دماغ پر کیا گزرتی ہے۔ مجھے اس کے متعلق صرف اتنا ہی علم تھا کہ گرد و پیش کی چیزیں یا تو بہت چھوٹی ہو جاتی ہیں۔ یا بہت بڑی۔ آدمی حد سے زیادہ ذکی الحس ہو جاتا ہے۔ کانوں میں ایسا شور مچتا ہے۔ جیسے ان میں لوہے کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ دریا پانی کی ہلکی سی لکیر بن جاتے ہیں اور پانی کی ہلکی سی لکیریں بہت بڑے دریا۔ آدمی ہنسنا شروع کرے تو ہنستا ہی جاتا ہے۔ روئے تو روتے نہیں تھکتا۔

میراجی نے اس نشے کی جو کیفیت بیان کی، وہ میرا خیال ہے اس سے بہت مختلف تھی۔ اس نے مجھے اس کے مختلف مدارج بتائے تھے۔ اس وقت جبکہ وہ بھنگ کھائے ہوئے تھا۔ غالباً لہروں کی بات کر رہا تھا ____ "لو وہ کچھ گڑبڑ سی ہوئی......... کوئی چیز ادھر سے اُدھر کی چیزوں سے مل ملا کر اُوپر کو اٹھی......... نیچے آ گئی......... پھر گڑبڑ سی ہوئی......... اور...... آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی......... دماغ کی نالیوں میں رینگنے لگی، سرسراہٹ محسوس ہو رہی ہے......... پر بڑی نرم نرم......... پہلے نون تھا......... پورے اعلان کے ساتھ......... اب یہ غنے میں تبدیل ہو رہا ہے..... دھیرے دھیرے...... ہولے ہولے...... جیسے بلّی گدگدے پنجوں پر چل رہی ہے..... اوہ....... زور سے میاؤں ہوئی... لہر ٹوٹ گئی...... غائب ہو گئی۔" اور وہ چونک پڑتا۔

تھوڑے وقفے کے بعد وہ پھر یہی کیفیت نئے سرے سے محسوس کرتا ____ "لو، اب پھر نون کے اعلان کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گڑبڑ شروع ہو گئی ہے...... آس پاس کی چیزیں یہ اعلان سننے کے لئے جمع ہو رہی ہیں۔ کانا پھوسیاں بھی ہو رہی ہیں......... ہو گیا....... اعلان ہو گیا ____ نون اوپر کو اٹھا......... آہستہ آہستہ نیچے آیا...... پھر وہی گڑبڑ ____ وہی کانا پھوسیاں......... آس پاس کی چیزوں کے ہجوم میں نون نے انگڑائی لی اور رینگنے لگا......... غنہ کھنچ کر لمبا ہوتا جا رہا ہے...... کوئی اسے کوٹ رہا ہے، روئی کے ہتھوڑوں سے...... ضربیں سنائی نہیں دیتیں، لیکن ان کا ننھا منا، پرے بھی ہلکا لمس..... محسوس ہو رہا ہے......... غوں، غوں، غوں....... جیسے بچہ ماں کا دودھ پیتے پیتے سو رہا ہے...... ٹھہرو، دودھ کا بلبلہ بن گیا ہے...... لو وہ پھٹ بھی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

گیا.....'' اور وہ پھر چونک پڑتا۔

مجھے یاد ہے، میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے اس تجربے، اپنی اس کیفیت کو اشعار میں من وعن بیان کرے۔ اس نے وعدہ کیا تھا۔ معلوم نہیں اس نے ادھر توجہ دی یا بھول گیا۔ کُرید کُرید کر میں کسی سے کچھ پوچھا نہیں کرتا۔ سرسری گفتگو کے دوران میں میراجی سے مختلف موضوعوں پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا لیکن اس کی ذاتیات کبھی معرض گفتگو میں نہیں آئی تھی۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں کس سلسلے میں اس کی اجابتِ جنسی کے خاص ذریعے کا ذکر آ گیا۔ اس نے مجھے بتایا۔ اس کے لئے اب مجھے خارجی چیزوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایسی ٹانگیں جن پر میل اتارا جا رہا ہے..... خون میں لتھڑی ہوئی خاموشیاں......''

یہ سُن کر میں نے محسوس کیا تھا کہ میراجی کی ضلالت اب اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ اسے خارجی ذرائع کی امداد طلب کرنا پڑ گئی ہے۔ اچھا ہوا جو وہ جلدی مر گیا کیونکہ اس کی زندگی کے خرابے میں اور زیادہ خراب ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اگر کچھ دیر سے مرتا تو یقیناً اس کی موت بھی ایک دردناک ابہام بن جاتی۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
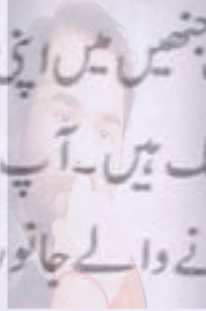
# چراغ حسن حسرت

مولانا چراغ حسن حسرت جنھیں میں اپنی اختصار پسندی کی وجہ سے حسرت صاحب کہتا ہوں، عجیب وغریب شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ پنجابی محاورے کے مطابق دودھ دیتے ہیں مگر مینگنیاں ڈال کر۔ ویسے یہ دودھ پلانے والے جانوروں کی قبیل سے نہیں ہیں۔ حالانکہ کافی بڑے بڑے کان رکھتے ہیں۔

آپ سے میری پہلی ملاقات عرب ہوٹل میں ہوئی۔ جسے اگر فرانس کا "لیٹن کوارٹر" کہا جائے تو بالکل درست ہوگا۔ ان دنوں میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا اور خود کو بزعمِ خویش بہت بڑا ادیب سمجھنے لگا تھا۔

عرب ہوٹل میں میرا تعارف مظفر حسین شمیم نے ان سے کرایا۔ یہ بھی حسرت صاحب کے مقابلے میں کم عجیب وغریب شخصیت نہیں رکھتے۔ میں بیکار تھا۔ شمیم صاحب کی وساطت سے مجھے ہفتہ وار "پارس" میں جس کے مالک کرم چند تھے، ملازمت مل گئی۔ تنخواہ چالیس روپے ماہوار مقرر ہوئی مگر ایک مہینے میں بمشکل دس پندرہ روپے ملتے تھے۔ شمیم صاحب اور میں دونوں دوپہر کا کھانا عرب ہوٹل میں کھاتے تھے۔

ایک دن میں نے اس ہوٹل کے باہر تھڑے پر وہ ٹوکرا دیکھا۔ جس میں بچا کھچا کھانا ڈال دیا جاتا تھا۔ اس کے پاس ایک کتا کھڑا تھا۔ ہڈیوں اور تڑی مڑی روٹیوں کو سونگھتا، مگر کھاتا نہیں تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ سلسلہ کیا ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

شمیم صاحب نے جب حسرت صاحب سے میرا تعارف کرایا اور ادھر اُدھر کی چند باتیں ہوئیں، تو میرے استفسار پہ بتایا کہ اس کتے کی محبت ایک سانڈ سے ہے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی، لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان دو حیوانوں میں دوستی تھی۔ سانڈ ساڑھے بارہ بجے دو پہر کو خراماں خراماں آتا۔ کتا دم ہلا ہلا کر اس کا استقبال کرتا اور وہ ٹوکرا جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس کے حوالے کر دیتا۔ جب وہ اپنا پیٹ بھر لیتا، تو جو کچھ باقی بچ جاتا اس پر قناعت کرتا۔

اس دن سے اب تک میری اور حسرت صاحب کی دوستی، اس سانڈ اور کتے کی دوستی ہے۔ معلوم نہیں حسرت صاحب سانڈ ہیں یا کتا۔ مگر ایک بات ہے کہ ہم میں سے کوئی نہ کوئی سانڈ اور کتا ضرور ہے۔ لیکن ہم میں اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، جو ان دو حیوانوں میں شاید نہ ہوتی ہوں۔

حسرت صاحب بڑی پیاری شخصیت کے مالک ہیں۔ میں ان سے عمر میں کافی چھوٹا ہوں۔ لیکن میں انھیں بڑی بڑی مونچھوں والا بچہ سمجھتا ہوں ____ یہ مونچھیں صلاح الدین احمد صاحب کی مونچھوں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔

حسرت صاحب کہنے کو تو کشمیری ہیں مگر اپنے رنگ اور خدوخال کے اعتبار سے معلوم نہیں کس نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ فربہ اندام اور خاصے کالے ہیں۔ معلوم نہیں کس اعتبار سے کشمیری ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؟

ویسے مجھے اتنا معلوم ہے کہ آپ آغا حشر کاشمیری کے ہم جلیس تھے۔ علامہ اقبال سے بھی شرفِ ملاقات حاصل تھا۔ جو کشمیری تھے۔ خاکسار بھی ہے۔ جس سے ان کی "سانڈ اور کتے" کی دوستی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اگر یہ ثابت کرنا چاہیں کہ خالص کشمیری ہیں تو کوئی کشمیری نہیں مانے گا۔ حالانکہ انھوں نے کشمیر پر ایک کتاب بھی لکھی ہے ____

یہ کتاب میں نے پڑھی ہے۔ میں عام طور پر بڑا برخود غلط انسان متصور کیا جاتا ہوں۔ لیکن مجھے ماننا پڑتا ہے ____ اور آپ سب کے سامنے کہ حسرت صاحب بڑی دلفریب اندازِ تحریر کے مختار اور مالک ہیں۔ بڑی سہل ممتنع قسم کے فقرے اور جملے لکھتے ہیں۔ پر ان کی ان پیاری تحریروں میں مجھے ایک بات کھٹکتی ہے کہ وہ ہمیشہ اُستادوں کا طریقِ تعلیم استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بے شمار شاگرد موجود ہیں جو شاید ان کے علم میں نہ ہوں۔ مگر ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر بچے، نوجوان اور بڑے بوڑھے پر رُعب جمائیں۔ اور اس کا کاندھا تھپکا کر اسے یہ محسوس کرنے پر مجبور کریں کہ وہ ان کا برخوردار ہے ____ مجھے ان کی طبیعت کا یہ رُخ سخت ناپسند ہے، اسی وجہ سے، میری اور ان کی لڑائی ہوتی رہی ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مجھے ان کا برخوردار ہونے میں کوئی عذر نہیں۔ میں آپ سب کے سامنے یہ اعتراف کرنے کے لئے تیار ہوں کہ میں صرف برخوردار ہی نہیں برخرسوار بھی ہوں۔ لیکن وہ مجھ پر رعب نہ ڈالا کریں۔ میں ان کی دل سے عزّت کرتا ہوں۔ جب سے ''نوائے وقت'' میں ان کے ''حرف وحکایت'' کا کالم چھپنا بند ہوا ہے۔ میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے مجھے صبح کی چائے نہیں ملی، جو میرے لئے بہت ضروری ہے۔

''حرف وحکایت'' کا کالم میرا خیال ہے، انھوں نے ''امروز'' میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اس روزنامے کی تخلیق وتولید میں ان کا بڑا حصّہ تھا۔ فیض صاحب (جو ان دنوں راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں قید ہیں) اور حسرت دونوں مل کر گھنٹوں اس نئے پرچے کی تشکیل کے متعلق سوچا کرتے تھے۔ حسرت صاحب کہنہ مشق صحافی تھے۔ اور فیض ان کے مقابلے میں طفلِ مکتب۔ بہر حال ان دونوں نے مل کر ایک ایسے روزنامے کا نمونہ تیار کیا، جو دوسرے پرچوں نے نقل کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ''امروز'' کا ہفتہ وار علمی وادبی ایڈیشن بھی مرتب کرنا شروع کیا جس میں پہلی مرتبہ مُلک کے تمام اہلِ قلم حضرات نے اپنی نگارشات طباعت کے لئے دیں۔

''امروز'' میں اب حسرت صاحب نہیں ہیں۔ اس کا ناک نقشہ وہی ہے، جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا مگر افسوس ہے کہ اس کو یہ حسرت ہے کہ اس میں حسرت نہیں ہے۔ ''حرف وحکایت'' کا کالم جو ان کی واحد ملکیت تھا۔ اب اس پر ایک صاحب کی جن کا قلمی نام ''پنج دریا'' ہے، اجارہ داری ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جو ''سندباد جہازی'' لکھ سکتا ہے، جو سلیقہ اور قرینہ اسے نصیب ہے، وہ پنج دریا کے فلک کو بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔

مجھے قطعی طور پر معلوم نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ روزناموں میں (خصوصاً پنجاب میں) مزاحیہ اور فکاہیہ کالم مولانا ظفر علی خاں نے شروع کیا تھا، جو بعد میں مولانا چراغ حسن حسرت کی ہلکی پھلکی اور شگفتہ ظرافت کی ملکیت بن گیا۔

عبدالمجید سالک صاحب کو حسرت صاحب کے مقابلے میں فکاہی کالموں کے سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ان دونوں میں بہت بڑا تفاوت ہے۔ سالک ٹھیٹ امریکیوں کے مانند پھکڑ باز ہیں۔ حسرت انگریزوں کی طرح کھل کر ہنسنے ہنسانے والے نہیں۔ مجھے سالک زیادہ پسند ہیں، اس لئے کہ پنجابی ہونے کی حیثیت سے میں خود بہت بڑا پھکڑ باز ہوں۔

حسرت صاحب تحریر وتقریر کے معاملے میں بڑے محتاط ہیں۔ ہمیشہ زبان کی اُلجھنوں میں گرفتار رہیں گے۔ اس کی باریکیوں کے متعلق غور وفکر کریں گے لیکن ان کی تحریروں میں مجہول

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اور تابع مجہول کی تکرار مجھے ہمیشہ کھٹکتی رہی ہے۔ معلوم نہیں وہ کس مجہول کے تابع ہیں؟

حسرت صاحب نے چند کتابیں لکھی ہیں جن کا اُردو ادب میں کوئی مقام نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے کبھی اس طرف رجوع ہی نہیں کیا۔ ان کی ساری عمر کاروباری زندگی میں گزری ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، ان کی بے شمار تصنیفات ہیں، جو ان کے نام سے شائع نہیں ہوئیں۔ انھوں نے اسکولوں کے لئے کئی نصاب لکھے ہوں گے جن پر بحیثیت مصنّف کے کسی پبلشر کا نام درج ہوگا۔

مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ انھوں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا کہ اُردو ادب کو ان سے کتنی توقعات ہیں۔ وہ روپیہ وصول کرتے ہیں اور ادب کو جہنّم میں جھونک دیتے ہیں۔ ورنہ، جیسا کہ مجھے قطعی احساس ہے اگر وہ محض کالم نویسی نہ کریں، زیادہ گپ بازیوں اور اپنے سے چھوٹے ادیبوں کو اپنی خداداد قابلیت سے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کریں تو وہ سعادت حسن منٹو سے چار قدم آگے ہوتے۔

میرے اس مضمون کا عنوان "شیر دارم شکر ک" ہوتا۔ اس لئے کہ چراغ حسن حسرت کا ہم وزن ہے۔ ان کا دودھ ان کی تحریر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت میٹھا ہوتا ہے۔ اپنے متعلق میں بیان کر چکا ہوں کہ وہ مجھے یہ دودھ مینگنیاں ڈال کر دیتے رہے ہیں۔

آج سے غالباً بیس برس پہلے کا ذکر ہے۔ جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ ان دنوں میں نے "ہمایوں" اور "عالمگیر" کے روسی ادب نمبر مرتب کئے تھے۔ حسرت صاحب نے جو غالباً "زمیندار" یا "احسان" میں ملازم تھے، اپنے فکاہی کالم میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا "منٹو آج کل کھٹ بنوں کی طرح صدا لگاتا پھرتا ہے کہ روسی نمبر نکلوالو، یا فرانسیسی نمبر نکلوالو—دوسرے الفاظ میں یہ کھٹ بنوں کی مخصوص صدا تھی ___ منجی پیڑھی ٹھکالو۔"

یہ پڑھ کر میں نے لطف اُٹھایا، مگر کباب بھی ہوا۔ بہر حال جب تک حسرت صاحب زندہ ہیں (اور میری دعاء ہے کہ کم از کم میری حیات تک زندہ رہیں) میں لطف اُٹھاتا رہوں گا اور کباب بھی ہوتا رہوں گا۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے شاعری سے کوئی شغف نہیں لیکن، مجھے حسرت صاحب کے ایک دُور دراز کے رشتے دار غنی کاشمیری کا ایک شعر یاد آگیا ہے۔

کدام سوختہ جاں دست زو بدامانت
کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

میرا خیال ہے کہ یہ حسرت صاحب ہی کی سوختہ جاں ہے۔ جس نے عرب ہوٹل میں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

کباب کھاتے ہوئے میرے دامن پر ہاتھ رکھ دیا کہ اب کباب ہونا میرے لئے ہر روز کی بات بن گیا ہے۔

غنی کاشمیری کا ذکر آیا ہے تو میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ حسرت صاحب اپنی عام گفتگو میں بڑے بڑے شعراء کے نام صرف اس غرض سے لیا کرتے ہیں کہ سُننے والے ان کے رعب کے نیچے دب جائیں۔ ان کا ایسے موقعوں پر ایک مخصوص لب ولہجہ ہوتا ہے۔ جس کی نقل میں کرسکتا ہوں۔ مگر یہ موقعہ محل نہیں، اس لئے کہ مجھے صرف یہ مضمون پڑھنا ہے۔

ان کا اندازِ گفتگو ویسے سارے لاہور میں مشہور ہے۔ انگوٹھے کے ساتھ والی دو انگلیوں میں سگریٹ دبا کر وہ تانگے والوں کے انداز میں زور کا کش لگائیں گے۔ اور پوچھیں گے ''مولانا آپ نے قاآنی کا مطالعہ کیا ہے؟''

اور اگر آپ میری طرح کم تعلیم یافتہ ہیں اور آپ کو فارسی سے کوئی شدبد نہیں، تو آپ مولانا چراغ حسن حسرت کے سامنے بالکل ایک چُغد کی حیثیت میں بیٹھے ہوں گے۔ پھر وہ آپ کو اور زیادہ چغد بنانے کے لئے فردوسی، سعدی، حافظ اور غالب کا فارسی کلام سُنائیں گے اور آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ خودکشی کرلیں۔

میں نے اب تک خودکشی نہیں کی، اس لئے کہ میں حسرت صاحب کی رگ رگ پہچانتا ہوں۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ وہ بڑی قابل شخصیت کے مالک ہیں۔ لیکن میں خود کو بھی کسی حد تک قابل سمجھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اب تک زندہ ہوں۔

حسرت صاحب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مردم کُش ہیں سراسر غلط ہوگا۔ لیکن ان کے کردار میں ایک عجیب وغریب چیز یہ ہے کہ وہ جلا کر مارتے ہیں۔ اور مار کر جلاتے ہیں۔ مجھے انھوں نے کئی مرتبہ موت کے گھاٹ اُتارا ہے۔ اور کئی بار اپنے اعجاز سے زندہ کیا ہے۔

ہم دونوں شرابی ہیں۔ لیکن ہم میں کچھ فرق ہے۔ وہ سمجھتے ہیں یا دوسروں کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ان کی بیگم کو ان کی شراب نوشی کا کوئی علم نہیں۔ یہاں یہ عالم ہے کہ دنیا جانتی ہے کہ میں پیتا ہوں اور اس دُنیا میں میری رفیقۂ حیات بھی شامل ہے۔

میں آپ کو ایک دلچسپ لطیفہ سُناؤں۔ دہلی میں ہم دونوں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن میں ملازم تھے۔ اور اکثر اکٹھے پیا کرتے تھے۔ ان دنوں آپ نے شادی کی تھی۔ میرے اور ان کے گھر میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا، اس لئے وہ ہمارے یہاں قریب قریب ہر روز آتے جاتے تھے۔ میری بیوی جانتی تھی کہ میں پیتا ہوں، لیکن حسرت صاحب کی بیگم صاحبہ یکسر منکر تھیں کہ وہ پیتے ہیں۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

حالانکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ وہ پیتے ہیں۔ اور بیچ کھیت پیتے ہیں۔ مگر وہ یہ فراڈ کرتے تھے کہ گھر میں رات کو ایک دو بجے کے قریب جاتے، جب کہ سب سو رہے ہوتے۔

ایک دن میں نے شرارت کی۔ ان کی بیگم صاحبہ ہمارے گھر میں تھیں۔ میں اور حسرت صاحب "بھولا رام اینڈ سنز" کے شراب خانے میں پی رہے تھے کہ مجھے اپنی بیوی کی طرف سے ایک چٹ ملی، جس میں یہ پوچھا گیا تھا کہ حسرت صاحب کہاں ہیں؟ میں نے جواباً لکھ دیا کہ وہ میرے ساتھ شراب خانے میں موجود ہیں۔ لیکن یہ حسرت صاحب کا کمال ہے کہ ان کی بیگم نے میری اس تحریر پر یقین نہ کیا۔

انہی دنوں کی بات ہے، بھولا رام کے شراب خانے میں ہم سب بیٹھے تھے۔ فیض، دیوندر ستیارتھی، محمد حسین ریڈیو آرٹسٹ اور احمد ندیم قاسمی صاحب بیٹھے تھے کہ میری حسرت صاحب سے جھڑپ ہو گئی۔ وہ حسبِ معمول مجھ پر رعب جھاڑنے لگے۔ میں نے چڑ کر ان سے کہا کہ میرے نزدیک ان کی حیثیت صرف ایک لغت کی سی ہے۔ جس کے اوراق پلٹ کر آدمی کسی لفظ کے معنی دیکھتا ہے اور پھر اسے طاق پر رکھ دیتا ہے۔ وہ بہت ناراض ہوئے۔ اس لئے کہ میرا یہ جملہ ان کی شخصیت پر بہت بڑا حملہ تھا۔

اسی دوران میں مختلف غیر ملکی مصنفوں کی بات چل نکلی ___ مجھے سامرسٹ مام پسند تھا۔ میں نے اس کا نام جب بار بار لیا تو مولانا چراغ حسن حسرت صاحب نے پنجابی محاورے کے مطابق میرا "گڈا بنھ دِتا" ___ اگر ان کا یہ کالم میرے پاس موجود ہوتا، تو میں یقیناً آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ اسے پڑھ کر میں بہت کباب ہوا تھا۔

دیوان سنگھ مفتوں کا یہ کہنا ہے کہ اگر میں کسی کے خلاف کچھ لکھوں اور وہ اسے پڑھ کر رات کو آرام و اطمینان سے سو جائے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ مجھے بہت بڑی شکست ہوئی ہے۔ حسرت صاحب کو میرے معاملے میں کبھی شکست نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ ان کی تحریروں نے جو مجھ سے متعلق ہیں، ہمیشہ مجھ پر راتوں کی نیند حرام کی ہے ___ خدا انہیں زندہ رکھے، تاکہ میں غالب کے اس مصرعہ کا مطلب اچھی طرح سمجھ سکوں کہ ___

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اختر شیرانی، حسرت صاحب کے دوست تھے۔ وہ کثرتِ شراب نوشی کے باعث مر گئے۔ باری صاحب تھے۔ (جو خود کو انقلابی ادیب کہتے تھے۔) ان کو معلوم نہیں شراب نوشی کی کثرت سے یا قلت سے دل کا عارضہ ہوا اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جو معلوم نہیں پانی بھی پیتا ہے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

یا کہ نہیں۔ میں شدید طور پر بیمار ہوا اور تین مہینے میو ہسپتال میں رہ کر بھی جانبر رہا۔

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز تھا ساقی

لیکن ڈاکٹر پیرزادہ صاحب کچھ اور علاج کرتے رہے۔ بہر حال میں بچ گیا۔ حسرت صاحب کے معالج بھی غالباً پیرزادہ صاحب تھے۔ علاج ان کا وہی آبِ نشاط انگیز تھا مگر وہ شاعر اور ادیب نہیں۔ محض ڈاکٹر ہیں اس لئے انھوں نے ان کو موت کے مُنہ سے بچالیا، جو بہت غیر شاعرانہ ہے۔

حسرت صاحب میو ہسپتال میں دوڈھائی مہینے رہ چکے ہیں، ان کو جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ان کو "رونری تھرومبوسس" کا عارضہ لاحق تھا۔ جب میں ہسپتال میں داخل ہوا، تو پیرزادہ صاحب نے یہ تشخیص کی تھی کہ مجھے "سورائس لور" کی شکایت ہے۔ بہر حال ہم دونوں ایک ہی "خانہ خراب" چیز کے شکار ہیں۔

سردیوں کی بات ہے، جب وہ میو ہسپتال میں تھے۔ مجھے وہاں سے نکلے ہوئے قریب قریب تین مہینے گذر چکے تھے۔ جب میں نے ایک روز "نوائے وقت" میں پڑھا کہ مولانا دل کے مرض میں گرفتار ہیں، تو مجھے بڑا تعجب ہوا کہ جہاں تک دل کی رعایت سے محبت کا تعلق ہے۔ وہ کبھی گرفتار نہیں ہوسکتے۔ (ہوسکتا ہے، ان کے متعلق میرا نظریہ غلط ہو)۔

جب وہ ہسپتال میں داخل ہوئے تو اس سے پندرہ بیس روز پیشتر میری ان سے ملاقات ہوئی۔ غالباً "ادارۂ فروغِ اُردو" میں، اس سے چندروز پہلے میں نے تھوڑی پینا شروع کردی تھی۔ اور وہ بھی ڈرڈر کے۔ مولانا ملے۔ ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ ہم میو ہسپتال کے پاس پہنچے تو میں نے ان سے عرض کیا "بوندا باندی ہورہی ہے۔ آج کوئی پروگرام ہونا چاہیئے۔"

انھوں نے مجھے بہت ڈانٹا۔ میری صحت کے پیش نظر ایک لمبا چوڑا لیکچر دیا، لیکن آخر کار میرے ساتھ پینے پر رضا مند ہوگئے اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ میو ہسپتال میں داخل ہوئے اور دوڈھائی مہینے تک وہاں مقیم رہے۔

میں ان کا بہت عقیدت مند ہوں۔ ایک مرتبہ میں نے تہیہ کیا کہ ان کے پاس جاؤں گا، لیکن راستے میں ایک نرس مل گئی، اس سے بات چیت ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس نے سمجھ لیا کہ میرے مُنہ سے "آئیڈوفارم" کی بو نہیں آرہی۔ اس لئے میں وہاں سے بھاگ گیا۔ اور ایسا بھاگا کہ پھر میو ہسپتال کا رُخ نہ کیا۔

حسرت صاحب بفضلِ خدا اب تندرست ہیں۔ میں تو میو ہسپتال کے جنرل وارڈ میں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

رہا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس دولت ابھی تک موجود ہے، جو شاید انھوں نے اپنی "میجری" کے زمانے میں کمائی ہو گی۔ اس لئے کہ وہ "فیملی" وارڈ میں رہے۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ پینا چھوڑتے ہیں یا نہیں۔

یہ مضمون نامکمل ہے۔ اس لئے کہ میں نے افراتفری میں لکھا ہے"

---

اس مضمون کا پہلا حصہ جو آپ نے پڑھا ہے، میں نے بڑی رواداری میں لکھا تھا۔ میں نے صبح اخباروں میں دیکھا کہ حسرت صاحب کے صحت یاب ہونے کی خوشی میں اُردو ادب کے اور مولانا کے دوست وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں ایک جلسہ کر رہے ہیں۔ حسرت صاحب سے چونکہ مجھے عقیدت ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے اپنا عزیز سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ ان کے بارے میں جو میرے احساسات ہیں، قلم بند کروں اور اس جلسے میں حاضرین کو پڑھ کے سناؤں۔

چنانچہ میں نے قلم اٹھانے سے پہلے محمود نظامی صاحب (ریجنل ڈائریکٹر، ریڈیو پاکستان لاہور) کو ٹیلی فون کیا اور ان سے دریافت کیا کہ اگر میں حسرت صاحب کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں، تو کیا مجھے اس کی اجازت ہو گی۔ انھوں نے حسبِ معمول اپنی فارغ البالی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ تمھیں کون روک سکتا ہے۔ آؤ اور پڑھو۔

مصیبت یہ تھی کہ مجھے اسی دن لاہور ریڈیو اسٹیشن سے سات بجے اپنا تازہ افسانہ براڈ کاسٹ کرنا تھا اور حسرت صاحب کی صحت یابی سے متعلق جلسہ ساڑھے چھ بجے شروع ہونا تھا۔ میں نے عشرت رحمانی صاحب (اسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹر) سے مشورہ کیا۔ انھوں نے ازراہِ عنایت فرمایا کہ تم کچھ فکر نہ کرو۔ یہاں افسانہ پڑھو۔ باہر موٹر کھڑی ہے وہ تمھیں وائی۔ ایم سی۔ اے پہنچا دے گی۔

اسی دن ایک اور مصیبت مجھ پر یہ آئی، کہ افراتفری کے عالم میں جب میں نے حسرت صاحب کے متعلق اپنے چند احساسات کاغذ پر گھسیٹے، تو ساڑھے تین کے قریب کامریڈ سبط حسن تشریف لے آئے۔ آپ نے اس خیال کے پیشِ نظر کہ میں اگر بیٹھا رہا تو ضرورت سے زیادہ پینا شروع کر دوں گا، مجھ سے اپنے بڑے پیارے انداز میں فرمایا کہ میں ان کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار میٹنگ میں چلوں۔

میں نے اپنی بیوی کو ساتھ لیا کہ آج کل وہ مجھے کہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی۔ ہم نقی بلڈنگ کے ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں سوویت کلچر ایسوسی ایشن کا دفتر ہے۔ بڑا تیسرے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

درجے کا — خیر یہ جملۂ معترضہ تھا، میں نے حسبِ عادت یہ زیادتی کی کہ سبط حسن صاحب کو صدارت کے لئے مجبور کیا، پھر ان پر زور دیا کہ جو خط انھوں نے میری درخواست پر میرے نام لکھا تھا، پڑھیں۔ اس کے بعد برادرم احمد ندیم قاسمی سے بھی یہی سلوک کیا۔ چنانچہ انھوں نے بادل ناخواستہ وہ مضمون پڑھ کے سنایا جو انھوں نے میرے بارے میں ''دو شخصیتیں'' کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا۔ اس کے بعد سب سے بڑی زیادتی میں نے یہ کی کہ حسرت صاحب کے متعلق اپنے تاثرات حاضرین کو جن کی تعداد تیس چالیس سے زیادہ نہیں تھی، سُنا دیا۔ اور یہ میٹنگ اس لئے پھسپھسی رہی کہ اس میں صرف میرا نام گو بختار رہا۔ حالانکہ مجھے اس بات کا زعم ہے کہ جہاں میرا نام لیا جائے، وہاں اور کچھ نہیں تو ایک لطیفے کے لئے ہنگامہ برپا ہونے کے آثار ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔

لیکن مجھے اپنے اس زعم کے بارے میں زیادہ دیر تک مایوسی نہ ہوئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ سے فارغ ہو کر ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ میری بیوی اور شاد امرتسری دونوں مجھے مناسب و موزوں ہدایات دینے کے لئے ''کرۂ نشر'' میں موجود تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ میری گاڑی پٹڑی سے اُتر گئی اور افسانے کا ایک پورا پیرا براڈ کاسٹ ہونے سے رہ گیا۔

حسرت صاحب پر میں نے جو مضمون لکھا تھا، وہ شاید سلیم شاہد صاحب کے حوالے کر دیا تھا کہ وہ اسے سنسر کرلیں۔ اور عبداللہ بٹ صاحب کو بھی دکھالیں۔ میری تحریروں پر اکثر لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بدمزگی پیدا ہو لیکن ہوئی اور ایک ننھے ہنگامے کا باعث بنی۔

ریڈیو اسٹیشن سے میں سیدھا وائی، ایم، سی، اے پہنچا۔ ہال میں سوڈیڑھ سو آدمی تھے۔ ہم پچھلے بنچوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے فوراً عبداللہ بٹ سے پوچھا کہ کیا مجھے اپنا مضمون پڑھنے کی اجازت ملے گی۔ انھوں نے فرمایا کہ ریڈیو آرٹسٹ، حسرت صاحب کی غزل گانے سے فارغ ہو جائے تو تمہاری باری آئے گی۔ مضمون میرے پاس نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ صاحب صدر میر قیوم ایم۔ ایل۔ اے کی تحویل میں ہے۔

گانے کے آخری بول ختم ہوئے تو میں ڈائس پر پہنچا۔ صاحب صدر نے مضمون میرے حوالے کیا۔ میں نے ایک نظر حسرت صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ویسی کی ویسی تھیں، مگر بے حد لاغر تھے۔ پھولوں کے ہاروں سے لدے پھندے ایک ایسے بوڑھے دولہا دکھائی دے رہے تھے جنھیں پانچویں چھٹی شادی کرانے کا شوق چرایا ہو۔

اردو صحافت سے حسرت صاحب کا رشتہ بہت مضبوط ہے۔ وہ خدانخواستہ مر بھی جائیں، تو مزاح نگاری ساری عمر عدت میں گذار دے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے اپنا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
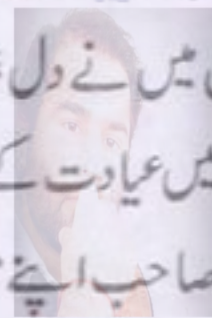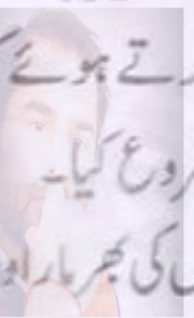
یہ جلوس نکالنے یا اپنا جلسہ کرانے کا تکلف کیوں کیا۔ وہ اس سے بالاتر ہیں۔

بہر حال میں نے دل ہی دل میں اس بات کا افسوس کرتے ہوئے کہ میں ان کی شدید علالت کے دوران میں عیادت کے لئے نہ گیا، اپنا مضمون پڑھنا شروع کیا۔

حسرت صاحب اپنے موڈ میں نہیں تھے۔ شاید تعریفوں کی بھرمار اور پھولوں کے بوجھ سے ان کی طبیعت مکدر ہو چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس سعادت منٹو کے احساسات کو بھی جو کافی بے تکلف تھے۔ گوارا نہ کیا۔ جب میں ایک صفحہ پڑھ چکا، تو انھوں نے مجھے اور صاحب صدر کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا کہ یہ کیا بکواس ہے۔

بکواس تو میں عام کیا کرتا ہوں، لیکن جہاں تک حسرت صاحب کا تعلق ہے۔ ان کے متعلق میں کبھی بکواس نہیں کر سکتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں نے ان کے کردار و اطوار کے متعلق چند ایک باتیں اپنے ٹھیٹ افسانوی مگر صاف گو انداز میں بیان کردی ہیں جو ان کی طبع نازک پر بار گذری ہوں، لیکن میرے پھکڑپن کے پیش نظر اور اس محبت کو سامنے رکھتے ہوئے جو مجھے ان سے ہے۔ اور یقیناً ان کو بھی ہے، مجھے معاف کر دینا چاہئے تھا۔
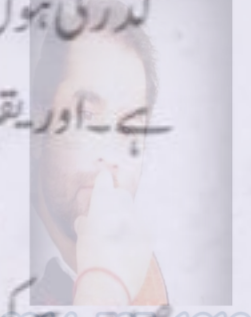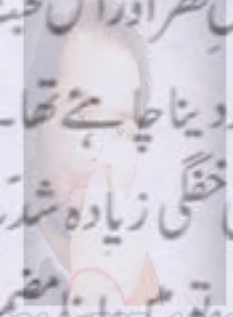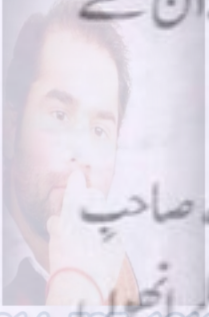
جب میں نے دیکھا کہ ان کی خفگی زیادہ شدت اختیار کر گئی ہے، تو میں نے صاحب صدر سے کہا۔ ''اگر حسرت صاحب چاہیں تو میں اپنا مضمون پڑھنا بند کر دیتا ہوں۔'' مگر انھوں نے ارشاد فرمایا کہ نہیں مضمون پڑھنا جاری رکھو۔''

سخت گرمی تھی، کچھ حسرت صاحب کے مزاج کی بھی۔ میں پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ مضمون ختم ہوا، تو میں نے حسرت صاحب کے پاس فرش پر بیٹھ کر معذرت چاہی، لیکن اس وقت وہ درگذر کرنے، یا میرے احساسات کے خلوص کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے — میں نے کہا ہٹاؤ، یہ شخص اگر نہیں مانتا، تو نہ مانے — اور اسٹیج سے اُتر کر مصورِ پاکستان جناب عبدالرحمن چغتائی صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ انھوں نے کمال شفقت سے میرا تکدر دور کیا۔ اس کے بعد میں وہاں سے چلا گیا۔
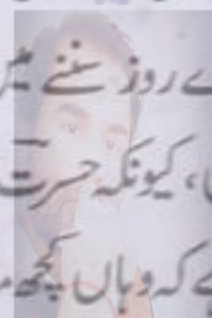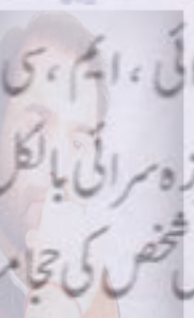
دوسرے روز سننے میں آیا کہ سعادت حسن منٹو کی وائی، ایم، سی، اے میں حجامت ہوتے ہوتے رہ گئی، کیونکہ حسرت صاحب کے مداحوں کو میری ہرزہ سرائی بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ وہاں کچھ مداح میرے بھی تھے۔ جو ہر اس شخص کی حجامت کرنے کے لئے تیار تھے، جو میری حجامت پر آمادہ ہوتا ____ اگر یہ دونوں باتیں درست ہیں، تو مزا آ جاتا۔ اس جلسے میں جتنے اصحاب تھے، ان کی مفت میں حجامت ہو جاتی ____ اور میں تو چچا غالب کا یہ شعر پڑھ کے ان تمام حجاموں کو سُناتا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
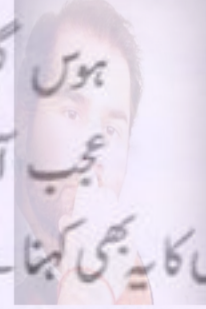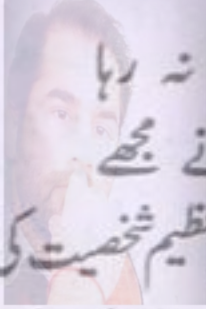
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا اس بے پر وبالی نے مجھے

لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ مجھے ایسے موقع پر جب کسی عظیم شخصیت کی "برسی" (معلوم نہیں یہ لفظ کیوں استعمال کیا گیا تھا) منائی جا رہی تھی، ایسا مضمون جو تقدیس کے معیار پر پُورا نہیں اُترتا تھا، ہرگز ہرگز پڑھنا نہیں چاہیے تھا۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس کے متعلق بہت کچھ کہا سُنا جا سکتا ہے ___ حسرت صاحب کی تقدیس کسی ولی یا پیغمبر کی تقدیس نہیں۔ ان کی شخصیت سے ان کی صحافت نگاری اور مزاح نویسی ہی سے کسی کو عقیدت ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح مجھے کئی لوگ محض باتیں بنانے والا سمجھتے ہیں اور افسانہ نگار نہیں مانتے، ان کو بھی چند لوگ محض ایک کالم نگار سمجھتے ہوں، مگر اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔
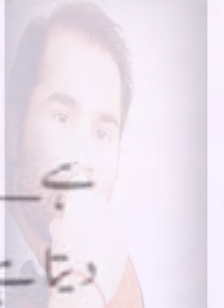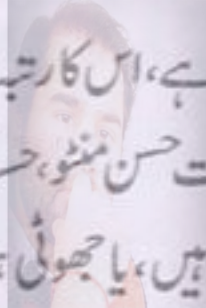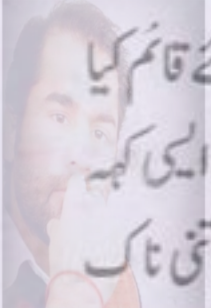
انسان وہی ہے، جو کچھ کہ وہ ہے، اس کا رتبہ وہی ہے، جو اس نے خود اپنے لئے قائم کیا ہے ___ دنیا جائے جہنم میں۔ اگر سعادت حسن منٹو، حسرت صاحب کے متعلق چند باتیں ایسی کہہ دیتا ہے جو سچی ہونے کے باعث کڑوی ہیں، یا جھوٹی ہونے کی وجہ سے کسیلی، تو اس پر اتنی ناک بھوں تو نہیں چڑھانی چاہیے کہ اپنا حُلیہ ہی بگڑ جائے۔

ہر انسان کو جو ادب یا صحافت کے میدان میں آتا ہے، معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کا واحد مالک نہیں ہوتا۔

میں تو خیر افسانہ نگار ہوں۔ بہت سے جیتے جاگتے، چلتے پھرتے کرداروں کو فرضی نام دے کر ان کی کہانیاں لکھتا رہتا ہوں، لیکن حسرت صاحب کو جو ہر روز کالم نویسی کرنا پڑتی ہے، اس کو ان میں تمام سیاسی اور تجارتی شخصیتوں کے اصلی نام لکھنے پڑتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے بغیر کوئی اور چارہ ہی نہیں۔

میرے مقابلے میں وہ بہت بڑے "پگڑی اچھال" ہیں۔ اس فن میں انہیں کافی مہارت حاصل ہے لیکن ایک بات انھیں بھولنا نہیں چاہیے کہ سو سنار کی اور ایک لوہار کی ___ میں لوہار نہیں ہوں، سنار ضرور ہوں، مجھے حیرت ہے کہ ان کو میرا یہ "سونار بننا" کیوں پسند نہ آیا۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس جلسے میں جو کہ اب میری وجہ سے کافی حد تک بدنام ہو چکا ہے، خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی صاحب نے ایک دعاء پڑھی۔ میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ تمھیں مضمون کے بجائے ایک اور دُعاء پڑھ دینی چاہیے تھی۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں حسرت صاحب کی طرح فارسی اور عربی کا عالم نہیں۔ بہر حال کفارے کے طور پر جو دعاء میری زبان پر آئی ہے، یہاں لکھے دیتا ہوں۔

''خداوند ___ نہ تو کھاتا ہے، نہ پانی پیتا ہے ___ تیرا وجود ہے بھی اور نہیں بھی ہے ___ یہ کیا مصیبت ہے۔ تیری دنیا میں ہم کھاتے بھی ہیں اور پیتے بھی ___ پانی بھی اور شراب بھی۔ تیرا ایک بندہ چراغ حسن حسرت ہے، جو صحافت کا چراغ ہے۔ اس کو پینے پلانے کی لت ہے، جس طرح مجھے ہے، ہم دونوں برے آدمی ہیں۔ مطلب یہ ہے ___ لیکن ___ مطلب بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے، تو سب باتیں جانتا ہے ___ پھر یہ کیا ظلم ہے کہ آئے دن تو ہمیں بیمار کر دیتا ہے ___ خدا کی قسم یہ اچھی بات نہیں ___ میں نے تیری ہی قسم کھائی ہے، اگر کسی اور کی کھائی ہوتی، تو تو میرا بیڑہ غرق کر دیتا ہے۔''

نماز کبھی میں نے پڑھی ہے، نہ میرے محترم دوست حسرت صاحب نے، بہر حال ہم تیرے قائل ضرور ہیں، اس لئے کہ تو ہمیں شدید طور پر بیماری میں مبتلا کر کے پھر اچھا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ ٹھیک نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تو ہمیں حیاتِ جاوداں عنایت فرما۔ میری صرف یہ درخواست ہے کہ تو مجھے ایک سال کے اندر اندر مار دے، لیکن حسرت صاحب کو کم از کم بیس برس اور زندہ رکھ، تا کہ وہ اس دوران میں بھی لوگوں کو یقین دلاتے رہیں کہ انھیں دخترِ رز سے کوئی واسطہ نہیں۔

حسرت صاحب کو اگر تو نے بیس برس اور زندگی عطا فرما دی، تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ تیرا جغرافیہ لکھ دیں گے، جو تو اپنے آسمانوں کے اسکولوں میں نصاب مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ رائلٹی مجھے ملے۔

تو عالم الغیب ہے ___ میری سفارش کے متعلق تو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں چاہتا، اس لئے کہ شاید تو میرا اسی وقت ٹینٹوا دبا دے، جس کو دبانے کی حسرت، حسرت صاحب کو اب تک رہی ہے۔''

یہ دعاء تو مانگ چکا۔ بد دعاء مانگتا تو وہ کچھ اس قسم کی ہوتی:

''اے اللہ میاں ___ حسرت صاحب کو موسیو اسٹالن بنا دے، تا کہ وہ اس امر کی طرح آہنی پردے کے پیچھے اپنی من مانی کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے جتنے کمیونسٹ ہیں، ان کے تابع رہیں اور ان کے گن گاتے رہیں۔

''اگر تو انھیں کامریڈ اسٹالن نہیں بنا سکتا (اس لئے کہ یہ تیرے لئے بھی کسی قدر مشکل ہے، تو انھیں مرزا محمود بنا دے، تا کہ وہ اپنی ایک امت بنا سکیں۔ احمد بشیر (جو آج کل لوگوں کے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

خاکے لکھتا پھرتا ہے) ان کے سکتر ہوں، تا کہ ان سے ناراض ہونے پر وہ ایک اور خاکہ لکھ سکے۔

''یہ بھی نہیں کر سکتا، تو انھیں سعادت حسن منٹو بنا دے۔''

یہ بد دعا، دعاء سے چھوٹی ہے، لیکن کافی جامع ہے۔

حسرت کے متعلق اور بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے، مگر ڈر ہے کہ وہ اور زیادہ ناراض نہ ہو جائیں، لیکن میں بھی ایک ہی حضرت ہوں۔

چلتے چلتے آپ کو ان کے متعلق ایک لطیفہ سنائے دیتا ہوں۔

بہت دنوں کی بات ہے، آپ ''امروز'' کے ایڈیٹر تھے۔

میں اور ''نیا ادارہ'' کے مالک چوہدری نذیر ان سے ملنے گئے۔ چوہدری صاحب نے ان کو کچھ رقم پیشگی کے طور پر دے رکھی تھی کہ وہ ان کو ایک کتاب لکھ کر مرحمت فرمائیں۔ باتوں باتوں میں چوہدری صاحب نے اس کا ذکر کیا۔ حسرت صاحب کو یہ بات اس قدر ناگوار گذری کہ تمام پبلشروں کی ہشت پشت کو بے نقط سنانا شروع کر دیں۔ مجھے تاؤ آ گیا۔ چنانچہ حسرت صاحب کی ان ''بے نقطیوں'' کو مستعار لے کر (ان کی اجازت کے بغیر) ان کے حق میں زیادہ سے زیادہ بیس پچیس سانسوں کے اندر اندر استعمال کر دیں۔ حسرت صاحب کی زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ کسی بدتمیز انسان نے ان سے ایسی بدتمیزی کی تھی۔ ان کے لئے یہ اتنا بڑا صدمہ تھا کہ منہ سے ایک لفظ بھی باہر نکال نہ سکے۔ میں خاموش ہوا، تو ان کو فوری طور پر اس بات کا بڑی شدت سے احساس ہوا کہ میں نے ان کی توہین کی ہے۔ میں اٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ انھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہا ''مولانا ___ ذرا بیٹھیے۔''

میں ذرا کیسے بیٹھتا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ گفتگو کے ہر معاملے میں ان کی لغت میری ڈکشنری پر بھاری ہے۔ چنانچہ میں نے ان سے عرض کیا ''حسرت صاحب، معاف فرمایئے۔ میں اب یہاں ایک منٹ بھی نہیں بیٹھ سکتا — میرا غصہ فرو ہو چکا ہے، آپ کے غصے کا پارہ چڑھ رہا ہے۔ میں گدھا ہوں، اگر آپ کو موقع دوں کہ آپ مجھے گالیاں دے سکیں ___ سلام علیکم۔''

یہ کہہ کر میں چل دیا۔ بعد میں سنا کہ وہ رات بارہ بجے تک اندر ہی اندر کھولتے رہے۔

مجھے اس بات کا کامل احساس ہے کہ حسرت صاحب ایسے بزرگ یت پسند بزرگ کے ساتھ میں نے بہت زیادتی کی، لیکن ہر انسان کو ایسے مواقع ضرور بہم پہنچانے چاہئیں کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے اندر ہی اندر کھولے اور بس کھولتا رہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس عمل سے آدمی سنورتا ہے، نکھرتا ہے ___ جس طرح بھٹی چڑھایا ہوا کپڑا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اب میں آپ کو حسرت صاحب کا ایک اور پہلو دکھاتا ہوں، جو بے حد شریف اور دوست پرور ہے ــــــ ان سے میرے تعلقات بظاہر کشیدہ ہو چکے تھے۔ مجھ پر افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کے سلسلے میں مقدمہ چل رہا تھا۔ فیصلہ ہوا، تو مجسٹریٹ صاحب نے مجھے تین سو روپے جرمانہ اور تین ماہ قید بامشقت کا حکم سنایا۔ اس کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی تو حسرت صاحب نے کمال شفقت سے مجھے ایک رقعہ لکھا جس میں یہ جذبہ مرقوم تھا کہ مجھے آپ کی سزا پر بہت افسوس ہوا ہے۔ اگر میں آپ کی کوئی خدمت کر سکوں، تو حاضر ہوں۔

مجھے تو سزائیں ملتی رہیں گی اور حسرت صاحب افسوس کرتے رہیں گے لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم دونوں اس ملک میں جو پہلے ہندوستان تھا اور اب پاکستان، نا کردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں اور تا دم آخر بھگتتے رہیں گے ــــــ ہمارے اپنے آدمی دم تحریر موجود ہوتے ہیں۔ مگر ان فرشتوں کو کیا کہیے، جن کے لکھے پر ہم پکڑے جاتے ہیں۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# دیوان سنگھ مفتون
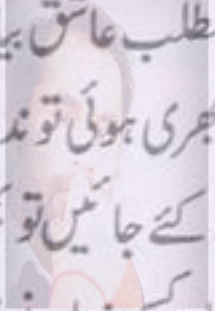
لغت میں ''مفتون'' کا مطلب عاشق بیان کیا گیا ہے۔ اب ذرا اس عاشقِ زار کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے۔ ناٹا قد، بھدا جسم، ابھری ہوئی توند، وزنی سر جس پر چھدرے کھچڑی بال جو کیس کہلانے کے ہرگز مستحق نہیں۔ اکٹھے کیے جائیں تو بمشکل کسی کٹر برہمن کی چوٹی بنے۔ گہرا سانولا رنگ۔ چھوٹی سی گھسی پٹی داڑھی جو شاید کسی زمانے میں داڑھیوں کی لاج رکھتی ہو۔ آنکھیں بڑی نہ چھوٹی۔ مگر بلا کی تیز اور مضطرب۔

بحیثیتِ مجموعی یہ عاشقِ زار، سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ہفتہ وار ''ریاست'' دہلی۔ کسی زمانے میں راجاؤں، مہاراجوں اور نوابوں کا دشمن۔ ان کے راز فاش کرنے والا مداری۔ صحافت میں ایک نئے، خام مگر بہت زوردار اندازِ تحریر کا مالک، دوستوں کا دوست بلکہ خادم اور دشمنوں کا ظالم ترین دشمن۔ مچلن، ٹائر کا اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس اشتہار میں جو ٹائروں کی بنی ہوئی انسان نما شکل ہے، اس کے جوڑوں میں درد نہیں ہوتا مگر دیوان سنگھ مفتون گٹھیا کا مارا ہے۔ اس کا بند بند اور جوڑ جوڑ درد کرتا ہے۔ آپ اس کے میز پر قلم دوات کے ساتھ ہر وقت کروشن سالٹ کی بوتل دیکھ سکتے ہیں۔ یہ قلم دان کا ایسا جزو بن کے رہ گئی ہے کہ بعض اوقات آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ دیوان سنگھ، اپنا قلم روشنائی میں ڈبونے کے بدلے کروشن سالٹ میں ڈبوتا ہے اور اسی سے لکھتا ہے۔

جس طرح دیوان سنگھ مفتون کی کوئی کل سیدھی نہیں، اسی طرح اس کی تحریر کا کوئی جملہ سیدھا نہیں ہوتا۔ ادب کا وہ جانے کب سے خون کر رہا ہے، لیکن صحافت میں اس کا وہی رتبہ ہے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جو "بمبئی سنٹی نل" کے ایڈیٹر آنجہانی بی۔ جی۔ ہارنی مین کا تھا۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں اس سے بالشت بھر اونچا ہے۔

ہارنی مین صرف پولیس سے ٹکر لیتا رہا۔ دیوان سنگھ نے اپنی پہلوانی کے دم خم کئی اکھاڑوں میں دکھائے۔ بڑی بڑی ریاستوں سے پنجہ لڑایا۔ اکالیوں سے متصادم ہوا۔ ماسٹر تارا سنگھ اور سردار کھڑک سنگھ سے تکوار بازی کی۔ مسلم لیگ سے چونچیں لڑائیں۔ پولیس کو تگنی کا ناچ نچایا۔ خواجہ گیسو دراز حضرتِ حسن نظامی سے چہلیں کیں۔ تیس سے کچھ اوپر مقدمے چلوائے اور ہر بار سرخرو رہا۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں کمائے اور اڑا ڈالے۔ مفلسی کے زمانے میں اگر کوئی دوست آیا تو چٹکیوں میں چار سو بیسی کر کے روپیہ حاصل کیا اور اس کی تواضع پر خرچ کر دیا۔ جیبیں لبالب بھری ہونے پر موٹر کی ہیڈ لائیٹس میں ننگی عورتوں کا رقص دیکھا اور اپنے دوستوں کو دکھایا۔ آپ کم پی، اپنے یاروں کو جی بھر کے پلائی۔

دیوان سنگھ مفتون اکائی نہیں۔ دہائی، سینکڑہ، ہزار ہے، دس ہزار ہے بلکہ لاکھ ہے۔ وہ ایک عجائب گھر ہے جس میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں نادر دستاویزات مقفل پڑی ہیں۔ وہ ایک بینک ہے جس کے لیجروں میں کروڑوں کا حساب درج ہے۔ وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ ہے جس میں لاکھوں جرائم پیشہ انسانوں کے خفیہ حالات موجود ہیں۔

اگر وہ امریکہ میں ہوتا تو وہاں کا سب سے بڑا "گینگسٹر" ہوتا۔ کئی اخبار اس کے تابع ہوتے۔ بڑے بڑے یہودی سرمایہ دار اس کے ایک اشارے پر ناچتے۔ وہ رابن ہڈ کا بھی باپ ہوتا۔ مفلسوں کے لئے اس کی تجوریاں ہر وقت کھلی ہوتیں۔

آپ مفتون کو دیکھئے گا تو اسے معمولی سا پڑھا لکھا ادھیڑ عمر کا سکھ سمجھیں گے۔ لیکن وہ بہت پڑھا لکھا ہے۔ ایک دن میں نے انھیں "ریاست" کے خوبصورت پیازی رنگ کے کارڈوں پر دستخط کرتے دیکھا۔ کارڈوں کی دو تین ڈھیریاں لگی تھیں۔ میں نے ایک کارڈ اٹھا کر ٹائپ شدہ عبارت پڑھی۔ بیرونی ملک کی کسی فرم سے فہرست بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی۔ سب کارڈ اسی مضمون کے تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ اتنی فہرستیں منگا کر سردار صاحب کیا کریں گے۔ میں نے پوچھا۔ مفتون صاحب، کیا آپ کوئی اسٹوڈیو کھولنے والے ہیں۔" سر کو سکھوں کے مخصوص انداز میں ایک طرف جھٹکا دے کر مفتون خوب ہنسا___ "نہیں منٹو صاحب۔ میں یہ فہرستیں منگا رہا ہوں کہ مجھے ان کے مطالعے کا شوق ہے۔"

میری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ "آپ مطالعہ فرمائیں گے، یعنی فہرستوں کا___

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

حاصل کیا ہوگا۔"

"معلومات ___ میں اپنی معلومات میں اسی طرح اضافہ کیا کرتا ہوں۔"

"آپ کی جو بات ہے نرالی ہے۔"

"ڈنلپ کمپنی کیا بناتی ہے؟" ایک دم مجھ سے سوال کیا گیا۔

میں نے جھٹ سے جواب دیا۔ "ٹائر۔"

اس پر مجھے بتایا گیا کہ ڈنلپ کمپنی صرف ٹائر ٹیوب ہی نہیں بناتی اور ہزار ہا چیزیں بناتی ہے۔ گاف بال۔ ربڑ کے گدّے گدّیاں۔ ربڑ اسپرنگ، نلکیاں، ہوز پائپ اور خدا معلوم کیا کیا—

جب فہرستیں آتی ہیں تو وہ ہر ایک کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ سردار دیوان سنگھ مفتون بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ تمام فہرستیں پڑھتا ہے۔ جب بیکار ہو جاتی ہیں تو محلے کے بچّوں میں تقسیم کر دیتا ہے کہ وہ تصویریں دیکھیں اور خوش ہوں ___ بچّوں سے اسے بہت پیار ہے۔

بیرونی ممالک کے کارخانوں کی فہرستیں پڑھ پڑھ کر وہ اپنے پرچے کے زوردار اداریئے لکھتا ہے۔ "ناقابلِ فراموش" کا ناقابلِ فراموش کالم لکھتا ہے۔ سوالوں کے "ٹچین" جواب دیتا ہے اور فصاحت و بلاغت کا ہر جگہ خون کرتا ہے۔

بہت بدخط ہے۔ جس طرح وہ آپ ٹیڑھا میڑھا ہے، اسی طرح اس کے قلم سے نکلے ہوئے حروف ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کاتب اس کا لکھا ہوا کیسے پڑھتا ہے۔ مجھے جب بھی اس کا خط آیا، میں نے اندازاً اس کا مطلب نکالا۔ دوسری مرتبہ غور سے "ڈی سائفر" کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ میں نے پہلی نظر میں جو مطلب اخذ کیا تھا بالکل غلط تھا۔ تیسری دفعہ پڑھا تو حروف اپنی صحیح شکل اختیار کرنے لگے۔ چوتھے مرحلے پر بالآخر عبارت مکمل طور پر روشن ہوئی۔

دیوان سنگھ مفتون بہت محتاط آدمی ہے۔ محاورہ ہے، دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ چھاچھ کے علاوہ وہ پانی بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ کاتب کو ہدایت ہے کہ جب اس کی لکھی ہوئی سلپیں پہلے کاغذ پر منتقل ہو جائیں تو فوراً واپس کر دی جائیں۔ کتابت شدہ سطور میں اغلاط لگانے کے بعد وہ میز پر پڑی ہوئی کالی صندوقچی کھولے گا اور اس میں تمام سلپیں ڈال کر اس کو مقفل کر دے گا اور جب پرچہ چھپ کر آ جائے گا تو اپنی تحریروں کو تلف کر دے گا۔ معلوم نہیں یہ احتیاط کیوں برتی جاتی ہے۔

اس کی ساری ڈاک ایک تھیلے میں مقفل ہو کر آتی ہے۔ اسے کھول کر وہ ایک ایک خط،

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ایک ایک اخبار باہر نکالے گا اور ترتیب وار میز پر رکھتا جائے گا۔ لفافہ کھول کر خط نکالنے کے بعد وہ لفافہ ردی کی ٹوکری میں نہیں پھینکتا بلکہ خط کے ساتھ پن لگا کر نتھی کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ رسالوں اور اخباروں کے "ریپر" بھی ضائع نہیں کرتا۔ میں نے اس طرزِ عمل کے متعلق پوچھا تو جواب ملا۔ احتیاط ہر حالت میں اچھی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے، میں کسی اخبار یا رسالے کے خلاف مقدمہ کرنا چاہوں۔ اب قانون یہ ہے کہ اگر لاہور کے کسی اخبار نے میرے خلاف لکھا ہے اور ریپر، جس پر میرا نام اور پتہ موجود ہے، میں پیش نہیں کر سکتا تو مقدمہ صرف لاہور ہی میں چل سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر یہ "ریپر" اس بات کا ثبوت ہوگا کہ میری بے عزتی یہاں دہلی میں ہوئی ہے جہاں مجھے یہ پرچہ ارسال کیا گیا ہے، اس لئے میں یہاں دہلی کی عدالت میں دعویٰ دائر کر سکتا ہوں۔"

دیوان سنگھ مفتون پر جو آخری مقدمہ (غالباً بتیسواں) چلا بہت خطرناک تھا۔ وہ اور ایک بنگالی بلاک میکر جعلی نوٹ بنانے کے الزام میں ماخوذ تھے۔ میں ان دنوں بمبئی میں تھا۔ ایک دن مجھے "مصور" ویکلی کی معرفت ایک ٹائپ کیا ہوا خط ملا جس پر کوئی دستخط نہیں تھے۔ ٹائپ میں "دیوان سنگھ مفتون" لکھا تھا۔ مجھ سے درخواست کی گئی تھی کہ میں گواہ کے طور پر پیش ہوں۔

عرصہ ہوا، میں دہلی گیا تھا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں دفتر پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ بہت بڑا میز تھا جس کے دونوں طرف ریڈیو پڑے تھے۔ قلمدان کے پاس کروشن سالٹ کی دو بوتلیں تھیں۔ ایک کونے میں پردے کے پیچھے صوفا نما چیز تھی جس پر غالباً دیوان صاحب استراحت فرماتے ہوں گے۔ سب الماریاں کھلی تھیں۔

میں نے یہ اور دوسری تفصیلات "مصوّر" میں ایک مضمون کی صورت میں شائع کی تھیں اور کہا تھا کہ اگر اس کمرے میں چھوٹا سا کمپارٹمنٹ بنا دیا جاتا جس میں کموڈ ہوتا تو یہ کمرہ کسی ریل کا بہت بڑا ڈبہ دکھائی دیتا۔

دیوان صاحب نے یہ مضمون سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔ جب پولیس نے چھاپہ مار کر اس کمرے کی الماری سے ایک کتاب میں رکھے ہوئے سو سو کے چھ (غالباً) نوٹ نکالے اور سردار صاحب کی گرفتاری عمل میں آئی تو انھوں نے مجھے صفائی کے گواہوں میں رکھ لیا۔ اس مضمون سے اور میری گواہی سے یہ ثابت کرنا مطلوب تھا کہ ان کے دفتر میں کوئی بھی شخص بے روک ٹوک آ جا سکتا ہے۔

میرا خیال ہے، میں دہلی میں دیوان صاحب سے اپنی اس ملاقات کے بارے میں بھی کچھ لکھ دوں کہ یہ خاصی دلچسپ تھی۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

دیر تک انتظار کرنے کے بعد جب وہ نہ آئے تو میں چلا گیا۔ شام کو آیا تو وہ دفتر میں موجود تھے۔ چپلن ٹائر کا اشتہار کرسی میں بیٹھا تھا۔ سر پر چھوٹی سی سفید پگڑی۔ قلم انگلیوں میں دبائے کچھ لکھ رہے تھے۔ چشمے کے شیشوں کے پیچھے آنکھیں ایک عجیب انداز میں اوپر کر کے مجھے دیکھا اور یوں اچھلے جیسے ربڑ کی ٹھوس گیند اچھلتی ہے۔ مجھ سے "گھٹ گھٹ جپھیاں پائیں"۔ یعنی بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے اور کہا "مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ آئے تھے۔ میں ایک ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔"

مجھے بیٹھنے کو کہا۔ بمبئی کے حالات پوچھے۔ ادھر اُدھر کی باتیں شروع کیں مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے متوجہ تو ضرور ہیں لیکن ان کا دماغ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ باتیں کرتے کرتے انھوں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ملا کر دوسرے سرے والے سے کہا۔ "میں سندر لال بول رہا ہوں نئی دلّی سے۔ لالہ ___ ہیں؟ ___ کہاں گئے ہیں؟ ___ اچھا۔"

آپ کا دفتر پرانی دلّی میں تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سندر لال نہیں بول رہا تھا۔ دیوان سنگھ مفتون بول رہا تھا۔ دوران گفتگو میں آپ نے کئی مرتبہ اسی طرح مختلف نمبر ملائے اور جعلی ناموں سے لالہ ___ کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہیں ___ معلوم نہیں کیا چار سو بیسی تھی۔ لیکن مجھے اتنا یقین تھا کہ اس لالے کی شامت آ گئی ہے یا عنقریب آنے والی ہے۔

ٹیلی فون کے ذریعے سے جب کچھ پتہ چلا یا نہ چلا تو انھوں نے سولھویں مرتبہ مجھے بیئر کی دعوت دینے کے بعد اپنے خاص آدمی (غالباً سردار وریام سنگھ) کو آواز دے کر بلایا۔ اس کے کان میں ہولے سے کچھ کہا اور رخصت کر دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "ہاں منٹو صاحب، تو بیئر منگواؤں آپ کے لئے۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "سردار صاحب زبانی جمع خرچ آپ نے آخر سیکھ ہی لیا دلّی والوں سے ___ منگوایئے۔ منگواتے کیوں نہیں۔"

یہ سن کر دیوان صاحب خوب کھل کر ہنسے اور اہالیان یوپی کو بے نقط سنانے لگے۔ انسانوں کی اس قسم سے ان کو خدا واسطے کا بیر ہے۔ چنانچہ جب کبھی انھیں اپنے دفتر میں کسی ملازم کی ضرورت ہوتی ہے تو اشتہار میں یہ بات خاص طور پر لکھی ہوتی ہے کہ صرف پنجابی درخواست بھیجیں ___ لیکن عجیب بات ہے کہ آپ احسان بھیا کو اپنا بہترین دوست یقین کرتے ہیں۔ ان کے دل میں یوپی کے اس باشندے کا بہت احترام ہے۔

ایک مرتبہ دیوان صاحب کو اپنی موٹر ایک تنگ بازار سے گزارنا تھی۔ میں ان کے ساتھ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تھا۔ موٹر مڑی تو سڑک کے عین بیچ کئی چارپائیاں بچھی دکھائی دیں۔ آپ آگ بگولا ہو گئے۔ لگے دلی والوں اور ان کی ہشت پشت کو بے نقط "سنانے" کم بختو ــــ تمہارے اسلاف۔ تمہارے آباواجداد نے بھی اسی طرح چارپائیوں پر دن رات سو سو کر اپنی سلطنت کا بیڑہ غرق کیا تھا ــــ اب تمہارے پاس کیا رہ گیا ہے جس کا بیڑہ غرق کرو گے۔ خدا تمہارا بیڑہ غرق کرے۔"

ایک لڑکے نے چارپائی اٹھانے کی کوشش کی مگر اس سے نہ اٹھی۔ دیوان صاحب موٹر سے باہر نکلے اور چارپائی کو اٹھا کر پھینک دیا۔ "برخوردار تم سے نہ اٹھتی ــــ اپنی کمر یا دیکھو ــــ تمہارے والد بزرگوار یقیناً تم سے بھی کہیں زیادہ نازک ہوں گے۔ ان سے تو پیخانے جاتے وقت لوٹا بھی نہ اٹھایا جاتا ہو گا۔"

اس پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ انھوں نے کرخنداروں کی زبان میں واہی تباہی بکنا شروع کیا مگر دیوان صاحب نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ موٹر میں آرام سے بیٹھے اور چلانا شروع کر دیا۔

سردار صاحب کو پنجابی بہت پسند ہیں، شاید اس لئے کہ وہ ایک زمانے سے دہلی میں قیام پذیر ہیں، ورنہ یہ حقیقت ان کی نظروں سے اوجھل نہیں کہ صرف پنجابی ہونا اچھے انسان کی دلیل نہیں۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ اپنے دفتر کی ملازمت کے سلسلے میں پنجابی کی قید لگا کر انھوں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا۔ کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جتنا نقصان ان کو پنجابیوں نے پہنچایا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی یوپی کے رہنے والوں نے نہیں پہنچایا۔

اب میں ان کے آخری اور خطرناک مقدمے کی طرف لوٹتا ہوں۔ میں دہلی گیا۔ سردار صاحب ضمانت پر رہا تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کو تنگ کرنے کے لئے ان کے مقدمے کی سماعت دہلی سے بہت دور گوڑگاؤں کی ایک عدالت میں ہو رہی ہے۔ ہم وہاں موٹر میں گئے۔ وکیل نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ چنانچہ میری گواہی دس منٹ کے اندر اندر ختم ہو گئی۔ سردار صاحب کو اپنا تحریری بیان پیش کرنا تھا۔ جب حوالات میں تھے تو آپ نے اس کے نوٹ لے لئے تھے۔ اب یہ چھوٹے ٹائپ میں غالباً چالیس پچاس صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اسے جستہ جستہ دیکھا اور میرا ذہن فرانس کے مشہور مصنف ایمیلی زولا کے شہرۂ آفاق مضمون IACUSR کی طرف منتقل ہو گیا۔

دیوان سنگھ مفتون کا یہ بیان ملزم صفائی کا بیان نہیں تھا۔ بلکہ فردِ جرم تھی حکومت اور اس کے کارندوں کے خلاف۔ آخر میں انھوں نے اپنے مقدمات کی فہرست لگا رکھی تھی۔ ہر صفحے پر مختلف خانے بنا کر یہ واضح کیا گیا تھا کہ کون سا مقدمہ کب چلا، کس کی ایما پر چلا، کس کی عدالت میں پیش ہوا اور اس کا کیا فیصلہ ہوا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

غالباً بتیس مقدمے تھے۔ ان میں سے اکتیس میں وہ باعزت طور پر بری ہوئے تھے۔ صرف ایک مقدمہ تھا ___ بہت بڑا اور بہت مشہور مقدمہ (جو نواب بھوپال نے ان پر چلایا تھا) جس میں ان کو شاید صرف اس عرصے کی سزائے قید دی گئی تھی جو انھوں نے حوالات میں گزارہ تھا۔

سردار صاحب نے فاضل جج کے یہ الفاظ خاص طور پر اپنے بیان میں درج کئے ہوئے تھے۔ میں سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" دہلی کی ہمت کی داد دیتا ہوں جو اپنے محدود ذرائع کے باوجود طویل عرصے تک ایک شہزادے کا تندہی کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔"

نواب بھوپال سے سردار دیوان سنگھ مفتون واقعی بہت دلیری اور ثابت قدمی سے لڑا، لیکن اس جنگ میں اس کا دیوالہ پٹ گیا۔ جو جمع پونجی تھی سب پانی کی طرح بہہ گئی۔ کوئی اور ہوتا تو اس کی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کمر ٹوٹ جاتی، مگر مفتون نے حوصلہ نہ ہارا اور جوں توں اپنا پیارا پرچہ "ریاست" شائع کرتا رہا۔

اس نے بڑے بڑے آدمیوں سے مقابلہ کیا اور فتح حاصل کی۔ لیکن اپنی زندگی میں ایک آدمی سے شکست بھی کھائی۔ کس سے؟ خواجہ حسن نظامی سے۔

سردار صاحب نے ایک دن زچ ہو کر مجھ سے کہا "میں نے بڑی بڑی قطب صاحب کی لاٹھیوں کو جھکا دیا۔ مگر یہ کم بخت حسن نظامی مجھ سے نہیں جھکایا جا سکا۔ منٹو صاحب، میں نے اس شخص کے خلاف اتنا لکھا ہے۔ اتنا لکھا ہے کہ اگر ریاست کے وہ تمام پرچے جن میں یہ مضامین چھپے ہیں اس پر رکھ دیئے جائیں تو ان کے وزن ہی سے اس کا کچومر نکل جائے ___ لیکن الٹا میرا کچومر نکل گیا ___ میں نے اس کے خلاف اس قدر زیادہ اس لئے لکھا کہ میں چاہتا تھا وہ بھنا کر قانون کو پکارے ___ کھلی عدالت میں مقدمہ پیش ہو اور میں وہاں اس کا ڈھول کا پول کھول کے رکھ دوں ___ مگر وہ بڑا کائیاں ہے۔ اس نے مجھے کبھی ایسا موقع نہیں دیا اور نہ دے گا۔"

یہ عجیب بات ہے کہ کسی زمانے میں سردار دیوان سنگھ مفتون اور خواجہ حسن نظامی میں گاڑھی چھنتی تھی۔ معلوم نہیں کس بات پر وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔

میں پھر مقدمے کی طرف آتا ہوں۔ گوڑ گاؤں کی عدالت نے ان کو غالباً دو دفعات کے ماتحت بارہ بارہ برس قید بامشقت کی دو سزائیں دیں۔ سردار صاحب نے گوڑ گاؤں ہی میں مجھ سے کہہ دیا تھا کہ یہاں کا مجسٹریٹ مجھے کڑی سے کڑی سزا دے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن انھوں نے مجھے تسلی دی تھی کہ متفکر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہائی کورٹ میں صاف بری ہو جاؤں گا۔ یہ بھی صحیح ثابت ہوا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہائی کورٹ نے انھیں باعزت طور پر بری کر دیا۔

سردار صاحب نے مجھ سے گوڑگاؤں میں کہا تھا کہ وہ کچھ عرصہ پہلے شملے میں تھے۔ وہاں ایک پارٹی تھی جس میں سر ڈگلس ینگ (اس زمانے کے چیف جسٹس) بھی تھے۔ وہ اس کے خلاف بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ سردار صاحب کو حیرت ہوئی جب سر ڈگلس نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ بہرحال ان دونوں کی ملاقات ہوئی اور چیف جسٹس نے ان کے قلم کی توانائی کی بہت تعریف کی اور کہا۔ ''میں ایسے آدمیوں کا دوست ہوں۔ اگر میں کبھی تمہارے کام آسکا تو یقین ماننا کہ میں تمہاری ضرور مدد کروں گا۔''

جہاں تک میں سمجھتا ہوں سر ڈگلس ینگ کے اس وعدے کو سردار دیوان سنگھ کی بریت میں کافی دخل ہونا چاہیے۔

مقدمہ دیر تک چلتا رہا۔ دیوان صاحب جیل میں تھے۔ اس مقدمے کی روداد بڑی دلچسپ تھی۔ استغاثے کی طرف سے یہ کہانی پیش کی گئی تھی کہ دیوان سنگھ نے کچھ جعلی نوٹ، چلانے کی خاطر اپنے دوست جیون لال مٹو کو ایک لفافے میں لاہور بھیجے تھے جو راستے ہی میں پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ لفافے میں ایک ٹائپ کیا ہوا خط بھی تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ خط دیوان صاحب نے اپنے دفتر کے ٹائپ رائٹر پر تیار کیا تھا، عدالت میں اسے بھی پیش کیا گیا۔

خط میں حرف ''او'' اور ''بی'' کے پیٹ کثرتِ استعمال سے بھر گئے تھے۔

ہائی کورٹ میں جب پیش کردہ ٹائپ رائٹر کی تحریر کا نمونہ لیا گیا تو او اور بی کے پیٹ بالکل صاف تھے۔ اس کے علاوہ جب صفائی کی طرف سے یہ استفسار کیا گیا کہ لفافہ جو کہ بقول استغاثہ دیوان سنگھ مفتون نے جیون لال مٹو کو بھیجا، اس پر دہلی کے ڈاکخانے کی مہر گیارہ جنوری کی تاریخ بتاتی ہے اور لاہور کے ڈاک خانے کی مہر ظاہر کرتی ہے یہ لفافہ پندرہ جنوری کو ''ڈیلیور'' ہوا۔ گیارہ تاریخ کا چلا ہوا لفافہ مکتوب الیہ کو زیادہ سے زیادہ تیرہ تاریخ کی صبح کو مل جانا چاہئے تھا (تاریخیں غلط ہیں۔ اصل تاریخیں مجھے یاد نہیں رہیں)۔ تین دن یہ لفافہ کہاں بھٹکتا رہا۔

یہ سوال اٹھنا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ استغاثہ اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا اور آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ یہ نکتہ ملزم کو، شک کا فائدہ بخشنے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ دہلی میں (ان دنوں میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا) اخباروں میں یہ خبر دیکھی کہ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر 'ریاست'، دہلی، جعلی نوٹ بنانے کے مقدمے میں صاف بری کر دیئے گئے ہیں۔

دوسرے دن صبح آٹھ نو بجے کے قریب حسن بلڈنگ، نکلسن روڈ کے فلیٹ نمبر نو

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

(میں یہاں رہتا تھا) کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میری بیوی نے دروازہ کھولا۔ معلوم ہوا کہ دیوان صاحب ہیں۔ میں نے دوڑ کر ان کا استقبال کیا۔ انھوں نے مجھے بازوؤں میں لے لیا اور ''گھٹ گھٹ جپھیاں پائیں''۔

پیشتر اس کے کہ میں انھیں مبارک باد دیتا، انھوں نے مجھ سے کہا ــــــ ''سبحان اللہ ــــــ لطف آ گیا۔''

میں نے ان سے پوچھا۔ کس بات کا؟''

آپ نے جواب دیا۔ میں نے جیل میں آپ کی کتاب ''منٹو کے افسانے'' پڑھی۔ اس کا انتساب خوب تھا۔ اخبار ''دین دنیا'' کے نام جس میں میرے خلاف سب سے زیادہ گالیاں چھپیں۔ میں آج صبح دہلی آیا ہوں۔ میں نے سوچا سب سے پہلے چل کر منٹو صاحب کو داد دینی چاہیے۔''

اس سے مجھ پر ثابت ہوا کہ شئے لطیف ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

ٹائپ رائٹر میں ''او'' اور ''بی'' کی ''کیز'' کیسے تبدیل ہوئی لفافہ اتنی دیر کے بعد کیوں ''ڈیلیور'' ہوا۔ یہ ایک راز ہے جو سدا راز رہے گا۔ جب میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گئے۔ ''منٹو صاحب، یہ ہاتھ کی صفائی ہے۔''

ہاتھ کی صفائی ہو یا پاؤں کی۔ استغاثے کی طبیعت یقیناً صاف ہو گئی تھی۔

دیوان صاحب کو مجھ سے پیار ہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت کا وہ احترام کرتے ہیں۔ ہم دونوں دہلی میں مقیم تھے۔ ان کو جب بھی فرصت ہوتی ہمیں ڈھونڈ نکالتے اور کسی دور دراز خاموش مقام پر لے جاتے۔ وہاں ہم سب بیٹھ کے پیتے، گپیں لڑاتے پھر وہ ہم دونوں کو گھر چھوڑ جاتے۔ ایسی نشستوں میں کوئی سیاسی یا ادبی بات نہیں ہوتی تھی۔

ایک لطیفہ سنیے جو انھوں نے خود مجھے سنایا۔ انتہائی مفلسی کے دن تھے کہ ان کا ایک دوست آن وارد ہوا۔ پہلے تو وہ بہت سٹپٹائے کہ جیب میں ایک ڈھیلا بھی نہیں تھا، لیکن فوراً ان کو ایک ترکیب سوجھی۔ بارہ لیمن کی بوتلیں منگوائیں۔ دو دوست کو پلائیں، دو خود پیں۔ باقی آٹھ غسلخانے میں خالی کر دیں اور نوکر سے کہا جاؤ یہ بارہ خالی بوتلیں بیچ آؤ۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ گولی والی بوتلیں اچھے دام لے آئیں، چنانچہ دوست کو رات کا کھانا کھلانے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ دوسرے تیسرے روز انھوں نے دکاندار کو بارہ بوتلوں کی قیمت ادا کر دی۔

ایک زمانہ آیا کہ وہ آل انڈیا ریڈیو کے جانی دشمن ہو گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ ہر پروگرام

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سنتے۔ ایک رجسٹر تھا جس میں کئی خانے بنے تھے۔ اس میں درج تھا کہ ریڈیو کے کس افسر کا کس گانے والی سے ٹانکا (یہ لفظ ان کی خاص الخاص ایجاد ہے) ہے۔

اگر کوئی گانے والی کسی وجہ سے پروگرام میں شریک نہ ہو سکتی اور اس کی جگہ کسی اور کو گوایا جاتا تو ان کو فوراً معلوم ہو جاتا، کس افسر کی مہربانی ہوئی ہے۔

بہت دیر تک وہ ذوالفقار بخاری کے خلاف لکھتے رہے۔ آخر جگل کشور (آل احمد سلمان، ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل، ریڈیو پاکستان) پر بل پڑے۔ جگل کشور پہلے کلکتے میں تھے۔ دہلی تبدیل ہو کر آئے تو ان کو وہاں کی ایک بنگالن نے محبت نامے بھیجنے شروع کیے۔ جگل کو حیرت تھی کہ یہ خط میرے پاس نہیں پہنچتے، مفتون کو ملتے ہیں۔ یہ بھی غالباً ہاتھ کی صفائی تھی۔ بہر حال میں نے منت خوشامد کر کے جگل صاحب کی گلو خلاصی کرائی اور ان سے درخواست کی بنگالن کے خطوط دے دیجئے۔ آپ نے مسکرا کر کہا ''میں اتنا بیوقوف نہیں۔ اگر آپ کا دوست یہ خط پڑھنا چاہتا ہے تو میں نقل کرا کے اس کو بھجوا دوں گا۔''

میں نے زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔

دہلی میں ایک شخص جو امرتسر کا یعنی میرا ہم شہر تھا۔ سخت پریشانی کے عالم میں میرے پاس آیا۔ اس کا چھوٹا بھائی ایک لڑکی کو بھگا کر دہلی لے آیا تھا۔ اس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ وہ اس معاملے کو سلجھانے کے لئے میری مدد چاہتا تھا۔ میں اسے دیوان صاحب کے پاس لے گیا۔ انھوں نے سارا ماجرا سن کر حکم دیا اغوا کرنے والے اور مغویہ کو میرے پاس لاؤ۔

دوسرے دن دیوان صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھ سے کہا ''وہ لوگ آگئے تھے ___ میں نے سب ٹھیک کر دیا ہے۔'' سب ٹھیک کر ہی دیا ہو گا ورنہ وہ شخص میرے پاس دوبارہ ضرور آتا۔

دیوان سنگھ کی معلومات کے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ پاکستان میں کسی کے فرشتے کو بھی معلوم نہیں تھا کہ قائد اعظم زیارت میں خطرناک طور پر علیل ہیں، لیکن 'ریاست' میں اس مضمون کا ایک نوٹ، گو بہت ہی دل آزار، دو ہفتے پہلے شائع ہو چکا تھا جس میں دیوان صاحب نے اپنے مخصوص ظالمانہ انداز میں لکھا تھا کہ قائد اعظم محمد علی جناح بستر مرگ پر ہیں، لیکن میری دعاء ہے کہ زندہ رہیں اور پاکستان کو ___

اب ریاستیں نہیں رہیں۔ راجے ہیں، نہ مہاراجے جو اس کے دل پسند کھلونے تھے، مگر سردار دیوان سنگھ مفتون نے یقیناً اور کھلونے چن لئے ہوں گے۔ راجہ نہیں ہو گا کوئی وزیر ہو گا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مہارانی نہیں ہوگی تو کسی بہت بڑے سرمایہ دار کی کھل کھیلنے والی دھرم پتنی ہوگی۔ مفتون کا جنون کیسے فارغ بیٹھ سکتا ہے۔

لوگ اسے بلیک میلر، دغاباز، چور، اچکا کہتے ہیں، مگر وہ اپنے پہلو میں انسانیت دوست دل رکھتا ہے۔ پچھلے فسادات میں اس نے جتنے مسلمانوں کو خونخوار سکھوں اور ہندوؤں سے بچایا، جتنی مسلمان عورتوں اور ان کے بچوں کو پناہ دی۔ ان کے دل سے اس کے لئے جو دعائیں نکلی ہوں گی، میرا خیال ہے کہ وہ اس کی مغفرت کے لئے کافی ہیں۔

پچھلے دنوں میں سخت بیمار تھا۔ میو ہسپتال کے اے وارڈ میں مجھ پر نیم بے ہوشی اور بے ہوشی دس پندرہ روز تک طاری رہی۔ میری بیوی اور بہن نے مجھے بتایا کہ اس عالم میں بار بار میں سردار دیوان سنگھ مفتون کو یاد کرتا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ دلّی میں ہوں۔ 'ریاست' کا دفتر کچھ دور ہے مگر وہاں ٹیلی فون کیا جاسکتا ہے۔ میں ان سے کہتا، جاؤ ٹیلی فون کرو اور دیوان صاحب سے کہو، منٹو بلا رہا ہے آپ کو، بہت ضروری کام ہے۔

وہ سمجھاتے تھے کہ تم لاہور میں ہو، لیکن میں بضد تھا کہ نہیں میں دلّی میں ہوں۔ "تم جاؤ اور دیوان صاحب کو ٹیلی فون کرو۔ وہ فوراً آجائیں گے۔"

گو اُن دنوں عالمِ برزخ میں تھا۔ ہونے نہ ہونے کے درمیان معلّق تھا۔ میرا دماغ دھند میں لپٹا ہوا تھا مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جہاں میرا بستر تھا، اس سے کچھ دور فاصلے پر ایک دروازہ تھا۔ اس کے آگے ایک بہت بڑا ہال جس میں دو یورپی بچے پینگ پانگ کھیلتے رہتے تھے۔ اس کو طئے کر جایئے تو باہر پلازا سنیما (دہلی) کا گیٹ آجاتا۔ مگر افسوس کہ یہ ہر وقت بند رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں بار بار لوگوں سے درخواست کرتا کہ وہ ٹیلی فون کر کے سردار دیوان سنگھ مفتون کو بلائیں۔ مجھے کون سا ضروری کام تھا، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ میرے قریب قریب ماؤف دماغ میں صرف دیوان صاحب کی یاد کیسے باقی رہی۔
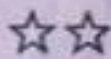
☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
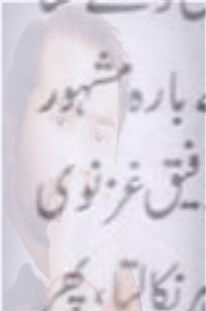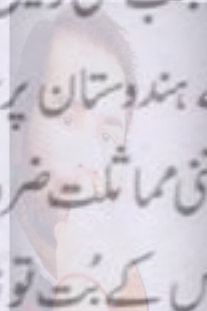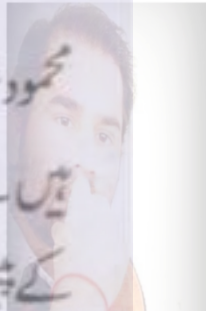
# رفیق غزنوی

معلوم نہیں کیوں، لیکن میں جب بھی رفیق غزنوی کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے معاً محمود غزنوی کا خیال آتا ہے، جس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے تھے، جن میں سے بارہ مشہور ہیں۔ رفیق غزنوی اور محمود غزنوی میں اتنی مماثلت ضرور ہے کہ دونوں بُت شکن ہیں۔ رفیق غزنوی کے پیشِ نظر کوئی ایسا سومنات نہیں تھا جس کے بُت توڑ کر وہ اس کے پیٹ سے زرو جواہر نکالتا، پھر بھی اس نے اپنی زندگی میں کئی طوائفوں کو (جن کی تعداد بارہ تک پہنچ سکتی ہے) استعمال کیا۔

رفیق غزنوی کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آبا و اجداد غزنی کے رہنے والے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے غزنی دیکھا ہے یا نہیں۔

صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ پشاور میں رہتا تھا۔ اس کو پشتو بولنا آتی ہے۔ افغانی فارسی بھی جانتا ہے۔ ویسے عام طور پر پنجابی میں گفتگو کرتا ہے، انگریزی اچھی خاصی لکھ لیتا ہے۔ اردو میں اگر مضمون نگاری کرتا تو اس کا بڑا نام ہوتا۔

اس کو اردو ادب سے بڑا شغف ہے۔ اس کے پاس اُردو لٹریچر کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ گلشن محل (بمبئی) میں اس کے کمرے میں بڑی ترتیب سے رکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ محض ایک میراثی ہے، جسے ادب سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب اس سے باتیں ہوئیں تو اس نے ایسے ایسے مصنفوں کا نام لیا جن سے میں واقف نہیں تھا۔ اس نے میری معلومات میں یہ اضافہ کیا کہ ایک ابوالفضل صدیقی ہیں جو چرندوں اور پرندوں کی کہانیاں لکھنے کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

افسانے پڑھے اور پسند کیے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مضمون جو مجھے رفیق غزنوی پر لکھنا ہے، کہاں سے شروع کروں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ شروع ہو چکا ہے اور اس کا خاتمہ بالخیر بھی ہو جائے گا۔ اس لئے میں اپنے حافظے کو ٹٹول کر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی۔

عجیب بات ہے کہ اس سے جسمانی طور پر متعارف ہونے سے پہلے ہی میں اسے جانتا تھا۔ کیسے جانتا تھا، کب جانتا تھا، یہ مجھے یاد نہیں۔ آج سے غالباً چوبیس پچیس برس پیچھے کی بات ہے، میں امرتسر میں بجلی والے چوک سے گذر رہا تھا کہ ایک پان والے نے مجھے آواز دی۔ میں رُک کر اس کی دکان کے پاس گیا تو اس نے مجھ سے کہا "بابو صاحب۔ اتنی دیر ہو گئی ہے۔ اب تو حساب چکا دیجئے؟"

میں بہت متحیر ہوا، اس لئے کہ اس پان والے سے میرا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا "کیسا حساب ___ میں تو آج پہلی مرتبہ تمہاری دکان کے پاس ٹھہرا ہوں۔" یہ سُن کر پان والے کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "نہ دینے والے اسی طرح کہا کرتے ہیں۔"

جب میں نے اس سے تفصیل چاہی تو پتہ چلا کہ وہ مجھے رفیق غزنوی سمجھتا تھا جو اس سے اُدھار لیتا رہا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں سعادت حسن ہوں تو اس نے مجھ سے کہا کہ میری اور رفیق کی شکل بہت ملتی جلتی ہے۔

رفیق غزنوی کا نام تو میں پہلے سُن چکا تھا۔ اس سے ملنے کی مجھے کوئی خواہش نہیں تھی، پر جب میں نے سُنا کہ اس کی شکل میری شکل کے مشابہ ہے تو مجھے اس کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب میں نے آوارہ گردی شروع کر رکھی تھی طبیعت ہر وقت اچاٹ اچاٹ سی رہتی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھد بد ہر وقت دل و دماغ میں ہوتی رہتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ جو چیز بھی سامنے آئے اُسے چکھوں، خواہ وہ انتہا درجے کی کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔ تکیوں میں جاتا تھا۔ قبرستانوں میں گھومتا تھا۔ جلیاں والا باغ میں گھنٹوں کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر کسی ایسے انقلاب کے خواب دیکھتا تھا جو چشم زدن میں انگریزوں کے حکومت کا تختہ اُلٹ دے۔ اسکولوں کو جاتی ہوئی لڑکیوں کے جھرمٹ دیکھتا تھا اور ان میں کوئی اچھی سی لڑکی منتخب کر کے اس سے عشق لڑانے کے منصوبے تیار کرتا تھا۔ بم بنانے کے نسخے حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ بڑے بڑے گویوں کے گانے سُنتا تھا اور کلاسیکل موسیقی کو سمجھنے کے لئے پیچ و تاب کھاتا تھا۔

میں نے اس زمانے میں شعر کہنے کی بھی کوشش کی۔ فرضی معشوقوں کے نام عطر لگے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کاغذوں پر بڑے بڑے طویل محبت نامے بھی لکھے، مگر بکواس سمجھ کر پھاڑ دیئے۔ دوستوں کے ساتھ مل کر چرس کے سگریٹ پیئے۔ کوکین کھائی۔ شراب پی، مگر جی کی بے کلی دُور نہ ہوئی۔

شدید آوارگی کے اسی دور میں مجھے رفیق غزنوی سے ملنے کی خواہش ہوئی۔ چنانچہ میں تکیوں میں، شراب خانوں میں اور رنڈیوں کے کوٹھوں پر جا جا کر پوچھا کہ رفیق غزنوی کہاں ہے مگر کسی نے اس کا ٹھور ٹھکانا نہ بتایا۔ کئی بار سُننے میں آیا کہ وہ امرتسر میں آیا ہوا ہے۔ میں نے ہر بار بڑی مستعدی سے اس کو ڈھونڈا مگر اس کا نشان نہ ملا — ایک دن پتہ چلا کہ وہ اپنے ایک دوست کے یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کا یہ دوست ایک درزی تھا۔ میں اس کا نام بھول گیا ہوں) اس کی بیٹھک ہمارے گھر کے پاس کرموں ڈیوڑھی کی ایک گلی میں تھی، جہاں وہ کام کرتا تھا۔ میں نے رفیق کو یہاں تلاش کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ شہر کے باہر ایک غیر آباد سے علاقے میں مقیم ہے جہاں اس درزی کا گھر تھا۔ یہ پتہ مجھے بالے نے دیا۔ وہ بھی وہیں جا رہا تھا موقع بڑا اچھا تھا چنانچہ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں بالے کا تعارف کرا دوں۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے کہ لوگ اُسے بالا کنجر کہتے تھے۔ معلوم نہیں انسانوں کے ساتھ ان کے آبا و اجداد کی ذات کیوں منسوب کر دی جاتی ہے۔ بالا جیسا کہ میں جانتا ہوں نہایت خوش ذوق نوجوان تھا۔ تعلیم یافتہ، خوبصورت، ہنسوڑ، بذلہ سنج، شاعر مزاج، اس کی طبیعت میں وہ جوہر تھا جو کسی بھی انسان کو فن کی بلندیوں پر پہنچا سکتا ہے۔ اس کو معلوم تھا کہ لوگ اسے کس نام سے یاد کرتے ہیں، لیکن اس کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ رہتا سہتا وہیں تھا جہاں عورتیں اپنا جسم بیچتی ہیں۔ اب وہ کراچی میں رہتا ہے اور اپنا فن بیچتا ہے۔ پچھلے دنوں مجھے ایک اخبار کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مشہور مصور ہے جس کی تصویروں کی نمائش اہلِ نظر حضرات میں بہت مقبول ہوئی۔

بالا گاتا بھی تھا، مگر اس کی آواز بھدّی تھی۔ کیپٹن وحید، انور پینٹر، عاشق علی فوٹو گرافر، شاعر فقیر حسین سلیس، گیانی ارور سنگھ دندان ساز۔ ان سب کی ایک بوہیمیا نہ قسم کی ٹولی تھی۔ ان کا بیٹھنا اٹھنا زیادہ تر انور پینٹر کی، یا گیانی ارور سنگھ کی دکان میں ہوتا تھا۔ یا ان کی نشست حججے (عزیز) کے ہوٹل شیراز اور اس درزی کی بیٹھک میں ہوتی تھی جس کا نام میں بھول گیا ہوں۔

بھنگ گھوٹی یا گوشت میں بھونی جاتی تھی اور طبلے کی تھاپ پر راگ راگنیاں، ٹھمریاں، دادرے الاپے جاتے تھے۔ عاشق علی فوٹو گرافر کی آواز سُریلی لیکن بہت پتلی تھی۔ وہ اکثر رفیق کی بحروں میں گاتا تھا۔ کیپٹن وحید طبلہ بجاتا تھا۔ انور پینٹر صرف داد دیتا تھا۔ گیانی ارور سنگھ دانت اکھیڑنا بھول کر خان صاحب عاشق علی خان (تان کپتان خان فتح علی خان کے فرزند) کی گمبھیر اور

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

بالشت بھر چوڑی آواز میں اکثر پہاڑی سُنایا کرتا تھا اور بالا صرف لطیفے۔ کبھی کبھی اپنی تازہ غزل بھی۔ مجھے اس کی ایک غزل کا صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے ۔

اشک مژگاں پہ ہے اٹک سا گیا
نوک سی چبھ گئی ہے چھالے میں

ہالے میں، شوالے میں، اجالے میں وغیرہ وغیرہ۔ اچھی غزل تھی۔

گیانی اروڑ سنگھ کا اچھا بھلا کام چل رہا تھا۔ مگر جسے آرٹ کی چاٹ پڑ جائے، اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ راگ کی دنیا میں وہ ایسا کھویا کہ دندان سازی کی دکان معہ جملہ ساز و سامان کے غائب ہوگئی۔ انور پینٹر کا بھی دیوالہ پٹ گیا۔ عاشق علی فوٹو گرافر کا بھی یہی حال ہوا ہے۔ چنانچہ وہ ایک دن امرتسر سے ایسا غائب ہوا کہ ابھی تک لاپتا ہے۔ جیجے (عزیز) کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔ اب وہ لاہور میں مطب کرتا ہے۔ شاعر فقیر حسین سلیس صابن بنا رہا ہے۔

گیانی اروڑ سنگھ کامیاب ایکٹر بنا، مگر اب سُنا ہے کہ اس نے دنیا تیاگ دی ہے اور خدا سے لو لگائے بیٹھا ہے۔ کیپٹن وحید نے پانچ بچوں والی ایک عورت سے شادی کر لی۔ آج کل ٹھیکیداری کرتا ہے۔

رفیق غزنوی جس رنگ میں پہلے تھا، اسی میں ہے۔ کراچی میں ریس کے گھوڑے دوڑاتا ہے اور فلموں میں موسیقی بھرتا ہے۔

بڑی مصیبت ہے، میں نے جب بھی ایسے موضوعات پر قلم اُٹھایا جو پُرانی یادوں کے متعلق ہوں تو ہمیشہ بہک گیا۔ اب دیکھئے میں بات رفیق غزنوی سے ملنے کی کوشش کی کر رہا تھا اور چلا گیا فروعات میں۔ لیکن سچ پوچھئے تو مجھے فروعات ہی سے محبت ہے۔ میں زندگی کو بھی ایک فروعی چیز سمجھتا ہوں۔

ہاں جناب، تو میں بالے کے ساتھ ہولیا۔ اپریل کی خنک رات تھی۔ ٹانگہ دیر تک چلتا رہا۔ آخر بالے نے ایک نیم تاریک مقام پر اُسے ٹھہرایا۔ آج سے تئیس چوبیس برس پہلے کی بات ہے، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس یک منزلہ مکان میں ہم داخل ہوئے وہ پیڑوں اور جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی۔ میدھا موٹا اور وہ درزی جس کا نام میں بھول گیا ہوں، اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے فلش کھیلنے اور شراب پینے میں مشغول تھے۔

مجھے میدھے موٹے سے سخت نفرت تھی۔ اوّل تو یہ کہ وہ بہت موٹا اور بہت طاقتور تھا، دوسرے یہ کہ وہ زبردستی مجھے فلش کھیلنے کو کہتا اور پتے بازی کر کے مجھ پر آٹھ دس روپے کا قرض چڑھا دیتا اور دوسرے تیسرے دن مجھے کسی بازار یا گلی میں پکڑتا اور اپنا خوفناک چاقو دکھا کر اسے وصول کر لیتا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

بالے نے درزی سے رفیق کے بارے میں پُوچھا تو جواب ملا کہ وہ دو روز سے غائب ہے۔ کہاں ہے یا ہو سکتا ہے اس کے متعلق اُسے علم نہیں تھا۔ درزی نے کہا۔ "بالے، تمہیں معلوم ہی ہے۔ جب وہ کسی کوٹھے پر چڑھتا ہے، پندرہ دن کے بعد ہی نیچے اُترتا ہے۔"

بالا مسکرا دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کو اچھی طرح معلوم ہے۔ میری یہ کوشش بھی بیکار گئی۔ غالباً ایک برس کے بعد میں نے اس کا فوٹو عاشق علی کے ڈارک روم کی ایک ڈش میں پانی پر تیرتا ہوا دیکھا۔ عاشق علی بہت اچھا فوٹو گرافر تھا۔ غالباً وہ پہلا شخص تھا جس نے فوٹو گرافی کے قدیم اصولوں کی خلاف ورزی کی۔

عام طور پر فوٹو گرافر، یہ کرتے تھے کہ اپنے گاہک کو خوش کرنے کے لئے اس کے چہرے کی وہ تمام لکیریں دُور کر دیتے تھے جو انسان میں اس کے کردار اور تشخص کی مظہر ہوتی ہیں۔ وہ اس کے چہرے کو چھلا ہوا آلو سا بنا دیتے تھے۔ جس پر کوئی داغ دھبہ ہو، نہ کوئی سلوٹ لکیر۔ عاشق علی کہتا تھا، فوٹو گرافر کا کام یہ ہے کہ انسان کو اس طرح پیش کرے جس طرح کہ وہ اسے دیکھتا ہے۔ کیمرے کا کام صرف عکس لینا ہے اور بس۔

عاشق علی روشنی اور سایوں کے امتزاج کا خاص خیال رکھتا ہے۔ رفیق کی جو تصویر میں نے دیکھی، میرا خیال ہے وہ عاشق علی کا شاہکار تھی۔ رفیق نے عربوں کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کا لمبوترہ چہرہ بہت پُرکشش تھا۔ سائے زیادہ تھے اور روشنیاں کم۔ خدوخال تیکھے اور نوکیلے نہیں تھے مگر جاذب نظر تھے۔ بڑی وجیہہ شکل وصورت تھی۔ ناک لمبی جو پھننگ کے قریب چوڑی ہو گئی تھی۔ ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست۔ ان کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی تکونیں۔ بال پیچھے کی طرف کنگھی کئے ہوئے۔ لمبی قلمیں ___ مجھے اُس میں اور اپنے میں کوئی مماثلت نظر نہ آئی۔ معلوم نہیں اُس پان والے کو مجھ پر اُس کا دھوکا کیسے ہو گیا۔

عاشق علی نے مجھے بتایا کہ رفیق پرسوں آیا تھا اور اُسی روز شام کو واپس لاہور چلا گیا۔ میں لاہور پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ راولپنڈی میں ہے — اب راولپنڈی کون جاتا۔ میں واپس امرتسر چلا آیا۔ آٹھویں روز پتہ چلا کہ وہ امرتسر ہی میں ایک طوائف کے مکان پر نظر بند تھا — میں جھنجھلا گیا۔

کئی برس گزر گئے، مگر رفیق غزنوی سے ملاقات کی کوئی سبیل پیدا نہ ہوئی۔ میں یوں بھی تھک ہار کر اس کو تلاش کرنے کی سرگرمی ترک کر چکا تھا۔ اس دوران میں البتہ یہ معلوم ہوتا رہا کہ وہ کٹڑہ گھنیاں کی قریب قریب تمام مشہور طوائفوں کو سرفراز کر چکا ہے۔

رفیق کی اپنے مخصوص طرز میں گائی ہوئی غزلیں ہر کوٹھے پر گائی جاتی تھیں۔ یہ کیا ہے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جی؟—رفیق کی بحر ہے۔ یہ کیا انداز ہے سرکار؟— حضور رفیق غزنوی کا۔ یہ چکنا چُور گھڑی رفیق صاحب کی ہے۔ کل انھوں نے تان جولی تو زور سے ہاتھ لہرایا۔ کلائی دیوار کے ساتھ ٹکرائی اور گھڑی کے ہزار ٹکڑے۔ پرسوں رفیق غزنوی ایک رنڈی کے کوٹھے پر گانا سُنانے لگا۔ ساز سُر میں کیے گئے۔ رفیق نے طبلے والے سے کہا تم بھی کرو سُر میں اپنے طبلے۔ طبلچی نے کہا، میں کر چکا ہوں۔ رفیق نے کہا دوبارہ کرو—دائیں پر ابھی ابھی ایک مکھی بیٹھ گئی تھی۔ لعنت ہے اس مکھی پر اور لعنت ہے رفیق غزنوی پر۔

اُن دنوں یہ غزل عام طور پر رفیق کی بحر میں گائی جاتی تھی۔ دیکھئے حافظے پر زور دے کر اس کا کوئی شعر یاد کرتا ہوں ___ نہیں یاد آرہا۔ کچھ ایسا ہی تھا:

سو رہے ہیں پاسباں یار ہے خوابِ ناز میں اور خدا معلوم کیا۔

نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں شاید اقبالؔ کی کوئی غزل تھی معاف کیجئے گا میرا حافظہ بہت کمزور ہے۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ اے۔ آر۔ کاردار لاہور میں، پنجاب کا پہلا متکلم فلم "ہیر رانجھا" بنا رہا ہے اور رفیق اس کا ہیرو ہے، یعنی رانجھا۔ ہیروئن امرتسر کی ایک طوائف انوری ہے (یہ آجکل ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل جناب احمد سلمان سابق جُگل کشور مہرہ کی بیگم ہیں) قیدو کا پارٹ ایم اسمٰعیل کو دیا گیا ہے۔

فلم بن گیا مگر میں لاہور نہ جا سکا۔ معلوم نہیں کیوں ___ اس دوران میں مختلف افواہیں سُننے میں آتی رہیں۔ کاردار کا رفیق سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ رفیق، انوری سے رومان لڑا رہا ہے۔ انوری کی ماں سخت برہم ہے۔ ضرور ایک روز چاقو چھُری چلیں گے ___ لیکن ایک دن یہ خبر آئی کہ رفیق، انوری کو بڑے ڈرامائی انداز میں لے اُڑا ہے۔

یہ خبر سچی تھی۔ واقعی وہ انوری کو لے اُڑا تھا۔ انوری کی ماں بہت چیخی چلائی تھی۔ رفیق کے پیچھے غنڈے بھی لگائے گئے تھے مگر، اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور شربت وصال وہسکی کے ساتھ ملا ملا کر پیتا رہا۔ آخر اس نے انوری کو، اس کی ماں کے پاس امرتسر روانہ کر دیا۔ ان فاتحانہ مگر نہایت تکلیف دہ الفاظ کے ساتھ۔ "لو سنبھال لو اپنی سُنڈ کی پڑی کو۔"

وہ بے چاری اب اپنی "سُنڈ کی پڑی" کو کیا سنبھال کے رکھتی جس دن کے لئے اس نے اُسے سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔ اس پر تو رفیق غاصبانہ قبضہ کر چکا تھا۔ کر چکا تھا کیا، کر کے فارغ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ یہ "پڑی" دوسرے لفظوں میں اپنی 'گوی' غیر مشروط طور پر رفیق غزنوی کے حوالے کر دے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

رفیق غزنوی کا حسن و عشق کے سومنات پر یہ پہلا معرکہ آرا حملہ ہے۔ انوری کے بطن اور رفیق کے نطفے سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام زرینہ رکھا گیا۔ (جو نسرین کے فلمی نام سے اے۔ آر۔ کاردار ہی کی فلم "شاہ جہاں" میں روحی کے رُوپ میں جلوہ گر ہوئی۔ حال ہی میں ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل جناب احمد سلمان سابق جگل کشور مہرہ کی دختر نیک اختر کی حیثیت سے اس کا نکاح کراچی میں ایک صاحب ثروت سے ہوا ہے۔)

کئی اور برس گذر گئے ___ اس دوران میں کن کن مراحل سے مجھے گذرنا پڑا، اس کا ذکر مناسب معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ اس مضمون کا موضوع صرف رفیق غزنوی کی ذات ہے۔

میں بمبئی پہنچ گیا۔ وہاں بہت دیر تک اخباروں میں جھک مارتا رہا۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ رفیق نے انوری کو چھوڑ دیا ہے اور اب کلکتے میں ہے جہاں وہ فلموں کے لئے موسیقی مرتب کرتا ہے۔

میں لکھنا شروع کر چکا تھا۔ ادبی حلقوں سے میرا تعارف بھی ہو گیا تھا۔ اس لئے اردو ادب سے دلچسپی لینے والے مجھے جاننے لگے تھے۔ دیر تک اخباروں میں جھک مارنے کے بعد میں فلمی دُنیا میں داخل ہوا۔ یہاں بھی ایک دو برس جھک مارنا پڑی۔ اپنے لئے کوئی مقام پیدا کرتے کرتے میں ہندوستان سینے ٹون پہنچ گیا جس کے مالک سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی تھے۔ آپ نے کئی فلم کمپنیاں قائم کیں، ان کا دیوالہ نکالا۔ اب انھوں نے ہندوستان سنے ٹون کے نام سے ایک فلم کمپنی قائم کی تھی جس کے قیام کے ساتھ ہی دیوالے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

میں نے اس کمپنی کے لئے "مڈ" یعنی "کیچڑ" کے عنوان سے ایک کہانی لکھی جو بہت پسند کی گئی۔ یہ اشتراکی خیالوں پر استوار کی گئی تھی۔ مجھے حیرت ہے، اس زمانے میں سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی نے اسے کیوں پسند کیا۔

میں مکالمے لکھنے میں مصروف تھا کہ مجھ سے کسی نے کہا کہ رفیق غزنوی اسٹوڈیو میں موجود ہے اور تم سے ملنا چاہتا ہے۔ پہلا سوال جو میرے دماغ میں پیدا ہوا یہ تھا کہ وہ مجھے کیسے جانتا ہے۔ میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک لم تڑنگ آدمی بہت عمدہ سلے ہوئے سوٹ میں نمودار ہوا ___ یہ رفیق غزنوی تھا۔

اس نے کمرے میں اندر داخل ہوتے ہی مجھے موٹی گالی دی اور کہا۔ "تم یہاں چھپے بیٹھے ہو۔"

اسی لمحے ___ اسی ثانیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں رفیق غزنوی کو ازل سے جانتا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہوں۔ چنانچہ ہم دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں بڑے بے تکلف انداز میں کرتے رہے۔

اس کے لب و لہجے، اس کی حرکات و سکنات میں ایک عجب سطحی قسم کا لا اُبالیا پن تھا__ جو تصویر میں نے عاشق علی فوٹو گرافر کے ڈارک رُوم میں ڈش کے اندر پانی میں ڈبکیاں لگاتی دیکھی تھی۔ اس میں اور گوشت پوست کے رفیق غزنوی میں یہ فرق تھا کہ وہ گنگ تھی اور یہ متکلم۔ لیکن اُس کے تکلم کا انداز اس پر سجتا نہیں تھا۔ اگر اس کے ہونٹ نہ کھلتے، اگر کھلتے تو بے ہنگم طریق پر نہ کھلتے جو اس کے بھدے دانتوں اور مسوڑوں کی بے وجہ نمائش کرتے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اگر اس کی گفتگو میں بازاریت کا رنگ نہ ہوتا تو میں شاید اس کے بھدے دانتوں اور مسوڑوں کو بھی برداشت کر لیتا مگر معاملہ اس کے برعکس تھا۔

اس کے ہاتھ نچانے کا انداز بھی مجھے پسند نہ آیا۔ مجھے یہ محسوس ہوتا کہ وہ جس سے مخاطب ہے، بڑے ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے، یہ احساس ظاہر ہے کہ میرے لئے خوشگوار نہیں تھا، بہر حال چونکہ پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی اتنے اشتیاق کے بعد میں نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا گہرا اثر نہ لیا۔

جب رفیق جانے لگا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ بمبئی سنٹرل اسٹیشن کے سامنے ایک ہوٹل میں (جس کا نام میں بھول گیا ہوں) ٹھہرا ہے۔ وہ بڑی بے سروسامانی کی حالت میں کلکتے سے آیا تھا۔ اس کو اُمید تھی کہ بمبئی میں اُسے کام مل جائے گا۔

چونکہ اس نے مجھے مدعو کیا تھا، اس لئے میں شام کو اس کے ہوٹل میں پہنچا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد اس کا کمرہ مل گیا__ اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے مجھے ایک کونے میں قالین کے ایک ٹکڑے پر وچتر وینا نظر آئی جو ریشمی کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے دوسرے کونے میں رفیق کے شو اور جوتے تھے۔ جو بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ پھر مجھے ایک عورت نظر آئی جس کے طوائف ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا، یہ زہرہ تھی (جواب زہرہ مرزا ہے۔ مرزا صاحب کسی زمانے میں فلم ڈائریکٹر تھے۔ اب پندرہ سولہ برس سے وہ فلم کمپنی کھولنے کی کوشش میں مصروف ہیں)

زہرہ کے ساتھ دو بچے تھے۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ لڑکا چھوٹا تھا۔ لڑکی بڑی جس کا نام پروین تھا (یہ فلمی دُنیا میں شاہینہ کے نام سے داخل ہوئی۔ پہلا فلم ''بیلی'' تھا جس کی کہانی میری تھی۔ یہ بہت بُری طرح ناکام ہوئی) اس کی عمر اس وقت پانچ برس کی ہوگی۔

دیکھئے، میں لکھتے لکھتے واقعات کی رَو میں ایسا بہا کہ آپ کو یہ بات بتانا بھول ہی گیا کہ جب میں فلمی دنیا میں داخل ہوا۔ یعنی جب میں نے امپیریل فلم کمپنی میں بطور ''منشی'' ملازمت

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کی تو اس زمانے میں دو نوجوان لڑکیاں لائی گئیں۔ ایک دبلی تھی، دوسری موٹی۔ (یہ زہرہ کی چھوٹی بہنیں تھیں، شیداں اور ہیراں)

شیداں بلا کی چنچل تھی۔ بوٹی بوٹی پڑی ناچتی تھی۔ ناک نقشہ اچھا۔ لیکن بہت تیز بولتی تھی۔ اتنی تیز کہ ایک لفظ دوسرے لفظ پر سوار ہو جاتا۔ مجھے اس سے گفتگو کرتے وقت بہت اُلجھن ہوتی تھی۔ اسی سے مجھے معلوم ہوا کہ پھیکو بھائی جان (رفیق غزنوی) انوری کو چھوڑ چکا ہے اور اس نے اس کی بڑی بہن زہرہ سے بیاہ کرلیا ہے۔)

ہیراں موٹی اور پھسپھسی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فلموں میں نہ چل سکی۔ شیداں کو امپریل کی رنگین فلم ''ہند ماتا'' میں کام مل گیا جو کامیاب رہا۔

میں آپ کو ایک دلچسپ لطیفہ سُناتا ہوں۔ ایک روز میں کسی کام سے امپیریل فلم کمپنی کے مالک سیٹھ آرڈیشر ایرانی سے ملنے گیا۔ دفتر کا 'سوئنگ ڈور' کھولتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ سیٹھ بڑے اطمینان سے شیداں کا ایک پستان یوں دبا رہے ہیں۔ جیسے کسی موٹر کار کا ہارن ___ میں اُلٹے پاؤں واپس چلا آیا۔

اب میں پھر زہرہ کی لڑکی پروین کی طرف آتا ہوں۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں جس طرح زرینہ المعروف نسرین کی ہیں۔ رفیق کی آنکھیں نیلی تھیں۔ انوری اور زہرہ کی بھی تھیں اور یہ دونوں بالترتیب زرینہ اور شاہینہ کی مائیں ہیں۔ اصل میں آنکھوں کا یہ نیلا پن ان لڑکیوں کو ان کی دادی سے ملا ہے۔ اس کی آنکھیں یہ بڑی بڑی اور نیلگوں تھیں۔

قد کاٹھ کی بہت تگڑی تھی مگر چُنیا بیگم کی رسیا۔

خیر ___ رفیق مجھ سے ملا۔ میں کمرے کا جائزہ لیتے ہی بھانپ گیا تھا کہ وہ انتہائی کس مپرسی کے عالم میں یہاں آیا ہے اور تلاش روزگار میں سرگرداں۔

میں یہاں آپ کو رفیق کی عجیب و غریب شخصیت کا ایک عجیب و غریب پہلو دکھانا چاہتا ہوں۔ جب اس پر بمبئی کی زبان میں کڑکی یعنی مفلسی کا زمانہ آتا ہے تو وہ بہترین لباس پہنتا ہے۔ جب یہ دور گذر جاتا ہے تو وہ معمولی کپڑے پہننے لگتا ہے ___ یوں وہ ہر لباس میں بانکا سجیلا نظر آتا ہے۔ اس کو ہر لباس پہننے کا سلیقہ ہے۔

ہوٹل کے کمرے میں ہم تھوڑی دیر رہے۔ اس کے بعد نیچے باغیچے میں چلے گئے۔ میں وسکی کی بوتل اپنے ساتھ لایا تھا، چنانچہ ہم دیر تک پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں ایک دلچسپ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہم پی رہے تھے کہ ایک بھرے بھرے جسم اور اچھے خاصے ڈیل ڈول کی عورت آئی۔ اس نے رفیق کی طرف اپنی چندھی آنکھوں سے دیکھا اور مسکرا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ رفیق نے اس کو گلاس پیش کیا جو اس نے لے لیا۔ اس کے بعد رفیق نے میرا اس سے تعارف کرایا۔

وہ کوئی فلم زدہ عورت تھی۔ میں عورت ہی کہوں گا اس لئے کہ وہ لڑکپن کے حدود سے بہت آگے نکل چکی تھی۔ رفیق نے مجھے بتایا کہ وہ سکھ مذہب سے تعلق رکھتی ہے اور کافی مالدار ہے۔ بمبئی صرف اس لئے آئی ہے کہ اشوک کمار کے صرف ایک بار درشن ہو جائیں۔ ''میں نے اس سے کہا ہے، سالی چھوڑ اشوک کمار کو۔ اپنا ڈیل ڈول دیکھ تمھاری چھاتی پر اگر اشوک کمار کو بیٹھا دوں تو ایسا معلوم ہو گا طوطا توپ چلا رہا ہے۔''

ضلع جگت، پھبتی رفیق کا محبوب ترین مشغلہ ہے، بلکہ یوں کہئے کہ یہ اس کی طبیعت بن چکا ہے۔ وہ سکھنی (جس کا نام میں بھول گیا ہوں) یہ پھبتی سن کر خاموش رہی۔ لیکن رفیق نے بڑے زور کا قہقہہ بلند کیا اور دیر تک ہنستا رہا۔

یہ بھی اس کی عادت ہے کہ پھبتی کہے گا، چست ہو یا پھسپھسی کوئی داد دے نہ دے، لیکن وہ خود اپنے کو خوب داد دے گا۔ اتنا ہنسے گا، اتنا شور مچائے گا کہ مجبوراً آپ کو بھی اس غل غپاڑے میں شریک ہونا پڑے گا۔

سکھنی معمولی شکل وصورت کی تھی۔ موٹے موٹے نقش۔ بہت ہی تنگ ماتھا۔ مردنما۔ رفیق اس سے باتیں کر رہا تھا، مگر مجھے احساس تھا کہ اسے اس عورت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کی باتیں محض برائے باتیں تھیں۔

وہ اس پر یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس سے جسمانی رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے مگر اس کے دل و دماغ پر اشوک کمار سوار تھا۔ رفیق نے جب زور دیا تو وہ ٹھیٹ دیہاتی سکھنیوں کے انداز میں جھنجھلا کے بولی ''چل بے رفیق، میں کتوں......''

رفیق نے فوراً اسے ٹوکا۔ ''بس بس بس... تم نہیں جانتی ہو۔ میں بہت بڑا کتا ہوں۔ بڑی اعلیٰ نسل کا۔''

نسل وسل کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا، لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ رفیق غزنوی واقعی بہت بڑا کتا ہے، جس کی دُم صرف طوائفیں ہی ہلا سکتی ہیں، کوئی شریف خاتون لاکھ پچکارے، چمکارے اس کی دم میں خفیف سی بھی جنبش پیدا نہیں ہو گی۔

یہ میری اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

میں یہاں اس کے کردار کا ایک اور پہلو واضح کر دوں کہ وہ اوّل درجے کا کمینہ، سفلہ اور خود غرض ہے۔ اپنی ذات اس کے لئے سب سے مقدم ہے۔ وہ کھانا جانتا ہے، کھلانا نہیں جانتا لیکن مطلب ہو گا تو وہ بڑی پُر تکلف دعوتیں بھی کرے گا۔ مگر ان دعوتوں میں بھی وہ مہمانوں کا کچھ خیال نہ کرتے ہوئے سب سے پہلے مُرغ کے بہترین حصے اپنی پلیٹ میں ڈال لے گا۔

وہ دوستوں کو بہت کم سگریٹ پیش کرتا ہے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سُناتا ہوں جب مجھے بڑی خجلت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک اسٹوڈیو میں اس سے ملاقات ہوئی۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ سگریٹوں کے تمام اچھے برانڈ بلیک مارکٹ میں بکتے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ میں "کریون اے" کا ڈبہ دیکھا۔ یہ میرے مرغوب سگریٹ ہیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈبہ پکڑنا چاہا مگر اس نے اپنا ہاتھ جھٹک کر ایک طرف کر لیا۔ میں نے کہا "ایک سگریٹ دینا یار۔"

رفیق نے پیچھے ہٹ کر ڈبہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ "نہیں منٹو ___ اولاً میں اپنا سگریٹ کسی کو دیا نہیں کرتا۔ ثانیاً یہ سگریٹ اعلیٰ درجے کے ہیں۔ تمہاری عادت بگڑ جائے گی۔ تم اپنے گولڈ فلیک پیا کرو۔"

میرے جاننے والے تین چار آدمی پاس کھڑے تھے۔ میں پانی پانی ہو گیا۔ سمجھ میں نہ آیا، کیا کہوں اور کیا کروں۔ ناچار کھسیانا ہو کر اپنی ٹانگ نوچنا شروع کر دی۔

رفیق پرلے درجے کا بے غیرت ہے۔ کہنے کو تو پٹھان ہے، لیکن غیور قطعاً نہیں۔ سنا ہے کہ پہلے اس کا سلسلہ زہرہ کی ماں سے تھا۔ اس کے بعد اس کی بڑی لڑکی مشتری سے ہوا۔ پھر زہرہ کی باری آئی، آخر میں شیداں کی۔ مجھے معلوم نہیں شیداں سے اس کا ٹانکا کیسے ملا۔ اتنا یاد ہے کہ وہ ان دنوں ماہم میں رہتا تھا۔ اینکلیو مینشن کی بالائی منزل پر اس کا فلیٹ تھا۔ اس کے سامنے میری بہن رہتی تھی۔

میری شادی ہو چکی تھی اور میں اڈلفی چیمبرز، کلیئر روڈ میں مقیم تھا، رفیق کا ہمارے یہاں آنا جانا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن پر بھی ہماری اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک روز وہ اپنا پروگرام ختم کر کے اسٹوڈیو سے باہر نکلا تو بڑی افراتفری میں تھا۔ دیر کے بعد ملا تھا، اس لئے میں نے پوچھا۔ "سناؤ رفیق کیا ہو رہا ہے آج کل۔"

اس نے جواب دیا ___ عشق ہو رہے ہیں ___ دُبلے ہو رہے ہیں۔ واقعی عشق ہو رہے تھے۔ کیونکہ ایک دن معلوم ہوا کہ زہرہ کی چھوٹی بہن خورشید (شیداں) نے افیم کھالی ہے۔ (زہرہ بھی چُنیا بیگم کی عاشق ہے) دونوں بہنوں میں زبردست چخ ہوئی تھی۔ زہرہ کو سخت

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ناگوار گزرا تھا کہ شیداں اس کے خاوند کو اس سے چھین رہی ہے۔ الھڑ جوان شیداں کس کو معلوم نہیں اس کا پھیکو بھائی جان اسے محبت کے کتنے جام پلا چکا تھا، سر سے پیر تک نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں عشق اور جنگ میں ہر ایک چیز جائز ہے، خود کو حق بجانب سمجھتی تھی اور پھر خود رفیق اس کی طرف مائل تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی بڑی بہن معترض کیوں ہے۔۔۔ چخ زبردست لڑائی کی شکل اختیار کر گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شیداں نے زہرہ کی افیم اڑا کر نگل لی تاکہ عشق کی راہ میں اپنی جان دے دے۔ لیکن جس کو اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ وہ شہادت کا رتبہ حاصل کرتے کرتے بچ گئی اور اس حادثے کا انجام بخیریوں ہوا کہ رفیق، زہرہ کے دل کا مکان خالی کر کے شیداں کے دل کی نئی کوٹھی میں اقامت پذیر ہو گیا۔

سُنا ہے کہ تعطیلوں میں وہ کبھی کبھی شیداں کی موٹی بہن ہیراں کے دل کے ڈاک بنگلے میں بھی ٹھہر جایا کرتا تھا ـــ رہے نام اللّٰہ کا اور اس کے ناچیز بندے رفیق غزنوی کا۔

جب رفیق کا عشق زوروں پر تھا، اس زمانے میں لیڈی جمشید جی روڈ، ماہم کے گلشن محل میں لاہور کے ایک لالہ جی آ کے ٹھہرے۔ آپ کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی زیب النساء تھی۔۔ لالہ جی عجیب و غریب آدمی تھے۔ آگ لگانے کو بھی روپیہ کافی تھا۔ ان کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ ان کی زیب پسِ پردہ کیا کرتی ہے، کیا نہیں کرتی۔ وہ اپنے چغد پنے میں مست رہنا چاہتے تھے۔ رفیق دو ایک مرتبہ لالہ جی سے ملنے آیا تو اس کی آنکھ زیب سے لڑ گئی۔ لڑکی سادہ لوح تھی۔ غریب نے گھر کی سب اچھی چادریں، غلاف، دریاں وغیرہ رفیق کے حوالے کر دیں۔ اس کو کھلاتی پلاتی بھی رہی۔ لیکن رفیق بہت جلد اس سے اُکتا گیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا، بڑی شریف عورت ہے ـــ مجھے لطف نہیں آتا۔"

رفیق کو عورت میں شرافت بہت بُری طرح کھلتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟ وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس کا واسطہ چونکہ شروع ہی سے ایک ایسے طبقے کی عورتوں سے پڑا تھا، فحش کلامی اور جگت بازی جن کا اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے، جو سستے اور بازاری قسم کے مذاق کرتی ہیں اور ایسے ہی ہنسی ٹھٹھے کی دوسروں سے توقع کرتی ہیں۔ اس لئے رفیق کے لئے شریف خواتین میں کوئی کشش نہیں تھی ـــ اس کی جسمانی حسیات کو بیوی پنا بیدار نہیں کر سکتا تھا۔

کہنے کو تو وہ ہر اس طوائف کا شوہر تھا جو اس کی "نیم بارانہ" زندگی میں آئی، لیکن درحقیقت وہ اس کا گاہک تھا ـــ عام گاہک نہیں ـــ خاص گاہک، (جو طوائف سے لیتا ہے اُس کو دیتا نہیں) جیسا کہ رفیق اپنی ابتدائی زندگی میں تھا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ زندگی بھی رفیق کے نزدیک ایک طوائف ہے۔ وہ ہر رات اس کے ساتھ سوتا ہے۔ صبح اُٹھتے ہی پہلے سانس کے ساتھ وہ اس سے جگت بازی شروع کر دیتا ہے۔ اس کا گانا سُنتا ہے، اپنا سُناتا ہے۔ پھکڑ بازی ہوتی ہے اور یوں ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔

میں نے اس کو کبھی ملول نہیں دیکھا۔ وہ بے حیائی اور ڈھٹائی کی حد تک ہر وقت خوش رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تندرست ہے۔ اتنی عمر ہونے پر بھی آپ اسے معمر نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ جُوں جُوں اس کی عمر میں اضافہ ہو رہا ہے، وہ جوان ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر سو برس پورے ہونے پر وہ ننھا منھا بچہ بن جائے اور انگوٹھا چوسنا شروع کر دے۔

وہ شواجی پارک میں رہتا تھا۔ شیداں کے مُردہ بچہ پیدا ہوا۔ میں اور میری بیوی افسوس کرنے گئے تو ایک عجیب و غریب تماشا دیکھنے میں آیا۔

رفیق فرش پر قراقلی ٹوپی پہنے نماز پڑھنے کے انداز میں بیٹھا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو دوسرے کمرے سے زہرہ سیاہ ماتمی لباس میں نمودار ہوئی۔ بال کھلے تھے اور آنکھیں نمناک۔ اس کے ساتھ اس کا شوہر مرزا تھا جو رفیق کے لڑکے کی موت سے بہت متاثر دکھائی دیتا تھا۔ دوسرے کمرے سے شیداں کے رونے کی آواز آئی تو زہرہ لپک کر اندر گئی اور بلند آواز میں اس کو دلاسا دینے لگی۔ میں رفیق کے پاس مبہوت بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یا اللہ یہ کیا مذاق ہے۔

رفیق کسی زمانے میں زہرہ کا خاوند تھا۔ اس کے بطن سے رفیق کے دو بچّے تھے، جو اس کمرے سے اس کمرے میں جاتے اور کبھی اس کمرے سے اس کمرے میں آتے۔ رفیق اب زہرہ کی بہن شیداں کا شوہر تھا۔ اور زہرہ کا مرزا۔ شیداں، زہرہ کی بہن تھی اور سوت بھی۔ رفیق کے بچّے شیدا کے کیا لگتے تھے۔ بہن کے رشتے سے ظاہر ہے، پروین بھانجی اور محمود بھانجا۔ اور شیداں کے جو مردہ لڑکا پیدا ہوا ہے، وہ زہرہ کا بھانجا۔ پروین اور محمود کا رشتہ رفیق کے نطفے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مُردہ لڑکے سے جو ہوا وہ ظاہر ہے — رفیق اور مرزا دونوں ایک دوسرے کے ہم زُلف ہوئے۔ میں چکرا گیا۔ لیکن رفیق نے بروقت مجھے اس اُلجھن سے نجات دی اور کہا، آؤ باہر چلیں۔

ہم برآمدے میں پہنچے تو رفیق نے قراقلی اُتار کر زور سے ایک طرف پھینکی اور سگریٹ سُلگا کر کہا "در فٹے منہ ______ غم کرتے کرتے چہرہ لمبوترہ ہو گیا ہے، اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔"

غیرت، شرم اور حیا شاید اضافی چیزیں ہیں۔ آپ مجھ سے بحث کریں گے تو میں مان لوں گا کہ یہ واقعی ہیں۔ بہن بھائی کے ازدواجی رشتے میں کیا قباحت ہے۔ باپ، بیٹی کے جسمانی تعلق میں کیا بُرائی ہے۔ اسی طرح اغلام بازی کو خلاف وضع فطری عمل کیوں قرار دیا جاتا ہے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جب کہ یہ رجحان انسان کی فطرت میں ازل سے موجود ہے___ کچھ بھی ہو۔ آپ مجھے کمزور کہہ لیجئے، رجعت پسند بنا دیجئے، لیکن ان باتوں کے تصور ہی سے مجھے گھن آتی ہے۔

عرصہ ہوا، میں بمبئی سے اپنے کسی مقدمے کے سلسلے میں لاہور آیا۔ ان دنوں رفیق بھی وہیں تھا۔ اس سے ملاقات سید سلامت اللہ شاہ کے نیلام گھر میں ہوئی۔ اللہ بخشے شاہ صاحب بڑے رنگیلے آدمی تھے۔ میں نے ان سے رفیق کا پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ اندر کمرے میں ہے اور بہت خوش ہے۔

معلوم ہوا کہ وہ امرتسر میں اپنی بیٹی زرینہ المعروف نسرین (انوری کے بطن سے) سے ملاقات کر کے آیا ہے۔ رفیق نے اس کا بچپن دیکھا تھا۔ اس کی جوانی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اصل میں انوری نے کوئی ایسا موقعہ ہی نہیں آنے دیا تھا کہ نسرین اپنے باپ کو دیکھ سکتی۔ اس سے یہی کہا گیا تھا کہ وہ بہت بدصورت اور بدمعاش ہے___

رفیق کے دوستوں نے مل جل کر منصوبہ بنایا اور باپ بیٹی کی ملاقات کا انتظام کر دیا۔ رفیق امرتسر پہنچا اور زرینہ سے ملا۔ رفیق نے مجھ سے کہا ''منٹو___ سرو قد نہ بے حد خوبصورت۔ جوانی سے بھرپور۔ میں نے جب اُسے اپنے بازوؤں میں بھینچا تو خدا کی قسم مزا آ گیا۔''

میں اس کے ان الفاظ پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

رفیق نے مجھے بتایا کہ وہ رخصت ہونے ہی والا تھا کہ انوری آن ٹپکی۔ ہلکی سی چخ ہوئی۔ رفیق نے اس سے کہا۔ ''خاموش رہ انوری۔___ شکریہ ادا کر کہ تجھے ایک سونے کی کان کا مالک بنا دیا ہے میں نے''___

معلوم نہیں رفیق نے ایسی سونے کی کانیں کس کس کو عطا کی ہیں۔ روزِ محشر جب کھدائی ہوگی، اسی وقت پتہ چل سکے گا۔ ویسے رفیق نے ایک بار مجھ سے کہا تھا ''مجھے معلوم نہیں میرے بچے بچیوں کی تعداد کتنی ہے___ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ سب سے بڑا مردم شمار ہے''۔

رفیق کی ایک سگی ''بیوی'' بھی تھی، یعنی سہرے جلووں کی بیاہی۔ یہ غریب شادی کے تین چار سال بعد ہی مر گئی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکی ظاہرہ ہے جو پہلے فلم ڈائریکٹر ضیا سرحدی کی بیوی تھی اور اب طلاق لے کر کراچی میں اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہے۔

مجھے اس لڑکی کی زندگی کی قبل از وقت تباہی کا بہت افسوس ہے، اور میں سمجھتا ہوں اس تباہی میں رفیق کا ہاتھ ہے، اس لئے کہ وہ ہمیشہ اس کو اپنی زندگی کا سانچہ پیش کرتا تھا اور کہتا تھا، تم اس میں ڈھل جاؤ۔ یہ حقیقت اس کی آنکھوں سے معلوم نہیں کیوں اوجھل رہی؟

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ آج ایک عبرت انگیز خرابے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس کی شادی کے متعلق بمبئی میں ایک جھگڑا سا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بھی رفیق کی غفلت کے باعث۔ اس کو دور کرنے کے لئے اس نے ظاہرہ سے کہا۔ ''دیکھ پتر۔ تو نذیر لدھیانوی سے شادی نہیں کرنا چاہتی نہ کر___ ضیا سرحدی سے کر۔ تذبذب میں ہے تو دونوں سے کر لے۔ اگر یہ تمہیں دھوکا دے گئے تو کوئی فکر نہ کرنا___ میں تیرا سب سے بڑا خاوند ہوں۔ تیرا باپ''۔

نذیر لدھیانوی کو ظاہرہ نے دھوکا دیا۔ ظاہرہ کو ضیا سرحدی نے۔ اب وہ اپنے سب سے بڑے خاوند — اپنے باپ رفیق غزنوی کے پاس ہے۔ بیڑیاں پیتی ہے اور ان کی راکھ میں اپنی جوانی کی وہ تمام چلبلاہٹیں کرید کرید کر نکالنے کی ناکام کوشش کرتی ہے جو کوئی مستقل سنجیدہ شکل اختیار کر سکتی تھیں۔

میں ظاہرہ کے متعلق اور کچھ نہیں لکھوں گا، اس لئے کہ میرے دکھ میں اضافہ ہوگا۔

رفیق میں کھلنڈرا پن اس عمر میں بھی موجود ہے۔ چھوٹی سی بات ہو گی اور وہ ہنس ہنس کر اپنا برا حال کر لے گا۔ بہت خوش ہوگا تو اچھلنا کودنا شروع کر دے گا۔

ہم فلمستان میں ''چل چل رے نوجوان'' بنا رہے تھے۔ ہیرو اشوک اور ہیروئن نسیم بانو (پری چہرہ) تھی۔ رفیق اس فلم میں ایک رول ادا کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نسیم کی ماں چھمیاں (شمشاد) کو جانتا ہے جو کسی زمانے میں دلی کی قیامت خیز طوائف تھی۔

دلی میں ایک رات اسے چھمیاں کے بالا خانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ چھمیاں گا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ بلوریں صراحی سے جام بھر بھر کے پی رہی تھی۔ مجرا سننے والے اور بھی تھے۔ شہر کے رئیس۔ چھمیاں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور اشارے سے اپنے پاس بلا کر ایک جام پیش کیا___ رئیس پیتے گئے اور وہ پندرہ روز تک اس کے بالا خانے میں زیر حراست رہا۔

میں نے نسیم سے اس کا تعارف کرایا۔ رفیق نے اس کو جب دلی میں دیکھا تو وہ چھوٹی سی بچی تھی جو بقول رفیق ہر وقت چنریا اوڑھے ادھر ادھر پھدکتی رہتی تھی۔

نسیم، رفیق کو جانتی تھی۔ ان میں جو گفتگو ہوئی بہت پر تکلف تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نسیم ادب آداب اور رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتی ہے۔ اس نے رفیق کو ایسا کوئی موقعہ نہ دیا کہ وہ ''ڈھیلی'' قسم کی بات کر سکتا۔ لیکن وہ اسی میں خوش تھا۔ اتنا خوش کہ میرے کمرے میں پہنچتے ہی اس نے بے تحاشا ناچنا شروع کر دیا۔ نسیم کے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا، وہ میز پر چڑھا۔ وہاں سے دھم کر کے فرش پر گرا اور لوٹنے لگا۔ لوٹتے لوٹتے میز کے نیچے چلا گیا۔ اٹھا تو اس کا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سر تڑاق سے اس کے ساتھ ٹکرایا۔ اس کی پروا، نہ کرتے ہوئے اس کے پیچھے سے نکلا اور گانے لگا۔

وہ چلے، جھٹک کے دامن میرے دستِ ناتواں سے
وہ ۔۔۔ وہ ۔۔ وہ چلے ۔۔ وہ چلے ۔۔۔ وہ چلے

میرا خیال ہے رفیق چاہتا تھا کہ نسیم بانو سے بھی سلسلہ ہو جائے، مگر انگور کھٹے تھے، اس لئے اس نے کوشش فضول سمجھی اور اسے دیکھ دیکھ کر ہی اپنا "جی پشوری" کرتا رہا۔

نور جہاں غالباً اس کے ہتھے چڑھ جاتی، لیکن وہ بہت بُری طرح فلم ڈائریکٹر سیّد شوکت حسین رضوی کی محبت میں گرفتار تھی۔ میں اس کے متعلق کسی قدر تفصیل سے اپنے مضمون "نور جہاں سرور جاں" میں لکھ چکا ہوں۔ البتہ رقاصہ ستارہ بغیر رفیق کی خواہش کے اور بغیر اپنے ارادے کے سرفراز ہوگئی۔

اروڑہ اور اس کا جھگڑا تھا۔ بیچ میں نذیر (ایکٹر) بھی تھا۔ اس تکڑم کی گرہیں کھولتے کھولتے رفیق نے ستارہ کی گرہ بھی کھول دی۔ کچھ اس طرح کہ اس کا پتہ رفیق کو چلا، نہ ستارہ کو۔

سہراب مودی "سکندر" بنا رہا تھا۔ ظہور احمد پون پل، (بمبئی میں جسم فروشوں کی منڈی) سے ایک نووارد اور نوجوان طوائف مینا کو لے اڑا تھا۔ اس نے اس نوخیز کو اپنی بیوی بنایا تھا۔ وہ منروا مووی ٹون میں ملازم تھی۔ رفیق غزنوی نے "سکندر" کے لئے ایک مارشل کورس مرتب کیا۔ اس کے بول شاید یہ تھے۔

زندگی ہے، پیار سے، پیار سے، بتائے جا
حسن کے حضور میں، اپنا سر جھکائے جا

یہ کورس بہت مقبول ہوا۔ شاید اسی خوشی میں اس نے مینا کے حُسن کے حضور میں اپنا سر جھکا دیا، مگر زیادہ دیر تک جھکائے نہ رکھا۔ تین چار سجدے کئے اور مصلّےٰ اُٹھا کر چل دیا۔

پون پل ہی میں حیدر آباد سے دو بہنیں غالباً شہزادہ معظم جاہ سے اپنی جان چھڑا کر آباد ہوئیں۔ بڑی کا نام اختر تھا چھوٹی کا انور۔ ان کا وطن دراصل آگرہ تھا۔ انور بالی عمر کی تھی۔ یہی کوئی چودہ پندرہ برس کی۔ دونوں مجرا کرتی تھیں۔ انور کی مسّی کی رسم ابھی تک ادا نہیں ہوئی تھی۔ بڑی پر ہمارے دِلّی کے ایک دوست ہلدیہ صاحب سو جان سے فدا تھے۔

ایک رات مجھے ہلدیہ صاحب کے ساتھ ان دو بہنوں کے بالا خانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجرا سننے کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو رفیق غزنوی کا ذکر آیا۔ میں نے کہا "بڑا حرامزادہ ہے۔"

چھوٹی (انور) نے ایک تیکھی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا، آپ کی شکل

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

اس سے ملتی جلتی ہے۔"

مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔

اس واقعے کا ذکر میں نے رفیق سے کیا۔ وہ ان کو نہیں جانتا تھا۔ مجھ سے پتہ پوچھ کر اس نے ان کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ میرا خیال ہے یہ سلسلہ کم از کم ایک برس تک جاری رہا۔ رفیق نے پیشگوئی کی کہ انور ایک دن بہت بڑی مغنیہ بنے گی اور ٹھمری گانے میں اس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ یہ صحیح ثابت ہوئی۔ جن لوگوں نے اسے سنا ہے اس کی تصدیق کریں گے۔ بمبئی کے بعد میں نے انور بائی آگرے والی کو دلی ریڈیو اسٹیشن میں دیکھا جہاں میں ان دنوں ملازم تھا ــــ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ اللہ اللہ کیا انقلاب تھا۔ چند برسوں ہی میں یہ کایا پلٹ ــــ پون پُل کا وہ چلبلا پن، وہ شریر اور تیکھا غمزہ معلوم نہیں کون ظالم اس کے وجود سے نوچ کر لے گیا تھا۔ اب وہ ایک لمبی آہ تھی، بڑی نازک ہوا کے ہلکے سے ہلکورے سے بھی جس کے ہزار ٹکڑے ہو سکتے تھے۔

مائکروفون کے سامنے گاؤ تکئے کا سہارا لے کر بیٹھی اور تانپورے کے ساتھ اپنی سر لگا دیتی کہ اس کی نحیف گردن کو سر کا سارا بوجھ نہ اٹھانا پڑے ــــ پھر وہ گاتی اور اس کی آواز سننے والوں کی رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتی۔

رفیق گویا کم ہے مداری زیادہ ہے۔ وہ آپ کو اپنا گانا سنانے سے پہلے ہی وجد میں لے آئے گا۔ باجے کے کسی سر پر انگلی رکھے گا اور خود پر سرتاپا رقت طاری کر کے کہے گا "ہائے" یہ ہائے بہت لمبی ہوگی۔ پھر وہ دوسرے سُر کو دبائے گا اور اس سے بھی لمبی "ہائے" اس کے حلق سے نکلے گی جو سامعین کے رونگٹے کھڑے کر دے گی۔ اس کے بعد وہ باجے میں مزید ہوا بھرے گا۔ اس کی آنکھوں کی پُتلیاں اُوپر چڑھ جائیں گی۔ ایک جگر دوز آہ اس کے سینے کی گہرائیوں سے نکلے گی اور جب وہ کسی اور سُر پر انگلی رکھے گا تو اس پر حال کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ قریب ہو گا کہ سُننے والے اپنے کپڑے پھاڑنے اور سر کے بال نوچنے لگیں کہ ایک دم وہ بے تحاشہ ہنسنا شروع کر دے گا اور باقاعدہ گانے لگے گا۔ آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ پیاسی زمین پر ساون کی جھڑی کھل کر برس جانے کے بعد کوئی ماشکی اپنی مشک سے چھڑکاؤ کر رہا ہے۔

گاتے وقت بہت بُرے بُرے منہ بناتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے قبض ہے۔ اس کے پیٹ میں شدت کا درد ہے جس کے باعث وہ پیچ و تاب کھا اور کراہ رہا ہے۔ اس کو گاتے دیکھ کر (خاص طور پر جب وہ کوئی پکا گانا گا رہا ہو) یا تو خود آپ کو تکلیف ہوگی یا اس کی حالت پر ترس آئے گا اور آپ خلوص دل سے دُعا کریں گے کہ خدا، اسے اس کرب سے نجات دلائے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

عذرا میر نے بمبئی کے بہت دولت مند یہودیوں سے مل کر لاکھوں کے سرمائے سے ایک فلم کمپنی قائم کی تو اپنے پہلے فلم ''ستارہ'' کے میوزک کے لئے رفیق غزنوی کو منتخب کیا۔ عذرا میر خوبصورت ہے۔ اس کے ساتھی۔ یہودی سرمایہ دار بھی خوش شکل اور رعب داب والے تھے۔ رفیق جب ان کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا تو بالکل الگ نظر آتا تھا۔ اس کی شان ہی دوسری تھی۔

رفیق جب کام شروع کرتا ہے تو بڑے ٹھاٹ سے۔ ایک سو سازندے ہوں گے جن کے جھرمٹ میں کھڑا وہ سب کو ہدایات دے رہا ہوگا۔ پنجابی میراثیوں کے ساتھ میراثی پن چلے گا۔ بات بات پر پھبتی اور جگت۔ جو کرسچین ہیں، ان سے انگریزی میں مذاق ہوتے رہیں گے۔ جو یو پی کے ہوں گے ان سے اردو میں شستہ کلامی ہوگی۔

ایک دن رفیق دفتر میں عذرا میر کے ساتھ بیٹھا فلم کے کسی گانے کے متعلق تبادلۂ خیالات کر رہا تھا۔ میں بھی پاس بیٹھا تھا۔ کوئی بات کرتے کرتے وہ فوراً رُک گیا۔ دفتر سے دور میوزک روم تھا۔ وہاں سازندے اس کی ایک کمپوزیشن کی ریہرسل کر رہے تھے۔ رفیق نے اپنے کان کا رُخ اس طرف کیا جہاں سے آواز آ رہی تھی اور ناک بھوں چڑھا کر بڑے اذیت بھرے لہجے میں کہا ''ڈیش اِٹ — ایک وائلن آوٹ آف ٹیون ہے!'' اور اُٹھ کر میوزک روم کی طرف چلا گیا۔

مجھے موسیقی سے کوئی شغف نہیں گو میں نے اپنے وقت کے تمام بڑے بڑے گانے والوں اور گانے والیوں کو سنا ہے، لیکن راگ ودیا نہیں سیکھ سکا۔ لیکن میں رفیق کے متعلق اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ سُر یلا نہیں۔ موسیقی کا علم وہ کہاں تک جانتا ہے اس کے بارے میں رائے دینا میری طرف سے بہت بڑی زیادتی ہوگی۔

البتہ وہ لوگ جو خود موسیقار ہیں اور جن کا موسیقی کے میدان میں کافی نام ہے، ان میں سے اکثر کا یہ کہنا ہے کہ رفیق بے سُرا ہے۔ سُر سے ایک ایک دو دو ''سوتر'' ہٹ کے گاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تھوڑے ہی دن ہوئے نور جہاں سے باتیں ہو رہی تھیں کہ رفیق کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے اس سے رفیق کے بارے میں دوسروں کی مندرجہ بالا تنقیص کا ذکر کیا تو اس نے جیبھ دانتوں تلے دبا کر اور دونوں کانوں کو اپنی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا ''توبہ، توبہ ___ یہ محض افترا ہے ___ وہ اُستاد ہے۔ اپنی طرز کا واحد مالک۔''

لیکن اس نے یہ تسلیم کیا کہ اب رفیق کی آواز میں وہ پہلی سی چمک دمک نہیں رہی اور یہ محض عمر کا تقاضا ہے، جہاں تک علم کا تعلق ہے نور جہاں اسے گُنی کہتی ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اس کے ایک گن کا میں بھی معترف ہوں۔ وہ بے شرم ہے، بے حیا ہے، بے غیرت ہے، لیکن اوباش نہیں۔ اس کی افتاد عام آدمی کی نہیں ایک آرٹسٹ کی افتاد ہے۔ وہ اگر شریعت کا پابند نہیں تو مروجہ قوانین کا پابند ضرور ہے۔ وہ اگر کسی کا دوست نہیں تو کسی کا دشمن بھی نہیں۔ وہ اگر صحیح معنوں میں کسی عورت کا شوہر نہیں تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں آج تک اس نے کسی عورت کو مجبور نہیں کیا کہ وہ صحیح معنوں میں اس کی بیوی بنے۔

شریف عورتیں چونکہ اس کی مطلب کی نہیں اس لئے وہ ان کا احترام کرتا ہے۔ غیر شریف عورتیں چونکہ اس کو اچھی لگتی ہیں اس لئے وہ ان کی بے حرمتی کرتا ہے۔ بینک میں روپیہ ہو تو اچھے اور شاندار کپڑے پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ بینک بیلنس خالی ہو تو اچھے اور شاندار کپڑے پہننا ضروری سمجھتا ہے۔

دلی کے ایک معزز ہندو خاندان کی ایک تعلیم یافتہ نوجوان دوشیزہ کو اس سے محبت ہو گئی۔ دیر تک وہ رفیق کو عشقیہ خط لکھتی رہی۔ رفیق بمبئی میں تھا کہ اس کا ایک ایسا خط آیا کہ رفیق پریشان ہو گیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ رفیق اور پریشانی۔ دو متضاد چیزیں؟

رفیق نے مجھے ساری رام کہانی سنائی اور کہا "منٹو، یہ لڑکی پاگل ہو گئی ہے۔ میں ایک ہرجائی مرد ہوں۔ مجھے اس افلاطونی محبت سے کیا واسطہ۔ کہتی ہے گھر سے بھاگ کر میرے پاس آجائے گی ___ آجائے، ٹھیک ہے، لیکن میں کب تک اس کی شریف اور پاکیزہ محبت سے چپکا رہوں گا ___ خدا کے لئے تمام شریف عورتیں اپنے گھر میں رہیں۔ شادی کریں، بچے جنیں اور جائیں جہنم میں۔ مجھے ان کا عشق درکار نہیں۔ میری ساری عمر گزر گئی کھوٹے سکے چلاتے۔ کھرے مجھ سے نہیں چلیں گے۔"

چنانچہ رفیق نے اس ہندو دوشیزہ کو ایسا دلشکن خط لکھا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آگئی۔

رفیق پر یہ میرا مضمون تشنہ ہے۔ مجھے اس کا شدید احساس ہے اس پر کسی اخبار، رسالے یا کتاب کے لئے جب بھی کوئی مضمون لکھے گا تشنہ ہی رہے گا۔ اس لئے کہ اس کی ہزار پہلو شخصیت کا احاطہ چند صفحات نہیں کر سکتے۔ زندگی رہی تو میں اپنے تاثرات قلم بند کر کے ایک مکمل کتاب کی صورت میں پیش کروں گا۔

آخر میں ایک لطیفہ سن لیجئے۔ فلم "چل چل رے نوجوان" کے زمانے میں رفیق نے پر وڈیوسر ایس مکرجی، ڈائریکٹر گیان مکرجی، اشوک کمار، سنتوشی، شاہد لطیف اور میری دعوت کی۔ ہم سب رفیق کے مکان واقع شواجی پارک پہنچے۔ رفیق ہلکے ہلکے سرور میں ہارمونیم سامنے رکھے فرش

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

پر بیٹھا تھا۔ پاس ہی شیداں تھی اور اس کا بھائی۔ ہم پہنچے تو اس نے ہمارا استقبال کیا۔ میرا گالیوں سے اور باقیوں کا سلاموں سے۔

شراب کے دو تین دور چلے۔ دوسروں کو اس نے اسکاچ دی اور مجھے ''سولن'' کی یعنی دیسی۔ میں خاموش رہا۔ وہ حسب عادت بات بات پر مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھانا لگایا گیا حسب معمول اس نے مُرغے کے گوشت کے اچھے اچھے ٹکڑے نکال کر اپنی پلیٹ میں رکھ لئے۔

کھانا کھانے کے بعد ایک ایک کر کے سب چلے گئے، میں بیٹھا رہا۔ شیداں اندر جا کے سوگئی۔ رفیق زیادہ پینے کا عادی نہیں۔ وہ پہلے ہی سے بمبئی کی زبان میں ''چکار'' تھا۔ مرغن کھانوں سے اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ میں چپکے سے اُٹھا، دوسرے کمرے میں جا کر بڑے اطمینان سے الماری کھولی اور اسکاچ کی بوتل اُٹھا لایا۔ آدھی سے کچھ زیادہ تھی۔ میں آرام سے پیتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے سالے کو بھی دیتا رہا۔ کبھی کبھی رفیق کو اکسا دیتا اور وہ غنودگی کے عالم میں چند لکنت بھری گالیاں مُنہ سے اُگل دیتا۔

اب میں نے جو مغلظات بکنا شروع کیں تو رفیق بلبلا اُٹھا۔ میری گالیوں کی فہرست کوئی اتنی لمبی چوڑی نہیں۔ دو تین بار مُنہ بھرا تو ختم ہو گئیں۔ میں نے یہ اُستادی کی کہ ایک گالی آدھی کرتا اور دوسری آدھی گالی کے ساتھ جوڑ کر لُڑھکا دیتا۔ اس ترکیب سے بھی زیادہ دیر تک کام نہ چلا۔ لیکن میں نے سوچا کم بخت کو ہوش کہاں ہے جو اَلّم غلّم مُنہ میں آئے نکال باہر پھینکو۔ چنانچہ میں نے یہی کیا۔ رفیق نشے میں چور پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر اس نے مُردہ آواز میں کہا۔ '' جانے دو منٹو میری جان ___ میں تھک گیا ہوں۔ مجھ میں اب گالیاں دینے کی سکت نہیں ہے۔''

میں یہی تو چاہتا تھا کہ اس میں سکت نہ ہو، ورنہ میں اور اس کے مقابلے کی جراَت کرتا؟

اب میں نے اس پر، یہ مضمون لکھا ہے جسے پڑھ کر وہ یقیناً اپنے مخصوص انداز میں مجھے بڑی نستعلیق گالیاں دے گا ___ لیکن میں لاہور میں ہوں، وہ کراچی میں۔ فی الحال تو محفوظ ہوں۔ لاہور آئے گا تو میں اس کی مغلظات سُن لوں گا۔ پھر اس کی دعوت کروں گا اور جم خانہ وہسکی میں اسپرٹ گھول کر.... خود پی لوں گا۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
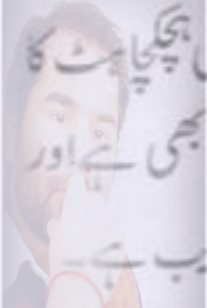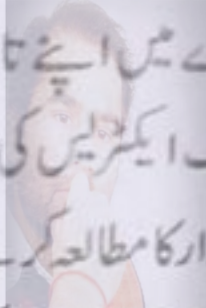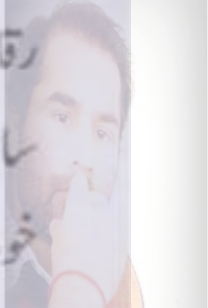
# ستارہ

لکھنے کے معاملے میں، میں نے بڑے بڑے کڑے مراحل طے کیے ہیں لیکن مشہور رقاصہ اور ایکٹریس ستارہ کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کرنے میں مجھے بڑی ہچکچاہٹ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ آپ تو اسے ایک ایکٹریس کی حیثیت سے جانتے ہیں جو ناچتی بھی ہے اور خوب ناچتی ہے لیکن مجھے اس کے کردار کا مطالعہ کرنے کا بھی موقعہ ملا ہے جو عجیب و غریب ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں کئی عورتوں کے کردار و اطوار کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب ستارہ کے حالاتِ زندگی مجھے آہستہ آہستہ معلوم ہوئے تو میں چکرا گیا۔ وہ عورت نہیں ایک طوفان ہے اور وہ بھی ایسا طوفان جو صرف ایک مرتبہ آ کے نہیں ٹلتا۔ بار بار آتا ہے۔ ستارہ یوں تو درمیانہ قد کی عورت ہے مگر بلا کی مضبوط ہے۔ اس نے جتنی بیماریاں کھی ہیں میرا خیال ہے اگر کسی اور عورت پر نازل ہوتیں تو وہ کبھی جانبر نہ ہو سکتی۔ وہ طبعاً بہت حوصلہ مند ہے، شاید اس لئے کہ وہ کسرت کی عادی ہے۔
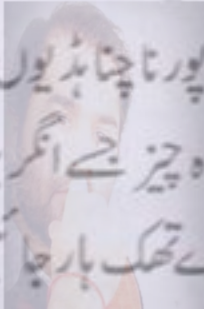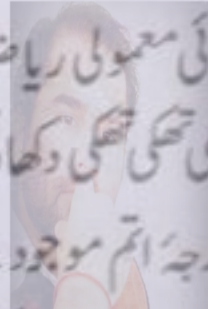
میں نے دیکھا ہے کہ صبح سویرے اُٹھ کر وہ کم از کم ایک گھنٹے تک ریاضت کرتی تھی اور یہ ریاضت کوئی معمولی ریاضت نہیں ہوتی تھی۔ ایک گھنٹہ بھرپور ناچنا ہڈیوں تک کو تھکا دیتا ہے مگر ستارہ مجھے کبھی تھکی دکھائی نہیں دی۔ اصل میں اس میں وہ چیز جسے انگریزی میں stamina کہتے ہیں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ تھکنے والی جنس نہیں دوسرے تھک ہار جائیں گے مگر وہ ویسی کی ویسی رہے گی جیسے اس نے کوئی مشقت نہیں کی۔ اس کو اپنے فن سے پیار ہے اسی والہانہ قسم کا جو وہ مختلف مردوں سے کرتی رہی ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

معمولی سے ڈانس کے لئے وہ اتنی محنت کرے گی جتنی کوئی رقاصہ عمر بھر نہیں کر سکتی۔ اس کی طبیعت میں اپج ہے۔ وہ ہمیشہ کوئی خاص بات کرنا چاہے گی۔ چلت پھرت جو ایک نٹنی میں ہو سکتی ہے اس میں ضرورت سے زیادہ موجود ہے۔ وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی نچلی نہیں بیٹھ سکتی۔ اس کی بوٹی بوٹی تھرکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ وہ نیپال کی رہنے والی ہے۔ مجھے اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ ستارہ کے علاوہ اس کی دو بہنیں اور تھیں۔ یہ ترشول یوں مکمل ہوتا ہے۔ تارہ، ستارہ اور الکنندہ۔ تارہ اور الکنندہ تو اب قریب قریب معدوم ہو چکی ہیں۔ میرا خیال ہے ان کا نام بھی کسی کو یاد نہیں ہوگا۔

ان تین بہنوں کی زندگی ویسے بہت دلچسپ ہے۔ تارہ کی کئی مردوں سے وابستگی رہی۔ اس ہجوم میں ایک شوکت ہاشمی بھی ہیں جو اب تک کئی پاپڑ بیل چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کی بیوی پورنیما نے ان سے طلاق لی ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں بڑے دردناک بیان دے چکے ہیں۔ الکنندہ کئی ہاتھوں سے گذری اور آخر میں پربھات کے شہرت یافتہ ایکٹر بلونت سنگھ کے پاس پہنچی۔ اس کے پاس وہ ابھی تک ہے یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں۔

ان تینوں بہنوں کی زندگی کی روداد اگر لکھی جائے تو ہزاروں صفحے کالے کئے جاسکتے ہیں۔ لوگ مجھے کوستے ہیں کہ میں فحش نگار ہوں، گندہ ذہن ہوں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس دنیا میں کیسی کیسی ہستیاں موجود ہیں۔ میں انہیں فحش نہیں کہتا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ یا تو کوئی آدمی ماحول کے باعث مذموم حرکات کا مرتکب ہوتا ہے یا اپنی جبلت کے باعث۔

جو چیز آپ کو فطرت نے عطا کی ہے، اس کی اصلاح نفسیاتی علاج سے کسی حد تک ہو سکتی ہے لیکن اگر آپ اس سے غافل رہے ہیں تو اس کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے یہ ذرا سوچنے کی بات ہے۔

تارہ، ستارہ، اور الکنندہ تین بہنیں کسی کے ہاں پیدا ہوئیں غالباً نیپال کے کسی گاؤں میں وہاں سے وہ ایک ایک کر کے بمبئی آئیں کہ فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کریں لیکن یہ مقدر کی بات ہے کہ صرف ستارہ کا ستارہ چمکا جو باقی تھیں وہ ٹمٹماتی رہ گئیں۔

ستارہ کے متعلق جیسا کہ میں اس مضمون کے آغاز میں کہہ چکا ہوں پوری تفصیل سے لکھتے ہوئے جھجکتا ہوں، وہ عورت نہیں کئی عورتیں ہے اس نے اتنے جنسی سلسلے کئے ہیں کہ میں اس مختصر مضمون میں ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

انگریزی زبان میں ایسی عورت کو Nafomanic کہا جاتا ہے۔ یہ عورت کی ایک خاص قسم ہے جو ایک مرد کے علاوہ اور سینکڑوں سے تعلق قائم کرتی ہے۔

ستارہ کا جب میں تصور کرتا ہوں تو وہ مجھے بمبئی کی پانچ منزلہ بلڈنگ معلوم ہوتی ہے جس میں کئی فلیٹ اور کئی کمرے ہوں اور یہ واقع ہے کہ وہ بیک وقت کئی مرد اپنے دل میں بسائے رکھتی تھی۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ جب وہ بمبئی میں آئی تو اس کا تعلق ایک گجراتی فلم ڈائریکٹر سے قائم ہوا جس کا پورا نام مجھے یاد نہیں رہا لیکن وہ ڈیسائی تھا، دُبلا پتلا مریل قسم کا انسان لیکن تھا بہت خوبیوں کا مالک۔ اپنے کام میں کافی ہوشیار تھا مگر قسمت نے اس کی یاوری نہ کی۔ چونکہ ضدی تھا اس لئے جگہ جگہ ٹھکرایا گیا۔ اس سے میری ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب سروج فلم کمپنی زندہ تھی ____

لیکن اصل میں زندہ درگور تھی۔ میری اس کی فوراً دوستی ہوگئی اس لئے کہ وہ فن شناس تھا اور ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ ستارہ اس کی بیوی ہے لیکن اس سے جدا ہوگئی ہے۔ ڈیسائی کو مگر اس جدائی کا اتنا رنج نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ اس عورت سے پورا نبٹ نہیں سکتا تھا۔

ستارہ اس زمانے میں کسی اور کے پاس تھی لیکن کبھی کبھی اپنے شوہر ڈیسائی کے پاس بھی آ جاتی تھی، وہ خوددار انسان تھا اس لئے وہ اس سے عموماً بے اعتنائی برتتا تھا اور ایک مختصر ملاقات کے بعد رخصت کر دیا کرتا تھا۔

ہندوؤں کے مذہب کے مطابق کوئی عورت طلاق نہیں لے سکتی۔ ڈیسائی سے ستارہ کی شادی ہندو قانون کے ماتحت ہوئی تھی اس لئے اب بھی وہ مسز ڈیسائی ہے حالانکہ وہ کئی مردوں سے منسلک ہو کر ان سے علیحدگی اختیار کر چکی ہے۔ میں یہ اس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب ڈائریکٹر محبوب کا ستارہ مائل بہ عروج تھا۔ محبوب نے اسے اپنے کسی فلم میں لیا تو اس کے ساتھ ستارہ کے جنسی تعلقات فوراً قائم ہو گئے۔ اس کی روداد میرا قلم بیان نہیں کر سکتا۔ صرف بیبو (عشرت جہاں) کی زبان ہی بیان کر سکتی ہے۔

آؤٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلے میں محبوب کو حیدر آباد جانا پڑا تھا۔ وہاں محبوب صاحب حسبِ دستور باقاعدہ نماز پڑھتے تھے۔ اور باقاعدہ ستارہ سے عشق فرماتے تھے۔ میں یہ سب کچھ لکھنے میں ہچکچا رہا ہوں۔ اصل میں ستارہ ایک "کیس ہسٹری" ہے۔ اس پر نفسیات کے کسی ماہر ہی کو لکھنا چاہئے تھا۔ بمبئی میں ایک اسٹوڈیو فلم سٹی تھا۔ محبوب نے غالباً اسی میں اپنی کوئی پکچر بنانا شروع کی تھی۔ ان دنوں وہاں ساؤنڈ ریکارڈ کرنے والے مسٹر پی۔ این اروڑہ تھے (جواب مشہور

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

پروڈیوسر ہیں) بڑے محنتی قسم کے نوجوان تھے۔ فضل بھائی نے جو فلم سٹی کے کرتا دھرتا تھے ان کو ولایت بھیجا تھا کہ وہ صدا بندی کا کام سیکھ کے آئیں۔ اسی زمانے میں سیٹھ شیراز علی حکیم بھی وہیں تھے اور لیبارٹری کے انچارج تھے۔ ڈائریکٹر محبوب سے تو ستارہ کا سلسلہ چل رہا تھا لیکن بقول دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" دہلی اس کا ٹانکا پی۔ این۔ اروڑہ سے بھی مل گیا۔

ڈائریکٹر محبوب نے فلم ختم کیا تو ستارہ پی۔ این اروڑہ کے ہاں بطور بیوی یا داشتہ کے رہنے لگی۔ لیکن اس دوران میں ایک اور حادثہ درپیش آیا۔ فلم سٹی ہی میں یا (کسی اور اسٹوڈیو میں جہاں ستارہ کام کر رہی تھی۔) ایک نووارد الناصر تشریف لائے۔ یہ بڑے خوبصورت جوان تھے کم عمر تازہ تازہ ڈیرہ دون سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ گال سُرخ وسپید تھے۔ ان کو شوق تھا کہ فلمی دُنیا میں داخل ہوں۔

جب آئے تو فوراً انھیں ایک فلم میں رول مل گیا۔ اتفاق سے اس کاسٹ میں ستارہ بھی شامل تھی جو بیک وقت پی۔ این۔ اروڑہ، ڈائریکٹر محبوب اور اپنے اصلی خاوند مسٹر ڈیسائی کے پاس آیا جایا کرتی تھی۔

معلوم نہیں یہ پہلے کی بات ہے یا بعد کی مگر ستارہ کی دوستی نذیر سے بھی ہو گئی جس کی پہلی داشتہ جو کہ ایک یہودن ایکٹریس یاسمین تھی اسے داغ مفارقت دے گئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کن حالات میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ نذیر ستارہ کا فریفتہ تھا اور ستارہ، نذیر پر اپنی جان چھڑکتی تھی۔

میں نذیر کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت سخت مزاج کا آدمی ہے۔ وہ عورت کو تابع رکھنے کا قائل ہے، عورت کا ذکر ہی کیا۔ مرد بھی جو اس کی ملازمت میں ہوں انھیں اس کی گالیاں اور گھڑکیاں سہنا پڑتی ہیں۔

وہ آدمی نہیں دیو ہے لیکن بڑا مخلص دیو۔ وہ میرا دوست ہے جب کبھی مجھ سے ملتا ہے سلام دُعا کے بجائے گالیاں دیتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ بے ریا ہے۔ اس کا دل خلوص سے معمور ہے۔

اس بے ریا اور مخلص آدمی نے ستارہ کو کئی برس برداشت کیا۔ اس کی سخت گیر طبیعت کے باعث ستارہ کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے پُرانے آشناؤں سے راہ و ربط قائم رکھے۔ لیکن وہ عورت جو صرف ایک مرد کی رفاقت پر قانع نہ رہتی ہو اس کا کیا علاج ہے۔ ستارہ نے کچھ دیر کے بعد وہی سلسلہ شروع کر دیا جس کی وہ عادی تھی۔ اروڑہ، الناصر، محبوب اور اس کا خاوند ڈیسائی سب

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہی اس کے التفات سے مستفید ہوتے رہے یہ چیز نذیر کی خوددار طبیعت پر بہت گراں گزرتی تھی۔ وہ ایسا آدمی ہے کہ ایک مرتبہ کسی عورت سے تعلق قائم کر لے تو اسے نبھانا چاہتا ہے مگر ستارہ کسی اور ہی آب وگل کی بنی تھی وہ نذیر جیسے آدمی سے بھی مطمئن نہیں تھی۔

میں اس میں ستارہ کا کوئی قصور نہیں دیکھتا جو کچھ بھی اس سے سرزد ہوا سراسر اس کی جبلّت کے باعث ہوا۔ قدرت نے اس کو اس طور سے بنایا ہے کہ وہ جادۂ ہر جام ہی اپنی رہے گی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی اس فطرت کے خلاف نہیں جاسکتی۔

یاسمین معتدل عورت تھی۔ خوبصورت، نسوانیت کا بڑا اچھا نمونہ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے جب نذیر سے مستقل گھریلو زندگی بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو نذیر نے جسے ہزاروں اشخاص بہت سخت گیر سمجھتے ہیں یاسمین کو اجازت دے دی کہ وہ جس کسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے کرسکتی ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نذیر اور ستارہ کا جسمانی تعلق اتنی دیر کیسے قائم رہا۔ نذیر سے میری ملاقات ہندوستان سینے ٹون میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فلم انڈسٹری نہایت نازک حالت میں تھی، وہ اس وجہ سے کہ فائنانسر سے باز تھا آج لاکھوں کے مالک ہیں دوسرے دن دیوالہ پٹ رہا ہے۔

ہندوستان سنے ٹون پہلے سورج فلم کمپنی تھی۔ اس سے پہلے خدا معلوم اس کا کیا نام تھا۔ میں نے ایک کہانی ''کیچڑ'' کے عنوان سے لکھی۔ جب میں نے سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی کو سنائی تو اس نے بے حد پسند کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں جب کہ حکومت کی طرف سے سخت قسم کا احتساب عاید تھا، کوئی پروڈیوسر اس کہانی کو فلمانے کی جرأت نہ کرتا، مگر نانو بھائی دلیر آدمی تھا اس نے کہانی لے لی مگر بعد میں مالی مشکلات درپیش آئیں تو وہ مجبور ہو گیا۔

نذیر کے لئے میں نے مزدور کا ایک اہم رول لکھا تھا جو اس کو بہت پسند تھا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ مالی مشکلات کے باعث یہ ''باغی فلم'' نہیں بنے گا، تو اس نے سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی سے کہا کہ آپ یہ کہانی مجھے دے دیجئے۔ میں اپنا سب کچھ بیچ کر اس کے فلمانے پر لگادوں گا۔ مگر ایسی نوبت نہ آئی۔ نانو بھائی کو کہانی پسند تھی چنانچہ کسی نہ کسی طرح سرمائے کا بندوبست ہوگیا۔ فلم کے ڈائریکٹر دادا گنجال تھے ___ گجراتی ___ فلم مکمل ہو کر ریلیز ہوگیا۔ لوگوں نے اس کی تعریف کی، پسند کیا۔ مگر میں مطمئن نہ تھا۔ لیکن اس کا میرے موضوع سے کوئی اتنا زیادہ تعلق نہیں۔ مجھے صرف یہ کہنا تھا کہ اس دوران میں نذیر کو اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ اسی زمانے میں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

یاسمین اس سے رخصت ہونے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ نذیر عزم کا مالک ہے، اس نے بہت جلد اپنا ذاتی فلم بنانے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے اس کا پہلا فلم ''سندیسہ'' تھا۔

اس کے بعد اس نے اپنا دوسرا فلم بنایا جس کا نام غالباً ''سوسائٹی'' تھا اس میں اس نے ستارہ کو بھی کاسٹ میں شامل کیا اور جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے اور بہت دیر تک رہے لیکن اس دوران میں جہاں تک میں جانتا ہوں ستارہ اپنے پُرانے دوستوں کے یہاں بھی آتی جاتی رہی۔ پی۔ این اروڑہ کے پاس وہ اکثر جاتی تھی۔

میں آپ کو ایک دلچسپ لطیفہ سناؤں، مجھے بمبئی چھوڑ کر دہلی جانا پڑا، وہاں میں نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی۔ قریب قریب ایک سال تک میں بمبئی کی فلمی دنیا کے حالات و کوائف سے غافل رہا۔ ایک دن اچانک میں نے نئی دلی میں اروڑہ کو دیکھا۔ ہاتھ میں موٹی چھڑی۔ کمر دوہری ہو رہی تھی، یوں بھی بیچارہ منحنی قسم کا انسان ہے مگر اس وقت بہت خستہ حالت میں تھا۔ بڑی مشکل سے قدم اُٹھا رہا تھا جیسے اس میں جان ہی نہیں۔ میں تانگے میں تھا اور وہ پیدل غالباً چہل قدمی کے لئے نکلا تھا۔ میں نے تانگہ روکا اور اس سے پوچھا کہ یہ قصہ کیا ہے۔ اس کا حلیہ کیوں اتنا بگڑا ہوا ہے۔ اس نے ہانپتے ہوئے مگر ذرا پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ستارہ ___ منٹو ستارہ'' میں سب سمجھ گیا۔ میرا خیال ہے آپ کو بھی سمجھ جانا چاہئے۔ اب ایک اور لطیفہ سنئے۔ الناصر جواب بہت موٹا اور بھدّا ہو گیا ہے۔ جب وہ شروع شروع میں فلم سٹی آیا تھا تو بہت خوبصورت تھا، بڑا نرم و نازک، سُرخ و سپید ڈیرہ دون کی پہاڑی فضا نے اس کو نکھار دیا تھا، میں تو یہ کہوں گا کہ وہ نسائیت کی حد تک خوبصورت تھا۔ اس میں وہ تمام ادائیں تھیں جو ایک خوبصورت لڑکی میں ہو سکتی ہیں۔ میں جب دہلی میں ڈیڑھ برس گزارنے کے بعد سید شوکت حسین رضوی کے بلانے پر بمبئی پہنچا تو اس سے میری ملاقات منروا مووی ٹون میں ہوئی۔ وہ گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ میں حیرت زدہ ہو گیا۔ گالوں کا گلابی رنگ ندارد ___ جسم پر پتلون ڈھیلی ڈھالی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکڑ گیا ہے، نچڑ گیا ہے۔ میں نے اس سے بڑے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''میری جان، یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے'' اس نے اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر سرگوشی میں کہا ''ستارہ ___ میری جان ___ ستارہ''۔

جہاں دیکھو ستارہ ___ میں نے سوچا کہ یہ ستارہ صرف زردیاں پیدا کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ ادھر پی۔ این۔ اروڑہ انگلینڈ کا تعلیم یافتہ صدا بند، ادھر ڈیرہ دون اسکول کا پڑھا ہوا نوخیز لڑکا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الگ لے جا کر جب میں نے اس سے پُوری تفصیل پُوچھی تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ ستارہ کے چکّر میں پڑ گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیمار ہو گیا۔ جب اس کو اس بات کا احساس ہوا کہ اگر وہ زیادہ دیر تک اس چکّر میں رہا تو وہ ختم ہو جائے گا۔ تو وہ ایک روز ٹکٹ کٹا کر ڈیرہ دون چلا گیا، جہاں اس نے تین مہینے ایک سینے ٹوریم میں گذارے اور اپنی کھوئی ہوئی صحت کسی قدر حاصل کی، اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ وہ اس دوران میں مجھے ہندی زبان میں بڑے لمبے لمبے خط لکھتی رہی لیکن میں یہ خط پڑھ نہیں سکتا تھا البتہ ان کی آمد سے کانپ کانپ ضرور جاتا تھا۔ اس نے پھر میرے کان میں کہا۔

"منٹو صاحب، بڑی عجیب و غریب عورت ہے۔"

ستارہ اصل میں ہے ہی عجیب و غریب عورت۔ ایسی عورتیں لاکھ میں دو تین ہوتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کئی مرتبہ خطرناک طور پر بیمار ہوئی۔ اس کو ایسے ایسے عارضے لاحق ہوئے کہ عام عورت کبھی جانبر نہ ہو سکتی مگر وہ ایسی سخت جان ہے کہ ہر بار موت کو غچہ دیتی رہی۔ اتنی بیماریوں کے بعد خیال تھا کہ اس کے ناچنے کی قوتیں سلب ہو جائیں گی مگر وہ اب بھی اپنے عہد جوانی کی طرح ناچتی ہے۔ ہر روز گھنٹوں ریاض کرتی ہے۔ مالشئے سے تیل کی مالش کراتی ہے اور وہ سب کچھ کرتی ہے جو پہلے کرتی آئی ہے۔ اس کے گھر میں دو نوکر ہوتے ہیں، ایک مرد، ایک عورت۔ مرد عام طور پر اس کا مالشیا ہوتا ہے، جو عورت ہے اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ پُرانی کہانیوں کی کٹنی معلوم ہوتی ہے جو آسمان میں تھگلی لگایا کرتی تھیں۔

وہ ململ کی باریک ساڑی پہنتی ہے، اتنی باریک کہ اس کا سارا ڈھیلا ڈھالا جسم اس میں سے چھن چھن کر باہر آتا رہتا ہے اور دیکھنے والوں کے لئے کراہت کا موجب ہوتا ہے، یہ عورت میں نے جب بھی دیکھی بہت کم گو، مگر بڑی تیز نظر دیکھی۔ اس کی عمر کم از کم پچپن برس کے قریب ہو گی مگر وہ جوانوں کے مانند چاق و چوبند تھی۔ اس کی آنکھیں عقاب کی طرح دیکھتی تھیں۔

جب ستارہ اکیلی تھی ___ یعنی وہ کسی ایک کی ہو کے نہیں رہتی تھی تو اس کا مکان دادر کے "خداداد سرکل" میں تھا اور جو صفتیں یا قباحتیں ستارہ میں ہیں وہ بھی خداداد ہیں۔ نذیر جواب سورن لتا سے منسلک ہے، بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ اس نے بہت دیر تک ستارہ کو برداشت کیا مگر جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں، وہ ایک مرد کی عورت نہیں ہے چنانچہ جب نذیر تنگ آ گیا اور اس کو حتمی طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ اس سے نباہ نہیں کر سکتا تو اس نے ایک روز اس سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ستارہ مجھے بخش دو، مجھ سے جو غلطی ہو گئی میں اس کے لئے پشیماں ہوں اور تم سے معافی کا خواستگار۔"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نذیر ستارہ کو مارا پیٹا بھی کرتا تھا۔ وہ اس سے ناخوش نہیں تھی۔ ایسی عورتیں زدوکوب سے ایک خاص قسم کی جنسی لذت محسوس کرتی ہیں مگران سے مسلکہ مرد کب تک ہاتھاپائی کرتا رہے۔ وہ غریب بھی ایک عرصے کے بعد عاجز آجاتا ہے۔ اب اسی سلسلے کی ایک اور کڑی کے متعلق بھی سُنیئے۔ جس زمانے میں ستارہ، نذیر کے یہاں تھی اسی زمانے میں نذیر کا بھانجا کے۔ آصف بھی وہیں تھا۔ کے۔ آصف بڑا تنومند نوجوان تھا، بڑا ہٹا کٹا، جوانی سے بھرپور۔ جس کو عورت ذات سے شاید کبھی سابقہ ہی نہیں پڑا تھا، اپنے ماموں کے ہاں رہتا تھا اور ان سے فلمی صنعت کے متعلق واقفیت حاصل کر رہا تھا۔ دل میں سینکڑوں ولولے تھے، بڑے ارمان تھے، پھر فلمی دنیا میں آکر اس نے عورتوں (اور وہ بھی ایکٹریسوں) کو قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے ماموں نذیر اور ستارہ کے باہمی تعلقات بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کے۔ آصف کی جوانی پھوٹی پڑتی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب مرد اپنی جوانی کے جوش میں پتھروں کی دیوار سے بھی بھڑ جانا چاہتا ہے۔ اور ستارہ یقیناً ایک پتھریلی دیوار تھی جو کسی سے ٹکرانا چاہتی تھی۔

نذیر اس زمانے میں رنجیت فلم اسٹوڈیو کے عین سامنے ایک احاطے کے اندر رہتا تھا۔ بڑی غلیظ سی جگہ تھی۔ نذیر نے ایک پورا فلیٹ لے رکھا تھا۔ اسی میں اس کی قائم کی ہوئی "ہند پکچرز" کا دفتر بھی تھا۔ دو تین کمرے تھے۔ ان میں تخلیہ کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ پُرجوش نوجوان آصف کو ہر وہ پہلو دیکھنے کا موقعہ ملا جو مرد و زن کے باہمی تعلقات سے وابستہ ہوتا ہے۔

نوجوان آصف کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ بڑا حیرت انگیز۔ اس نے اپنے شادی شادہ دوستوں سے ازدواجی زندگی کے اسرار کئی بار سنے تھے مگر اسے کبھی تعجب نہیں ہوا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ایک بستر ہوتا ہے جس پر انسانی فطرت اپنا ازلی و ابدی کھیل کھیلتی ہے۔ مگر آصف کی آنکھوں نے جو کچھ ایک بار محض اتفاق سے دیکھا۔ وہ بالکل مختلف تھا۔ بڑا خوفناک جس نے اس کی ہڈی ہڈی جھنجھوڑ دی۔ اس نے کئی بار کتوں کی لڑائی دیکھی تھی جو ایک دوسرے سے بڑے وحشت ناک طریقے پر گتھ جاتے تھے۔ ایک دوسرے کو جھنجھوڑتے، بھنبھوڑتے، کاٹتے اور نوچتے تھے ___ اس کا تن بدن لرز گیا، اس نے سوچا یہ محبت وحبت سب بکواس ہے۔ اصل میں انسان درندہ ہے اور اس کی محبت ایک بڑی خوفناک قسم کی کشتی مگر اس کو اکھاڑے میں اُترنے اور ایسی کشتی لڑنے کا شوق ضرور تھا۔ اس کے بازوؤں میں قوت تھی، اس کے بدن میں حرارت تھی، اس کے تمام پٹھے فولادی تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ صرف ایک بار اسے موقعہ دیا جائے تو وہ حریف کو چاروں شانے چت گرا دے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اس زمانے میں ڈائریکٹر نیر (پاکستان کا ذہین مگر بد قسمت ڈائریکٹر) بھی نذیر کے ساتھ تھا۔ آصف اور وہ دونوں ہم عمر تھے۔ دونوں کنوارے اور خوابوں کی دُنیا میں رہنے والے، آپس میں ملتے تو وہ عورتوں کی باتیں کرتے، ان عورتوں کی جو مستقبل میں ان کی ہونے والی تھیں پر جب ستارہ کا ذکر آتا تو وہ دونوں کانپ اُٹھتے اور ایک ایسی دُنیا میں چلے جاتے جہاں جن، دیو، اور چڑیلیں رہتی ہیں۔

ان کو کیا معلوم کہ ''نفومینک'' عورت کیا ہوتی ہے۔ ان کو کیا معلوم کہ ستارہ کے مقابلے میں ایسی عورتیں بھی ہیں جنھیں اگر برف کی سل کہا جائے تو بجا ہے۔

لیکن ان کو اتنا معلوم تھا کہ ستارہ نذیر کے ساتھ وفادار نہیں۔ وہ ہر جائی ہے، یوں تو نذیر کی ''ہول ٹائم'' داشتہ کے طور پر رہتی ہے مگر پی۔ این اروڑہ کے پاس بھی جاتی ہے اور کبھی کبھی اپنے پتی ڈیسائی کے پاس بھی جو بیچارہ بڑے حسرت کے دن گزار رہا تھا ___ اور پھر اور بھی تھے جن میں الناصر بھی شامل تھا۔

دونوں چکرائے چکرائے رہتے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ نذیر کے بستر کی ہر شکن کا پس منظر ان کو معلوم تھا۔ نذیر کے کھردرے اور گہرے سانولے رنگ کے چہرے کی گینڈے ایسی سخت کھال پر جو آئے دن داغ، دھبے پڑتے تھے اس کا جواز بھی ان کو معلوم تھا۔ لیکن اس قدر دونوں کو یقین تھا کہ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چلے گا مگر وہ چلتا رہا اپنے معمول کے مطابق۔

صبح سویرے ستارہ اُٹھتی اور دوسرے کمرے میں ریاض شروع کر دیتی۔ یہ بھی حیرت ناک چیز تھی کہ صبح اُٹھتے ہی دو گھنٹے لگاتار وحشیوں کی مانند ناچتی رہے۔ ایسے ایسے توڑے لے کہ زمین گھوم جائے۔ طبلچی کے ہاتھ شل ہو جائیں۔ مگر اسے کچھ نہ ہو۔ ریاضت کے بعد وہ اپنے ایک مخصوص مالیشئے سے مالش کراتی تھی۔ اس کے بعد نہا دھو کر وہ نذیر کے کمرے میں جاتی جو کہ سو رہا ہوتا۔ اس کو جگاتی اور اپنے ہاتھ سے دُودھ یا خدا معلوم کس چیز کا پیالہ اسے زبردستی پلاتی۔ اور ایک دوسرا ناچ شروع ہو جاتا۔ یہ سب کچھ آصف اور نیر کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ ان کی عمر تجسس کی عمر تھی جب آدمی خالی کمروں میں بھی خواہ کھڑکی کی درزوں سے جھانک کر دیکھتا ہے۔ روشن دانوں سے بھرے کمروں کا جائزہ لیتا ہے۔ ذرا سی آواز آنے پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ ان میں معانی بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نیر آصف کے مقابلے میں جسمانی لحاظ سے بہت کمزور تھا۔ اس کی جنسی خواہشیں بھی اسی لحاظ سے معتدل تھیں مگر آصف کے مضبوط اور تنومند جسم کی رگ رگ میں بجلی بھری ہوئی تھی جو کسی پر گرنا چاہتی تھی۔ اسی لئے آصف چاہتا تھا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کہ اندھیری رات ہو، آسمان پر کالے بادلوں کا ہجوم ہو، کان بہرے کردینے والی بجلی کی کڑک اور طوفان بادوباراں میں وہ کسی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے اور اسے کھینچتا کہیں دور لے جائے جہاں پتھروں کا بستر ہو۔

نذیر کا عزیز ہونے کے باعث ستارہ گھنٹوں آصف کے پاس بیٹھی رہتی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی تھی، جوں جوں وقت گذرتا گیا آصف کا حجاب کم ہوتا گیا جو وہ لاہور سے اپنے ساتھ لایا تھا مگر اس کو اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ ستارہ کو ہاتھ لگاتا۔ کیونکہ وہ اپنے ماموں کی سخت گیر طبیعت سے واقف تھا اور اس سے ڈرتا تھا ___ لیکن اس دوران میں اتنا جان گیا تھا کہ ستارہ اس کی طرف مائل ہے۔ وہ جب بھی چاہے اس کی کلائی اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ کر اسے جہاں چاہے لے جاسکتا ہے ___ مگر وہ گھپ اندھیری رات، وہ طوفان بادوباراں اور وہ پتھروں کا بستر!

آصف جھنجھلا رہا تھا، قدرت اتنی تعویق کیوں کر رہی ہے جو ہونا ہے آج ہی کیوں نہیں ہوجاتا۔ گاڑیاں جنھیں کل ایک دوسرے سے ٹکرانا ہے، آج ہی کیوں نہیں ٹکرا جاتیں، مگر یہ کیسے ہوتا جب کانٹا بدلنے والا کانٹا نہ بدلتا۔

وہ دو گاڑیوں کی طرح ایک پلیٹ فارم پر رُکتے تھے مگر ان میں فاصلہ ہوتا تھا۔ بہت معمولی سا فاصلہ۔ مگر جس طرح ایک گاڑی دوسری گاڑی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی اس لئے کہ وہ اپنی اپنی پٹریوں کے ساتھ جکڑی ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ بھی ایک دوسرے سے ہمکنار نہیں ہوسکتے تھے۔

جس طرح اِدھر کے مسافر اُدھر کے مسافروں سے کھڑکیوں میں سے سر باہر نکال نکال کر باتیں کرتے ہیں اسی طرح وہ بھی کرتے تھے، مگر فوراً ایک گاڑی اُدھر روانہ ہوجاتی اور دوسری اِدھر، آصف کو بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ مگر وہ گھپ اندھیری رات اور طوفان بادوباراں کا منتظر تھا۔ آخر وہ گھپ اندھیری رات، طوفان بادوباراں، رعدوبرق کی جملہ ہولناکیوں کے ساتھ آہی گئی۔

بالآخر ستارہ کے کرتوت دیکھ کر نذیر بھونچکا ہو کے رہ گیا۔

نذیر کے سر سے اب پانی گذر چکا تھا۔ کافی لعن طعن کے بعد اس نے ستارہ سے کہا اب تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔ اپنا بستر فوراً گول کرو۔

ستارہ، کچھ بھی ہو، آخر عورت ذات ہے۔ نذیر کی سرزنش کے بعد اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اکیلی اپنا بستر گول کرسکتی۔ نذیر سے وہ کیسے مدد مانگتی وہ غصے میں بھرا، منہ میں جھاگ نکالتا باہر نکل کر اپنے دفتر میں جا بیٹھا۔ آصف نے اس کے یہ تیور دیکھے تو اس کو یقین ہوگیا کہ وہ اندھیری رات آگئی۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تھوڑی دیر وہ خاموش بیٹھا رہا، اس کے بعد اُٹھا اور آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں ستارہ پلنگ پر بیٹھی اپنی چوٹیں سہلا رہی تھی۔

چند باتوں ہی سے اس کو معلوم ہو گیا کہ معاملہ ختم ہے۔ دل ہی دل میں وہ بہت خوش ہوا۔ چنانچہ اس نے ستارہ کو ڈھارس دی، کچھ اس طور پر کہ ایک نیا معاملہ شروع ہو گیا۔

آصف نے اس کا بستر بوریا باندھا اور اس کے ساتھ اس کے گھر واقع دادر (خداداد سرکل) چھوڑنے گیا۔

یہاں ستارہ نے آصف کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

آصف نے جرأت سے کام لے کر ستارہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "اس کی کیا ضرورت تھی ستارہ——"

ستارہ نے اپنا ہاتھ آصف کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش نہ کی مگر آصف مطمئن نہ تھا۔ تھوڑی دیر راز و نیاز کی باتیں ہوئیں، ستارہ نے آصف کو اپنے اس سحر کا نمونہ بھی چکھایا، جس سے وہ اس وقت تک سینکڑوں مرد، دُبلے پتلے، ہٹے کٹے، ضدی اور وحشی اپنی خواہشات کا غلام بنا چکی تھی۔

اگر دن ہوتا تو آصف کو یقیناً تارے نظر آجاتے، مگر رات کو اسے خداداد سرکل کے اس فلیٹ میں دن طلوع ہوتا نظر آیا——اس کی مسرتوں کا دن۔ مگر وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔ اس نے ستارہ سے کہا کہ دیکھو، تمہارا میرا اسمبندھ بہت مضبوط ہونا چاہئے۔ ہرجائی پن چھوڑو۔ بس ایک کی ہو جاؤ۔

ستارہ نے اسے یقین دلایا کہ وہ آصف کے سوا کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ آصف مطمئن ہو گیا۔ مگر اس خوف سے کہ نذیر اس سے اتنی دیر لگانے کی وجہ نہ پُوچھ بیٹھے عاشق صادق کی طرح اس کا ہاتھ چوم کر چلا گیا، اور وعدہ کر گیا کہ وہ دوسرے روز ضرور آئے گا۔ وہ گیا، تو ستارہ اُٹھی، سنگار میز کے پاس جا کر اس نے اپنے بال دُرست کئے۔ ساڑی تبدیل کی اور کسی کی طرف آنکھ اُٹھائے بغیر نیچے اُتری اور ٹیکسی لے کر پی۔ این۔ اروڑہ کے پاس چل گئی۔

جملہ معترضہ ہے۔ لیکن ہُوا کرے۔ کہنا یہ ہے کہ ستارہ کو مجھ سے سخت نفرت تھی۔ میں "مصور" کا ایڈیٹر تھا۔ اور بے لاگ لکھتا تھا۔ "بال کی کھال" اور "نت نئے" کالموں میں کئی بار میں نے اس کی درگت بنائی تھی۔ لیکن بڑے سلیقے سے۔ اس میں کوئی سوقیانہ پن نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ناراض تھی۔ اور مجھے اس ناراضی کی سچ پوچھئے تو کوئی پرواہ بھی نہیں تھی اس لئے کہ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اور یوں بھی فلمی ہستیوں سے دُور دُور ہی رہتا تھا۔

میں نے "نت نئے" یا "بال کی کھال" کے کالموں میں جب نذیر اور اس کی لڑائی کا ذکر

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ذرا نمک مرچ لگا کے کیا تو وہ بہت سیخ پا ہوئی اور اس نے مجھے خوب خوب گالیاں دیں۔

اس کے بعد جب مجھے اپنے جاسوسوں کے ذریعے سے آصف اور اس کے خفیہ معاشقے کا پتہ چلا اور میں نے چبھتے ہوئے اشاروں اور کنایوں میں اس کا ذکر اپنے کالموں میں کیا تو وہ بھنا گئی اور اس نے آصف سے کہا، تم اس شخص کو پیٹتے کیوں نہیں، خود نہیں پیٹتے تو کسی سے پٹواؤ۔ یا کسی اور اخبار والے سے کہو کہ وہ اسے اپنے اخبار میں ڈھیروں کے ڈھیر گالیاں دے۔

آصف، بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ اس میں بُردباری ہے۔ تحمّل سے مذاق سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ حالانکہ ان پڑھ ہے۔ اس نے ستارہ کی یہ باتیں اس کان سنیں اس کان نکال دیں۔

معاملہ اب زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ ستارہ کس قسم کی عورت ہے۔ اگر اس سے کسی مرد کا واسطہ پڑ جائے تو اس کی رہائی مشکل ہو جاتی ہے۔ فقط ایک الناصر ہی تھا جو چند ماہ اس کے ساتھ گذار کر دُہرہ دون بھاگ گیا۔ ورنہ ایک روز اس کی انتڑیاں بالکل جواب دے دیتیں اور اس کی قبر بمبئی کے قبرستان میں بنی ہوتی۔ جس کے کتبے پر کچھ اس قسم کا شعر مرقوم ہوتا ____

لحد پہ مری وہ پردہ پوش آتے ہیں
چراغِ گورِ غریباں، صبا، بجھا دینا

ہاں تو معاملہ بہت نزاکت اختیار کر گیا تھا۔ اس لئے کہ نذیر کے دل میں شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا۔ یہ میرا بھانجا، اتنی اتنی دیر کہاں غائب رہتا ہے۔ جب وہ اس سے پوچھتا تو وہ کوئی بہانہ پیش کر دیتا۔

مگر یہ بہانے کب تک چلتے۔ ان کا اسٹاک ایک روز ختم ہونا ہی تھا۔ نذیر کے دل میں ستارہ کے لئے اب کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ ایسا آدمی نہیں کہ اپنا فیصلہ تبدیل کر دے۔ اُس کو ستارہ کی نہیں آصف کی فکر تھی۔ اپنے بھانجے کی جس کو وہ اپنا عزیز سمجھتا تھا۔ اور جس کو اُس نے صرف اس غرض سے اپنے پاس رکھا تھا کہ وہ کچھ بن جائے۔

البتہ اس کو فکر تھی کہ وہ کہیں اس عورت کے ہتّے نہ چڑھ جائے۔ وہ اس عورت کے ساتھ کئی برس گذار چکا تھا۔ اس کی رگ رگ اور نخ نخ سے واقف تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ آصف جیسے نوجوان اس کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ اور ان کو اپنے دام میں پھنسانا اس ایسی تجربہ کار عورت کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ وہ خود بخود اس کے دام کے نیچے آجاتے تھے۔ ایک بار پھنس جاتے تو پھر رہائی مشکل ہو جاتی تھی۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ستارہ سے کسی مرد کا سابقہ پڑ جائے اور اتفاق سے وہ ستارہ کو پسند آ جائے تو پھر دن اور رات کا بیشتر حصہ اسی کے ساتھ کاٹنا پڑتا ہے۔ نذیر کو آصف کی پے در پے غیر حاضریوں ہی سے پتہ چل گیا تھا۔ مگر جب آصف کہتا کہ ماموں جان، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اس کے متعلق تو سوچ بھی نہیں سکتا، تو وہ شش و پنج میں پڑ جاتا۔ لیکن دل میں اُسے پورا یقین تھا کہ یہ لونڈا پھنس چکا ہے اور جھوٹ بول رہا ہے۔

آصف واقعی جھوٹ بول رہا تھا۔ معاملہ اگر کسی اور عورت کا ہوتا تو وہ یقیناً کبھی جھوٹ نہ بولتا۔ مگر ستارہ اس کے ماموں کی داشتہ تھی۔ اس کے ساتھ وہ ایسے تعلقات قائم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تعلقات جو قائم ہو چکے تھے۔

پیچھے ہٹنا اور فرار اب بہت مشکل تھا۔ آصف اس ''زنِ تسمہ پا'' کی گرفت میں تھا۔ بھاگ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر ادھر نذیر کی آنکھوں میں برابر خون اُتر رہا تھا۔ اس کو بس ایک موقعہ چاہئے تھا۔ ایسا موقعہ کہ وہ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

ایک روز نذیر نے وہ سب کچھ دیکھ بھی لیا جو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میرا حافظہ ساتھ نہیں دیتا۔ مجھے سارے واقعات اچھی طرح معلوم تھے۔ مگر اب اتنا عرصہ گذر گیا ہے کہ بہت سی باتیں ذہن سے اُتر گئی ہیں۔ وہ خون جو نذیر کی آنکھوں میں ایک عرصے سے اُتر رہا تھا۔ وہ اس وقت پی گیا اور ان دونوں پر ٹوٹ پڑا۔

آصف نے اپنے ماموں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ دونوں بے گناہ ہیں۔ ان کے درمیان ایسا کوئی رشتہ، ایسا کوئی تعلق نہیں جس کے لئے انھیں موردِ عتاب بنایا جائے۔ لیکن نذیر اس وقت کچھ بھی سُننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مار مار کے ان دونوں کی ہڈی پسلیاں توڑ دینا چاہتا ہے تاکہ سارا قصہ ہی ختم ہو، مگر مجید (مشہور ایکٹریس جواب پاکستان میں ہے) نے بڑی ہوشیاری سے بیچ بچاؤ کر دیا۔

نذیر مان گیا۔ وہ بہت کم کسی کی مانا کرتا ہے مگر ان دنوں مجید انگریزی محاورے کے مطابق اس کی ''اچھی کتابوں'' میں تھا۔

مجید کو آصف اور ستارہ کے معاشقے کا علم تھا۔ سُنا ہے کہ اس نے آصف کو کئی بار متنبہ کیا تھا کہ وہ اس خطرناک کھیل سے باز آ جائے، مگر جوانی کے وہ دیوانے دن جن میں سے آصف کی زندگی گذر رہی تھی۔ نہ مانے اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ راز جن کو وہ اپنی دانست کے مطابق بڑے دبیز پردوں کے اندر چھپائے بیٹھے تھے۔ فاش ہو گیا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نذیر جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں بہت سخت گیر آدمی ہے۔ مگر ایسے بہت کم آدمی ہیں جن کو معلوم ہے کہ وہ نرم دل بھی ہے۔ جو کام وہ خود کرتا ہے۔ اس کی اچھائی برائی کا شعور رکھتا ہے۔ جو اوسط درجے کا آدمی نہیں رکھتا۔ وہ ستارہ سے ایک عرصے تک جسمانی طور پر وابستہ رہا، لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ وابستگی آصف کی ستارہ سے بھی ہو۔

آصف اس کا بھانجا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسی رشتے کی بنا پر آصف اور ستارہ کا ملاپ پسند نہیں کرتا تھا مگر میں جو نذیر کے کردار کے تمام ٹیڑھے ترچھے زاویوں سے واقف ہوں، وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آصف کے بجائے کوئی اور آدمی ہوتا تو وہ اس سے بھی یہی کہتا کہ دیکھو اس عورت سے بچو۔ ایک صرف میں ہی تھا۔ جسے اپنی توانائی اور قوت پر ناز تھا۔ لیکن میں بھی ہار گیا۔

نذیر خلوص کا پتلا ہے۔ ایک ایسے خلوص کا جو ہر وقت بڑا درشت اور کھردرا لباس پہنے رہتا ہے۔

نذیر نے مجید کے کہنے پر ستارہ اور آصف دونوں کو چھوڑ دیا۔ اس لئے بھی کہ آصف نے اپنے ماموں کو یقین دلایا تھا کہ ان دونوں کے تعلقات بالکل پاک اور صاف ہیں۔

نذیر چلا گیا۔ مگر وہ مطمئن نہیں تھا۔ بظاہر وہ ایک اکھڑ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ شئے لطیف سے کورا، مگر وہ دوسروں کے دل کی گہرائیوں میں ایک ماہر غوطہ زن کی طرح اتر سکتا ہے۔ اور پھر وہ ستارہ کی ایک ایک رگ سے واقف تھا۔ اور جس عمر سے آصف گذر رہا تھا۔ اس میں تو وہ چھلانگیں لگاتا گذر چکا تھا۔ اس نے ایسی کئی منزلیں دیکھی تھیں جو آصف شاید ساری عمر میں بھی نہ دیکھ سکے ___ وہ مطمئن نہیں تھا۔

اس حادثے کے بعد آصف اور ستارہ کے درمیان کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ وعدے وعید ہوئے۔ قسمیں کھائی گئیں کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد آصف نے سچے عاشقوں کے انداز میں ستارہ سے رخصت لی اور چلا گیا۔

ستارہ نے اپنا میک اپ دُرست کیا۔ نئے کپڑے پہنے اور ٹیکسی منگوا کر پی۔ این۔ اروڑہ کے پاس چلی گئی۔ جس کی صحت دہلی کے حکیموں کے علاج سے اب کسی قدر بحال ہو چکی تھی۔ اور اس کے پچکے ہوئے گالوں میں تھوڑا سا گوشت آ گیا تھا۔

الناصر بھی تھا۔ ڈائرکٹر محبوب بھی تھے۔ اور خدا معلوم اور کتنے تھے۔ آصف گو ایک بہت ہی کڑے مرحلے سے گذر چکا تھا۔ مگر اس نے ستارہ کے یہاں اپنی آمد و رفت یکسر منقطع نہ کی۔ اور وہ کر بھی کیسے سکتا تھا جبکہ پرانی جادوگرنیوں کی طرح اس جادوگرنی نے آصف کو ایک مکھی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

بنا کر اپنی دیوار کے ساتھ چپکا رکھا تھا۔ اب صرف بخات کا ایک ہی راستہ تھا کہ پُرانی کہانیوں کا کوئی شہزادہ سلیمانی تعویذ کے ذریعے سے اس جادوگرنی کا مقابلہ کرتا اور انجام کار آصف اس کے چنگل سے نکلتا۔

میں جانتا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ طاقتور سے طاقتور سلیمانی تعویذ بھی ستارہ پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک ایسا حصار ہے جسے لندھور بھی سر نہیں کرسکتا۔

یہ چکر یونہی چلتا رہا۔ نذیر اور آصف کے تعلقات روز بروز "کشیدہ" ہوتے چلے جارہے تھے۔

ہاں میں ایک بات کہنا بھول ہی گیا۔ جب نذیر نے ستارہ کا بستر گول کیا تھا۔ تو رفیق غزنوی، مشہور موسیقار نے مفاہمت کی کوشش کی۔ اس نے ستارہ، اروڑہ اور نذیر کو اپنے یہاں بلایا۔ شراب کے دور چلے۔ رفیق نے جو گفتار کا غازی ہے۔ بڑے فلسفیانہ انداز میں کئی پیگ شراب کے علاوہ پلائے، مگر کوئی صورت پیدا نہ ہوئی اور جب کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو خود بخود ایک صورت پیدا ہوگئی۔ رات بھر ستارہ رفیق کے فلیٹ میں رہی اور وہ اس کو سمجھاتا رہا کہ اب کوئی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔

عجیب بات ہے کہ رفیق نے پھر مفاہمت کی کوشش نہ کی اور نہ ستارہ اس کے یہاں رات کو یہ سننے کے لئے گئی کہ اب کوئی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔ شاید اس کے لئے کہ ستارہ کے کئی توڑے میں رفیق کو ایک دو ماترے کم محسوس ہوئے ہوں گے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ستارہ نے یہ محسوس کیا ہو کہ رفیق سُر سے ایک آدھ سوتر اُوپر یا نیچے گاتا ہے...... اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

اب ہم پھر ستارہ اور آصف کی طرف پلٹتے ہیں۔ ستارہ اس پر بہت بُری طرح لٹو تھی کہ وہ نوجوان خام کار تھا۔ اس کی زندگی میں ستارہ شاید سب سے پہلی عورت تھی۔

کہا جاتا ہے کہ نذیر نے ایک بار پھر چھاپہ مارا اور دونوں کو عین موقع پر جا پکڑا۔ اس دفعہ کس نے بیچ بچاؤ کیا۔ اس کا مجھے علم نہیں بہر حال معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ کیونکہ آصف نے اپنے ماموں کو یقین دلایا کہ اس کے اور ستارہ کے درمیان ایسی ویسی کوئی بات نہیں، بہر حال آصف اور ستارہ کے سر سے آئی بلا ایک دفعہ پھر ٹل گئی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن آصف غائب ہوگیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ستارہ بھی غائب ہے۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ وہ کسی تیرتھ کی یاترا کرنے گئی ہے۔ اگر موسم حج کا ہوتا تو یار لوگ یقیناً اُڑا دیتے کہ حضرت آصف حج کرنے گئے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں وہ دونوں کہاں گئے تھے۔ مگر دہلی سے خبر موصول ہوئی کہ ستارہ مشرف

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

بہ اسلام ہو چکی ہے۔ اور اس کا اسلامی نام اللہ رکھی رکھا گیا ہے۔ اور یہ کہ آصف نے اس سے باقاعدہ نکاح پڑھوالیا ہے۔

اس کے ماموں نذیر پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا اس کے متعلق آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ مگر پُر لطف بات یہ ہے کہ ہندوؤں کے قانون کے مطابق طلاق ہو ہی نہیں سکتی۔ عورت ایک دفعہ کسی مرد سے وابستہ ہو جائے تو سو حیلے کرنے پر بھی خود کو اپنے پتی سے جدا نہیں کر سکتی۔ یوں وہ آوارہ گردی کر سکتی ہے۔ سینکڑوں مردوں کی آغوش کی زینت بن سکتی ہے مگر رہے گی اپنے پتی کی پتنی۔ اور یہ بھی ہے کہ ہندو عورت چاہے دوسرا مذہب اختیار کر لے مگر اس کی اصل پوزیشن میں فرق نہیں آسکتا۔ اس لحاظ سے گو ستارہ اللہ رکھی بن کر بیگم کے آصف ہو گئی تھی۔ مگر قانون کی نظروں میں وہ مسز ڈیسائی تھی۔ اس بیمار صورت ڈیسائی کی بیوی جو روٹی کمانے کے لئے بہت بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

جب اس خبر کی تصدیق ہو گئی تو میں نے ''مصور'' کے کالموں میں جی بھر کے لکھا۔ قریب قریب ہر ہفتے اس نئے بیاہتا جوڑے کا ذکر ہوتا تھا۔ بڑے طنزیہ، فرحیہ اور فکاہیہ انداز میں۔

ماہ غُسل یعنی ہنی مون منانے کے بعد جب یہ جوڑا بمبئی واپس آیا تو نذیر خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔ ایک دفعہ مجھے ریس کورس جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ہجوم میں سے آصف شارک سکن کے بے داغ سوٹ میں ملبوس پھرتیلی ستارہ کی کمر میں ہاتھ دیئے چلا آرہا ہے۔ جب وہ میرے قریب پہنچا تو وہ پہلے مسکرایا، پھر ہنسنے لگا۔ اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا۔ ''بھئی خوب ____ بہت خوب۔ ''نمک مرچ'' اور ''بال کی کھال'' کے کالموں میں تم جو لکھ رہے ہو خدا کی قسم لاجواب ہے۔''

ستارہ تیوری چڑھا کر ایک طرف ہٹ گئی مگر آصف نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی اور مجھ سے بڑے بلند بانگ خلوص کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ اور ان پڑھ ہونے کے باوجود مزاح اور فکاہ سمجھنے کی اہمیت رکھتا ہے۔

اب بمبئی میں ہر شخص کو جسے فلمی صنعت سے دلچسپی تھی۔ معلوم ہو چکا تھا کہ کوئی آصف ہے، جس سے ستارہ نے شادی کر لی ہے۔ بھنڈی بازار اور محمد علی روڈ کے ایرانی ہوٹلوں میں پنجاب اور یو پی کے مسلمان جو مسلم لیگ کی حمایت میں تھے، چائے کی پیالیاں سامنے رکھ کر اپنی بے پناہ مسرّت کا اظہار کرتے تھے کہ میاں بھائی، (مسلمان) نے ایک کافر عورت کو مسلمان کر کے اپنے عقد میں لے لیا۔

بعض کہتے تھے کہ آصف کو اب اس سالی سے ایکٹنگ نہیں کرانی چاہیے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

بعض کہتے تھے کوئی وانده (حرج) نہیں مگر جب باہر نکلے تو پردہ ضرور کیا کرے۔

بعض کہتے تھے۔ ہٹاؤ یار ـــ یہ سب اسٹنٹ ہے۔

بہر حال جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آصف، ستارہ سے قانونی طور پر شادی کر چکا تھا۔ مگر ایک عرصے کے بعد جب میں نے اس سے پوچھا ''کیوں دھانسو کیا واقعی ستارہ تمہاری منکوحہ بیوی ہے'' تو وہ ہنسا'' کیسا نکاح اور کیسی شادی''۔

اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اصل معاملہ کیا تھا اور کیا ہے۔

آصف کا اپنا مکان کوئی بھی نہیں تھا۔ بس دونوں وہیں خداداد سرکل (دادر) میں رہتے تھے۔ اور کھلے بندوں رہتے تھے۔ ستارہ کی موٹر تھی۔ اس میں گھومتے تھے۔

میرا خیال ہے، دہلی میں آصف نے شاید لالہ جگت نرائن کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اسے ایک فلم بنانے کا سرمایہ دے۔ اس سے شاید اس نے کچھ ایڈوانس بھی لیا ہوگا۔ جبھی تو وہ تنگ دست نہیں تھا۔

آصف میں ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ خود اعتماد ہے۔ اس کے اندر احساس کمتری کا شائبہ تک موجود نہیں۔ وہ بڑے بڑے ڈائریکٹروں اور اسٹوری رائٹروں کے چھکے چھڑا دیتا ہے۔ محض اپنی خداداد قابلیت کی بدولت۔ اس خداداد قابلیت کو میں ''ہاؤس سنس'' کہا کرتا تھا۔ آصف کے سامنے بھی مگر اس نے کبھی بُرا نہ مانا۔

آصف جب ڈائریکٹر بنا تو دوسرے تنگ خیال اور کم ظرف ڈائریکٹروں کے مانند اس نے اپنا حلقۂ فکر و نظر محدود نہ رکھا۔ اس نے ہر دماغ کو دعوت دی کہ وہ کوئی اچھی چیز پیش کرے، جسے وہ بخوبی قبول کرے گا۔

میں خدا معلوم کہاں کا کہاں چلا گیا ہوں، مگر یہاں مجھے ایک لطیفے کا ذکر کرنا اس لئے دلچسپ معلوم ہوتا ہے کہ میری ذات سے متعلق ہے۔

آصف ان دنوں ''پھول'' بنا رہا تھا۔ میں اپنے فلیٹ واقع کلیئر روڈ میں تھا کہ نیچے سے موٹر کے ہارن کی تابڑ توڑ آوازیں آئیں۔ میں نے باہر بالکنی میں نکل کر دیکھا۔ ایک بہت بڑی موٹر نیچے کھڑی تھی۔ جب میں جنگلے پر جھکا تو پچھلی سیٹ سے آصف نے کھڑکی میں سے اپنا وزنی سر باہر نکالا اور مسکرایا۔ میں نے اس سے کہا ''آؤ کیا بات ہے؟''

اس نے دروازہ کھولا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ستارہ سے کچھ کہا۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا'' آتا ہوں اور بتاتا ہوں۔''

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

لمبی چوڑی موٹر کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ چشم زدن میں ڈلفی چیمبرز کے احاطے سے باہر نکل گئی۔ آصف نے سیڑھیوں کا رُخ کیا۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ ایک منٹ میں آصف اندر داخل ہوا اور بڑے پُر جوش انداز میں مجھ سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا۔ "میں تمہیں اپنی کہانی سُنانے آیا ہوں۔"

میں نے ازراہِ مذاق کہا "تمہیں معلوم ہے۔ میں فیس لیا کرتا ہوں۔"

آصف نے کچھ نہ کہا، مجھ سے ہاتھ ملایا اور اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ میں نے اس کو آوازیں دیں۔ اس کے پیچھے دوڑتا گیا۔ مگر اس نے میری ایک نہ سُنی بس اتنا کہا کہ وہ فیس لے کر آئے گا تو کہانی سنائے گا۔ ورنہ نہیں۔

میں بہت پشیمان ہوا کہ میں نے اس سے ایسا مذاق کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ میری اس بات کو اسی رنگ میں لے گا جس رنگ میں وہ کہی گئی تھی مگر معاملہ اس کے برعکس نکلا اور وہ چلا گیا۔

میں اُوپر آیا اور اپنی بیوی سے سارا قصہ بیان کیا۔ تو اس نے صاف لفظوں میں کہا کہ یہ میری عین حماقت تھی۔ اس لئے کہ آصف میرا بے تکلف دوست نہیں تھا۔ اور یہ واقع ہے کہ اس کے اور میرے مراسم کچھ زیادہ نہیں تھے۔ چونکہ وہ اور میں طبعاً صاف گو، دل شکن حد تک صاف گو ہیں۔ اس لئے میں نے جب اس سے فیس کا مذاق کیا تھا تو میرے دل و دماغ میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے مجھے اس کے جذبات مجروح کرنا مطلوب تھے۔ اور نہ میں ایسا بنیا ہوں کہ اس سے پہلے ہی روپے کا تقاضا کرتا۔ مجھے تو صرف کہانی سُننا تھی۔ اور بس۔

اور میں کئی ڈائریکٹروں سے ان کی تھرڈ کلاس کہانیاں ایک نہیں چار چار مرتبہ سن چکا تھا۔ کیونکہ وہ میری رائے کے طالب ہوتے تھے۔ میں نے ان سے کبھی اپنے وقت کی (جو کہ ظاہر ہے ضائع ہوتا تھا) قیمت طلب نہیں کی تھی۔

مجھے افسوس تھا کہ میں نے آصف کو ناراض کیا۔ میں اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے فوراً دروازہ کھولا۔ ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دیا اور چلا گیا۔ میں ابھی لفافہ کھول ہی رہا تھا کہ نیچے سے ہارن کی آواز آئی۔ میں نے بالکنی میں جا کر دیکھا۔ ستارہ کی کار تھی۔ اور وہ اڈلفی چیمبرز کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

لفافہ کھول کر میں نے دیکھا کہ سو سو کے پانچ نوٹ ہیں۔ ان کے ساتھ ایک مختصری تحریر تھی۔ "فیس حاضر ہے۔ اب میں کل آؤں گا۔" میں بھونچکا ہو کے رہ گیا۔

دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب وہ اسی کار میں آیا۔ ستارہ ساتھ تھی، مگر وہ اُوپر نہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

آئی۔ آصف کو دستک دینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، اس لئے کہ دروازہ کھلا تھا۔ اور میں اس کے استقبال کے لئے دہلیز میں کھڑا تھا۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "کیوں ڈاکٹر صاحب، فیس مل گئی آپ کو؟" میں بہت شرمندہ ہوا۔ جس کا اظہار میں نے بڑے پُر خلوص اور موزوں و مناسب الفاظ میں کیا۔ اور وہ پانچ سو اس کو واپس کرنا چاہے۔

آصف اپنے مخصوص انداز میں ہنسا اور صوفے پر اپنی نشست جما کر کہنے لگا "منٹو صاحب۔ آپ کس خیال میں ہیں۔ یہ پیسہ میرا ہے۔ نہ میرے باپ کا۔ پروڈیوسر کا ہے۔ غلطی میری تھی جو میں بغیر فیس کے چلا آیا۔ حالانکہ میری نیت واللہ ہرگز یہ نہیں تھی کہ مفتوں مفتی کام کرا یا جائے۔ آپ کا وقت یقیناً ضائع ہوگا۔ اور اس کی قیمت بھی خدا کی قسم آپ کو ضرور ملنی چاہئے لیکن اب چھوڑیئے اس بکواس کو اور کہانی سُنیئے۔"

اس نے مجھے کچھ اور کہنے کی مہلت نہ دی۔ وہ بڑے صوفے پر تھا۔ میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ آصف کو میں نے کبھی کہانی سنانے یا سُننے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی بوسکی کی قمیض کی آستینیں اُوپر چڑھائیں۔ پتلون کے اُوپر کے بٹن جو پیٹی کا کام دیتے ہیں کھولے اور صوفے پر ایک آسن جما کر کہانی سُنانے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ "ہاں تو کہانی سُنیئے۔ عنوان ہے، "پھول"۔ کیا خیال ہے آپ کا عنوان کے متعلق؟ میں نے کہا "اچھا ہے"۔

"شکریہ ___ اب آپ سنئے ___ میں آپ کو منظر بہ منظر سُناتا ہوں"۔

اور اس نے اپنی کہانی جو خدا معلوم کس کی لکھی تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں سُنانا شروع کی۔ یہ مخصوص انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ کہانی سُنانے کے دوران میں وہ مداری پن کرتا ہے یعنی حسب ضرورت واقعات کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ خود بھی اترتا چڑھتا رہتا ہے۔ ابھی وہ صوفے پر ہے۔ چند لمحات کے بعد اس کی پشت کی دیوار پر، دوسرے لمحے اس کا سر نیچے ہے اور ٹانگیں اُوپر اور دھم سے نیچے فرش پر۔ اس کے فوراً بعد کرسی پر اکڑوں بیٹھا ہے۔ مگر فوراً اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ الیکشن میں کوئی آدمی ووٹ حاصل کرنے کے لئے تقریر کر رہا ہے۔

کہانی ختم ہوئی ___ بڑی لمبی کہانی۔ شیطان کی آنت کی طرح۔

چند لمحات خاموشی میں گذرے۔ اس کے بعد آصف نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا خیال ہے۔ آپ کا کہانی کے متعلق۔"

میرے مُنہ سے یہ الفاظ خود بخود نکل گئے۔ بکواس ہے؟

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

آصف نے زور زور سے اپنے ہونٹ کاٹے اور بوکھلا کر صوفے کی پُشت کی دیوار پر بیٹھ گیا اور غصب ناک لہجے میں پُوچھا کیا کہا؟“

کوئی اور ہوتا تو بہت ممکن ہے لڑکھڑا جاتا، مگر میں ہمیشہ ایسے معاملوں میں ثابت قدم رہا ہوں، چنانچہ میں نے اور زیادہ مضبوطی سے کہا۔

”میں نے کہا تھا بکواس ہے۔“

آصف نے اپنے مداری پن سے مجھے متاثر کرنے کی بہت کوشش کی۔ مجھے فضول کی جھک جھک پسند نہیں تھی۔ وہ بہت اُونچے سروں میں بولتا تھا۔ میں نے سوچا، اس کا علاج یہی ہے کہ ایک دفعہ میں بھی اپنے حلق کو کھلی چھٹی دے دوں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا ”سُنئے آصف صاحب۔ آپ ایک بہت وزنی پتھر منگوائیے، اس کو میرے سر پر رکھئے اور اس پر وزنی ہتھوڑے ماریئے۔ خدا کی قسم میں پھر بھی کہوں گا کہ آپ کی یہ کہانی بکواس ہے۔“

یہ سب کچھ میں نے بہت اُونچے سروں میں کہا تھا۔ آصف صوفے کی پُشت کی دیوار پر سے نیچے اُتر آیا۔ آگے بڑھ کر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اپنے ہونٹ چوستے ہوئے کہا ”خدا کی قسم بالکل بکواس ہے۔ میں تم سے یہی سُننے آیا تھا۔“

میں سمجھا شاید مذاق کر رہا ہے۔ لیکن چند لمحات کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ قطعاً سنجیدہ تھا۔ چنانچہ ہم کہانی میں ترمیم و اصلاح کے متعلق سوچنے لگے۔

لطیفہ ختم ہوا۔ یہ میری ذات سے یقیناً متعلق ہے، مگر اس کے بیان سے مقصود صرف یہ تھا کہ آپ کو آصف اور ستارہ کے کردار کا تقابل نظر آ جائے۔

ایک زمانہ گذر گیا۔ آصف اور ستارہ میاں بیوی کی زندگی گذار رہے تھے مگر یہاں مجھے ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔

جس زمانے میں آصف سے میری دوستی نہیں تھی۔ اور اس کا تعلق بھی ستارہ کے ساتھ قائم نہیں ہوا تھا۔ آصف صاحب کے چہرے پر بلا مبالغہ دس ہزار کیلیں تھیں اور اتنے ہی مہاسے تھے۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ جوانی کی نشانیاں ہیں۔ میں سوچتا تھا اگر جوانی کی نشانیاں اتنی بدنما اور تکلیف دیں تو خدا کرے کسی پر جوانی نہ آئے (مجھ پر اللہ کا شکر ہے۔ کبھی آئی ہی نہیں)۔

میں جب اس کے چہرے کی طرف دیکھتا جو کہ بلا مبالغہ خانۂ زنبور دکھائی دیتا تھا۔ تو مجھے بڑی کوفت ہوتی۔ میں نیم حکیم بھی ہوں۔ اپنی دانست کے مطابق اور اپنے ڈاکٹر دوستوں سے مشورہ کر کے میں نے کئی دوائیں خرید کر اس کو دیں مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کیلیں اسی طرح موجود تھیں۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

مگر جب ستارہ اس کی زندگی میں آئی تو چند مہینوں کے اندر اندر اس کا چہرہ بالکل صاف ہوگیا۔ صرف نشان باقی رہ گئے تھے۔

ایک اور لطیفہ سن لیجئے۔ بمبئی ٹاکیز میں کمال امروہوی اور میں دونوں اکٹھے کام کر رہے تھے۔ اس کی کہانی ''محل'' کو فلم کے لئے موزوں و مناسب شکل دینے کے لئے سوچ بچار ہو رہی تھی۔ اس دوران میں کمال کے داہنے گال پر ایک چھوٹی سی پھنسی نمودار ہوئی جو اس کو بہت تکلیف دینے لگی۔ اس نے اس تکلیف کا ذکر مجھ سے کیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ایک بڑا سہل علاج ہے۔ اور تیر بہدف۔''

اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا؟''

''میں نے اس سے کہا'' تم ستارہ کا گھر جانتے ہو نا؟
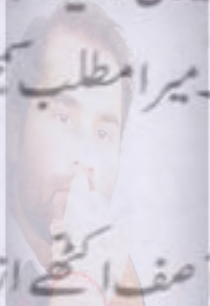
''ہاں ہاں، کیوں نہیں!''

تو ایسا کرو۔ اس کی سیڑھیوں کا ایک چکر لگاؤ ___ مگر دیکھو اندر نہیں جانا۔''

کمال ذہین آدمی ہے۔ میرا مطلب سمجھ گیا اور بہت دیر تک ہنستا رہا۔

لطیفے ختم ہوئے۔

بہت دیر تک ستارہ اور آصف اکٹھے ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ اب دونوں غالباً ماہم کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے ___ ہاں وہیں رہتے تھے۔ کیونکہ وہاں میرا کئی مرتبہ آنا جانا ہوا۔ لیڈی جمشید جی روڈ کے چرچ کے سامنے ایک گلی تھی۔ جس کے آخری سرے پر ایک تین منزلہ بلڈنگ۔ غالباً تیسری منزل پر ستارہ کا فلیٹ تھا۔

مجھے یہاں جانے کا کئی بار اتفاق ہوا تھا۔ ان دنوں آصف ''پھول'' بنانے کے بعد غالباً ''انارکلی'' بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی کہانی کمال امروہوی نے لکھی تھی۔ مگر وہ شاید اس سے مطمئن نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کئی آدمیوں کو دعوت دے چکا تھا کہ وہ اس میں کچھ جدّت پیدا کریں۔ میں بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔

میں عام طور پر صبح آٹھ بجے کے قریب وہاں پہنچتا۔ دروازہ ایک بڑھیا کھولتی۔ جو ململ کی باریک ساڑی پہنے ہوتی۔ اسے دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہوتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ دروازہ الف لیلیٰ کی کسی کٹنی نے کھولا ہے۔

میں اندر جاتا اور صوفے پر بیٹھ جاتا۔ ساتھ والے کمرے سے جو غالباً خواب گاہ تھی۔ ایسی ایسی آوازیں آتیں کہ روح لرز لرز جاتی۔ تھوڑی دیر کے بعد آصف نمودار ہوتا۔ حسبِ عادت

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اپنے ہونٹ چاٹتے ہوئے۔ اس کی ہیئت کذائی دیکھنے کی چیز تھی۔ ململ کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔ گردن اور سینے پر نیل پڑے ہیں۔ بال پریشان ہیں۔ سانس پھولی ہوئی ہے۔ معمولی علیک سلیک ہوتی۔ اور وہ فرش پر ڈھیر ہو جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ستارہ، آصف کے لئے ایک پیالہ بھیجتی۔ جس میں معلوم نہیں کس چیز کی کھیر ہوتی۔ آصف آہستہ آہستہ بادل نخواستہ پیالہ ختم کرتا، اس کے بعد ہم اپنا کام شروع کر دیتے۔ جو زیادہ تر گپوں پر مشتمل ہوتا۔

کافی عرصہ گذر گیا۔ ستارہ اور آصف کے تعلقات بڑے مستحکم نظر آتے تھے، مگر ایک دم جانے کیا ہوا کہ یہ سننے میں آیا کہ آصف اپنے عزیزوں میں کسی لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ تاریخ پکی ہوگئی۔ اور وہ عنقریب اپنے دوستوں کے ساتھ لاہور روانہ ہونے والا ہے۔

میں ان دنوں بہت مصروف تھا۔ ورنہ اس سے مل کر ضرور دریافت کرتا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ لیکن مجھے اس کا موقع نہ ملا۔ لیکن ایک روز اس سے سر راہ ملاقات ہوگئی۔ میں نے سرسری طور پر اس سے پوچھا تو اس نے صرف اتنا کہا ''میں نے وہ قصہ ختم کر دینے کی ٹھانی تھی۔ چنانچہ ہو جائے گا۔''

وہ کار میں تھا۔ میں پیدل تھا۔ اور اس کو عجلت بھی تھی۔ اس لئے زیادہ باتیں نہ ہو سکیں۔ چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ آصف ایک بہت بڑی پارٹی کے ساتھ روانہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد یہ اطلاع ملی کہ لاہور میں اس کی شادی بڑے ٹھاٹ سے ہوئی۔ خم کے خم لنڈھائے گئے۔ مجرے ہوئے اور راگ رنگ کی کئی محفلیں جمیں پھر سنا کہ آصف اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ بمبئی پہنچ چکا ہے۔ اور پالی ہل باندرہ میں اس نے ایک کوٹھی کا نصف حصہ کرائے پر اٹھالیا ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ پوری کوٹھی نذیر کے پاس تھی۔ جس نے آدھی اپنے بھانجے کو دے دی۔

یہ بڑا خوشگوار انقلاب تھا۔ مجھے معلوم نہیں ستارہ کا ردعمل کیا تھا۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اروڑہ کے ہاں وہ اکثر جایا کرتی تھی۔ اور وہ بھی اس کے ہاں اکثر آیا کرتا تھا۔

ان دنوں آصف پالی ہل پر رہتا تھا۔ نئی نویلی دلہن پاس تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ان دنوں ''مغل اعظم'' کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس کی کہانی کمال حیدر امروہوی نے لکھی تھی۔ مگر آصف اس سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے کئی انشاء پردازوں سے مشورہ لیا تھا مگر وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔

اس ضمن میں آپ کو کئی لطیفے سنا سکتا ہوں۔ مگر ان سے کوئی مطلب حل نہیں ہوگا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ آصف اور اس کی نئی نویلی بیوی، سہرے جلوؤں کی بیاہی چند روز اکٹھے رہے، اس کے بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ آصف صاحب گھر سے غائب ہیں اور راتیں ستارہ کے ساتھ گذارتے ہیں۔

یہ شادی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ نذیر کا نوجوان لڑکا بھی وہیں تھا۔ معلوم نہیں کیا ہوا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

کہ آصف نے اپنی بیوی کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ ناچاقی ہوئی۔ اس کے بعد پتہ چلا کہ طلاق ہونے والی ہے۔ اور اس دوران میں آصف برابر ستارہ کے یہاں جاتا تھا۔
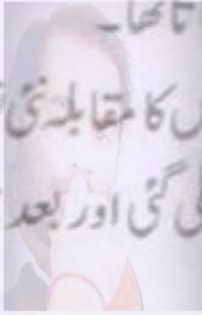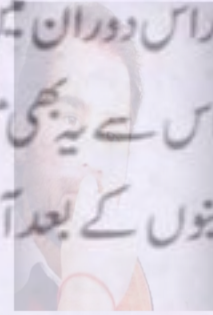
اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ستارہ کاریگر ہے۔ اس کا مقابلہ نئی نویلی دلہن نہیں کر سکتی۔ چنانچہ چند مہینوں کے بعد آصف کی دلہن اپنے گھر واپس چلی گئی اور بعد میں معلوم ہوا کہ طلاق ہوگئی ہے۔

اب پھر آصف اور ستارہ اکٹھے تھے۔ آصف کی بیاہتا بیوی کے متعلق کئی افسانے مشہور ہیں۔ مگر میں ان کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ مجھے ان کی صداقت کے متعلق اچھی طرح علم نہیں۔

میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آصف نے بیاہ کیا۔ لاہور میں بڑے ٹھاٹ کی مجلسیں جمیں، اس کے بعد آصف اپنی بیوی کو لے کر بمبئی آیا۔ پالی ہل پر ٹھہرا اور دو تین مہینے کے اندر اندر اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا ــــــ اس کی وجہ ستارہ کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔

ستارہ مردم شناس عورت ہے۔ اس کو وہ تمام ڈھب آتے ہیں جو مرد کو اپنی طرف راغب کر سکتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ اسے دوسری عورتوں کے لئے بالکل ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آصف نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا اور ستارہ کی آغوش میں چلا گیا۔ اس لئے کہ اس میں کشش تھی۔

آصف کی شادی اپنے خاندان میں ہوئی تھی۔ اس خاندان کے متعلق مختلف روایات مشہور ہیں۔ لیکن میں ان کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا۔

آصف نے اپنی بیاہتا بیوی کو چھوڑ دیا۔ شاید اس لئے کہ اس میں وہ خصوصیتیں موجود نہیں تھیں، جو ستارہ میں تھیں۔ شاید اس لئے کہ آصف کنواری لڑکی کا قائل نہیں تھا۔ بہرحال جو نتیجہ برآمد ہوا وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔

آصف کی نئی نویلی دلہن چلی گئی اور آصف نے پھر سے ستارہ کے یہاں قیام شروع کر دیا، اس قیام کے دوران میں عجیب و غریب افواہیں منتشر ہوئیں مگر میں ان کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

میں نے یہ مضمون لکھا ہے، مجھے معلوم ہے کہ آصف مجھ سے ناراض نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ ستارہ یقیناً ناراض ہوگی ــــــ مگر وہ مجھے تھوڑی دیر کے بعد بخش دے گی۔ اس لئے کہ اس کا ظرف بھی چھوٹا نہیں ہے۔ وہ بڑی قد آور عورت ہے۔ (حالانکہ اس کا قد بہت پست ہے۔) ــــــ وہ مجھے معلوم نہیں کیسا آدمی سمجھتی ہے۔ مگر میں اسے بحیثیت عورت کے ایک عورت سمجھتا ہوں، جو سو سال میں شاید ایک مرتبہ پیدا ہوتی ہے۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# سعادت حسن منٹو
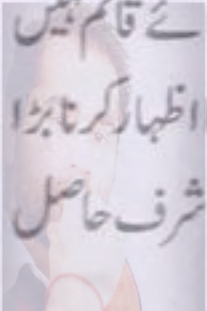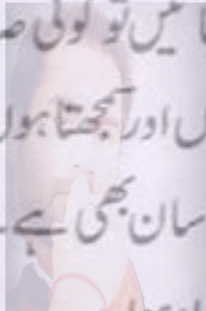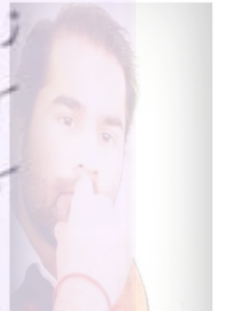
منٹو کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ اس کے حق میں کم اور خلاف زیادہ۔ یہ تحریریں اگر پیشِ نظر رکھی جائیں تو کوئی صاحبِ عقل منٹو کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے۔ اس لئے کہ منٹو سے مجھے قربت کا شرف حاصل رہا ہے اور سچ پوچھئے تو منٹو کا میں ہمزاد ہوں۔

اب تک اس شخص کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اتنا سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے حقیقت سے بالاتر ہے۔ بعض لوگ اسے شیطان کہتے ہیں بعض گنجا فرشتہ ___ ذرا ٹھہرئے میں دیکھ لوں کہیں وہ کم بخت سن تو نہیں رہا ___ نہیں نہیں، ٹھیک ہے مجھے یاد آ گیا کہ یہ وقت ہے۔ جب وہ پیا کرتا ہے۔ اس کو شام کے چھ بجے کڑوا شربت پینے کی عادت ہے۔

ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے۔ اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے۔ اسی لئے میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نبھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگر وہ زندہ رہا اور میں مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہو گئی ہے۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ منٹو ایسا ون ٹو آدمی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ جسے اگر جمع کیا جائے تو وہ تین بن جائے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مثلث کے بارے میں اس کی معلومات کافی ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ابھی اس کی نہیں ہوئی۔ یہ اشارے ایسے ہیں صرف باقہم سامعین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یوں تو منٹو کو میں اس کی پیدائش ہی سے جانتا ہوں ___ ہم دونوں اکٹھے ایک ہی وقت گیارہ مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے ___ لیکن اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ خود کو کچھوا بنائے رکھے۔ جو ایک دفعہ اپنا سر اور گردن اندر چھپالے تو آپ لاکھ ڈھونڈتے رہیں۔ اس کا سراغ نہ ملے۔ لیکن میں بھی آخر اس کا ہمزاد ہوں۔ میں نے اس کی ہر جنبش کا مطالعہ کر ہی لیا۔

لیجئے، اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ خرذات افسانہ نگار کیسے بنا ___ تنقید نگار بڑے لمبے چوڑے مضامین لکھتے ہیں۔ اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شوپن ہار، فرائڈ، ہیگل، نطشے، مارکس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مگر حقیقت سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

منٹو کی افسانہ نگاری متضاد عناصر کے تصادم کا نتیجہ ہے۔ اس کے والد خدا انہیں بخشے، بڑے سخت گیر تھے اور اس کی والدہ بے حد نرم دل۔ ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانہ گندم کس شکل میں باہر نکلا ہوگا۔ اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

اب میں اس کی اسکول کی زندگی کی طرف آتا ہوں۔ بہت ذہین لڑکا تھا۔ اور بے حد شریر۔ اس زمانے میں اس کا قد زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین فٹ ہوگا۔ وہ اپنے باپ کا آخری بچہ تھا۔ اس کو اپنے ماں باپ کی محبت تو میسر تھی لیکن اس کے تین بڑے بھائی جو عمر میں اس سے بہت بڑے تھے اور ولایت میں تعلیم پا رہے تھے۔ ان سے اس کو کبھی ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس لئے کہ وہ سوتیلے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملیں۔ اس سے بڑے بھائیوں ایسا سلوک کریں لیکن یہ سلوک اسے اس وقت نصیب ہوا جب دنیائے ادب اسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر چکی تھی۔

اچھا اب اس کی افسانہ نگاری کے متعلق سنئے۔ وہ اوّل درجے کا فراڈ ہے۔ پہلا افسانہ اس نے بعنوان "تماشا" لکھا جو جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثہ سے متعلق تھا۔ یہ اس نے اپنے نام سے نہ چھپوایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پولیس کی دست برد سے بچ گیا۔

اس کے بعد اس کے متلون مزاج میں ایک لہر پیدا ہوئی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اس نے انٹرنس کا امتحان دو بار فیل ہو کر پاس کیا تھا، وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں اور آپ کو یہ سن کر بھی حیرت ہوگی کہ وہ اردو کے پرچے میں ناکام رہا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ وہ اردو کا بہت بڑا ادیب ہے، اور میں یہ سن کر ہنستا ہوں، اس لئے کہ اردو اب بھی اسے نہیں آتی۔ وہ لفظوں کے پیچھے یوں بھاگتا ہے جیسے کوئی جالی والا شکاری تتلیوں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کے پیچھے۔ وہ اس کے ہاتھ نہیں آتیں یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر میں خوبصورت الفاظ کی کمی ہے۔ وہ لٹھ مار ہے لیکن جتنے لٹھ اس کی گردن پر پڑے ہیں اس نے بڑی خوشی سے برداشت کئے ہیں۔

اس کی لٹھ بازی عام محاورے کے مطابق جاٹوں کی لٹھ بازی نہیں ہے وہ بنوٹ اور پھیکت ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا۔ بلکہ تنے ہوئے رسّے پر چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا، اب گرا ___ لیکن وہ کم بخت آج تک کبھی نہیں گرا ___ شاید گر جائے اوندھے منہ..... کہ پھر نہ اٹھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ مرتے وقت وہ لوگوں سے کہے گا کہ میں اسی لئے گرا تھا کہ گراوٹ کی مایوسی ختم ہو جائے۔

میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ منٹو اوّل درجے کا فراڈ ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ وہ افسانہ نہیں سوچتا، خود افسانہ اسے سوچتا ہے۔ یہ بھی ایک فراڈ ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جب اسے افسانہ لکھنا ہوتا ہے تو اس کی وہی حالت ہوتی ہے۔ جب کسی مرغی کو انڈا دینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ انڈا کہیں چھپ کر نہیں دیتا۔ سب کے سامنے دیتا ہے۔ اس کے دوست یار بیٹھے ہوتے ہیں، اس کی تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں اور وہ اپنی مخصوص کرسی پر اکڑوں بیٹھا انڈے دیا جاتا ہے۔ جو بعد میں چوں چوں کرتے افسانے بن جاتے ہیں۔ اس کی بیوی اس سے بہت نالاں ہے۔ وہ اس سے اکثر کہا کرتی ہے کہ تم افسانہ نگاری چھوڑ دو، کوئی دکان کھول لو۔ لیکن منٹو کے دماغ میں جو دکان کھلی ہے اس میں منہاری کے سامان سے کہیں زیادہ سامان موجود ہے اس لئے وہ اکثر سوچا کرتا ہے کہ اگر میں نے کبھی کوئی اسٹور کھول لیا تو ایسا نہ ہو کہ وہ کولڈ اسٹوریج یعنی سرد خانہ بن جائے۔ جہاں اس کے تمام خیالات و افکار منجمد ہو جائیں۔

میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ منٹو مجھ سے خفا ہو جائے گا۔ اس کی ہر چیز برداشت کی جاسکتی ہے لیکن خفگی نہیں کی جاسکتی۔ خفگی کے عالم میں وہ بالکل شیطان بن جاتا ہے لیکن صرف چند منٹوں کے لئے۔ اور یہ چند منٹ، اللہ کی پناہ.....

افسانے لکھنے کے معاملے میں وہ نخرے ضرور بگھارتا ہے لیکن میں جانتا ہوں، اس لئے..... کہ اس کا ہمزاد ہوں ___ کہ وہ فراڈ کر رہا ہے۔ اس نے ایک دفعہ خود لکھا تھا کہ اس کی جیب میں بے شمار افسانے پڑے ہوتے ہیں، حقیقت اس کے برعکس ہے۔

جب اسے افسانہ لکھنا ہوگا تو وہ رات کو سوچے گا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ صبح پانچ بجے اٹھے گا۔ اور اخباروں سے کسی افسانے کا رس چوسنے کا خیال کرے گا لیکن اسے ناکامی ہوگی پھر وہ غسل خانے میں جائے گا۔ وہاں اپنے شوریدہ جسم کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سوچنے کے قابل ہو سکے۔ لیکن ناکام رہے گا۔ پھر جھنجھلا کر اپنی بیوی سے خواہ مخواہ کا جھگڑا شروع کردے گا۔ یہاں سے بھی ناکامی ہوگی تو پان لینے کے لئے چلا جائے گا۔ پان اس کی میبل پر پڑا رہے گا۔ لیکن افسانے کا موضوع پھر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ آخر وہ انتقامی طور پر قلم یا پنسل ہاتھ میں لے لے گا اور ۷۸۶ لکھ کر جو پہلا فقرہ اس کے ذہن میں آئے گا اس سے افسانے کا آغاز کردے گا۔ "بابو گوپی ناتھ"، "ٹوبہ ٹیک سنگھ"، ہتک، ممی، موذیل" یہ سب افسانے اس نے اسی فراڈ طریقہ سے لکھے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ لوگ اسے بڑا غیر مذہبی اور فحش انسان سمجھتے ہیں اور میرا بھی خیال ہے کہ وہ کسی حد تک اس درجہ میں آتا ہے اس لئے کہ اکثر اوقات وہ بڑے گندے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور ایسے الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کرتا، جن پر اعتراض کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ جب بھی اس نے کوئی مضمون لکھا۔ پہلے صفحے کی پیشانی پر ۷۸۶ ضرور لکھا، جس کا مطلب ہے بسم اللہ...... اور یہ شخص جو اکثر خدا سے منکر نظر آتا، کاغذ پر مومن بن جاتا ہے، پر وہ کاغذی منٹو ہے۔ جسے آپ کاغذی باداموں کی طرح صرف انگلیوں ہی میں توڑ سکتے ہیں۔ ورنہ وہ لوہے کے ہتھوڑے سے بھی ٹوٹنے والا آدمی نہیں۔

اب میں منٹو کی شخصیت کی طرف آتا ہوں جو چند الفاظ میں بیان کئے دیتا ہوں۔ وہ چور ہے ___ جھوٹا ہے ___ دغا باز ہے اور مجمع گیر ہے۔ اس نے اکثر اپنی بیوی کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کئی سو روپے اڑا دئے ہیں۔ ادھر آٹھ سو لا کے دیئے اور چور آنکھ سے دیکھتا رہا کہ اس نے کہاں رکھے ہیں۔ اور دوسرے دن ان میں سے ایک سبزہ غائب کردیا اور اس بیچاری کو جب اپنے اس نقصان کی خبر ہوئی تو اس نے نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کردیا۔

یوں تو منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ راست گو ہے لیکن میں اس سے اتفاق کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اول درجے کا جھوٹا ہے۔ شروع شروع میں اس کا جھوٹ اس کے گھر چل جاتا تھا۔ اس لئے کہ اس میں منٹو کا ایک خاص ٹچ ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں اس کی بیوی کو معلوم ہوگیا کہ اب تک مجھ سے خاص معاملہ کے مطابق جو کچھ کہا جاتا تھا، جھوٹ تھا ___ منٹو جھوٹ بقدرِ کفایت بولتا ہے لیکن اس کے گھر والے، مصیبت ہے کہ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس کی ہر بات جھوٹی ہے، اس تل کی طرح جو کسی عورت نے اپنے گال پر سرمے سے بنا رکھا ہو۔

وہ ان پڑھ ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا۔ فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری، ہیگل کا وہ صرف نام ہی جانتا ہے، ہیولک ایلس کو وہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

صرف نام سے جانتا ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ، میرا مطلب ہے تنقید نگار، یہ کہتے ہیں کہ وہ ان تمام مفکروں سے متاثر ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، منٹو کسی دوسرے شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب چغد ہیں۔ دنیا کو سمجھانا نہیں چاہئے اس کو خود سمجھنا چاہئے۔

خود کو سمجھا کر وہ ایک ایسی سمجھ بن گیا ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ بعض اوقات ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے۔

میں آپ کو پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ منٹو، جس پر فحش نگاری کے سلسلے میں کئی مقدمے چل چکے ہیں، بہت طہارت پسند ہے۔ لیکن میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک ایسا پاانداز ہے جو خود کو جھاڑتا پھٹکتا رہتا ہے۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
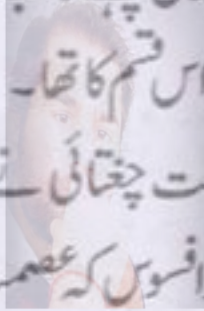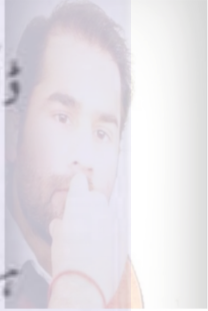
# عصمت چغتائی

آج سے تقریباً ڈیڑھ برس پہلے جب میں بمبئی میں تھا۔ حیدر آباد سے ایک صاحب کا ڈاک کارڈ موصول ہوا۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

”یہ کیا بات ہے کہ عصمت چغتائی نے آپ سے شادی نہ کی؟ منٹو اور عصمت اگر یہ دو ہستیاں مل جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا مگر افسوس کہ عصمت نے شاہد سے شادی کر لی اور منٹو.....

ان ہی دنوں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ میں اس میں شریک نہیں تھا۔ لیکن حیدر آباد کے ایک پرچے میں اس کی روداد دیکھی، جس میں یہ لکھا تھا کہ وہاں بہت سی لڑکیوں نے عصمت کو گھیر کر یہ سوال کیا۔ آپ نے منٹو سے شادی کیوں نہ کی؟“

مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات درست ہے یا غلط لیکن جب عصمت چغتائی واپس آئی تو اس نے میری بیوی سے کہا کہ حیدر آباد میں جب ایک لڑکی نے اس سے سوال کیا ”کیا منٹو کنوارا ہے؟“ تو اس نے ذرا طنز کے ساتھ جواب دیا۔ ”جی نہیں۔“ اس پر وہ محترمہ عصمت کے بیان کے مطابق کچھ کھسیانی سی ہو کر خاموش ہو گئیں۔

واقعات کچھ بھی ہوں۔ لیکن یہ بات غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے کہ سارے ہندوستان میں ایک صرف حیدر آباد ہی ایسی جگہ ہے، جہاں مرد اور عورتیں میری اور عصمت کی شادی کے متعلق فکر مند رہے ہیں۔

اس وقت تو میں نے غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں اگر میں اور عصمت واقعی میاں بیوی بن جاتے تو کیا ہوتا؟ یہ ”اگر“ بھی کچھ اسی قسم کی اگر ہے۔ اگر کہا جائے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ایک انچ کا اٹھارھواں حصہ بڑی ہوتی تو اس کا اثر وادی نیل کی تاریخ پر کیا پڑتا ___ لیکن یہاں عصمت قلوپطرہ ہے اور نہ منٹو انطنی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر منٹو اور عصمت کی شادی ہو جاتی تو اس حادثے کا اثر عہدِ حاضر کے افسانوی ادب کی تاریخ پر ایٹمی حیثیت رکھتا، افسانے افسانے بن جاتے، کہانیاں مڑ تڑ کر پہیلیاں ہو جاتیں۔ انشاء کی چھاتیوں میں سارا دودھ خشک ہو کر یا تو ایک سفوف کی شکل اختیار کر لیتا یا بھسم ہو کر راکھ بن جاتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح نامے پر ان کے دستخط ان کے قلم کی آخری تحریر ہوتے لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ ہوتا۔ زیادہ قرین قیاس تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح نامے پر دونوں افسانے لکھتے اور قاضی صاحب کی پیشانی پر دستخط کر دیتے تا کہ سند رہے۔ نکاح کے دوران میں کچھ ایسی باتیں بھی ہو سکتی تھیں۔

"عصمت، قاضی صاحب کی پیشانی ایسا لگتا ہے تختی ہے۔"

"کیا کہا!"

"تمہارے کانوں کو کیا ہو گیا ہے؟"

میرے کانوں کو تو کچھ نہیں ہوا ___ تمہاری اپنی آواز حلق سے باہر نہیں نکلتی۔"

"حد ہو گئی ہے ___ لو اب سنو۔ میں یہ کہہ رہا تھا قاضی صاحب کی پیشانی بالکل تختی سے ملتی جلتی ہے۔"

"تختی تو بالکل سپاٹ ہوتی ہے۔"

"یہ پیشانی سپاٹ نہیں؟"

"تم سپاٹ کا مطلب بھی سمجھتے ہو۔"

"جی نہیں۔"

"سپاٹ ماتھا تمہارا ہے۔ قاضی جی کا ماتھا تو......"

"بڑا خوبصورت ہے۔"

"خوبصورت تو ہے۔"

"تم محض چڑا رہی ہو مجھے۔"

"چڑا تم رہے ہو مجھے۔"

"میں کہتا ہوں تم چڑا رہی ہو مجھے۔"

"میں کہتی ہوں تم چڑا رہے ہو مجھے۔"

"تمہیں ماننا پڑے گا کہ تم چڑا رہی ہو مجھے۔"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
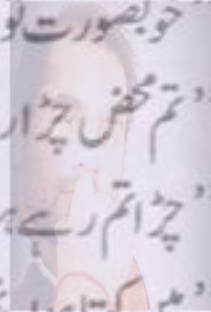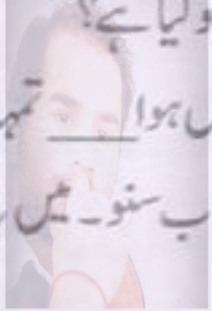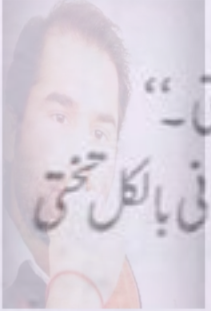
"اجی واہ ___ تم تو ابھی سے شوہر بن بیٹھے۔"

"قاضی صاحب، میں اس عورت سے شادی نہیں کروں گا ___ اگر آپ کی بیٹی کا ماتھا بھی آپ ہی کے ماتھے کی طرح ہے تو میرا نکاح اس سے پڑھوا دیجئے۔"

"قاضی صاحب، میں اس مردوے سے شادی نہیں کروں گی ___ اگر آپ کی چار بیویاں نہیں ہیں تو مجھ سے شادی کر لیجئے۔ مجھے آپ کا ماتھا بہت پسند ہے۔

کرشن چندر "چوٹیں" کے دیباچے میں لکھتا ہے۔

"سمت کو چھپانے میں، پڑھنے والے کو حیرت و اضطراب میں گم کر دینے میں اور پھر یکا یک آخر میں اس اضطراب و حیرت کو مسرت میں مبدل کر دینے کی صفت میں عصمت اور منٹو ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور اس فن میں اردو کے بہت کم افسانہ نگاران کے حریف ہیں"۔

اگر ہم دونوں کو شادی کا خیال آتا تو دوسروں کو حیرت و اضطراب میں گم کرنے کی بجائے ہم خود اس میں غرق ہو جاتے۔ اور جب ایک دم چونکتے تو یہ حیرت اور اضطراب جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ مسرت کے بجائے ایک بہت بڑے فکاہیہ میں تبدیل ہو جاتا ___ عصمت اور منٹو، نکاح اور شادی کتنی مضحکہ خیز چیز ہے۔

عصمت لکھتی ہے:

"ایک ذرا سی محبت کی دنیا میں کتنے شوکت، کتنے محمود، عباس عسکری، یونس اور نہ جانے کون کون تاش کی گڈی کی طرح پھینٹ کر بکھیر دیئے گئے ہیں۔ کوئی بتاؤ۔ ان میں سے چور پتا کون سا ہے! ___ شوکت کی بھوکی بھوکی کہانیوں سے لبریز آنکھیں، محمود کے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے اعضاء، عسکری کے بے رحم ہاتھ، یونس کے نچلے ہونٹ کا سیاہ تل، عباس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹیں اور ہزاروں چوڑے چکلے سینے، کشادہ پیشانیاں، گھنے گھنے بال، سڈول پنڈلیاں، مضبوط بازو۔ سب ایک ساتھ مل کر پکے سوت کے ڈوروں کی طرح الجھ کر رہ گئے ہیں۔ پریشان ہو ہو کر اس ڈھیر کو دیکھتی ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا سرا پکڑ کر کھینچوں کہ کھنچتا ہی چلا آئے اور میں اس کے سہارے دور افق سے بھی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں"۔ (چھوٹی آپا)

منٹو لکھتا ہے:-

"میں صرف اتنا سمجھا ہوں کہ عورت سے عشق کرنا اور زمینیں خریدنا تمہارے لئے ایک ہی بات ہے۔ سو تم محبت کرنے کے بجائے ایک دو بیگھے زمین خرید لو اور اس پر ساری عمر قابض رہو ___ زندگی میں صرف ایک عورت ___ اور یہ دنیا اس قدر بھری ہوئی کیوں ہے، ___ کیوں اس میں اتنے تماشے جمع ہیں! ___ صرف گندم پیدا کر کے ہی اللہ میاں نے اپنا ہاتھ کیوں نہ روک لیا ___ میری سنو اور اس زندگی کو جو کہ تمہیں دی گئی ہے اچھی طرح استعمال کرو۔ تم ایسے گاہک ہو جو عورت حاصل کرنے کے لئے ساری عمر سرمایہ جمع کرتے رہو گے مگر اسے ناکافی سمجھو گے۔ میں ایسا خریدار ہوں جو زندگی میں کئی عورتوں سے سودے کرے گا ___ تم ایسا عشق کرنا چاہتے ہو کہ اس کی ناکامی پر کوئی ادنیٰ درجے کا مصنف ایک کتاب لکھے جسے نرائن دت سہگل پیلے کاغذوں پر چھاپے اور ڈبی بازار میں اسے روی کے بھاؤ بیچے ___ میں اپنی کتابِ حیات کے تمام اوراق دیمک بن کر چاٹ جانا چاہتا ہوں تا کہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ تم محبت میں زندگی چاہتے ہو، میں زندگی میں محبت چاہتا ہوں۔" (تکلیف)

عصمت کو اگر الجھے ہوئے سوت کے ڈھیر میں سے ایسا سرا مل جاتا۔ کھینچنے پر جو کھنچتا ہی چلا آتا اور وہ اس کے سہارے دور افق سے اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاتی اور منٹو اگر اپنی کتابِ حیات کے آدھے اوراق بھی دیمک بن کر چاٹنے میں کامیاب ہو جاتا تو آج ادب کی لوح پر ان کے فن کے نقوش اتنے گہرے کبھی نہ ہوتے۔ وہ دور افق سے بھی اوپر ہوا میں تنی رہتی اور منٹو کے پیٹ میں اس کی کتابِ حیات کے باقی اوراق بھس بھر کے اس کے ہمدرد اسے شیشے کی الماری میں بند کر دیتے۔

"چوٹیں" کے دیباچے میں کرشن چندر لکھتا ہے۔

"عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اس خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

عصمت کے متعلق جو کچھ میں لکھ رہا ہوں۔ کسی بھی قسم کی خفت مٹانے کا نتیجہ نہیں۔ ایک قرض تھا۔ جو سود کی بہت ہی ہلکی شرح کے ساتھ ادا کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے میں نے عصمت کا کون سا افسانہ پڑھا تھا۔ مجھے بالکل یاد نہیں۔ یہ سطور لکھنے سے پہلے میں نے حافظے کو بہت کھرچا۔ لیکن اس نے میری رہبری نہیں کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں عصمت کے افسانے کاغذ پر منتقل ہونے سے پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ پر کوئی دورہ نہیں پڑا۔ لیکن جب میں نے اس کو پہلی بار دیکھا تو مجھے سخت ناامیدی ہوئی۔

ڈلفی چیمبرز، کلیر روڈ بمبئی کے، ۱ نمبر فلیٹ میں جہاں "مصوّر" ہفتہ وار کا دفتر تھا۔ شاہد لطیف اپنی بیوی کے ساتھ داخل ہوا۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ تمام کانگریسی لیڈر مہاتما گاندھی سمیت گرفتار ہو چکے تھے اور شہر میں کافی گڑبڑ تھی۔ فضا سیاسیات میں بسی ہوئی تھی۔ اس لئے کچھ دیر گفتگو کا موضوع تحریک آزادی رہا۔ اس کے بعد رُخ بدلا اور افسانوں کی باتیں شروع ہوئیں۔

ایک مہینہ پہلے جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں ملازم تھا۔ ادبِ لطیف میں عصمت کا "لحاف" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد ہے۔ میں نے کرشن چندر سے کہا تھا۔ "افسانہ بہت اچھا ہے۔ لیکن آخری جملہ بہت غیر صناعانہ ہے۔ احمد ندیم کی جگہ اگر میں ایڈیٹر ہوتا تو اسے یقیناً حذف کر دیتا۔ چنانچہ جب افسانوں پر باتیں شروع ہوئی تو میں نے عصمت سے کہا۔

"آپ کا افسانہ "لحاف" مجھے بہت پسند آیا۔ بیان میں الفاظ کو بقدرِ کفایت استعمال کرنا آپ کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس افسانے کے آخر میں آپ نے بیکار سا جملہ لکھ دیا کہ ایک انچ اٹھے ہوئے لحاف میں، میں نے کیا دیکھا۔ کوئی مجھے لاکھ روپیہ بھی دے تو میں کبھی نہیں بتاؤں گی۔"

عصمت نے کہا۔ "کیا عیب ہے اس جملے میں؟"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے عصمت کے چہرے پر وہی سمٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتنی شئے کا نام سن کر نمودار ہوا کرتا ہے۔ مجھے سخت ناامیدی ہوئی اس لئے کہ میں "لحاف" کے تمام جزئیات کے متعلق اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ جب عصمت چلی گئی تو میں نے دل میں کہا "یہ تو کم بخت بالکل عورت نکلی۔"

مجھے یاد ہے اس ملاقات کے دوسرے ہی روز میں نے اپنی بیوی کو دہلی خط لکھا۔ "عصمت سے ملا۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بالکل ایسی ہی عورت ہے جیسی تم ہو۔ میرا مزا تو بالکل کرکرا ہو گیا۔ لیکن تم اسے یقیناً پسند کرو گی۔ میں نے جب اس سے ایک انچ اٹھے ہوئے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

لحاف کا ذکر کیا تو نالائق اس کا تصور کرتے ہی جھینپ گئی۔"

ایک عرصے کے بعد میں نے اپنے اس پہلے ردعمل پر سنجیدگی سے غور کیا اور مجھے اس امر کا شدید احساس ہوا کہ اپنے فن کی بقاء کے لئے انسان کو اپنی فطرت کی حدود میں رہنا ازبس لازم ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں کا فن آج کہاں ہے، کچھ تو گیسوؤں کے ساتھ کٹ کر علیحدہ ہو گیا اور کچھ پتلون کی جیبوں میں ٹھس ہو کر رہ گیا۔ فرانس میں جارج ساں نے نسوانیت کا حسین ملبوس اتار کر تصنع کی زندگی اختیار کی، پولستانی موسیقار شوپیں سے لہو تھکوا تھکوا کر اس نے لعل و گہر ضرور پیدا کرائے۔ لیکن اس کا اپنا جوہر اس کے بطن میں دم گھٹ کے مر گیا۔

میں نے سوچا عورت جنگ کے میدانوں میں مردوں کے دوش بدوش لڑے، پہاڑ کاٹے افسانہ نگاری کرتے کرتے عصمت چغتائی بن جائے۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں کبھی کبھی مہندی رچنی ہی چاہئے۔ اس کی بانہوں سے چوڑی کی کھنک آنی ہی چاہئے۔ مجھے افسوس ہے جو میں نے اس وقت اپنے دل میں کہا۔ "یہ تو کم بخت بالکل عورت نکلی!"

عصمت اگر بالکل عورت نہ ہوتی تو اس کے مجموعوں میں "بھول بھلیاں"، "تل"، "لحاف" اور "گیندا" جیسے نازک اور ملائم افسانے کبھی بھی نظر نہ آتے۔ یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ صاف، شفاف، ہر قسم کے تصنع سے پاک۔ یہ ادائیں، وہ عشوے، وہ غمزے نہیں جن کے تیر بنا کر مردوں کے دل اور کلیجے چھلنی کئے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزل مقصود انسان کا ضمیر ہے۔ جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی ان جانی ____ ان بوجھی مگر مخملیں فطرت لئے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔

ان کی رنگت بدلی۔ "بچارا بچہ ____ مر گیا اس کا باپ شاید! خاک تمہارے منہ میں، خدا نہ کرے۔" میں نے ننھے کو کلیجے سے لگا لیا۔

"ٹھائیں" ننھے نے موقعہ پا کر بندوق چلائی۔

"ہائیں باجی۔ ابا کو مارتا ہے۔" میں نے بندوق چھین لی"۔ (بھول بھلیاں)

اور لوگ کہتے ہیں عصمت ناشدنی ہے، چڑیل ہے ____ گدھے کہیں کے۔ ان چار سطروں میں عصمت نے عورت کی روح نچوڑ کر رکھ دی ہے۔ اور یہ لوگ اسے اخلاق کی امتحانی نلیوں میں بیٹھے بلا بلا کر دیکھ رہے ہیں۔ توپ دم کر دینا چاہئے ایسی اوندھی کھوپڑیوں کو۔

"ساقی" میں "دوزخی" چھپا۔ میری بہن نے پڑھا اور مجھ سے کہا۔ "سعادت! یہ عصمت کتنی بے ہودہ ہے۔ اپنے موئے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا کم بخت نے ____ کیسی کیسی فضول

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری بُس بُک گروپ کتابیں پڑھئے 0314.595.1212

باتیں لکھی ہیں۔"

میں نے کہا۔" اقبال اگر میری موت پر تم ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج ہی مرنے کے لئے تیار ہوں۔"

شاہجہاں نے اپنی محبوبہ کی یاد قائم رکھنے کے لئے تاج محل بنوایا۔ عصمت نے اپنے محبوب بھائی کی یاد میں "دوزخی" لکھا۔ شاہجہاں نے دوسروں سے پتھر اٹھوائے، انھیں ترشوایا اور اپنی محبوبہ کی لاش پر عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔ عصمت نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے خواہرانہ جذبات چن چن کر ایک اونچا مچان تیار کیا اور اس پر نرم نرم ہاتھوں سے اپنے بھائی کی نعش رکھ دی___ تاج شاہجہاں کی محبت کا برہنہ مرمریں اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دوزخی، عصمت کی محبت کا نہایت ہی لطیف اور حسین اشارہ ہے۔ وہ جنت جو اس مضمون میں آباد ہے۔ عنوان اس کا اشتہار نہیں دیتا۔

میری بیوی نے یہ مضمون پڑھا تو عصمت سے کہا۔" یہ تم نے کیا خرافات لکھی ہے۔"

"بکو نہیں___ لاؤ وہ برف کہاں ہے؟"

عصمت کو برف کھانے کا بہت شوق ہے بالکل بچّوں کی طرح ڈلی ہاتھ میں لئے دانتوں سے کٹا کٹ کاٹتی رہتی ہے۔ اس نے اپنے بعض افسانے بھی برف کھا کھا کر لکھے ہیں۔ چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی ہے۔ سامنے تکیے پر کاپی کھلی ہے، ایک ہاتھ میں فاؤنٹین پین ہے اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلی، ریڈیو اونچے سروں میں چلاّ رہا ہے مگر اس کا قلم اور منھ دونوں کھٹا کھٹ چل رہے ہیں۔

عصمت پر لکھنے کے دورے پڑتے ہیں۔ نہ لکھے تو مہینوں گزر جاتے ہیں پر جب دورہ پڑے تو سینکڑوں صفحے اس کے قلم کے نیچے سے نکل جاتے ہیں۔ کھانے پینے، نہانے دھونے کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ بس ہر وقت چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی اپنے ٹیڑھے میڑھے اعراب اور املا سے بے نیاز خط میں کاغذوں پر اپنے خیالات منتقل کرتی رہتی ہے۔

"ٹیڑھی لکیر" جیسا طول طویل ناول میرا خیال ہے۔ عصمت نے ساتھ آٹھ نشستوں میں ختم کیا تھا۔

کرشن چندر نے عصمت کے بیان کی رفتار کے متعلق لکھا ہے:

"افسانوں کے مطالعہ سے ایک بات جو ذہن میں آتی ہے وہ ہے گھوڑ دوڑ یعنی رفتار، حرکت، سبک خرامی (میرا خیال ہے اس سے کرشن چندر کی مراد برق رفتاری تھی) اور تیز گامی۔ نہ صرف افسانہ دوڑتا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہوا معلوم ہوتا ہے بلکہ فقرے کنائے اور اشارے اور آوازیں اور کردار
اور جذبات اور احساسات ایک طوفان کی سی بلاخیزی کے ساتھ چلتے اور
آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔"

عصمت کا قلم اور اس کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ لکھنا شروع کرے گی تو کئی مرتبہ اس کا دماغ آگے نکل جائے گا اور الفاظ بہت پیچھے ہانپتے رہ جائیں گے۔ باتیں کرے گی تو لفظ ایک دوسرے پر چڑھتے جائیں گے۔ شیخی بگھارنے کی خاطر اگر کبھی باورچی خانے میں چلی جائے گی تو معاملہ بالکل چوپٹ ہو جائے گا۔ طبیعت میں چونکہ بہت ہی عجلت ہے اس لئے آٹے کا پیڑا بناتے ہی سنکی سنکائی روٹی کی شکل دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ آلو ابھی چھیلے نہیں گئے لیکن ان کا سالن اس کے دماغ میں پہلے ہی تیار ہو جاتا ہے اور میرا خیال ہے بعض اوقات وہ باورچی خانے میں قدم رکھ کر خیال خیال میں شکم سیر ہو کر لوٹ آتی ہوگی ـــــ لیکن اس حد سے بڑھی ہوئی عجلت کے مقابلے میں اس کو میں نے بڑے ٹھنڈے، اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی بچی کے فراک سیتے دیکھا ہے۔ اس کا قلم لکھتے وقت املا کی غلطیاں کر جاتا ہے۔ لیکن ننھی کے فراک سیتے وقت اس کی سوئی سے ہلکی سی لغزش بھی نہیں ہوتی۔ نپے تلے ٹانکے ہوتے ہیں اور مجال ہے جو کہیں جھول ہو۔

"اُف رے بچے" میں عصمت لکھتی ہے۔

"گھر کیا ہے محلے کا محلہ ہے۔ مرض پھیلے وبا آئے۔ دنیا کے
بچے پٹاپٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی ٹس سے مس ہو جائے۔ ہر
سال ماشاءاللہ گھر ہسپتال بن جاتا ہے ـــــ سنتے ہیں دنیا میں بچے بھی مرا
کرتے ہیں۔ مرتے ہوں گے۔ کیا خبر؟"

اور پچھلے دنوں بمبئی میں جب اس کی بچی سیما کو کالی کھانسی ہوئی تو وہ راتیں جاگتی تھی، ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ ممتا ماں بننے کے ساتھ ہی کوکھ سے باہر نکلتی ہے۔

عصمت پرلے درجے کی ہٹ دھرم ہے۔ طبیعت میں ضد ہے بالکل بچوں کی سی، زندگی کے کسی نظریے کو، فطرت کے کسی قانون کو پہلے ہی سابقہ میں کبھی قبول نہیں کرے گی۔ پہلے شادی سے انکار کرتی رہی۔ جب آمادہ ہوئی تو بیوی بننے سے انکار کر دیا۔ بیوی بننے پر جوں توں رضامندی ہوئی تو ماں بننے سے منکر ہو گئی۔ تکلیفیں اٹھائے گی۔ صعوبتیں برداشت کرے گی۔ مگر ضد سے کبھی باز نہیں آئے گی۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی اس کا ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ وہ زندگی کے حقائق سے دوچار ہو کر بلکہ ٹکرا ٹکرا کر ان کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی ہر بات نرالی ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

عصمت کے زنانہ اور مردانہ کرداروں میں بھی یہ عجیب و غریب ضد یا انکار عام پایا جاتا ہے۔ محبت میں بری طرح مبتلا ہیں۔ لیکن نفرت کا اظہار کئے چلے جارہے ہیں۔ جی گال چومنے کو چاہتا ہے، لیکن اس میں سوئی کھبو دیں گے۔ ہولے سے تھپکانا ہوگا تو ایسی دھول جمائیں گے کہ دوسرا بلبلا اٹھے۔ یہ جارحانہ قسم کی منفی محبت جو محض ایک کھیل کی صورت میں شروع ہوتی ہے۔ عام طور پر عصمت کے افسانوں میں ایک نہایت رحم انگیز صورت میں انجام پذیر ہوتی ہے۔

عصمت کا اپنا انجام بھی اگر کچھ اسی طور پر ہوا۔ اور میں اسے دیکھنے کے لئے زندہ رہا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔

عصمت سے ملتے جلتے مجھے پانچ چھ برس ہو گئے ہیں۔ دونوں کی آتش گیر اور بھک سے اڑ جانے والی طبیعت کے پیش نظر احتمال تو اسی بات کا تھا کہ سینکڑوں لڑائیاں ہوتیں۔ مگر تعجب ہے کہ اس دوران میں صرف ایک بار چخ ہوئی اور وہ بھی ہلکی سی۔

شاہد اور عصمت کے مدعو کرنے پر میں اور میری بیوی صفیہ دونو ملاڈ (بمبئی کے مضافات میں ایک جگہ جہاں شاہد بمبئی ٹاکیز کی ملازمت کے دوران مقیم تھا) گئے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد باتوں باتوں میں شاہد نے کہا "منٹو" تم سے اب بھی زبان کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

ڈیڑھ بجے تک میں نے تسلیم نہ کیا کہ میری تحریر میں زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ شاہد تھک گیا۔ دو بجے تک عصمت نے اپنے شوہر کی پیروی کی۔ میں پھر بھی نہ مانا۔ دفعتاً کوئی بات کہتے ہوئے عصمت نے لفظ "دست درازی" استعمال کیا۔ میں نے جھٹ سے کہا۔ "صحیح لفظ دراز دستی ہے۔" "تین بج گئے، عصمت نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔ میری بیوی سو گئی۔ شاہد قصہ ختم کرنے کے لئے دوسرے کمرے سے لغت اٹھا لایا۔ "د" کی تختی میں لفظ دست درازی موجود ہی نہیں تھا۔ البتہ دراز دستی اور اس کے معنی درج تھے۔ شاہد نے کہا۔ "عصمت اب تمہیں ماننا پڑے گا____ اب میاں بیوی میں چخ شروع ہو گئی۔ مرغ اذانیں دینے لگا۔ عصمت نے لغت اٹھا کر ایک طرف پھینکی اور کہا۔

"جب میں لغت بناؤں گی تو اس میں صحیح لفظ دست درازی ہوگا۔ یہ کیا ہوا دراز دستی____ دراز دستی۔

کج بحثی کا یہ سلسلۂ دراز بہر حال ختم ہوا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں لڑے بلکہ یوں کہیے کہ ہم نے اس کا کبھی موقع ہی نہیں آنے دیا۔ گفتگو کرتے کرتے جب بھی کوئی خطرناک موڑ آیا تو عصمت نے رُخ بدل لیا یا میں راستہ کاٹ کے ایک طرف ہو گیا۔

عصمت کو میں پسند کرتا ہوں۔ وہ مجھے پسند کرتی ہے لیکن اگر کوئی دفعتاً پوچھ بیٹھے۔ "تم

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

دونوں ایک دوسرے کی کیا چیز پسند کرتے ہو۔" تو میرا خیال ہے کہ میں اور عصمت دونوں کچھ عرصے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو جائیں۔

عصمت کی شکل وصورت دلفریب نہیں لیکن دل نشین ضرور ہے، اس سے پہلی ملاقات کے نقش ابھی تک میرے دل ودماغ میں محفوظ ہیں۔ بہت ہی سادہ لباس میں تھی، چھوٹی کنی کی سفید ساڑی، سفید زمین کا کالی کھڑی لکیروں والا چست بلاؤز، ہاتھ میں چھوٹا پرس، پاؤں میں بغیر ایڑی کا براؤن چپل۔ چھوٹی چھوٹی مگر تیز اور متجسس آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک چھوٹے مگر گھنگھریالے بال ___ ٹیڑھی مانگ۔ ذرا سا مسکرانے پر بھی گالوں میں گڈھے پڑ جاتے تھے۔

میں عصمت پر عاشق نہ ہوا۔ لیکن میری بیوی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ عصمت سے اگر صفیہ اس کا ذکر کرے تو وہ ضرور کچھ یوں کہے گی۔ "بڑی آئی ہو میری محبت میں گرفتار ہونے والی۔ تمہاری عمر کی لڑکیوں کے باپ تک قید ہوتے رہے ہیں میری محبت میں"۔

ایک بزرگوار اہل قلم کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ جو بہت دیر تک عصمت کے پریم پجاری رہے۔ خط وکتابت کے ذریعہ سے آپ نے عشق فرمانا شروع کیا، عصمت شہہ دیتی رہی لیکن آخر میں ایسا اڑنگا دیا کہ ثریا ہی دکھا دی غریب کو۔ یہ بچی کہانی میرا خیال ہے وہ کبھی قلم بند نہیں کریں گے۔

باہم متصادم ہو جانے کے خوف سے میرے اور عصمت کے درمیان بہت ہی کم باتیں ہوتی تھیں۔ میرا افسانہ کبھی شائع ہوتو پڑھ کر داد دے دیا کرتی تھی۔ "نیلم" کی اشاعت پر اس نے غیر معمولی جوش وخروش سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ "واقعی یہ بہن بنانا کیا ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کسی عورت کو بہن کہنا اس کی توہین ہے۔" اور میں سوچتا رہ گیا ___ وہ مجھے منٹو بھائی کہتی ہے اور میں اسے عصمت بہن کہتا ہوں ___ دونوں کو خدا سمجھے!

ہماری پانچ چھ برس کی دوستی کے زمانے کا ایسا کوئی واقعہ نہیں جو قابل ذکر ہو۔ فحاشی کے الزام میں ایک بار ہم دونوں گرفتار ہوئے۔ مجھے تو پہلے دو دفعہ تجربہ ہو چکا ہے۔ لیکن عصمت کا پہلا موقعہ تھا۔ اس لئے بہت بھنائی۔ اتفاق سے گرفتاری غیر قانونی نکلی۔ کیونکہ پنجاب پولیس نے ہمیں بغیر وارنٹ پکڑ لیا تھا۔ عصمت بہت خوش ہوئی۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ آخر اسے لاہور کی عدالت میں حاضر ہونا ہی پڑا۔

بمبئی سے لاہور تک کافی لمبا سفر ہے۔ لیکن شاہد اور میری بیوی ساتھ تھے۔ سارا وقت خوب ہنگامہ رہا۔ صفیہ اور شاہد ایک طرف ہو گئے اور چڑانے کی خاطر ہم دونوں کی فحش نگاری پر حملے کرتے رہے۔ قید کی صعوبتوں کا نقشہ کھینچا۔ جیل کی زندگی کی جھلکیاں دکھائیں۔ عصمت نے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

آخر میں جھلا کر کہا۔ "سولی پر بھی چڑھا دیں۔ لیکن یہاں حلق سے انا الحق ہی نکلے گا۔"

اس مقدمے کے سلسلے میں ہم دو دفعہ لاہور گئے۔ دونوں مرتبہ کالجوں کے تماشائی طالب علم مجھے اور عصمت کو دیکھنے کے لئے ٹولیاں باندھ باندھ کر عدالت میں آتے رہے۔ عصمت نے مجھ سے کہا "منٹو بھائی چوہدری نذیر سے کہیئے کہ ٹکٹ لگا دے کہ یہاں آنے جانے کا کرایہ ہی نکل آئے گا۔

ہم دو دفعہ لاہور گئے۔ اور دو ہی دفعہ ہم دونوں نے کرنال شاپ سے مختلف ڈیزائنوں کے دس دس بارہ بارہ جوڑے سینڈلوں اور جوتیوں کے خریدے۔ بمبئی میں کسی نے عصمت سے پوچھا لاہور آپ کیا مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے؟ عصمت نے جواب دیا۔ "جی نہیں جوتے خریدنے گئے تھے۔"

غالباً ساڑھے تین برس پہلے کی بات ہے۔ ہولی کا تہوار تھا۔ ملاڈ میں شاہد اور میں بالکنی میں بیٹھے پی رہے تھے۔ عصمت میری بیوی کو اکسا رہی تھی۔ "صفیہ یہ لوگ اتنا روپیہ اڑا ئیں، ہم کیوں نہ، اس عیش میں شریک ہوں۔" ہم دونوں ایک گھنٹے تک دل کڑا کرتی رہیں۔ اتنے میں ایک دم ہلڑ سا مچا اور فلمستان سے پروڈیوسر مکر جی، ان کی بھاری بھر کم بیوی اور دوسرے لوگ ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ چند منٹوں ہی میں ان کا حلیہ ناقابلِ شناخت تھا۔ عصمت کی توجہ وسکی سے ہٹی اور رنگ پر مرکوز ہو گئی۔ "آؤ صفیہ ہم بھی ان کے رنگ لگائیں۔"

ہم سب بازار میں نکل آئے۔ چنانچہ گھوڑ بندر روڈ پر باقاعدہ ہولی شروع ہو گئی۔ نیلے پیلے سبز اور کالے رنگوں کا چھڑکاؤ سا شروع ہو گیا۔ عصمت پیش پیش تھی۔ ایک موٹی بنگالن کے چہرے پر تو اس نے تارکول کا لیپ کر دیا۔ اس وقت مجھے اس کے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خیال آیا، ایک دم عصمت نے جرنیلوں کے سے انداز میں کہا "آؤ، پری چہرہ کے گھر پر دھاوا بولیں۔"

ان دنوں نسیم بانو ہماری فلم "چل چل رے نوجوان" میں کام کر رہی تھی۔ اس کا بنگلہ پاس ہی گھوڑ بندر روڈ پر تھا۔ عصمت کی تجویز سب کو پسند آئی۔ چنانچہ چند منٹوں میں ہم سب بنگلے کے اندر تھے۔ نسیم حسب عادت پورے میک اپ میں تھی اور نہایت نفیس ریشمی جارجٹ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ وہ اور اس کا خاوند احسان ہمارا شور سن کر باہر نکلے۔ عصمت نے جو رنگوں میں لتھڑی ہوئی بھتنی سی لگتی تھی۔ میری بیوی سے جس پر مزید رنگ لگانے سے میرا خیال ہے کوئی فرق نہ پڑتا۔ نسیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا "صفیہ، نسیم واقعی حسین عورت ہے۔"

میں نے نسیم کی طرف دیکھا اور کہا "حسن ہے لیکن بہت ٹھنڈا۔"

عینک کے رنگ آلود شیشوں کے پیچھے عصمت کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھومیں اور اس

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نے آہستہ سے کہا "صفراوی طبیعتوں کے لئے ٹھنڈی چیزیں مفید ہوتی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور ایک سیکنڈ کے بعد پری چہرہ نسیم سرکس کا مسخرہ بنی تھی۔

عصمت اور میں بعض اوقات عجیب عجیب باتیں سوچا کرتے ہیں۔ "منٹو بھائی جی چاہتا ہے اب مرغ اور مرغیوں کے رومانس کے متعلق کچھ لکھوں۔ یا "میں تو فوج میں بھرتی ہو جاؤں گی اور ہوائی جہاز اڑانا سیکھوں گی"۔ چند مہینوں کی بات ہے میں اور عصمت بمبئی ٹاکیز سے واپس الیکٹرک ٹرین میں گھر جا رہے تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے کہا۔ "کرشن چندر کے افسانوں میں دو چیزیں میں نے عام دیکھی ہیں...... زنا بالجبر اور قوسِ قزح جسے وہ قوس وقزح لکھتا ہے۔" "عصمت نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا" یہ تو ہے۔"

"سوچتا ہوں ایک مضمون لکھوں۔ جس کا عنوان "کرشن چندر، قوسِ قزح اور زنا بالجبر" ہو۔ میں ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا تھا۔ "لیکن زنا بالجبر سے قوسِ قزح کا نفسیاتی رشتہ کیا ہو سکتا ہے؟"

عصمت نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا" جمالیاتی نقطۂ نظر سے قوسِ قزح کے رنگوں میں انتہائی جاذبیت اور کشش...... لیکن آپ تو کسی اور زاویے سے سوچ رہے تھے۔"

"جی ہاں...... سرخ رنگ آگ اور خون کا رنگ ہے۔ ضمیات میں اس رنگ کو مریخ یعنی جلاد فلک سے منسوب کیا جاتا ہے...... ہو سکتا ہے کہ زنا بالجبر سے قوسِ قزح کے صرف اسی رنگ کا دامن بندھا ہو۔"

"ہو سکتا ہے...... آپ یہ مضمون ضرور لکھئے۔"

"لیکن عیسائیوں کے فنِ مصوری میں سرخ رنگ عشقِ الٰہی کا مظہر ہے......

...... نہیں نہیں۔" میرے دماغ میں دفعتاً ایک خلیہ پھوٹا۔ "صلیب پر چڑھنے کے شدید جذبے کو بھی اسی رنگ سے معنون کیا گیا ہے اور کنواری مریم کا لباس سرخ ہوتا ہے...... یہ عصمت کی نشانی ہے......"

یہ کہتے کہتے میں نے اچانک عصمت کے سفید لباس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔

"منٹو بھائی آپ یہ مضمون ضرور لکھئے، مزہ آجائے گا...... لیکن عنوان میں سے بالجبر اڑا دیجئے۔"

کرشن کو اعتراض ہوگا۔ کیونکہ وہ جبر یہ فعل سمجھ کر ہی تو روتا ہے۔"

"بیکار روتا ہے۔ کیا معلوم کہ یہ ظلم ہی اس کی مظلوم ہیروئینوں کو اچھا لگا ہو۔"

اللہ بہتر جانتا ہے!

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

عصمت کی افسانہ نگاری پر کافی مضمون لکھے گئے ہیں، حق میں کم، خلاف کچھ تو بالکل مجذوب کی بڑ ہیں۔ چند ایسے ہیں جن میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے گئے۔

پطرس صاحب نے بھی جن کو لاہور کے ادبی ٹھیکیداروں نے ڈبیا میں بند کر رکھا تھا اپنا ہاتھ باہر نکالا اور قلم پکڑ کر عصمت پر ایک مضمون لکھ دیا۔ آدمی ذہین ہیں، طبیعت میں شوخی اور مزاح ہے اس لیے مضمون کافی دلچسپ اور سلجھا ہوا ہے۔ آپ عورت کے لیبل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک مقتدر و پختہ کار دیباچہ نویس (آپ کی مراد صلاح الدین صاحب سے ہے) نے بھی معلوم ہوتا ہے۔ انشا پردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں۔ عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انھیں بھی وہی رتبہ حاصل ہے جو ایک زمانے میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا۔ گویا ادب کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے۔ جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علاحدہ ہوتے ہیں۔ جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلّم۔ لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے تگ ہی ملا اور بوجھوں تو کیا ہر ے گا۔ اب یہ امر ایک علاحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے جو خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں بلکہ داخلی اور جبلی اور بنیادی، جو انشاء پرداز عورتوں کے ادب کو انشاء پرداز مردوں کے ادب سے تمیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ ہو بہرحال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنیاد پر مصنفین کو "جنس کے اعتبار سے" الگ الگ دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔"

ان سوالوں کا جواب۔ بہت ممکن ہے ایسا نہ ہو جس کی بنیاد پر مصنفین کو جنس کے اعتبار سے دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن جواب دیتے وقت لوگ یہ ضرور سوچیں گے کہ سوال کرنے والا کون ہے..... مرد یا عورت؟ کیونکہ صنف معلوم ہونے پر سوال کرنے والے کا جبلی اور بنیادی زاویۂ نگاہ بہت حد تک واضح ہو جائے گا۔

پطرس صاحب کا یہ کہنا کہ "گویا ادب بھی کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علاحدہ ہوتے ہیں۔" ٹھیٹ پطرسی فقرے بازی ہے، ٹینس ٹورنامنٹ ادب نہیں۔ لیکن عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہونا بے ادبی بھی نہیں۔

پطرس صاحب کلاس میں لیکچر دیتے ہیں تو طلباء اور طالبات سے ان کا خطاب جداگانہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نہیں ہوتا۔ لیکن جب انہیں کسی شاگرد لڑکے یا شاگرد لڑکی کے دماغی نشوونما پر غور کرنا پڑے گا تو ماہر تعلیم ہونے کی حیثیت میں وہ ان کی جنس سے غافل نہیں ہو جائیں گے۔

عورت اگر جارج ایلیٹ یا عصمت چغتائی بن جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ادب پر اس کے عورت ہونے کے اثر کی طرف غور نہ کیا جائے۔ ہیجڑے کے ادب کے متعلق بھی کیا پطرس صاحب یہی استفسار فرمائیں گے کہ کیا کوئی ما بہ الامتیاز ایسا ہے۔ داخلی اور جبلی اور بنیادی جو انشاء پرداز ہیجڑوں کے ادب کو انشاء پرداز مردوں اور عورتوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے۔

میں عورت پر عورت اور مرد پر مرد کے نام کا لیبل لگانا بھونڈے پن کی دلیل سمجھتا ہوں۔ مسجدوں اور مندروں پر یہ بورڈ لگانا کہ یہ عبادت اور بندگی کی جگہیں ہیں بہت ہی مضحکہ خیز ہے لیکن جب کسی مسجد اور مندر کے مقابلے میں کسی عام رہائش گاہ کو رکھ کر ہم فنِ تعمیر کا جائزہ لیں گے تو اس پر مندر اور مسجد کی تقدیس کا اثر اپنے ذہن سے محو نہیں کر دیں گے۔

عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ادب کے ہر ہر نقطے میں موجود ہے جو اس کو سمجھنے میں ہر ہر قدم پر ہماری رہبری کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خوبیوں اور کمیوں سے جن کو پطرس صاحب نے اپنے مضمون میں غیر جانبداری سے بیان کیا ہے۔ ہم مصنف کی جنس سے علاحدہ نہیں کر سکتے اور نہ ایسا کرنے کے لئے کوئی تنقیدی، ادبی یا کیمیائی طریقہ ہی موجود ہے۔

عزیز احمد صاحب "نیا دور" میں عصمت کی "ٹیڑھی لکیر" پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جسم کے احتساب کا عصمت کے پاس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے مساس۔ چنانچہ رشید سے لیکر ٹیلر تک بیسوں مرد جو اس ناول میں آتے ہیں سب کا اندازہ جسمی یا ذہنی مساس سے کیا گیا ہے۔ زیادہ تر مساس کی کیفیت انفعالی ہی ہوتی ہے مساس ہی عصمت کے یہاں احتسابِ مرد، احتسابِ انسان، احتسابِ زندگی، احتسابِ کائنات کا واحد ذریعہ ہے۔

رضائیوں کے بادلوں میں عباس کے ہاتھ بجلیوں کی طرح کوندتے ہیں اور لڑکیوں کے گروہ میں ننھی ننھی لرزشیں مچل مچل کر بکھر جاتی ہیں۔ رسول فاطمہ کے چوہے جیسے ہاتھ مساس کا تاریک رخ ہیں۔ نیم تاریک رخ میٹرن کا وہ منافرہ یا معاشقہ ہے۔ جس میں میٹرن کو تعجب تھا کہ ذہن میں لڑکیاں اور ان غنڈوں کی آنکھیں اپنی رانوں پر رینگتی ہوئی محسوس نہیں کرتیں۔ مساس کے سلسلے میں شمن کا نسوانی احساس (پطرس

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

صاحب متوجہ ہوں) ران پر انگلیوں کی سرسراہٹ محسوس کرتا ہے۔"

عزیز احمد صاحب کا یہ نظریہ غلط ہے کہ عصمت کے یہاں احتساب کا ذریعہ ایک فقط مساس ہی ہے۔ اوّل تو مساس کہنا ہی غلط ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسا عمل یا فعل ہے جو کچھ دیر جاری رہتا ہے۔ عصمت تو غایت درجہ کی ذکی الحس ہے۔ ہلکا سا لمس ہی اس کے لئے کافی ہے۔ عصمت کے یہاں آپ کو دوسری جسمانی حسّیں بھی محوِ عمل نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر سونگھنے اور سننے کی حِس۔ صورت کا تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں عصمت کے ادب سے، بہت ہی گہرا تعلق ہے۔

"گھر گھر۔ پھٹ شوں۔ فش" باہر برآمدے میں موٹر بھنا رہی تھی۔" "ریڈیو کو مروڑتے رہے۔ کھڑ کھڑ، شرو شرو، گھڑ گھڑ، میرے آنسو نکل آئے۔"

"ٹنن ٹنن۔ سائیکل کی گھنٹی بجی میں سمجھ گئی، ایڈنا آ گئی" (پنکچر)

"اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھما دھم ٹھٹوں کی آواز چھت پر آئی اور دھم دھم چھن چھن کرتی بہو سیڑھیوں پر سے اتری۔"

"غُنن غُنن، غُنن غُنن۔" بہو منمنائی۔

"مکھی تنن تنن کر کے رہ گئی۔" (ساس)

"بچہ کوں کوں کر کے چپڑ چپڑ منہ مارنے لگتا۔" (سفر میں)

"بلی کی طرح سپڑ سپڑ رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آنے لگیں۔" لحاف "ٹک ٹک، ٹک ٹک، گھڑی کی طرح اس کا دل ہلنے لگا۔"

"موٹے موٹے قہقہے لگاتے ہوئے پچھر۔" (تل)

"ایک پراسرار قبرستانی سسکی ہوا میں لرزتی ہے۔"

(جھری میں سے)

"گھنگھروؤں کی جھنکار اور تالیوں کی آوازیں ایک بارگی میرے جسم میں رینگ کر ہزاروں بھنوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگیں۔"

(پیشہ)

اسی طرح سونگھنے کی حس بھی جگہ جگہ مصروفِ عمل ہے۔

"اور بو تو دیکھو، حقے کی سڑاند ہے۔ توبہ، تھو۔"

"قوام کی بو ایسی بس گئی تھی کہ اسے نیند نہ آئی۔ (ڈائن)

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

''سرسوں کا تیل آٹھویں دن ہی کھٹی کھٹی بو دینے لگتا۔'' (نیرا)

''اور جسم سے عجیب گھبرانے والی بو کے شرارے نکلتے تھے۔''

''گرم گرم خوشبوؤں کے عطر نے اور بھی انھیں انگارہ بنا دیا۔''

''میں نے نتھنے پھیلا کر ''سوں سوں'' ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر صندل اور حنا کی گرم گرم خوشبو کے اوپر کچھ محسوس نہ ہوا۔'' (لحاف)

''سرد آہوں اور بھینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر دکھا دیا تھا۔

(تل)

''پسینے سے گل چکے تھے اور ان میں مرگھٹ جیسی چراند آنے لگی تھیں۔'' (جال)

''مردانہ قمیض۔ سگریٹ کی بو میں غرق ملگجی سی۔'' (ہیرو)

''نیچے کیاریوں میں سے دھنئے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی۔'' (میرا بچہ)

عصمت کی سب حسیّں وقت پڑنے ___ پر اپنی اپنی جگہ کام کرتی ہیں اور ٹھیک طور سے کرتی ہیں۔ عزیز احمد صاحب کا یہ کہنا کہ جنس ایک مرض کی طرح عصمت کے اعصاب پر چھائی ہوئی ہے۔ ممکن ہے ان کی تشخیص کے مطابق درست ہو۔ مگر وہ اس مرض کے لئے نسخہ تجویز نہ فرمائیں۔ یوں تو لکھنا بھی ایک مرض ہے۔ کامل طور پر صحت مند آدمی جس کا درجۂ حرارت ہمیشہ ساڑھے اٹھانوے رہتا ہے۔ ساری عمر اپنی زندگی کی ٹھنڈی سلیٹ ہاتھ میں لئے بیٹھا رہے گا۔''

عزیز احمد صاحب لکھتے ہیں:۔

عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔ عشق ایک ایسی چیز ہے جس کا جسم سے وہی تعلق ہے جو بجلی کا تار سے ہے۔ لیکن کھٹکا دیا تو یہی عشق ہزاروں قندیلوں کے برابر روشنی کرتا ہے۔ دوپہر کی جھلستی لو میں پنکھا جھلتا ہے۔ ہزاروں دیووں کی طاقت سے زندگی کی عظیم الشان مشینوں کے پہیے گھماتا ہے۔ اور کبھی کبھی زلفوں کو سنوارتا اور کپڑوں پر استری کرتا ہے۔ ایسے عشق سے عصمت چغتائی بحیثیت مصنفہ واقف نہیں۔''

ظاہر ہے کہ عزیز احمد صاحب کو اس کا افسوس ہے ___ مگر یہ عشق جس سے عزیز احمد

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

صاحب واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے پنج سالا اکسموں کے ماتحت تیار کیا ہے اور اب وہ اسے ہر انسان پر عائد کر دینا چاہتے ہیں۔

عزیز احمد صاحب کو خوش کرنے کے لئے میں فرض کر لیتا ہوں کہ عصمت کی ہیروئن سے ٹریجڈی کیسے وقوع پذیر ہوتی کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔

عصمت واقعی عزیز احمد صاحب کے تصنیف کردہ عشق سے نا آشنا ہے اور اس کی یہ نا آشنائی ہی اس کے ادب کا باعث ہے اگر آج اس کی زندگی کے تاروں کے ساتھ اس عشق کی بجلی جوڑ دی جائے اور کھٹکا دیا جائے تو بہت ممکن ہے ایک اور عزیز احمد پیدا ہو جائے۔ لیکن ''تل'' ''گیندا''، ''بھول بھلیاں'' اور ''جال'' تصنیف کرنے والی عصمت یقیناً مر جائے گی۔

عصمت کے ڈرامے کمزور ہیں۔ جگہ جگہ ان میں جھول ہے۔ عصمت پلاٹ کو مناظر میں تقسیم کرتی ہے تو ناپ کر قینچی سے نہیں کرتی۔ یوں ہی دانتوں سے چیر پھاڑ کر چیتھڑا بنا ڈالتی ہے۔ پارٹیوں کی دنیا عصمت کی دنیا نہیں۔ اس میں وہ بالکل اجنبی رہتی ہے۔ جنس عصمت کے اعصاب پر ایک مرض کی طرح سوار ہے۔ عصمت کا بچپن بڑا غیر صحت بخش رہا ہے۔ پردے کے اس پار کی تفصیلات بیان کرنے میں عصمت کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ عصمت کو سماج سے نہیں شخصیتوں سے شغف ہے۔ شخصیتوں سے نہیں اشخاص سے ہے۔ عصمت کے پاس جسم کے احتساب کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ مساس...... عصمت کے افسانوں کی کوئی سمت ہی نہیں...... عصمت کی غیر معمولی قوتِ مشاہدہ حیرت میں غرق کر دیتی ہے...... عصمت فحش نگار ہے...... ہلکا ہلکا طنز اور مزاح عصمت کے اسٹائل کی ممتاز خوبیاں ہیں...... عصمت تلوار کی دھار پر چلتی ہے۔

عصمت پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ کوئی اسے پسند کرے گا۔ کوئی ناپسند۔ لیکن لوگوں کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے زیادہ اہم چیز عصمت کی تخلیقی قوت ہے۔ بری، بھلی، عریاں، مستور جیسی بھی ہے قائم رہنی چاہیۓ۔ ادب کا کوئی جغرافیہ نہیں۔ اسے نقشوں اور خاکوں کی قید سے جہاں تک ممکن ہو بچانا چاہیۓ۔

عرصہ ہوا دہلی کے ایک ذاتِ شریف درویش نے عجیب و غریب حرکت کی۔ آپ نے ''اوروں کی کہانی سن میری زبانی اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا'' جیسے عنوان سے شائع کی۔ اس میں میرا، عصمت، مفتی، پریم چند، خواجہ محمد شفیع اور عظیم بیگ چغتائی کا ایک ایک افسانہ شامل تھا۔ دیباچے میں ترقی پسند ادب پر ایک تنقیدی چوٹ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کے بمصداق فرمائی گئی تھی اور اس کارنامے کو اپنے دو ننھے ننھے بچوں کے نام سے معنون کیا گیا تھا۔ اس

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کی ایک کاپی آپ نے عصمت کو اور مجھے روانہ کی۔ عصمت کو درویش کی یہ ناشائستہ اور بھونڈی حرکت سخت ناپسند آئی۔ چنانچہ بہت بھنا کر مجھے ایک خط لکھا:

منٹو بھائی آپ نے وہ کتاب جو درویش نے چھاپی ہے دیکھی؟ ذرا اسے پھٹکاریے اور ایک نوٹس دیجئے۔ نجی طور پر کہ ہر مضمون کا جرمانہ دو سو روپے دو، ورنہ دعویٰ ٹھونک دیں گے۔ کچھ ہونا چاہئے۔ آپ بتایئے کیا کیا جائے۔ یہ خوب ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے اٹھا کر ہمیں کیچڑ میں لتھیڑ دیتا ہے اور ہم کچھ نہیں کہتے۔ ذرا مزہ رہے گا۔ اس شخص کو خوب رگڑیئے ڈانٹئے کہ الٹا علمبردار کیوں بن رہا ہے عریاں ادب کا۔ اس نے ہمارے افسانے صرف کتاب فروخت کرنے کے لئے چھاپے ہیں۔ ہماری ہتک ہے کہ ہرا یرے غیرے نتھو خیرے، کم عقلوں کی ڈانٹیں سننا پڑیں۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو سامنے رکھ کر ایک مضمون لکھئے۔ آپ کہیں گے میں کیوں نہیں لکھتی تو جواب ہے کہ آپ پہلے ہیں۔''

جب عصمت سے ملاقات ہوئی تو اس خط کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا۔ ''سب سے پہلے لاہور کے چوہدری محمد حسین صاحب ہیں ان سے ہم درخواست کریں تو وہ ضرور مسٹر درویش پر مقدمہ چلوا دیں گے۔''

عصمت مسکرائی۔ تجویز تو ٹھیک ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم بھی ساتھ دھر لئے جائیں گے''۔

میں نے کہا'' کیا ہوا...... عدالت خشک جگہ سہی لیکن کرنال شاپ تو کافی دلچسپ جگہ ہے...... مسٹر درویش کو وہاں لے جائیں گے۔'' اور عصمت کے گالوں کے گڈھے گہرے ہو گئے۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# کشتِ زعفران
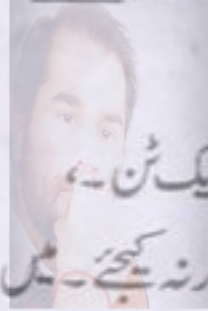
لائٹس اون ___ فین اوف ___ کیمرہ ریڈی ___ سٹارٹ مسٹر جگتاپ ؟

''سٹارٹڈ۔''

سین تھرٹی فور ___ ٹیک ٹن۔

''نیلا دیوی آپ کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں نے بھی پشاور کا پیشاب پیا ہے؟''

''کٹ کٹ۔''

لائٹس اون ہوئیں۔ وی۔ ایچ۔ ڈیسائی نے رائفل ایک طرف رکھتے ہوئے بڑے اطمینان سے اشوک سے پوچھا۔ ''او کے مسٹر گنگولی؟''

اشوک نے جو جل بھن کر راکھ ہونے کے قریب تھا۔ قہر آلود نگاہوں سے خلاء میں دیکھا اور زہر کے چند بڑے بڑے گھونٹ جلدی جلدی پی کر چہرے پر مصنوعی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ڈیسائی سے کہا۔ ''ونڈر فل' پھر اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کیوں منٹو؟'' میں نے ڈیسائی کو گلے لگا لیا ___ ''ونڈر فل''

ہمارے چاروں طرف لوگ اپنی اپنی ہنسی کا بہت بری طرح گلا گھونٹ رہے تھے۔ ڈیسائی بہت خوش تھا چونکہ اس نے بہت دیر کے بعد میرے منہ سے اپنی اس قدر پُر جوش تعریف سنی تھی۔ دراصل اشوک نے کچھ عرصہ پہلے مجھے منع کر دیا تھا کہ میں اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار ہرگز ہرگز نہ کروں۔ کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ ڈیسائی بوکھلا جائے گا۔ اور سارا دن غارت کر دے گا۔

جب چند لمحات گزر گئے تو ڈیسائی نے مکالمہ آموز دکشت سے کہا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
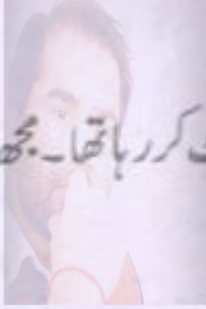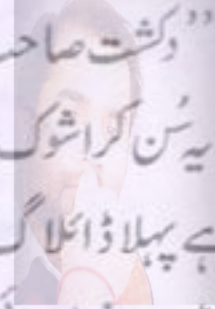
"دکشت صاحب نکسٹ ڈائلاگ؟"

یہ سُن کر اشوک جو کہ "آٹھ دن" نامی فلم ڈائریکٹ کر رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہوا۔ منٹو، میرا خیال ہے پہلا ڈائلاگ ایک دفعہ اور لے لیں۔"

میں نے ڈیسائی کی طرف دیکھا۔ "کیوں ڈیسائی صاحب؟___ میرا خیال ہے اس دفعہ اور بھی ونڈرفل ہو جائے۔"

ڈیسائی نے گجراتی انداز میں اپنا سر ہلایا۔ "ہو— تو لے لو ابھی گرما گرم معاملہ ہے۔"

دتا رام چلّایا۔ "لائٹس اون۔"

لائٹس روشن ہوئی۔ ڈیسائی نے رائفل سنبھالی۔ دکشت جھٹ سے ڈیسائی کی طرف لپکا اور مکالموں کی کتاب کھول کر کہنے لگا۔ "مسٹر ڈیسائی۔ ذرا وہ ڈائلاگ یاد کر لیجئے۔"
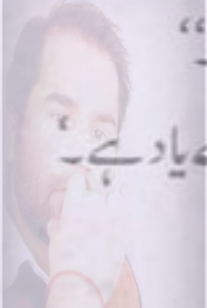
ڈیسائی نے پوچھا۔ "کون سا ڈائلاگ؟"

دکشت نے کہا۔ "وہی جو آپ نے اتنا ونڈرفل بولا تھا۔ ذرا اُسے دُہرا لیجئے۔"

ڈیسائی نے رائفل کندھے پر جماتے ہوئے بڑے، سنگین اعتماد سے کہا "مجھے یاد ہے۔"

دکشت نے مجھے اشارہ کیا۔ "منٹو صاحب ذرا آپ سن لیجئے۔"

میں نے ڈیسائی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔
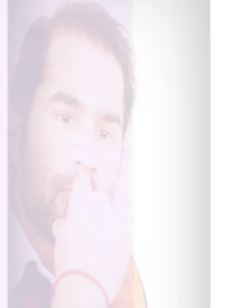
"ہاں تو وہ کیا ہے ڈیسائی صاحب___ نیلا دیوی، آپ کوئی فکر نہ کیجئے۔ میں نے بھی پشاور کا پانی پیا ہے۔"

ڈیسائی نے اپنے سر پر پشاوری لنگی کا زاویہ درست کیا۔ اور ویرا (فلم میں نیلا دیوی) سے مخاطب ہو کر کہا۔ "نیلا دیوی، آپ کوئی پشاور نہ کیجئے۔ میں نے بھی آپ کا پانی پیا ہے۔"

ویرا اس قدر بے تحاشا ہنسی کہ ڈیسائی ڈر گیا۔ "کیا ہوا مس ویرا؟"

ویرا ساڑی کے آنچل میں ہنسی دباتی سیٹ سے باہر چلی گئی۔ ڈیسائی نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے دکشت سے پوچھا۔ "کیا بات تھی؟"

دکشت نے اپنا ہنسی سے اُبلتا ہوا منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے ڈیسائی کی پریشانی دور کرنے کے لئے کہا۔ "نتھنگ سیریس___ کھانسی آ گئی۔"

ڈیسائی ہنسا۔ "اوہ" پھر وہ مستعد ہو کر اپنے مکالمے کی طرف متوجہ ہوا۔ "نیلا دیوی، آپ کوئی کھانسی نہ کیجئے۔ میں نے بھی دیوی کا........"

اشوک اپنے سر کو مکّے مارنے لگا۔ ڈیسائی نے دیکھا تو متفکر ہو کر اس سے پوچھا۔ "کیا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری
بس بک گروپ
کتابیں پڑھنے
0314 .595. 1212

بات ہے مسٹر گنگولی۔"

گنگولی نے ایک زور کا مکا اپنے سر پر مارا "کچھ نہیں۔ سر میں درد تھا ـــــ تو ہو جائے ٹیک؟"

ڈیسائی نے اپنا کدو سا سر ہلایا۔ "ہو!"

گنگولی نے مردہ آواز میں کہا" کیمرہ ریڈی۔ ریڈی۔ ریڈی مسٹر جگتاپ؟"

بھونپو سے جگتاپ کی منمناہٹ سنائی دی ـــــ "ریڈی!"

"گنگولی نے اور زیادہ مردہ آواز میں کہا"۔

"سٹارٹ۔"

کیمرہ اسٹارٹ ہوا۔ کلیپ اسٹک ہوئی۔

"سین تھرٹی فور ـــــ ٹیک الیون!"

ڈیسائی نے رائفل لہرائی اور دریا سے کہنا شروع کیا۔ نیلا پانی۔ آپ کوئی دیوی نہ کیجیے۔ میں بھی نے پشاور کا..........

اشوک دیوانہ وار چلایا۔" کٹ کٹ۔"

ڈیسائی نے رائفل فرش پر رکھی۔ اور گھبرا کر اشوک سے پوچھا" اینی مسٹیک مسٹر گنگولی!"

اشوک نے ڈیسائی کی طرف قاتلانہ نگاہوں سے دیکھا۔ مگر فوراً ان میں بھیڑوں کی سی نرمی اور معصومیت پیدا کرتے ہوئے کہا۔" کوئی نہیں ـــــ بہت اچھا تھا۔ بہت ہی اچھا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔" آؤ منٹو، ذرا باہر چلیں۔"

سیٹ سے باہر نکل کر اشوک قریب قریب رو دیا۔ منٹو بتاؤ، اب کیا کیا جائے صبح سے یہ وقت ہو گیا ہے۔ پشاور کا پانی اس کے منہ پر چڑھتا ہی نہیں ـــــ میرا خیال ہے آج کے لئے بریک کر دیں۔"

بڑا معقول خیال تھا۔ کیونکہ ڈیسائی سے یہ فوری توقع بالکل فضول تھی کہ وہ صحیح مکالمہ بول سکے گا۔ ایک دفعہ اگر اس کی زبان پر کوئی چیز جم جائے تو بڑی مشکل سے ہٹتی تھی۔ اصل میں اس کا حافظہ بالکل صفر تھا۔ اسے چھوٹے سے چھوٹا مکالمہ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ اگر سیٹ پر وہ پہلی بار کوئی مکالمہ صحت کے ساتھ ادا کر جاتا تو اسے محض اتفاق سمجھا جاتا تھا۔ مگر لطف یہ ہے کہ غلط ادائیگی کے باوجود، ڈیسائی کو قطعاً اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس نے مکالمے کو کس حد تک ـــــ کس رُلا دینے والی حد تک مسخ کیا ہے۔

مکالمے کی ٹانگ توڑ کر اس کو مکمل طور پر اپاہج کر کے وہ عام طور پر حاضرین کی طرف

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

داد طلب نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کی ایک دو لڑکھڑاہٹیں یقیناً تفریح کا موجب ہوتی تھیں۔ مگر جب وہ حد سے تجاوز کر جاتا تو سب کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ اس کے سر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔

میں فلمستان میں تین برس رہا۔ اس دوران میں ڈیسائی نے چار فلموں میں حصّہ لیا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس نے ایک مرتبہ بھی پہلے ہی مرحلے میں اپنا مکالمہ صحت سے ادا کیا ہو۔ اگر حساب لگایا جائے تو آنجہانی نے اپنے فلمی زندگی میں لاکھوں فٹ فلم ضائع کیا ہوگا۔

اشوک نے مجھے بتایا کہ ڈیسائی کی ری ٹیکس، کا ریکارڈ پچھتر ہے۔ یعنی بمبئی ٹاکیز میں اس نے ایک بار ایک مکالمے کو چوہتّر مرتبہ غلط ادا کیا۔ یہ صرف جرمن ڈائریکٹر فرانز اوسٹن ہی کا حوصلہ تھا کہ وہ بہت دیر تک ضبط کئے رہا۔ آخر اس کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ سر پیٹ کر اس نے ڈیسائی سے کہا! مسٹر ڈیسائی مصیبت یہ ہے کہ لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں۔ تمہیں پردے پر دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں، ورنہ آج میں نے تمہیں ضرور اٹھا کر باہر پھینک دیا ہوتا۔"

اور فرانز اوسٹن کی اس صاف گوئی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوہتر ری ٹیک ہوئے اور اسٹوڈیو کے ہر کارکن کو باری باری ڈیسائی کو دم دلاسا دینے کا فرض ادا کرنا پڑا لیکن کوئی حیلہ کارگر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک بار اکھڑ جائے تو کوئی دوا یا دعا بااثر ثابت نہیں ہوتی۔ ایسے وقتوں میں چنانچہ یہی مناسب خیال کیا جاتا تھا کہ نتیجہ خدا کے ہاتھ سونپ کر دھڑا دھڑ ضائع کیا جائے۔ جب اس کی اور ڈیسائی کی مرضی بیک وقت شاملِ حال ہو جائے تو سجدہ شکرانہ ادا کرے۔

اشوک نے لنچ کے لئے بریک کر دیا۔ جیسا کہ عام دستور تھا کسی نے ڈیسائی سے مکالمے کے بارے میں گفتگو نہ کی تاکہ جو کچھ ہو چکا ہے۔ اس کی یاد تازہ نہ ہو۔ اشوک ادھر ادھر کی گپیں سناتا رہا۔ ڈیسائی نے حسبِ معمول اپنی طرف سے مزاح انگیز باتیں کیں۔ جن میں ذرہ برابر مزاح نہیں تھا۔ لیکن سب ہنستے رہے۔ لنچ ختم ہوا، شوٹنگ پھر شروع ہوئی۔ اشوک نے اس سے پوچھا۔ "کیوں ڈیسائی صاحب، آپ کو ڈائیلاگ یاد ہے؟"

ڈیسائی نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا ___ "جی ہو!"

لائٹس آن ہوئیں۔ سین تھرٹی فور، ٹیک لولو شروع ہوا۔ ڈیسائی نے رائفل لہرا کر دیرا سے کہا۔ "ٹیلا دیوی..... آپ ___ آپ۔" اور ایک دم رک گیا۔ "آئی ایم سوری۔"

اشوک کا دل بیٹھ گیا۔ لیکن اس نے ڈیسائی کا دل رکھنے کے لئے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ جلدی کیجئے۔"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

"سین تھرٹی فور، ٹیک تھرٹین" شروع ہوا۔ مگر ڈیسائی نے پیشاور سے پیشاب کو الگ نہ کیا۔ جب چند اور کوششیں بھی بار آور نہ ہوئیں، تو میں نے الگ لے جاکر اشوک کو یہ مشورہ دیا "دادا منی، دیکھو یوں کرو۔ جب ڈیسائی یہ مکالمہ ادا کرتا ہے تو وہ کیمرے کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے اس کا بقایا حصّہ ادا کرے۔ یعنی پیشاور کا پیشاب پیا ہے، کیمرے کے سامنے منہ کر کے نہ بولے۔"

اشوک سمجھ گیا کیونکہ اس مشکل سے نکلنے کی ایک صرف یہی ترکیب تھی کیونکہ ہم بڑی آسانی سے یہ مکالمہ بعد میں "ڈب" کر سکتے تھے۔ اگر وہ سارا مکالمہ کیمرے کے سامنے منہ کر کے ادا کرتا تو اس کے ہونٹوں کی جنبش صحیح مکالمے کے ساتھ چسپاں نہ ہو سکتی۔

جب ڈیسائی کو یہ ترکیب سمجھائی گئی تو اسے بہت ٹھیس پہنچی۔ اس نے ہم سب کو یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اب غلطی نہیں کرے گا مگر پانی سر سے گزر چکا تھا ___ اور وہ بھی پشاور کا، اس لئے اس کی منت سماجت بالکل نہ سنی گئی، بلکہ اس سے کہہ دیا کہ وہ جو اس کے دل میں آئے بول دے۔

ڈیسائی بہت بد دل ہوا۔ لیکن اس نے مجھ سے کہا۔ "کوئی بات نہیں منٹو میں منہ دوسری طرف موڑ لوں گا۔ لیکن آپ دیکھئے گا کہ میں ڈائیلاگ بالکل کوریکٹ بولوں گا۔"

"سین تھرٹی فور ___ ٹیک فورٹین" کی آواز آئی۔ ڈیسائی نے بڑے عزم کے ساتھ رائفل ہوا میں لہرائی اور ویرا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "نیلا دیوی آپ کوئی فکر نہ کیجئے۔" یہ کہہ کر وہ مڑا۔ "میں نے بھی پشاور کا پیشاب پیا ہے۔"

سین کٹ ہوا۔ ڈیسائی نے فتح مندانہ انداز میں رائفل کندھے پر رکھی اور اشوک سے پوچھا۔ "کیوں مسٹر گنگولی؟" اشوک اب بالکل سنگ دل بن چکا تھا، اس نے بڑے روکھے انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے...... پھر وہ کیمرہ مین ہردیپ سے مخاطب ہوا۔ "چلو نیکسٹ شوٹ!"

شوٹنگ ختم ہوئی۔ مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ چرچ گیٹ جانا تھا اس لئے ہم جلدی جلدی اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی کھڑی تھی ہم ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ڈیسائی صاحب بھی براجمان ہیں اور مسافروں کو اپنے کارنامے سنا رہے ہیں...... میرا دوست جو اس دن کی شوٹنگ دیکھ چکا تھا۔ ڈیسائی کے پاس بیٹھ گیا۔ دورانِ گفتگو میں اس نے ایک بڑا بے ڈھب سا سوال کیا۔

"سیٹ پر جو لوگ ڈائیلاگ بھول جاتے ہیں اس کا کیا علاج کیا جاتا ہے۔"

ڈیسائی نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں، میں تو ایک دفعہ بھی نہیں بھولا، اس کا یہ جواب بے حد معصوم تھا۔ جیسے وہ ڈائیلاگ بھول جانے کے مرض سے قطعاً نا آشنا ہے...... میرا خیال ہے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کہ خود اس کو اس کا کامل یقین تھا کہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی اور یہ درست تھا اس لئے کہ غلطی کا احساس تو صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے اگر صحت کے متعلق ہلکا سا تصور انسان کے دماغ میں موجود ہو۔ ڈیسائی مرحوم کے دماغ میں کوئی ایسا خانہ ہی نہیں تھا جو غلط اور صحیح میں تمیز کر سکے، وہ اس سے بالکل بے نیاز تھا، معصومیت کی حد تک۔

وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا مزاح کار تھا۔ یکسر غلط ہے۔ وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا گردار کار تھا۔ قطعاً نادرست ہے۔ ایسا گناہ آنجہانی سے کبھی سرزد نہیں ہوا۔ لوگ اگر اس کی حرکات پر ہنس ہنس کے دوہرے ہوتے تھے تو اس کا باعث قدرت کی چھیڑ خانی تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اس کی تخلیق ہی ایسے آب و گل سے کی تھی، جس میں زعفران گندھی ہو۔

ایک دفعہ ریس کورس پر میں نے دور سے اس کی طرف اشارہ کیا اور اپنی بیوی سے کہا۔

''وہ ڈیسائی ہے...... وہ!''

میری بیوی نے اس جانب دیکھا اور بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''اتنی دور سے دیکھنے پر اس قدر بے تحاشا ہنسنے کی وجہ کیا ہے؟''

وہ میرے سوال کا اطمینان بخش جواب نہ دے سکی۔ صرف یہ کہہ کر وہ اور زیادہ ہنسنے لگی۔ ''معلوم نہیں!''

آنجہانی کو ریس کا بہت شوق تھا۔ اپنی بیوی اور لڑکی کو ساتھ لاتا تھا مگر دس روپے سے زیادہ کبھی نہیں کھیلتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق کئی جوکی اس کے بہت ہی قریبی دوست تھے جو اس کو سولہ آنے کھری ٹپ دیتے تھے۔ یہ ٹپ وہ اکثر دوسروں کو دیتا تھا۔ اس درخواست کے ساتھ کہ وہ اسے اپنے تک رکھیں اور کسی اور کو نہ بتائیں' خود وہ کسی اور کی دی ہوئی ٹپ پر کھیلتا تھا۔

ریس کورس پر جب میں نے اس کو اپنی بیوی سے متعارف کرایا تو اس نے ایک ''شیور'' یعنی یقینی ٹپ دی۔ جب وہ نہ آئی تو اس نے میری بیوی سے پر تعجب لہجے میں کہا۔ ''حد ہوگئی ہے...... یہ ٹپ تو آنا ہی مانگتی تھی۔'' اس نے خود ایک دوسرے نمبر کا گھوڑا کھیلا تھا جو پلس آ گیا تھا۔ اس پر اس نے کسی قسم کا تعجب کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ڈیسائی آنجہانی کی اوائلی زندگی کے متعلق لوگوں کی معلومات بہت محدود ہیں۔ خود میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ گجرات کے ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد اس نے ایل ایل بی کیا۔ چھ سات برس تک بمبئی کی چھوٹی عدالتوں کی خاک چھانتا رہا۔ اس کی پریکٹس معمولی تھی لیکن اس کا گھر بار چلانے کے لئے کافی تھی۔ لیکن جب وہ دماغی عارضے میں گرفتار ہوا۔ تو اس کی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مالی حالت بہت پتلی ہوگئی۔ ایک عرصے تک نیم پاگل رہا۔ علاج معالجے سے یہ عارضہ دور تو ہوگیا مگر ڈاکٹروں نے دماغی کام کرنے سے منع کردیا۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ مرض پھر عود نہ کر آئے...... اب ڈیسائی غریب کے لئے بڑی مشکل تھی کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ وکالت ظاہر ہے کہ یکسر دماغی کام تھا۔ اس لئے ادھر رجوع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کچھ عرصے تک وہ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ تجارت سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حالانکہ اس کی رگوں میں ٹھیٹ گجراتی خون تھا۔

جب حالات بہت نازک ہوگئے تو وہ ساگر موویٹون کے چمن لال ڈیسائی سے ملا اور خواہش ظاہر کی کہ اسے اسٹوڈیو میں کام مل جائے۔ اصل میں اس کا مقصد یہ تھا کہ اسے ایکٹنگ کا موقع دیا جائے۔ چمن لال گجراتی اور ڈیسائی تھا۔ اس نے وی۔ ایچ۔ ڈیسائی کو ملازم رکھ لیا۔ اس کے کہنے پر چند ڈائریکٹروں نے آزمائش کے طور پر مختلف فلموں میں تھوڑا تھوڑا کام دیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کو پھر آزمانا بہت بڑی خطا ہے۔ چنانچہ وہ کچھ عرصے کے لئے بیکار ساگر موویٹون میں پڑا روٹیاں توڑتا رہا۔

اس دوران میں مسٹر ہمانشو رائے بمبئی ٹاکیز قائم کرچکے تھے جس کے متعدد فلم کامیاب بھی ہوچکے تھے۔ اس ادارے کے متعلق مشہور تھا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی قدر کرتا ہے۔ یہ درست بھی تھا۔ چنانچہ ڈیسائی قسمت آزمائی کے لئے وہاں پہنچا۔ دو تین چکر لگانے اور مختلف سفارشی خطوط حاصل کرنے کے بعد مسٹر ہمانشو رائے سے ملا۔ ہمانشو رائے نے اس کی شکل و صورت اور اس کی تمام کمزوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک خاص کردار وضع کیا اور ہندوستانی اسکرین کو ایک ایسا ایکٹر بخشا جو ایکٹنگ سے بالکل ناآشنا تھا۔

پہلے ہی فلم میں وی۔ ایچ۔ ڈیسائی فلم بینوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بمبئی ٹاکیز کے عملے کو شوٹنگ کے دوران میں جو مشکلات پیش آئیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ سب کی قوت برداشت جواب دے جاتی تھی۔ مگر وہ اپنے تجربے میں ڈٹے رہے۔ آخر کامیاب رہے۔ اس فلم کے بعد ڈیسائی بمبئی ٹاکیز کے فلموں کا جزو لاینفک بن گیا۔ اس کے بغیر بمبئی ٹاکیز کی فلم غیر مکمل اور روکھی پھیکی سمجھی جاتی تھی۔ ڈیسائی اپنی کامیابی پر خوش تھا مگر اس کو حیرت ہرگز نہیں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی کامیابی اس کی ذہانت، ذکاوت اور ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے مگر خدا بہتر جانتا ہے کہ ان تمام چیزوں کا اس کی شہرت اور کامیابی میں ذرہ برابر دخل نہیں تھا۔ یہ صرف قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ وہ فلموں کا سب سے بڑا ظریف بن گیا تھا۔

میری موجودگی میں اس نے فلمستان کے تین فلموں میں حصہ لیا۔ ان تین فلموں کا نام

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

علی الترتیب یہ ہے ''چل چل رے نوجوان''، ''شکاری'' اور ''آٹھ دن'' ہر فلم کی تیاری کے دوران میں ہم اس کی طرف سے متعدد بار مایوس ہوئے مگر اشوک اور مکرجی چونکہ مجھے بتا چکے تھے کہ اس سے کام لینے کے لئے پتا قطعی طور پر مار دینا پڑتا ہے۔ اس لئے مجھے اپنی جلد گھبرا جانے والی طبیعت کو قابو میں رکھنا پڑا، ورنہ بہت ممکن تھا کہ میں ''چل چل رے نوجوان'' کی شوٹنگ ہی کے دوران میں دوسرے جہان کو چل پڑتا۔ ویسے کبھی کبھی غصے کے عالم میں یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہوتی تھی کہ کیمرہ اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا جائے۔ مائکروفون کا پورا بوم اس کے حلق میں کھونس دیا جائے اور سارے بلب اتار کر اس کی لاش پر ڈھیر کر دیئے جائیں مگر جب اس قصد سے اس کی طرف دیکھتے تو یہ سفاکانہ عزم ہنسی میں تبدیلی ہو جاتا۔

مجھے معلوم نہیں عزرائیل علیہ السلام نے اس کی جان کیوں کر لی ہوگی۔ کیونکہ اس کو دیکھتے ہی ہنسی کے مارے ان کے پیٹ میں بل پڑ گئے ہوں گے۔ مگر سنا ہے کہ فرشتوں کے پیٹ نہیں ہوتا۔ کچھ بھی ہو ڈیسائی کی جان لیتے ہوئے وہ یقیناً ایک بہت ہی دلچسپ تجربے سے دوچار ہوئے ہوں گے۔

جان لینے کا ذکر آیا تو مجھے ''شکاری'' کا آخری سین یاد آ گیا۔ اس میں ہمیں ڈیسائی کی جان لینا تھی۔ انھیں بے رحم جاپانیوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر مرنا تھا۔ اور مرتے وقت اپنے ہونہار بہادر شاگرد بادل (اشوک) اور اس کی محبوبہ ویرا سے مخاطب ہو کر یہ کہنا تھا کہ وہ اس کی موت پر مغموم نہ ہوں، اور اپنا نیک کام کئے جائیں۔ مکالموں کی صحت ادائیگی کا سوال حسب معمول تھا مگر اب یہ مصیبت درپیش تھی کہ ڈیسائی کو کس انداز سے مارا جائے کہ لوگ نہ ہنسیں۔ میں نے تو اپنا فیصلہ دے دیا تھا کہ اس کو اگر سچ مچ بھی مار دیا جائے تو لوگ ہنسیں گے۔ وہ کبھی یقین ہی نہیں کریں گے کہ ڈیسائی مر رہا ہے، یا مر چکا ہے۔ ان کے ذہن میں ڈیسائی کی موت کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔

میرے اختیار میں ہوتا تو میں نے یقیناً یہ آخر کا سین حذف کر دیا ہوتا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ کہانی کا بہاؤ ہی کچھ ایسا تھا کہ انجام میں اس کیریکٹر کی موت ضروری تھی جو کہ اسے سونپا گیا تھا، کئی دن ہم سوچتے رہے کہ اس مشکل کا کوئی حل مل جائے مگر ناکام رہے۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسے مرتا دکھایا جائے۔

مکالموں کی صحت اب ثانوی اہمیت رکھتی تھی۔ جب ریہرسلیں کی گئیں تو ہم سب نے نوٹ کیا کہ وہ نہایت ہی مضحکہ خیز طریقے پر مرتا ہے۔ اشوک اور ویرا سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ کچھ اس انداز سے اپنے دونوں ہاتھ ہلاتا ہے۔ جیسے کوک بھرا کھلونا۔ اس کی یہ حرکت بہت ہی خندہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

خیز تھی۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ ساکت پڑا رہے اور اپنے بازوؤں کو جنبش نہ دے۔ مگر دماغ کی طرح اس کا جسم بھی اس کے اختیار سے باہر تھا۔

بڑی دیر کے بعد آخر اشوک کو ایک ترکیب سوجھی اور وہ یہ تھی کہ جب سین شروع ہو تو ویرا اور وہ دونوں اس کے ہاتھ پکڑ لیں۔ یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن جب پردے پر یہ فلم پیش ہوئی اور ڈیسائی کی موت کا یہ منظر آیا تو سارا حال قہقہوں سے گونج اٹھا...... ہم نے فوراً دوسرے شو کے لئے اس کو قینچی سے مختصر کر دیا۔ مگر تماشائیوں کے ردعمل میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ آخر تھک ہار کر اس کو ویسے کا ویسا رہنے دیا۔

ڈیسائی آنجہانی بے حد کنجوس تھا۔ کسی دوست پر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں کرتا تھا۔ بڑے عرصے کے بعد اس نے قسطوں پر اشوک سے اس کی پرانی موٹر خریدی وہ خود چونکہ ڈرائیو کرنا نہیں جانتا تھا اس لئے ایک ملازم رکھنا پڑا۔ مگر یہ ملازم ہر دسویں پندرھویں روز بدل جاتا تھا۔ میں نے ایک روز اس کی وجہ دریافت کی تو ڈیسائی گول کر گیا۔ لیکن مجھے ساؤنڈ ریکارڈسٹ جگتاپ نے بتایا کہ ڈیسائی صاحب ایک ڈرائیور رکھتے ہیں۔ نمونے کے طور پر اس کا کام دس بارہ روز دیکھتے ہیں اور پھر اسے ''کنڈم'' کر کے دوسرا رکھ لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ مگر اسی دوران میں اس نے خود موٹر چلانا سیکھ لیا۔

آنجہانی کو دمے کی شکایت بہت عرصے سے تھی۔ یہ مرض لاعلاج قرار دے دیا گیا تھا۔ کسی کے کہنے پر اس نے ہر روز دوا کے طور پر تھوڑی سی خشک بھنگ کھانا شروع کی تھی۔ اب وہ اس کا عادی بن گیا تھا۔ شام کو سردیوں کے موسم میں برانڈی کا آدھا پیگ بھی پیتا تھا اور خوب چہکا کرتا تھا۔ ''آٹھ دن'' میں ایک سین ایسا تھا کہ اسے پانی کے ٹب میں بیٹھنا تھا۔ موسم خوشگوار تھا مگر اس کی حد سے نازک طبیعت کے لئے ناقابل برداشت حد تک سرد تھا۔ ہم نے اس کے پیشِ نظر پانی گرم کرا دیا۔ اور ساتھ ہی پروڈکشن منیجر سے کہہ دیا کہ برانڈی تیار رکھے۔ جن اصحاب نے یہ فلم دیکھی ہے۔ ان کو یہ منظر ضرور یاد ہوگا جس میں ٹیکم لالہ (ڈیسائی) سرزیندر کے فلیٹ کے غسل خانے میں ٹب میں بیٹھا ہے۔ سر پر برف کی تھیلی ہے۔ ایک چھوٹا پنکھا چل رہا ہے۔ اور وہ شراب کے نشے میں دھت یہ کہہ رہا ہے۔ ''چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ اوپر برف کا پہاڑ ہے...... وغیرہ وغیرہ۔''

شوٹنگ ختم ہوئی تو جلدی جلدی ڈیسائی کے کپڑے تبدیل کرائے گئے۔ اور اس کے بدن کو اچھی طرح خشک کیا گیا۔ پھر اس کو ایک پیگ برانڈی کا دیا گیا۔ یہ اس کے حلق سے نیچے اتری تو اس نے بھکنا شروع کر دیا۔ اتنی قلیل مقدار ہی نے اسے پورا شرابی بنا دیا، کمرے میں صرف میں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

موجود تھا۔ چنانچہ وہ مجھے لکنت بھرے لہجے میں اپنے تمام کارناموں کی داستان سنانے لگا۔ کچہریوں میں وہ کیسے مقدمے لڑتا تھا اور کس شاندار اور زوردار طریقے پر اپنے مؤکلوں کی وکالت کرتا تھا۔

ڈیسائی قائداعظم محمد علی جناح مرحوم اور شری بھولا بھائی ڈیسائی کی قانون دانی اور ان کے زورِ وکالت کا بہت معترف تھا۔ قائدِ اعظم مرحوم سے وہ کئی بار شرف ملاقات حاصل کر چکا تھا اور متعدد مرتبہ عدالتِ عالیہ میں ان کی قانونی موشگافیاں سن چکا تھا۔

غالباً ''آٹھ دن'' فلمانے ہی کا زمانہ تھا کہ حکومتِ پنجاب نے زیر دفعہ ۲۹۲ میرے نام وارنٹ جاری کئے۔ میرے افسانے ''بو'' پر فحاشی کا الزام تھا۔ اس کا ذکر ڈیسائی سے ہوا تو اس نے اپنی قانونی واقفیت بگھارنا شروع کر دی۔ دفعتاً مجھے ایک دلچسپ شرارت سوجھی۔ وہ یہ کہ اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے اسے منتخب کروں۔ عدالت میں یقیناً ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا جب وہ میری طرف سے پیش ہوتا۔ میں نے اس کا ذکر مکرجی سے کیا وہ فوراً مان گئے بات واقعی مزے کی تھی۔

گواہوں کی فہرست بنائی تو میں نے انڈین چارلی نور محمد کو بھی اس میں شامل کیا۔ چارلی اور ڈیسائی سارے لاہور کو عدالت کے کمرے میں کھینچنے کے لئے کافی تھے، میں اس کا تصور کرتا تو میرے سارے وجود میں ہنسی کا چشمہ پھوٹنے لگتا۔ مگر افسوس کہ شوٹنگ کی مشکلات کے باعث میرا یہ دلچسپ خواب پورا نہ ہوا۔

ڈیسائی نے متعلقہ دفعہ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی تھیں جو میرے نزدیک قطعی ضروری نہیں تھیں اس لئے کہ میں تو صرف تفریح چاہتا تھا۔ نور محمد چارلی نے بھی اپنی گواہی کا خاکہ تیار کر لیا تھا مگر وہ ادھر رنجیت میں کچھ اس طرح اپنی فلموں کی شوٹنگ میں مصروف تھا کہ ایک دن کے لئے بھی بمبئی چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

ڈیسائی کو افسوس تھا کہ اسے اپنی قانونی قابلیت دکھانے کا موقع نہ ملا۔ کم بخت کی نگاہوں سے یہ بالکل اوجھل تھا کہ مجھے اس کی اس قابلیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ جب وہ عدالت میں پیش ہو تو بار بار بوکھلائے اور جو کچھ کہنا چاہتا تھا بار بار بھولے۔ پشاور کے پانی کو پیشاب بنائے اور اتنے ری ٹیک کرائے کہ سب کی طبیعت صاف ہو جائے۔

ڈیسائی مر چکا ہے۔ زندگی میں صرف ایک بار اس نے ری ٹیک ہونے نہیں دیا۔ ریہرسل کئے بغیر اس نے عزرائیل علیہ السلام کے حکم کی تعمیل کی۔ اور لوگوں کو مزید ہنسائے بغیر موت کی گود میں چلا گیا۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
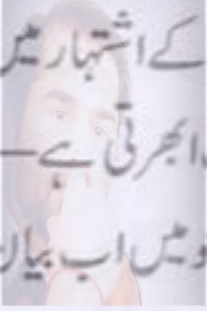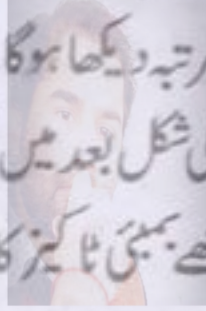
الحمد لائبریری
بس بک گروپ
0314 .595. 1212

الحمد لائبریری
بس بک گروپ
0314 .595. 1212

# کے کے
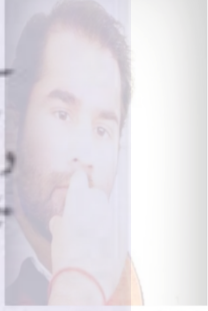
یہ اس مشہور ایکٹریس کا نام ہے، جو ہندوستان کی متعدد فلموں میں آچکی ہے۔ اور آپ نے یقیناً اسے سیمیں پردے پر کئی مرتبہ دیکھا ہوگا۔ میں جب بھی اس کا نام کسی فلم کے اشتہار میں دیکھتا ہوں تو میرے تصوّر میں اس کی شکل بعد میں، لیکن سب سے پہلے اس کی ناک ابھرتی ہے— تیکھی، بہت تیکھی ناک۔ اور پھر مجھے بمبئی ٹاکیز کا وہ دلچسپ واقعہ یاد آجاتا ہے، جو میں اب بیان کرنے والا ہوں۔

بٹوارے پر جب پنجاب میں فسادات شروع ہوئے، تو کلدیپ کور جو لاہور میں تھی، اور وہاں فلموں میں کام کر رہی تھی، ہجرت کر کے بمبئی چلی گئی۔ اس کے ساتھ اس کا داشتہ پران بھی تھا، جو پنچولی کی کئی فلموں میں کام کر کے شہرت حاصل کر چکا تھا۔

اب پران کا ذکر آیا ہے، تو اس کے متعلق بھی چند تعارفی سلسلہ لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پران اچھا خاصا خوش شکل مرد ہے۔ لاہور میں اس کی شہرت اس وجہ سے بھی تھی کہ وہ بڑا ہی خوش پوش تھا۔ بہت ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ اس کا تانگہ گھوڑا لاہور کے رئیسی تانگوں میں سے زیادہ خوبصورت اور دلکش تھا۔

مجھے معلوم نہیں، پران سے کلدیپ کور کی دوستی کب اور کس طرح ہوئی۔ اس لئے کہ میں لاہور میں نہیں تھا۔ لیکن فلمی دنیا میں دوستیاں عجائب میں داخل نہیں۔ وہاں ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران میں ایکٹریسوں کا دوستانہ بیک وقت کئی مردوں سے ہو سکتا ہے۔ جو اس فلم سے وابستہ ہوں۔

جن دنوں پران اور کلدیپ کور کا معاشقہ چل رہا تھا۔ ان دنوں شیام مرحوم بھی وہیں تھا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

پونہ اور بمبئی میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد وہ لاہور چلا گیا تھا جس سے اسے والہانہ محبت تھی۔ عشق پیشہ انسان تھا اور کلدیپ بھی اس میدان میں اس سے پیچھے نہیں تھی ___ دونوں کا تصادم ہوا۔ قریب تھا کہ وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے کہ ایک اور لڑکی شیام کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

اس کا نام ممتاز تھا جو تاجی کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ زیب قریشی ایم۔ اے کی چھوٹی بہن تھی۔ کلدیپ کو شیام کی یہ قلابازی پسند نہ آئی چنانچہ وہ اس سے ناراض ہو گئی اور ہمیشہ ناراض رہی۔ میں یہاں آپ کو یہ بتا دوں کہ کلدیپ بڑی ہٹیلی عورت ہے۔ جو بات اس کے دماغ میں سما جائے اس پر اڑی رہتی ہے۔ میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ یہ واقعہ بمبئی کا ہے۔

ہم تینوں بمبئی ٹاکیز میں تھے اور شام کو برقی ٹرین سے اپنے گھر جا رہے تھے۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ اس دن قریباً قریباً خالی تھا۔ ہم تینوں کے سوا اس میں اور کوئی مسافر نہ تھا۔

شیام طبعاً بڑا بلند بانگ اور منہ پھٹ تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ کمپارٹمنٹ میں کوئی غیر نہیں تو اس نے کلدیپ کور سے چھیڑ خانی شروع کر دی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ رشتہ جو لاہور میں قائم ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اب یہاں بمبئی میں قائم ہو جائے۔ کیونکہ تاجی سے اس کی کھٹ پٹ ہو گئی تھی۔ رمولا کلکتہ میں تھی اور نگار سلطانہ نغمہ نویس مدھوک کے پاس۔ وہ ان دنوں بقول اس کے ''خالی ہاتھ'' تھا۔

چنانچہ اس نے کلدیپ کور سے کہا ''کہ تم مجھ سے دور دور کیوں رہتی ہو۔ ادھر آؤ میری جان میرے پاس بیٹھو۔'' کلدیپ کی ناک اور تیکھی ہو گئی۔

''شیام صاحب آپ مجھ پر ڈورے نہ ڈالیں۔''

میں ان کی گفتگو جو مجھے مکمل طور پر یاد ہے یہاں نقل کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ وہ بہت بے باک تھی۔ ویسے اس کی روح اپنے لفظوں میں بیان کئے دیتا ہوں۔

شیام کبھی سنجیدگی سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس کے ہر لفظ میں ایک قہقہہ ہوتا تھا۔ اس نے کلدیپ سے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''جانِ من اس اُلّو کے پٹھے پران کو چھوڑ دو اور میرے ساتھ ناطہ جوڑو۔ وہ میرا دوست ہے لیکن یہ معاملہ بڑی آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔''

کلدیپ کور کی آنکھیں اس کی ناک کی طرح بڑی اور تیکھی ہیں۔ اس کا لب دہان بھی بڑا تیکھا ہے۔ اس کے چہرے کا ہر خدوخال تیکھا ہے جب وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کر بات کرتی ہے تو آدمی بوکھلا جاتا ہے کہ یہ کیا مصیبت ہے۔

اس نے تیز تیز نگاہوں سے شیام کی طرف دیکھا اور اس سے زیادہ تیز لہجے میں اس

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سے کہا۔ ''منہ دھو کر رکھئے شیام صاحب۔'' شیام پر عورتوں کی تیز گفتاری کا بھلا کیا اثر ہوتا۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا کہ میری جان تم لاہور میں مجھ پر مرتی تھیں۔ یاد نہیں تمہیں۔

اب کلدیپ نے قہقہہ لگایا جس میں نسوانی طنز بھرا تھا۔ ''آپ کو وہم ہو گیا تھا۔''

شیام نے کہا تم غلط کہتی ہو تم یقیناً مجھ پر مرتی ہو۔

میں نے کلدیپ کی طرف دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ اس کے جسم پر سپردگی کی خواہش موجود ہے۔ مگر اس کا ہٹیلا دماغ اس کی اس خواہش کو رد کرنے کی کوشش کرنے میں مصروف ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی تیکھی پلکیں پھڑ پھڑا کر کہا۔ ''مرتی تھی لیکن اب نہیں مروں گی۔''

شیام نے اپنے اسی لاابالیانہ انداز میں کہا۔ اب نہیں مرو گی تو کل مرو گی۔ مرنا بہر حال تمہیں مجھ پر ہی ہے۔

کلدیپ کور بھنا گئی۔ شیام تم مجھ سے آج آخری بار سن لو کہ تمہارا میرا کوئی سلسلہ نہیں ہو سکتا۔ تم اتراتے ہو۔ ہو سکتا ہے لاہور میں کبھی میری طبیعت تم پر آئی ہو لیکن جب تم نے بے رخی برتی تو میں کیوں تمہیں منہ لگاؤں۔ اب اس قصہ کو ختم کرو۔''

قصہ ختم ہو گیا۔ صرف وقتی طور پر کیونکہ شیام زیادہ بحث بحثی کا عادی نہیں تھا۔''

کلدیپ کور اٹاری کے ایک مشہور و معروف اور مالدار سکھ گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا ایک فرد لاہور کی ایک مشہور مسلمان عورت سے منسلک ہے جس کو اس نے لاکھوں روپے دیئے اور سنا ہے کہ اب بھی دیتا ہے۔

یہ مسلمان عورت کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت ہو گی۔ مگر اب موٹی اور بھدی ہو گئی ہے۔ مگر وہ اٹاری کے سکھ حضرت اب بھی باقاعدہ یہاں لاہور میں فلیٹی ہوٹل میں آتے ہیں اور اپنی مسلمان محبوبہ کے ساتھ چند روز گزار کر واپس چلے جاتے ہیں۔

جب بٹوارہ ہوا تو کلدیپ کور اور پران کو افراتفری میں لاہور چھوڑنا پڑا۔ پران کی موٹر (جو غالباً کلدیپ کور کی ملکیت تھی) یہیں رہ گئی۔ لیکن کلدیپ کور ایک باہمت عورت ہے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مردوں کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔ اس کے لئے وہ کچھ دیر کے بعد لاہور آئی اور فسادات کے دوران میں یہ موٹر خود چلا کر بمبئی لے گئی۔

جب میں نے موٹر دیکھی اور پران سے پوچھا کہ یہ کب خریدی گئی ہے تو اس نے مجھے سارا واقعہ سنایا کہ کے کے لاہور سے لے کر آئی ہے۔ اور یہ کہ راستے میں اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ایک صرف دہلی میں اسے چند روز ٹھہرنا پڑا کہ ایک گڑ بڑ ہو گئی تھی۔ یہ گڑ بڑ کیا تھا اس کے متعلق

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مجھے کچھ علم نہیں

جب وہ موٹر لے کر آئی تو اس نے سکھوں پر مسلمانوں کے مظالم بیان کئے۔ اور اس انداز سے بیان کئے کہ معلوم ہوتا تھا وہ میز پر سے مکھن لگانے والی چھری اٹھائے گی اور میرے پیٹ میں گھونپ دے گی۔ لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جذباتی ہو گئی تھی ورنہ مسلمانوں سے کوئی عداوت یا بغض نہیں۔

اصل میں اس کا کوئی مذہب نہیں۔ وہ صرف عورت ہے، ایک ایسی عورت جو جسمانی لحاظ سے بڑی پر خلوص ہے۔

اس کی ناک بے حد تیکھی ہے۔ اس کی آنکھیں بہت تیز ہیں۔ اس کا لب دھان بہت باریک ہے ــــ یہی وجہ ہے کہ اس کے چہرے پر ذرا سا چڑھاؤ بہت تیز و تند بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا لہجہ اور اس کی آواز بھی غیر معمولی طور پر تند و طرار ہے۔

کلدیپ کور کی تیکھی ناک کا ذکر میں کئی بار کر چکا ہوں اس سلسلے میں آپ ایک لطیفہ سن لیجئے۔

میں فلستان چھوڑ کر اپنے دوست اشوک کمار اور ساوک واچا کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا تھا۔ اس زمانے میں فسادات کا آغاز تھا۔ اسی دوران میں کلدیپ کور اور اس کا داشتہ پران ملازمت کے لئے وہاں آیا۔

پران سے جب میری ملاقات شیام کے توسط سے ہوئی تو میری اس کی فوراً دوستی ہو گئی۔ بڑا بے ریا آدمی ہے۔ کلدیپ کور سے البتہ کچھ رسمی قسم کی ملاقات رہی۔

ان دنوں تین فلم ہمارے اسٹوڈیو میں شروع ہونے والے تھے۔ چنانچہ جب کلدیپ کور نے مسٹر ساوک واچا سے ملاقات کی تو انھوں نے جوزف واشنگ، جرمن کیمرہ مین سے کہا کہ وہ اس کا کیمرہ ٹیسٹ کر لے تاکہ اطمینان ہو جائے۔

واشنگ گورے رنگ اور ادھیڑ عمر کا موٹا سا آدمی ہے، اس کو ہمانشو رائے مرحوم اپنے ساتھ جرمن سے لائے تھے۔ جب جنگ شروع ہوئی تو اسے دیولالی میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک عرصہ تک وہاں رہا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو اسے رہا کر دیا گیا۔ اور وہ پھر واپس بمبئی ٹاکیز میں آ گیا۔ اس لئے کہ مسٹر واچا سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ کیونکہ وہ عرصہ ہوا بمبئی ٹاکیز میں اکٹھے ایک دوسرے کے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ ان دنوں مسٹر واچا ساؤنڈ ریکارڈسٹ تھے۔

واشنگ نے اسٹوڈیو میں روشنی کا انتظام کرایا اور میک اپ مین سے کہا کہ وہ کلدیپ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کور کو تیار کر کے کیمرہ ٹیسٹ کے لئے لائے۔ وہ خود تیار تھا۔ کیمرہ نیا تھا۔ اس کو اس نے اچھی طرح دیکھا۔ روشنیاں درست کرائیں اور اپنا چرٹ سلگائے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

کلدیپ کور آئی۔ میں نے اسے دیکھا اس کی ناک پر میک اپ مین نے سرخی اور سفیدے کے کچھ ایسے خط لگائے تھے کہ وہ دس گنا اور تیکھی ہو گئی تھی۔ جب واشنگ نے اس کو دیکھا تو وہ گھبرا گیا کیونکہ وہ سرتاپا ناک تھی۔

کلدیپ کور بالکل بے خوف، بے جھجک کیمرے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

واشنگ نے اب اس کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھا مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کو بڑی الجھن ہو رہی ہے۔ وہ اس کی ناک ایسے زاویے پر بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ معیوب معلوم نہ ہو۔

بیچارہ اس کوشش میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ آخر اس نے تھک ہار کر مجھ سے کہا "میں اب ایک کپ چائے پیوں گا۔" میں سارا معاملہ سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں کینٹین میں پہنچ گئے۔ وہاں اس نے اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ مسٹر منٹو اس کی ناک بھی ایک آفت ہے۔ کیمرے میں گھسی چلی آتی ہے۔ چہرہ بعد میں آتا ہے ناک پہلے آتی ہے، اب میں کیا کروں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آتا۔ میں نے کہا۔ "تم جانو تمہارا کام جانے۔"

پھر اس نے ایک اور الجھن کا اظہار کیا لیکن وہ میرے کان میں "مسٹر منٹو ___ اس کا وہ معاملہ ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن میں اس سے کیسے کہوں اور یہ کہہ کر موٹے واشنگ نے اپنا پسینہ پھر پونچھا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا لیکن واشنگ نے پھر بھی مجھے وضاحت سے سب کچھ بتایا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں کے کے سے درخواست کروں کہ وہ اس معاملے کو ٹھیک کرے کہ وہ بہت ضروری ہے۔ ناک کا وہ کوئی نہ کوئی زاویہ نکال لے گا۔ مگر اس معاملے کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا کہ یہ اس کا کام ہے۔ میں نے اس کی تشفی کی کہ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ کیونکہ اس نے مجھے اس معاملے کی درستی کا حل بتا دیا تھا کہ جو پینتیس روپے میں وائٹ وے اینڈ لیڈ لا کی دکان سے دستیاب ہو سکتا تھا۔

اس روز ٹیسٹ کسی بہانے موقوف کر دیا گیا۔ کلدیپ جب اسٹوڈیو سے باہر نکلی تو میں نے بے تکلفی سے ساری بات جو اس معاملے کے متعلق تھی بتا دی اور اس سے کہا کہ وہ آج ہی فورٹ میں جا کر وہ چیز خرید لے جس سے اس کے جسم کا نقص دور ہو جائے گا۔ اس نے بلا جھجک میری بات سنی اور کہا کہ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ چنانچہ وہ اسی وقت پران کے ساتھ گئی اور وہ چیز خرید لائی۔ جب دوسرے روز اسٹوڈیو میں اس سے ملاقات ہوئی تو زمین و آسمان کا فرق تھا۔ یہ چیزیں ایجاد کرنے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

والے بھی بلا کے آدمی ہیں۔ جو یوں چٹکیوں میں "معاملوں" کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

واشنگ نے جب اسے دیکھا تو وہ مطمئن تھا۔ گو کلدیپ کی ناک اسے تنگ کر رہی تھی مگر اب دوسرا معاملہ بالکل ٹھیک تھا۔ چنانچہ اس نے ٹیسٹ لیا اور جب اس کا پرنٹ تیار ہوا اور ہم سب نے اسے اپنے پروجیکشن ہال میں دیکھا تو اس کی شکل و صورت کو پسند کیا اور یہ رائے متفقہ طور پر قائم ہوئی کہ وہ خاص رولز کے لئے بہت اچھی رہے گی۔ خصوصاً ویمپ رول کے لئے۔

کلدیپ کور سے مجھے زیادہ ملنے جلنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پران چونکہ دوست تھا اور اس کے ساتھ اکثر شامیں گذرتی تھیں اس لئے کلدیپ بھی کبھی کبھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاتی تھی۔ وہ ایک ہوٹل میں رہتی تھی۔ جو ساحلِ سمندر کے پاس تھا۔ پران بھی اس سے کچھ دور ایک سکویل میں مقیم تھا جہاں اس کی بیوی اور بچہ بھی تھا۔ لیکن اس کا زیادہ وقت کلدیپ کور کے ساتھ گزرتا تھا۔ میں اب آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔

میں اور شیام تاج ہوٹل میں بیئر پینے جا رہے تھے کہ راستے میں مشہور نغمہ نویس مدھوک سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ہمیں "ایروز سینما" کی بار میں لے گئے وہاں ہم سب دیر تک بیئر نوشی میں مشغول رہے۔ مدھوک ٹیکسیوں کا بادشاہ مشہور ہے۔ باہر ایک گرانڈیل ٹیکسی کھڑی تھی۔ یہ مدھوک صاحب کے پاس تین دن سے تھی۔

جب ہم فارغ ہوئے تو انھوں نے پوچھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ مدھوک صاحب کو اپنی محبوبہ نگار سلطانہ کے پاس جانا تھا جس سے کسی زمانے میں شیام کا بھی تعلق تھا۔ اور کلدیپ کور بھی اس کے آس پاس ہی رہتی تھی۔ شیام نے مجھ سے کہا چلو پران سے ملتے ہیں۔

چنانچہ مدھوک صاحب کی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم وہاں پہنچے۔ وہ تو اپنی نگار سلطانہ کے پاس چلے گئے اور ہم دونوں کلدیپ کور کے ہاں۔ پران وہاں بیٹھا تھا۔ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ بیئر پی ہوئی تھی۔ غنودگی طاری تھی۔ اس کو زائل کرنے کے لئے شیام نے سوچا کہ تاش کھیلنی چاہئے۔ کلدیپ فوراً تیار ہو گئی لیکن یہ کہا کہ فلش ہوگی۔ ہم مان گئے۔

فلش شروع ہوگئی۔ کلدیپ اور پران ایک ساتھ تھے۔ پران ہی پتے بانٹتا تھا۔ وہی اٹھاتا تھا۔ اور کلدیپ اس کے کاندھے کے ساتھ اپنی نوکیلی ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی تھی۔ البتہ جتنے روپے پران جیتتا تھا اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیتی۔

اس کھیل میں ہم صرف ہارا کئے۔ میں نے فلش کئی مرتبہ کھیلی ہے لیکن وہ فلش کچھ عجیب وغریب قسم کی تھی۔ میرے پچھتر روپے پندرہ منٹ کے اندر اندر کلدیپ کور کے پاس تھے۔ میری

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آج پتوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹھکانے کے آتے ہی نہیں۔

شیام نے جب یہ رنگ دیکھا تو مجھ سے کہا "منٹو اب بند کرو۔"

میں نے کھیلنا بند کر دیا۔ پران مسکرایا اور اس نے کلدیپ سے کہا۔ "کے کے پیسے واپس کر دو منٹو صاحب کے۔"

میں نے کہا۔ یہ غلط ہے۔ تم لوگوں نے جیتے ہیں۔ واپسی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اس پر پران نے مجھے بتایا کہ وہ اوّل درجے کا نوسر باز ہے۔ اس نے جو کچھ مجھ سے جیتا ہے اپنی چابکدستی کی بدولت مجھ سے جیتا ہے۔ چونکہ میں اس کا دوست ہوں اس لئے وہ مجھ سے دھوکا کرنا نہیں چاہتا۔ میں پہلے سمجھا کہ وہ اس حیلے سے میرے روپے واپس کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جب اس نے تاش کی گڈی اٹھا کر تین چار بار پتے تقسیم کئے۔ اور ہر بار بڑے داؤ جیتنے والے پتے اپنے پاس گرائے تو میں اس کے ہتھکنڈے کا قائل ہو گیا۔ یہ کام واقعی بڑی چابکدستی کا ہے۔ پران نے پھر کلدیپ کور سے کہا کہ وہ روپے واپس کر دے مگر اس نے انکار کر دیا۔ شیام کباب ہو گیا۔ پران ناراض ہو کر چلا گیا۔ غالباً اسے اپنی بیوی کے ساتھ کہیں جانا تھا۔ شیام اور میں وہیں بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر شیام اس سے گفتگو کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا آؤ چلو سیر کریں۔ کلدیپ راضی ہو گئی۔

ٹیکسی منگوائی گئی ہم سب بائی کلہ روانہ ہوئے۔ کلیئر روڈ پر میرا فلیٹ تھا۔ ہم سیدھے وہاں پہنچے۔ گھر میں ان دنوں کوئی بھی نہیں تھا۔ شیام میرے ساتھ رہتا تھا۔ ہم فلیٹ میں داخل ہوئے تو شیام نے کلدیپ سے چھیڑ خانی شروع کر دی۔ کلدیپ بہت جلد تنگ آنے والی عورت نہیں۔ وہ کسی مرد سے گھبراتی نہیں۔ اس کو خود پر پورا پورا اعتماد ہے۔ چنانچہ وہ دیر تک شیام کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہی۔

ہاں میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ جب ہم کلیئر روڈ پر پہنچے تو کلدیپ نے ایک اسٹور کے پاس ٹیکسی روکنے کے لئے کہا کہ وہ سینٹ کی شیشی خریدنا چاہتی ہے۔ شیام سخت کباب تھا کہ وہ اس روپے سے ہر چیز خریدے گی جو پران نے نوسر بازی کے ذریعے مجھ سے جیتے تھے پر میں نے اس سے کہا کوئی ہرج نہیں۔ تم اس بات کا کچھ خیال نہ کرو، ہٹاؤ اس قصے کو۔ کلدیپ کے ساتھ میں اسٹور میں گیا۔ اس نے پارو کا سینٹ پسند کیا۔ اس کی قیمت بائیس روپے آٹھ آنے تھی۔ کلدیپ نے خوبصورت شیشی اپنے پرس میں رکھی اور مجھ سے کہا منٹو صاحب قیمت ادا کر دیجئے۔

میں اس سینٹ کے دام ہرگز ادا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر دکاندار میرا واقف تھا۔ اور پھر ایک عورت نے اس انداز سے مجھ سے قیمت ادا کرنے کو کہا تھا کہ انکار کرنا مردانہ وقار کی تذلیل کا باعث ہوتا۔ چنانچہ میں نے جیب سے روپے نکالے اور ادا کر دیئے۔ فلیٹ میں جب شیام کو معلوم ہوا کہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سینٹ میں نے خرید کر دیا ہے تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے مجھے اور کلدیپ کور کو پیٹ بھر کر گالیاں دیں۔ لیکن بعد میں نرم ہو گیا۔ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ کلدیپ کسی نہ کسی طرح رام ہو جائے اور میں نے بھی کوشش کی اور کلدیپ کور کو سمجھایا کہ اب اس کے اختلافات مٹ جانے چاہئیں۔ کلدیپ مان گئی۔ میں نے شیام اور اس سے کہا کہ میں جاتا ہوں۔ تم دونوں آپس میں سمجھوتہ کر لو مگر اس نے کہا کہ نہیں یہ سمجھوتہ اس کے ہوٹل میں ہو گا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ دونوں اس میں چلے گئے۔

میں خوش تھا کہ چلو یہ قصہ طے ہوا۔

مگر پون گھنٹے بعد ہی شیام لوٹ آیا۔ سخت غصے میں بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے جب برانڈی کا گلاس پیش کیا تو میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ زخمی ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔ میں نے بڑی تشویش کے ساتھ پوچھا۔ وہ کباب تھا لیکن برانڈی نے اس کے موڈ کو کسی قدر درست کر دیا۔ اس نے بتایا کہ جب وہ کے۔ کے کے ساتھ ہوٹل پہنچا اور ٹیکسی سے باہر نکلے تو وہ (کلدیپ کو گالی دے کر) منکر ہو گئی۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ ہم دونوں ایک پتھریلی دیوار کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ تم لاہور میں مجھ پر مرتی تھیں۔ اب یہ کیا نخرہ ہے۔ اس نے جواب میں کچھ ایسی بات کہی کہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے تان کر گھونسہ مارا مگر وہ۔۔۔ ایک طرف ہٹ گئی اور میرا گھونسہ دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ وہ ہنستی، قہقہے لگاتی اوپر ہوٹل میں چلی گئی۔ اور میں کھڑا اپنا زخمی ہاتھ دیکھتا رہا۔

کلدیپ کور عجیب و غریب شخصیت کی مالک ہے۔ جس طرح اس کی ناک تیکھی ہے، اسی طرح اس کا کردار تیکھا اور نوکیلا ہے۔

پچھلے دنوں یہ خبر آئی تھی کہ اس پر ہندوستان میں پاکستان کی جاسوسی کا الزام لگایا گیا ہے۔ معلوم نہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے لیکن میں وثوق سے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس جیسی عورت ماتا ہری کبھی نہیں بن سکتی جس کا ظاہر باطن ایک ہو۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# مرلی کی دھن
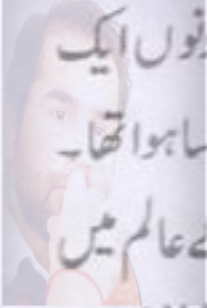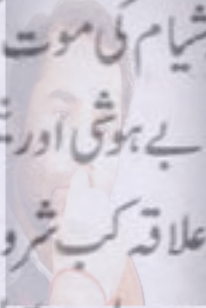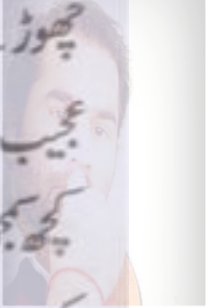
اپریل کی تئیس یا چوبیس تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ پاگل خانے میں شراب چھوڑنے کے سلسلے میں زیرِ علاج تھا کہ شیام کی موت کی خبر ایک اخبار میں پڑھی۔ ان دنوں ایک عجیب وغریب کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے ایک چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہوش مندی کا علاقہ کب شروع ہوتا ہے۔ اور میں بے ہوشی کے عالم میں کب پہنچتا ہوں۔ دونوں کی سرحدیں کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہوگئی تھیں کہ میں خود کو ”نومینز لینڈ“ میں بھٹکتا محسوس کرتا تھا۔

شیام کی موت کی خبر چنانچہ جب میری نظروں سے گزری تو میں نے سمجھا یہ سب ترک شراب کی کارستانی ہے۔ جس نے میرے ذہن میں ہلچل پیدا کر رکھی ہے۔ اس سے قبل نیم خوابی کے عالم میں کئی عزیزوں کی موتیں میرے لئے واقع ہو چکی تھیں۔ اور نیم ہوشمندی کے وقت مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ سب کے سب زندہ ہیں اور میری صحت کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے یہ خبر پڑھی تو ساتھ والے کمرے کے پاگل سے کہا۔ ”جانتے ہو۔ میرا ایک نہایت ہی عزیز دوست مر گیا۔“

اس نے پوچھا۔ ”کون؟“

میں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ ”شیام۔“

”کہاں؟ یہاں پاگل خانے میں؟“

میں نے جواب کوئی نہ دیا۔ اوپر تلے کئی تصویریں میرے مضطرب دماغ میں ابھریں۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جن میں شیام تھا۔ مسکراتا شیام، ہنستا شیام، شور مچاتا شیام، زندگی سے بھرپور شیام، موت اور اس کی ہولناکیوں سے قطعاً ناآشنا شیام۔ میں نے سوچا جو کچھ میں نے پڑھا ہے بالکل غلط ہے...... اخبار کا وجود میرے دماغ کی اختراع ہے۔

آہستہ آہستہ الکوہل کی دھند دماغ سے ہٹنے لگی اور میں تمام واقعات کو ان کے صحیح خدوخال میں دیکھنے لگا۔ مگر یہ عمل کچھ اس قدر سست رفتار تھا کہ جب میں شیام کی موت کے حادثے سے دوچار ہوا تو مجھے زبردست دھکا نہ لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ عرصہ ہوا مر چکا تھا اور اس کی موت کا صدمہ بھی عرصہ ہوا مجھے پہنچ چکا تھا۔ اب صرف اس کے آثار باقی تھے۔ صرف ملبہ رہ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ جس کی میں کھدائی کر رہا تھا۔ شکستہ اینٹوں کے ڈھیر میں کہیں شیام کی مسکراہٹ دبی ہوئی مل جاتی تھی۔ کہیں اس کا بانکا قہقہہ۔

پاگل خانے سے باہر فرزانوں کی دنیا میں یہ مشہور تھا کہ سعادت حسن منٹو شیام کی موت کی خبر سن کر پاگل ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔ شیام کی موت کی خبر سن کر مجھے زیادہ ہوش مند ہو جانا چاہئے تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا احساس میرے دل و دماغ میں زیادہ شدید ہو جانا چاہئے تھے۔ اور انتقامی جذبے کے تحت اپنی زندگی کو پوری طرح استعمال کرنے کا عزم میرے اندر پیدا ہو جانا چاہئے تھا...... شیام کی موت کی خبر سن کر پاگل ہو جانا محض پاگل پن تھا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

رسوم و قیود کے بتوں کو توڑنے والے شیام کی موت پر پاگل ہو جانا اس کی بہت بڑی توہین تھی۔

شیام زندہ ہے اپنے دو بچوں میں جو اس کی بے لوث محبت کا نتیجہ ہیں۔ تاجی (ممتاز) میں جو بقول اس کے اس کی کمزوری تھی اور ان تمام عورتوں میں جن کی اوڑھنیوں کے آنچل اس کے محبت بھرے دل پر گاہے گاہے سایہ کرتے رہے اور میرے دل میں جو صرف اس لئے سوگوار ہے کہ وہ اس کی موت کے سرہانے یہ نعرہ بلند نہ کر سکا۔ ''شیام زندہ باد!''

مجھے یقین ہے موت کے ہونٹوں کو بڑے خلوص سے چومتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہوتا۔ ''منٹو ___ خدا کی قسم ان ہونٹوں کا مزا کچھ اور ہی ہے۔''

میں جب بھی شیام کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے مشہور روسی ناول نویس آرتزبی شیف کا ہیرو سنیائن یاد آ جاتا ہے۔ شیام عاشق تھا، عشق پیشہ نہیں تھا۔ وہ ہر خوبصورت چیز پر مرتا تھا ___

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میرا خیال ہے کہ موت ضرور خوبصورت ہو گی، ورنہ وہ کبھی نہ مرتا۔

اس کو تپش اور حدت سے پیار تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ میں نہیں مانتا۔ شیام ٹھنڈے ہاتھوں کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اگر واقعی موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے تو اس نے یہ کہہ کر ایک طرف جھٹک دیے ہوتے — "ہٹو بڑی بی — تم میں خلوص نہیں؟"

مجھے ایک خط میں لکھتا ہے:

"قصہ یہ ہے جانِ من! کہ یہاں ہر ایک "ہپ ٹلا" ہے لیکن اصلی "ہپ ٹلا" یہاں سے بہت دور لیکن میری پوچھتے ہو تو بھئی کوئی ایسی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ حرفِ شکایت لب پر لاؤں...... زندگی خوب گزر رہی ہے ___ رندی و مے نوشی! مے نوشی و رندی! ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔
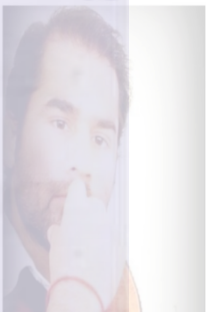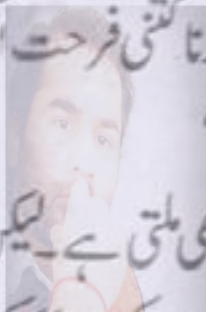
تاجی (ممتاز) چھ مہینے کے عرصے کے بعد واپس آ گئی ہے وہ ابھی تک میری ایک بڑی زبردست کمزوری ہے اور تم جانتے ہو عورت کی محبت کی گرمی کی راحت محسوس کرنا کتنی فرحت انگیز چیز ہے!...... آخر میں انسان ہوں ایک نارمل انسان۔"

نگار (نگار سلطانہ) کبھی کبھی ملتی ہے۔ لیکن اولین حق "ت" کا ہے۔

شاموں کو تمہاری "دانشمندانہ بکواس" اکثر یاد آتی ہے۔"

شیام نے اس خط میں ایک لفظ "ہپ ٹلا" استعمال کیا ہے۔ اس کی تشریح چونکہ خالی از دلچسپی نہیں۔ اس لئے آپ بھی سن لیجئے۔

میں بمبئی ٹاکیز میں ملازم تھا۔ ان دنوں کمال امروہوی کی فلمی کہانی "حویلی" (جو "محل" کے نام سے فلمائی گئی) کی تشکیل و تکمیل ہو رہی تھی۔ اشوک، واچا، حسرت، (لکھنوی) اور میں سب ہر روز بحث و تمحیص میں شامل ہوتے تھے۔ ان نشستوں میں کام کے علاوہ بھی کبھی کبھی خوب زوروں پر گپ بھی چلتی تھی۔ ایک دوسرے سے مذاق ہوتے، شیام کو جب فلم "مجبور" کی شوٹنگ سے فراغت ہوتی تو وہ بھی ہماری محفل میں شریک ہو جاتا۔

کمال امروہوی کو عام گفتگو میں بھی ٹھیٹ قسم کے ادبی الفاظ استعمال کرنے کی عادت ہے۔ میرے لئے یہ ایک مصیبت ہو گئی تھی۔ اس لئے اگر میں عام فہم انداز میں کہانی کے متعلق اپنا کوئی نیا خیال پیش کرتا تو اس کا اثر کمال پر پوری طرح نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس اگر میں زوردار الفاظ میں اپنا عندیہ بیان کرتا تو اشوک اور واچا کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ چنانچہ میں ایک عجیب قسم کی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ملی جلی زبان استعمال کرنے لگا۔

ایک روز صبح گھر سے بمبئی ٹاکیز آتے ہوئے میں نے ٹرین میں اخبار کا اسپورٹس کالم کھولا۔ بڑے برن اسٹیڈیم میں کرکٹ میچ ہو رہے تھے۔ ایک کھلاڑی کا نام کچھ عجیب و غریب تھا، "ہپ ٹلا" ___ ایچ، ای، پی، ٹی، یو، ایل، ایل، ایچ، اے ___ ہپ ٹلا...... میں نے بہت سوچا کہ آخر یہ کیا ہو سکتا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ شاید ہیبت اللہ کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔

اسٹوڈیو پہنچا تو کمال کی کہانی کی فلمی تشکیل کا کام شروع ہوا۔ کمال نے اپنے مخصوص ادیبانہ اور اثر پیدا کرنے والے انداز میں کہانی کا ایک باب سنایا۔ مجھ سے اشوک نے رائے طلب کی۔ "کیوں منٹو؟"

معلوم نہیں کیوں، میرے منھ سے نکلا۔ "ٹھیک ہے ___ مگر ہپ ٹلا نہیں!"

بات کچھ بن ہی گئی۔ "ہپ ٹلا" میرا مطلب بیان کر گیا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ سیکونس زوردار نہیں ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد حسرت نے اسی باب کو ایک نئے طریقے سے پیش کیا۔ میری رائے پوچھی گئی تو میں نے اب کی دفعہ ارادی طور پر کہا۔ "بھئی حسرت بات نہیں بنی ___ کوئی ہپ ٹلا چیز پیش کرو۔ ہپ ٹلا۔"

دوسری مرتبہ ہپ ٹلا کہہ کر میں نے سب کی طرف ردعمل معلوم کرنے کے لئے دیکھا۔ یہ لفظ اب معنی اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نشست میں بلا تکلف میں نے اسے استعمال کیا۔ ہپ ٹلیٹی نہیں۔ ہپ ٹولائز کرنا چاہئے وغیرہ وغیرہ لیکن اچانک ایک بار اشوک مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہپ ٹلا کا اصل مطلب کیا ہے؟ کس زبان کا لفظ ہے؟"

شیام اس وقت موجود تھا۔ جب اشوک نے مجھ سے یہ سوال کیا۔ اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ٹرین میں وہ میرے ساتھ تھا۔ جب میں نے کرکٹ کے کھلاڑی کے اس عجیب و غریب نام کی طرف اس کو متوجہ کیا تھا۔ ہنس ہنس کے دوہرا ہوتے ہوئے اس نے سب کو بتایا کہ یہ منٹو کی نئی منٹویت ہے جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہپ ٹلا کو کھینچ کر فلمی دنیا میں لے آیا۔ مگر کھینچا تانی کے بغیر یہ لفظ بمبئی کے فلمی حلقوں میں رائج ہو گیا۔

۴۸/۷/۲۹ کے خط میں شیام مجھے لکھتا ہے:

"پیارے منٹو، اس کی دفعہ تم پھر خاموش ہو، تمہاری یہ خاموشی مجھے بہت دق کرتی ہے۔ اس کے باوجود کہ میں تمہارے دماغی تساہل سے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

بخوبی واقف ہوں۔ میں غصے سے دیوانہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جبکہ تم یکلخت چپ سادھ لیتے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ میں بھی کوئی بہت بڑا خط باز نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ایسے خط لکھنے اور وصول کرنے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔ جو ذرا الگ قسم کے ہوں...... یعنی ہپ ٹلا۔

لیکن ہپ ٹلا یہاں بہت ہی نایاب چیز ہوتی ہے...... اسے کاغذ پر لکھو تو کم بخت "ہپ ٹلی" بن جاتی ہے اور اگر "یہ ہپ ٹلی" بھی دستیاب نہ ہو تو بتاؤ کتنی کوفت ہوتی ہے۔ معاف کرنا۔ اگر میں نے پچولائز کرنا شروع کر دیا ہو...... لیکن کیا کروں۔ جب حقیقتیں گم ہو جائیں تو انسان، پچولیٹ ہی کرتا ہے۔ مگر مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ تم کیا کہو گے، کیا نہیں کہو گے۔ میں اتنا جانتا ہوں۔ اور تمہیں اس کا علم ہو گا کہ تم ایسے بڑے ہپ ٹلا کو اس میدان میں شکست دینے کا سہرا صرف میرے ہی سر ہے۔
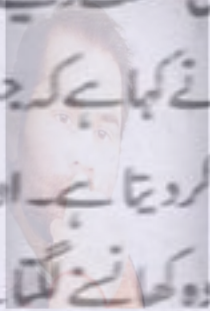
منٹو! کسی نے کہا ہے کہ جب عاشق کے پاس لفظ ختم ہو جاتے ہیں تو وہ چومنا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب کسی مقرر کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ کھانسنے لگتا ہے۔ میں اس کہاوت میں ایک اور چیز شامل کرتا ہوں جب مرد کی مردانگی ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ماضی کو پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہے لیکن تم فکر مند نہ ہونا۔ میں اس آخری منزل سے کچھ دور ہوں۔ زندگی بہت مصروف اور بھرپور ہے۔ اور بھرپور زندگی میں تم جانتے ہو دیوانگی کے لئے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ حالانکہ مجھے اس کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔
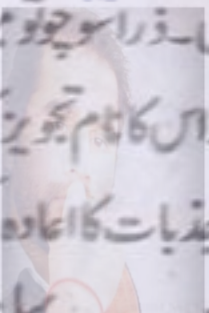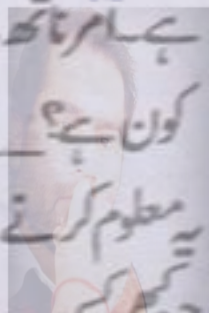
نسیم والا فلم (چاندنی رات) قریب قریب نصف مکمل ہو چکا ہے۔ امرناتھ سے ایک فلم کا کنٹریکٹ کر چکا ہوں۔ ذرا سوچو تو میری ہیروئن کون ہے؟ ___ نگار (نگار سلطانہ) میں نے خود اس کا نام تجویز کیا تھا۔ محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پردے پر ان پرانے جذبات کا اعادہ کیسے لگتا ہے جو کبھی کسی حقیقت کی دنیا میں متعلق رہے ہیں...... پہلے مسرت تھی، اب محض کاروبار لیکن کیا خیال ہے تمہارا۔ یہ سلسلہ جوش آفریں نہیں رہے گا۔ تاجی، ابھی تک میری زندگی میں ہے۔ نگار بہت ہی اچھی ہے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اور اس کا سلوک بے حد نرم و نازک۔ پچھلے دنوں سے رمولا بھی یہاں بمبئی میں ہے۔ اس سے ملاقات کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک اس کمزوری کو جو اس کے دل و دماغ میں میری طرف سے موجود ہے مغلوب نہیں کر سکی۔ چنانچہ اس کے ساتھ بھی سیر و تفریح رہی۔

اولڈ بوائے میں ان دنوں ''فلرٹیشن کے فن میں ایڈوانس ٹریننگ لے رہا ہوں مگر دوست یہ سارا سلسلہ بہت ہی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بہر حال میں پیچیدگیاں پسند کرتا ہوں۔

وہ میرے اندر جو قسمت آزما، مہم جو اور آوارہ گرد ہے ابھی تک کافی طاقتور ہے۔ میں کسی مخصوص جگہ کا نہیں اور نہ کسی مخصوص جگہ کا ہونا چاہتا ہوں۔ میں لوگوں سے محبت کرتا ہوں اور ان سے نفرت کرتا ہوں۔ زندگی یوں ہی گزر رہی ہے۔ دراصل زندگی ہی ایک ایسی معشوقہ ہے، جس سے مجھے محبت ہے، لوگ جائیں جہنم میں!

مجھے مصنف کا نام بھول گیا ہوں۔ مگر اس کا ایک جملہ یاد رہ گیا ہے۔ شاید وہ بھی درست نہ ہو۔ مگر مفہوم کچھ اسی قسم کا تھا...... وہ لوگوں سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ (خود کو محبت کرنے میں) کبھی تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ اس طور پر ان سے نفرت کرتا تھا کہ نفرت کرنے میں خود کو یکہ و تنہا محسوس کرتا تھا

میں اس میں اور کوئی فقرہ شامل نہیں کر سکتا۔''

ان دو خطوں میں تاجی کا ذکر آیا ہے۔ خطوط وحدانی میں اتنا تو میں بتا چکا ہوں کہ یہ ممتاز کی تصغیر ہے۔ ممتاز کون ہے، یہ خود شیام بتا چکا ہے کہ وہ اس کی کمزوری ہے۔ سچ پوچھیے تو نگار، رمولا سب اس کی کمزوریاں تھیں۔ عورت دراصل اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اور یہی اس کے کردار کا مضبوط ترین پہلو تھا۔

ممتاز، زیب قریشی ایم۔ اے کی چھوٹی بہن ہے۔ زیب کے ساتھ بمبئی گئی تو ظہور راجہ کے بھاری بھرکم عشق میں پھنس گئی۔ کچھ عرصے کے بعد اس سے اپنا دامن چھڑا کر لاہور آئی تو شیام کے ساتھ رومانس شروع ہو گیا۔ بمبئی میں جب شیام کی حالت درست ہوئی تو اس نے اپنے ہونے والے بچے کی خاطر اس سے شادی کر لی۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

شیام کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ خاص طور پر خوبصورت بچوں سے خواہ وہ حد درجہ بدتمیز ہی کیوں نہ ہوں۔ طہارت و نفاست پسند طبقوں کی نظر میں وہ خود بہت بڑا بدتمیز تھا۔ بعض عورتیں تو اس سے اس کی بدتمیزی کی وجہ سے سخت نفرت کرتی تھیں۔ مگر وہ بالکل بے پرواہ تھا۔ اس نے کبھی ان عورتوں کی خوشنودی کے لئے اپنی عادت سنوارنے کی کوشش نہ کی۔ اس کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ''منٹو میری باتیں سن کر یہ ناک بھوں چڑھانے والی سالیاں سب بنتی ہیں ـــــ میک اپ کی دنیا میں رہتی ہیں۔''

لیکن بعض عورتیں اس کی بدتمیزیوں سے محبت بھی کرتی تھیں۔ کیونکہ ان میں بستر کی بو نہیں ہوتی تھی۔ شیام ان سے کھلے مذاق کرتا۔ وہ بھی اس سے ایسی باتیں کرتیں۔ جو مہذب سوسائٹی میں قابل ستر پوش سمجھی جاتی تھیں...... ہونٹوں پر مسکراہٹیں ناچتیں۔ حلق سے قہقہے اچھلتے۔ ہنستے ہنستے شیام کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ دور کونے میں طہارت پسندی تو کیلے کیلوں پر آسن جمائے اپنے گناہ بخشوانے کی رائیگاں کوشش کر رہی ہے۔

شیام سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ یہ مجھے بالکل یاد نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس سے ملنے سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ ویسے اب سوچتا ہوں تو اتنا یاد آتا ہے کہ بمبئی میں اس سے شروع شروع کی ملاقاتیں شاید لیڈی جمشید جی روڈ پر ہوئی تھیں۔ جہاں میری بہن رہتی تھی۔ ''ہائی نسٹ'' میں بالائی منزل کے ایک فلیٹ میں ڈائمنڈ رہتی تھی۔ اس کے ہاں شیام کا آنا جانا تھا۔ دو تین مرتبہ غالباً سیڑھیوں میں اس سے ملنا ہوا۔ یہ ملاقاتیں گو رسمی تھیں۔ لیکن غایت درجہ بے تکلف تھیں۔ کیونکہ شیام نے مجھے خود ہی بتا دیا تھا کہ ڈائمنڈ نام کی عورت جو مسز شیام کہلاتی ہے۔ درحقیقت اس کی بیوی نہیں لیکن تعلقات کی بناء پر وہ بیوی سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ ازدواجی رشتے اور اس کے اشتہار کا بالکل قائل نہیں تھا۔ لیکن جب ایک تکلیف کے سلسلے میں اسے ڈائمنڈ کو ہسپتال داخل کرنا پڑا تو اس نے رجسٹر میں اس کا نام مسز شیام ہی لکھوایا۔

بہت دیر بعد ڈائمنڈ کے شوہر نے مقدمے بازی کی۔ شیام کو بھی اس میں پھنسایا گیا۔ لیکن معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اور ڈائمنڈ جو کہ اب فلمی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی۔ اور وزنی جیبیں دیکھ چکی تھی۔ شیام کی زندگی سے نکل گئی مگر شیام اس کو اکثر یاد کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے۔ پونے کے ایک باغ میں اس نے مجھے سیر کراتے ہوئے کہا۔ ''منٹو ـــــ ڈائمنڈ گریٹ عورت تھی...... خدا کی قسم جو عورت اسقاط برداشت کر سکتی ہے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی صعوبت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ لیکن فوراً ہی اس نے کچھ سوچ کر کہا ـــــ یہ کیا بات ہے منٹو ـــــ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

عورت پھل پھول سے کیوں ڈرتی ہے۔ کیا اس لئے کہ یہ گناہ کا ہوتا ہے؟ مگر یہ گناہ اور ثواب کی بکواس کیا ہے۔ ایک نوٹ اصلی یا جعلی ہو سکتا ہے۔ ایک بچہ حلال کا یا حرام کا نہیں ہو سکتا۔ وہ جھٹکہ یا کلمہ پڑھ کے چھری پھیرنے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی پیدائش کا موجب تو عظیم الشان دیوانگی ہے۔ جس کے مرتکب سب سے پہلے باوا آدم اور اماں حوا ہوئے تھے ___ آہ یہ دیوانگی!''

اور وہ دیر تک اپنی مختلف دیوانگیوں کی باتیں کرتا رہا۔

شیام بہت بلند بانگ تھا۔ اس کی ہر بات، اس کی ہر حرکت اس کی ہر ادا اونچے سروں میں ہوتی تھی۔ اعتدال کا وہ بالکل قائل نہیں تھا۔ محفل میں سنجیدگی و متانت کی ٹوپی پہن کر بیٹھنا اس کے نزدیک مسخرہ پن تھا۔ شغلِ مے نوشی کے دوران میں خاص طور پر اگر کوئی خاموش ہو جاتا یا فلسفی بن جاتا تو اسے ناقابل بیان کوفت ہوتی۔ اس قدر جھنجھلا جاتا کہ بعض اوقات بوتل اور گلاس توڑ پھوڑ کر گالیاں دیتا محفل سے باہر چلا جاتا۔

الحمد لائبریری

پونے کا ایک واقعہ ہے۔ شیام اور مسعود پرویز دونوں ''زبیدہ کاٹج'' میں رہتے تھے۔ ایک کہانی فروخت کرنے کے سلسلے میں مجھے وہاں ٹھہرنا پڑا۔ مسعود طبعاً خاموشی پسند ہے۔ شراب پی کر وہ اور بھی زیادہ منجمد ہو جاتا۔ ایک دن صبح سے رم کا دور شروع ہوا۔ اس دوران میں کئی آئے اور بہک کر چلے گئے۔ میں، مسعود اور شیام ڈٹے ہوئے تھے، شیام بہت خوش تھا۔ اس لئے کہ وہ بہکنے والوں سے مل کر جی بھر کے شور مچاتا رہا تھا۔ مگر شام کے قریب اس کو دفعتاً محسوس ہوا کہ مسعود دن کی تمام ہاؤ ہو سے الگ تھلگ رہا ہے۔ نشے سے چور آنکھوں کو سکیڑ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کیوں حضرت پرویز ___ کیا آپ نے اپنا مرثیہ مکمل فرما لیا ہے۔''

مسعود حسب عادت مسکرا دیا۔ اتنے میں کرشن چندر آ گیا اور شیام مسعود کی منجمد مسکراہٹ کے پیدا کردہ اثر کو بھول گیا۔ دو ایک دور چلے تو شیام نے کرشن سے مسعود کے ''ناقابلِ برداشت انجماد'' کا ذکر کیا۔ کرشن کی زبان کا تالا کھولنے کے لئے دو پیگ کافی تھے۔ چنانچہ مسعود سے مخاطب ہو کر اس نے لعن طعن شروع کر دی۔ تم کیسے شاعر ہو پرویز ___ صبح سے پی رہے ہو اور تم نے ابھی تک کوئی واہیات بات نہیں کی۔ خدا کی قسم جو شاعر واہیات بکواس کرنا نہیں جانتا۔ وہ شاعری بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم شاعری کیسے کر لیتے ہو۔ میرا خیال ہے تمہاری یہ شاعری یقیناً بکواس ہوگی۔ اور تمہارا پی کر یوں کیسٹر آئل کی بوتل بن جانا تمہاری اصل شاعری ہے۔''

یہ سن کر شیام اس قدر ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ جب کچھ دیر تک مسعود سے چھیڑ جاری رہی تو وہ اکسا، اٹھ کر اس نے ہم سب کے گلاس خالی کر دیئے اور کہا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

"چلو باہر چلیں۔"

ہم باہر نکلے۔ مسعود کے کہنے پر سب نے اپنے جوتے اتار کر جیبوں میں رکھ لئے۔ اور دوڑنے لگے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ پونہ کی سڑکیں سب سنسان تھیں۔ میں، مسعود، شیام اور ایک اور جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ دیوانہ وار شور مچاتے دوڑ رہے تھے۔ بالکل بے مطلب! اپنی منزل سے ناآشنا۔

راستے میں کرشن چندر کا مکان پڑتا تھا۔ وہ دوڑ سے پہلے ہم سے الگ ہو کر چلا گیا تھا۔ دروازہ کھلوا کر ہم نے اسے بہت پریشان کیا۔ اس کی ثمینہ خاتون ہمارا شور سن کر دوسرے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس سے کرشن اور بھی زیادہ پریشان ہوا۔ جس کے پیش نظر ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور پھر سڑک پیمائی شروع کر دی۔

پونہ مندروں کا شہر ہے۔ ہر فرلانگ پر ایک نہ ایک مندر ضرور ہوتا ہے۔ مسعود نے ایک کا گھنٹہ بجایا۔ میں اور شیام سجدے میں چلے گئے اور شو شمبھو، شو شمبھو کہنے لگے۔ اس کے بعد جو بھی مندر آتا۔ ہم چاروں یہی عمل دہراتے اور خوب قہقہے لگاتے۔ جب کوئی پجاری آنکھیں ملتا باہر نکلتا تو ہم خاموش ہو جاتے اور چپ چاپ چل پڑتے۔

اسی طرح تین بج گئے ___ ایک سڑک پر کھڑے ہو کر مسعود نے وہ مغلّظات بکیں کہ میں دنگ رہ گیا۔ کیونکہ اس کی زبان سے میں نے کبھی ناشائستہ کلمہ نہیں سنا تھا۔ مگر جب وہ موٹی موٹی گالیاں اگل رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اس کی زبان پر ٹھیک طور پر بیٹھتی نہیں تھیں۔

چار بجے ہم زبیدہ کا مچ پہنچے اور سو گئے۔ لیکن مسعود شاید جاگتا اور شعر کہتا رہا۔ مے نوشی کے معاملے میں بھی شیام اعتدال پسند نہیں تھا۔ وہ کھل کھیلنے کا قائل تھا۔ مگر اپنے سامنے میدان کی وسعت دیکھ لیتا تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی کو اچھی طرح جانچ لیتا تھا۔ تاکہ حدود سے آگے نکل نہ جائے۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا۔ "میں چوکے پسند کرتا ہوں ___ چھکے محض اتفاق سے لگ جاتے ہیں۔"

ایک چھکا ملاحظہ ہو:-

تقسیم ہونے سے چند ماہ پیشتر کا ذکر ہے ___ شیام، شاہد لطیف کے گھر سے میرے یہاں چلا آیا تھا۔ بمبئی کی زبان میں کڑکی یعنی مفلسی کے دن تھے۔ مگر مے نوشی بڑی باقاعدگی سے جاری تھی۔ ایک شام باتوں باتوں میں زیادہ پی گئے۔ راجہ مہدی علی خاں بھی اتفاق سے موجود تھا۔ کرفیو کا وقت ہوا تو اس نے جانے کی اجازت چاہی۔ میں نے اس سے کہا۔ "پاگل ہوئے ہو پکڑے جاؤ گے۔"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

شیام نے اس سے ازراہِ مذاق کہا۔ "یہیں سو جاؤ۔ آج کل تاجی یہاں نہیں ہے۔"

راجہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مجھے نیند نہیں آئے گی۔ سپرنگ والے پلنگوں پر میں قطعاً سو نہیں سکتا۔"

شیام نے ایک گلاس میں راجہ کے ڈیل ڈول کے مطابق برانڈی کا پیگ ڈالا۔ اور اس کو دے دیا۔ "یہ لو اس سے نیند آ جائے گی۔"

راجہ ایک جرعے میں سارا گلاس چڑھا گیا۔ بہت دیر تک تاجی کی باتیں ہوتی رہیں جو شیام سے ناراض ہو کر اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھی۔ ہر آٹھویں دسویں روز نکمی نکمی باتوں پر دونوں میں چخ ہو جاتی تھی۔ میں بالکل دخل نہیں دیتا تھا۔ اس لئے کہ شیام کو یہ بالکل پسند نہیں تھا۔ ہم دونوں میں گویا دل ہی دل میں یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ ایک دوسرے کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔

تاجی یوں گئی تھی جیسے کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اور شیام نے بھی اسے یوں وداع کیا تھا جیسے وہ پھر کبھی اس کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں ہوگا۔ مگر دونوں ایک دوسرے سے دور بیٹھے تڑپتے رہتے تھے۔ شاموں کو تو شیام اکثر تاجی کے معاملے میں بہت جذباتی ہو جاتا تھا۔ میں سوچتا کہ وہ ضرور رات بھر اس کی یاد میں جاگتا رہے گا۔ مگر کم بخت نیند کا کچھ ایسا ماتا تھا کہ پلنگ پر لیٹتے ہی سو جاتا۔

میرے فلیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک سونے کا اور دوسرا بیٹھنے کا۔ سونے والا کمرہ میں نے شیام اور تاجی کو دے دیا تھا۔ اور بیٹھنے والے کمرے میں گدا بچھا کر میں سوتا تھا۔ تاجی چونکہ موجود نہیں تھی، اس لئے اس کا پلنگ راجہ مہدی علی خان کو مل گیا۔ رات بہت گزر گئی تھی۔ اس لئے ہم سب اپنی اپنی جگہ پر سو گئے۔

حسبِ معمول پونے چھ کے قریب میری جاگ کھلی۔ نیم خوابی کے عالم میں یوں محسوس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی لیٹا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بیوی ہے مگر وہ تو لاہور بیٹھی تھی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ شیام ہے۔ اب میں نے سوچنا شروع کیا کہ یہ کیسے میرے پاس پہنچ گیا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جلے ہوئے کپڑے کی بو ناک میں گھسی۔ پاس ہی صوفہ پڑا تھا۔ عرصہ ہوا سگریٹ گرنے سے اس کا ایک حصہ جل گیا تھا۔ مگر اتنی دیر کے بعد اب بو آنے کا کیا مطلب ہے۔ آنکھیں زیادہ کھلیں تو میں نے دھوئیں کی کڑواہٹ محسوس کی اور ہلکے ہلکے دودھیا بادل بھی دیکھے ___ اُٹھ کر میں دوسرے کمرے میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ پلنگ جس پر شیام

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سویا کرتا تھا۔ سلگ رہا ہے اور پاس ہی دوسرے پلنگ پر راجہ مہدی علی خان اپنی توند نکالے پڑا خراٹے لے رہا ہے۔

میں نے قریب جا کر پلنگ کے جلے ہوئے حصہ کا معائنہ کیا۔ میٹرس میں بڑی رکابی کے برابر سوراخ تھا۔ جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آگ بجھانے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ پلنگ پانی میں تر بتر تھا۔ مگر معاملہ چونکہ روئی اور ناریل کے پھوس کا تھا۔ اس لئے آگ پوری طرح بجھی نہیں تھی اور برابر سلگ رہی تھی۔ میں نے راجہ کو جگانے کی کوشش کی مگر وہ کروٹ بدل کر اور زور سے خراٹے لینے لگا۔ ایک دم پلنگ کے سیاہ سوراخ سے ایک لال شعلہ باہر لپکا۔ میں فوراً غسل خانے کی طرف بھاگا ایک بالٹی پانی کی اس سوراخ میں ڈالی اور جب پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ آگ بجھ گئی تو راجہ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ اس سے جب آتشزدگی کی واردات کے متعلق استفسار کیا تو اس نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں خوب نمک مرچ لگا کر واقعات بیان کیے۔ تمہارا یہ شیام ہنومان مہاراج ہے۔ رات برانڈی کے تالاب میں غوطہ لگاتے ہوئے میں سو گیا۔ دو بجے کے قریب جب عجیب عجیب آوازیں آئیں تو میں جاگ پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شیام ایک بہت بڑا ہنومان ہے۔ اس کی گچھے دار دم کے ساتھ مٹی کے تیل میں ڈوبی چندیاں بندھی ہیں اور ان میں آگ لگی ہے۔ شیام پلنگ پر زور زور سے اچھل کود رہا ہے اور اپنی دم سے آگ لگا رہا ہے۔ جب آگ لگ گئی تو میں نے آنکھیں بند کر لیں اور برانڈی کے تالاب میں غوطہ لگا گیا۔ تہہ کے ساتھ لگ کر سونے ہی والا تھا کہ مجھے تمہارا خیال آیا کہ غریب آدمی کا پلنگ ایسا نہ ہو کہ جل کر راکھ ہو جائے۔ چنانچہ اٹھا شیام غائب تھا۔ دوسرے کمرے میں تمہیں حالات سے آگاہ کرنے کے لئے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیام اپنے اصلی روپ میں تمہارے ساتھ چمٹ کر لیٹا ہے۔ میں نے تمہیں جگانے کی کوشش کی۔ اپنے پھیپھڑوں پر زور لگا کر تمہیں پکارا۔ گھنٹے بجائے۔ ایٹم بم چلائے۔ مگر تم نہ اٹھے۔ آخر میں نے ہولے ہولے تمہارے کان میں کہا۔ خواجہ اٹھو۔ اسکاچ وسکی کی ایک پوری پیٹی آئی ہے۔ تم نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور پوچھا "کہاں" ...... میں نے کہا "ہوش میں آؤ...... سارا مکان جل رہا ہے...... آگ لگ گئی ہے آگ! تم نے کہا۔ "بکتے ہو" میں نے کہا "نہیں خواجہ، میں خواجہ خضر کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ آگ لگی ہے۔" جب تمہیں میرے بیان پر یقین آ گیا تو تم آرام سے یہ کہتے ہوئے سو گئے۔ "فائر بریگیڈ کو اطلاع دے دو۔" "تمہاری طرف سے مایوس ہو کر میں شیام کو حالات کی نزاکت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ اس قابل ہوا کہ میری بات اس کے دماغ تک پہنچ سکے۔ تو اس نے مجھ سے کہا۔ "تم بجھا دو نا یار۔ کیوں تنگ کرتے ہو۔" ...... اور سو

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

گیا...... آگ آخر آگ ہے اور اس کا بجھانا ہر انسان کا فرض ہے۔ اس لئے میں فوراً اپنی ساری انسانیت مجتمع کر کے فائر بریگیڈ بن گیا اور وہ جگ جو میں نے تمہاری سالگرہ پر تحفے کے طور پر دیا تھا بھر کے آگ پر ڈال دیا...... میرا کام چونکہ پورا ہو چکا تھا۔ نتیجہ خدا کے ہاتھ سونپ کر سو گیا۔"

شیام جب پوری نیند سو کر اٹھا تو میں نے اور راجہ نے اس سے پوچھا کہ آگ کیسے لگی تھی۔ شیام کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بہت دیر غور و فکر کے بعد اس نے کہا "میں آتشزدگی کی اس واردات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔" مگر جب راجہ دوسرے کمرے سے شیام کی جلی ہوئی ریشمی قمیض اٹھا کر لایا تو شیام نے مجھ سے کہا "اب تفتیش کرنی ہی پڑے گی۔"

سب نے مل کر تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ شیام صاحب نے جو بنیان پہنا تھا۔ وہ بھی دو ایک جگہ سے جلا ہوا ہے۔ زیادہ گہرائیوں میں گئے تو دیکھا کہ ان کی چھاتی پر روپے روپے جتنے دو بڑے آبلے ہیں۔ چنانچہ شرلک ہومز نے اپنے دوست واٹسن سے کہا۔ "یہ بات قطعی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ آگ ضرور لگی تھی اور شیام صرف اس غرض سے کہ اس کے ہمسائے راجہ مہدی علی خان کو تکلیف نہ ہو۔ چپ چاپ اٹھ کر میرے پاس چلا آیا۔"

جب شیام نے تہذیب و تمدن کے مروجہ قوانین کے پیش نظر تاجی سے باقاعدہ شادی کی۔ تو میرا خیال ہے صرف ایک انتقامی جذبے کے تحت اس نے اتنی شاندار دعوت کی کہ دیر تک فلمی دنیا میں اس کے چرچے رہے۔ اتنی شراب بہائی گئی کہ خم کے خم خالی ہو گئے۔ مگر افسوس کہ تہذیب تمدن کی ستر پوش چولی کے داغ دھل نہ سکے۔

شیام صرف بوتل اور عورت ہی کا رسیا نہیں تھا۔ زندگی میں جتنی نعمتیں موجود ہیں۔ وہ ان سب کا عاشق تھا۔ اچھی کتاب سے بھی وہ اسی طرح پیار کرتا تھا جس طرح ایک اچھی عورت سے کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کے بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ مگر اس کی اپنی سوتیلی ماں سے بھی ویسی ہی محبت تھی۔ جو حقیقی ماں سے ہو سکتی ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سوتیلے بہن بھائی تھے۔ ان سب کو وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ باپ کی موت کے بعد صرف اس کی اکیلی جان تھی جو اتنے بڑے کنبے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

ایک عرصے تک وہ انتہائی خلوص کے ساتھ دولت اور شہرت حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ اس دوران میں تقدیر نے اسے کئی غچے دیئے مگر وہ ہنستا رہا۔ "جانِ من ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ تو میری بغل میں ہوگی۔" اور وہ کئی برسوں کے بعد آخر آ ہی گیا کہ دولت اور شہرت دونوں اس کی جیب میں تھیں۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

موت سے پہلے اس کی آمدنی ہزاروں روپے ماہوار تھی۔ بمبئی کے مضافات میں ایک خوبصورت بنگلہ اس کی ملکیت تھا اور کبھی وہ دن تھے کہ اس کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں تھی۔ مگر مفلسی کے ان ایام میں بھی وہی ہنستا ہوا شیام تھا۔ دولت و شہرت آئی تو اس نے ان کا یوں استقبال نہ کیا جس طرح لوگ ڈپٹی کمشنر کا کرتے ہیں۔ یہ دونوں محترمائیں اس کے پاس آئیں تو اس نے ان کو اپنی لوہے کی چارپائی پر بٹھالیا۔ اور پٹاخ پٹاخ بوسے داغ دیئے۔

میں اور وہ جب ایک چھت کے نیچے رہتے تھے تو دونوں کی حالت پتلی تھی۔ فلم انڈسٹری ملک کی سیاسیات کی طرح ایک بڑے ہی نازک دور سے گذر رہی تھی۔ میں بمبئی ٹاکیز میں ملازم تھا۔ اس کا وہاں ایک پکچر کا کنٹریکٹ تھا، دس ہزار روپے میں۔ عرصے کی بیکاری کے بعد اس کو یہ کام ملا تھا۔ مگر وقت پر پیسے نہیں ملتے تھے۔ بہر حال ہم دونوں کا گذر کسی نہ کسی طور پر ہو جاتا تھا۔ میاں بیوی ہوتے تو ان میں روپے پیسے کے معاملے میں ضرور چخ ہوتی۔ مگر شیام اور مجھے کبھی محسوس تک نہ ہوا کہ ہم میں سے کون خرچ کر رہا ہے اور کتنا کر رہا ہے۔

ایک دن اسے بڑی کوششوں کے بعد موٹی سی رقم ملی (غالباً پانچ سو روپے تھے) میری جیب خالی تھی۔ ہم ملاڈ سے گھر آ رہے تھے، راستے میں شیام کا یہ پروگرام بن گیا کہ وہ چرچ گیٹ کسی دوست سے ملنے جائے گا۔ میرا اسٹیشن آیا تو اس نے جیب سے دس دس روپے کے نوٹوں کی گڈی نکالی، آنکھیں بند کر کے اس کے دو حصے کئے اور مجھ سے کہا۔ ”جلدی کرو منٹو...... ان میں سے ایک لے لو۔“

میں نے گڈی کا ایک حصہ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ شیام نے مجھے ”ٹاٹا“ کہا اور کچھ نوٹ جیب سے نکال کر لہرائے۔ ”تم بھی کیا یاد رکھو گے۔ سیفٹی کی خاطر میں نے یہ نوٹ علاحدہ رکھ لئے تھے...... ہپ ٹلا۔“

شام کو جب وہ اپنے دوست سے مل کر آیا تو کباب ہو رہا تھا۔ مشہور فلم اسٹار ”کے کے“ نے اس کو بلایا تھا کہ وہ اس سے ایک پرائیویٹ بات کرنا چاہتی ہے۔ شیام نے برانڈی کی بوتل بغل میں سے نکال کر اور گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈال کر مجھ سے کہا۔ ”پرائیویٹ بات یہ تھی...... میں نے لاہور میں ایک دفعہ کسی سے کہا تھا کہ ”کے کے“ مجھ پر مرتی ہے۔ خدا کی قسم بہت بری طرح مرتی ہے۔ لیکن ان دنوں میرے دل میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ آج اس نے مجھے اپنے گھر بلا کر کہا کہ تم نے بکواس کی تھی۔ میں تم پر کبھی نہیں مری۔ میں نے کہا تو آج مر جاؤ۔ مگر اس نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور مجھے غصے میں آ کر اس کے ایک گھونسہ مارنا پڑا۔“

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں نے اس سے پوچھا۔ "تم نے ایک عورت پر ہاتھ اٹھایا۔"

شیام نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا جو زخمی ہو رہا تھا۔ "کم بخت آگے سے ہٹ گئی۔ نشانہ چوکا اور میرا گھونسہ دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔"

یہ کہہ کر وہ خوب ہنسا۔ "سالی بے کار رنگ کر رہی ہے۔"

میں نے اوپر روپے پیسے کا ذکر کیا ہے...... غالباً دو برس پیچھے کی بات ہے۔ میں یہاں لاہور میں فلمی صنعت کی زبوں حالی اور اپنے افسانے...... "ٹھنڈا گوشت" کے مقدمے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ عدالتِ ماتحت نے مجھے مجرم قرار دے کر تین مہینے قید بامشقت اور تین سو روپیہ جرمانے کی سزا دی تھی۔ میرا دل اس قدر کھٹا ہو گیا تھا کہ جی چاہتا تھا اپنی تمام تصانیف کو آگ میں جھونک کر کوئی اور کام شروع کر دوں۔ جس کا تخلیق سے کوئی علاقہ نہ ہو...... چنگی کے محکمے میں ملازم ہو جاؤں اور رشوت کھا کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالا کروں۔ کسی پر نکتہ چینی کروں نہ کسی معاملے میں اپنی رائے دوں۔

ایک عجیب و غریب دور سے میرا دل و دماغ گذر رہا تھا۔ بعض لوگ سمجھتے تھے کہ افسانے لکھ کر ان پر مقدمے چلوانا میرا پیشہ ہے۔ بعض کہتے تھے کہ میں صرف اس لئے لکھتا ہوں کہ سستی شہرت کا دلدادہ ہوں اور لوگوں کے سفلی جذبات مشتعل کر کے اپنا الو سیدھا کرتا ہوں۔ مجھ پر چار مقدمے چل چکے تھے ان چار الوؤں کو سیدھا کرنے میں جو خم میری کمر میں پیدا ہوا اس کو کچھ میں ہی جانتا ہوں۔

مالی حالت کچھ پہلے ہی کمزور تھی۔ آس پاس کے ماحول نے جب نکما کر دیا تو آمدنی کے محدود ذرائع اور بھی سکڑ گئے۔ ایک "صرف مکتبۂ جدید" لاہور کے چودھری برادران تھے جو مقدور بھر میری امداد کر رہے تھے۔ غم غلط کرنے کے لئے جب میں نے کثرت سے شراب نوشی شروع کی تو انھوں نے چاہا کہ اپنا ہاتھ روک لیں۔ مگر وہ اتنے مخلص تھے کہ مجھے ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس زمانے میں میری کسی سے خط و کتابت نہیں تھی۔ دراصل میرا دل بالکل اچاٹ ہو چکا تھا۔ اکثر گھر سے باہر رہتا اور اپنے شرابی دوستوں کے گھر پڑا رہتا جن کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی صحبت میں رہ کر میں جسمانی و روحانی خودکشی کی کوشش میں مصروف تھا۔

ایک دن مجھے کسی اور کے گھر کے پتے سے ایک خط ملا۔ تحسین پکچرز کے مالک کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا کہ میں فوراً ملوں۔ بمبئی سے انھیں میرے بارے میں کوئی ہدایت موصول ہوئی ہے۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ ہدایت بھیجنے والا کون ہے۔ میں تحسین پکچرز والوں سے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ملا۔ معلوم ہوا کہ بمبئی سے شیام کے پے در پے انھیں کئی تار ملے ہیں کہ مجھے ڈھونڈ کر ۵۰۰ روپے دے دیئے جائیں۔ میں جب دفتر میں پہنچا تو وہ شیام کے تازہ تاکیدی تار کا جواب لکھ رہے تھے کہ تلاش بسیار کے باوجود انھیں منٹو نہیں مل سکا۔

میں نے ۵۰۰ روپے لے لئے اور میری مخمور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے بہت کوشش کی کہ شیام کو خط لکھ کر اس کا شکریہ ادا کروں اور پوچھوں کہ اس نے مجھے یہ ۵۰۰ روپے کیوں بھیجے تھے۔ کیا اس کو علم تھا کہ میری مالی حالت کمزور ہے۔ اس غرض سے میں نے کئی خط لکھے اور پھاڑ دیئے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ میرے لکھے ہوئے الفاظ شیام کے اس جذبے کا منہ چڑا رہے ہیں۔ جس کے زیر اثر اس نے مجھے یہ روپے روانہ کئے تھے۔

پچھلے سال جب شیام اپنی ذاتی فلم کی نمائش کے سلسلے میں امرت سر آیا تو تھوڑی دیر کے لئے لاہور بھی آ گیا۔ یہاں اس نے بہت سے لوگوں سے میرا اتا پتا پوچھا۔ مگر اس دوران میں اتفاق سے مجھے ہی معلوم ہو گیا کہ وہ لاہور میں موجود ہے۔ میں اسی وقت دوڑا اس سینما پہنچا۔ جہاں وہ ایک دعوت کھا کے آ رہا تھا۔

میرے ساتھ رشید عطرے تھا۔ شیام کا پُرانا دوست جب موٹر سینما کے صحن میں داخل ہوئی تو شیام نے مجھے اور رشید کو دیکھ لیا۔ ایک زور کا نعرہ بلند کیا۔ اس نے ڈرائیور سے موٹر روکنے کے لئے بہت کہا۔ مگر اس کے استقبال کے لئے اس قدر ہجوم تھا کہ ڈرائیور نہ رُکا۔ موٹر سے نکل کر پولیس کی مدد سے شیام اور اوم ایک ہی قسم کا لباس اور سر پر سفید پانامہ ہیٹ پہنے سینما کے اندر پچھلے دروازے سے داخل ہوئے۔ بڑے دروازے سے ہم اندر پہنچے۔ شیام...... وہی شیام تھا۔ مسکراتا ہنستا اور قہقہے لگاتا شیام۔

دوڑ کر ہم دونوں سے لپٹ گیا۔ پھر اس قدر شور مچا کہ ہم میں سے کوئی بھی مطلب کی بات نہ کر سکا۔ اوپر تلے اتنی باتیں ہوئی کہ انبار لگ گئے اور ہم ان کے نیچے دب کے رہ گئے۔ سینما سے فارغ ہو کر اسے ایک فلم ڈسٹری بیوٹر کے دفتر میں جانا تھا۔ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ یہاں جو بات بھی شروع ہوتی، فوراً کٹ جاتی۔ لوگ دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔ نیچے بازار میں ہجوم شور برپا کر رہا تھا کہ شیام درشن دینے کے لئے باہر بالکونی میں آئے۔

شیام کی حالت عجیب و غریب تھی۔ اس کو لاہور میں اپنی موجودگی کا شدید احساس تھا۔ اس لاہور میں جس کی معتدد سڑکوں پر اس کے رومانوں کے چھینٹے بکھرا کرتے تھے۔ اس لاہور میں جس کا فاصلہ اب امرتسر سے ہزاروں میل ہو گیا تھا اور اس کا راولپنڈی کہاں تھا۔ جہاں اس نے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اپنے لڑکپن کے دن گزارے تھے؟ لاہور، امرتسر اور راولپنڈی، سب اپنی اپنی جگہ پر تھے۔ مگر وہ دن نہیں تھے۔ وہ راتیں نہیں تھیں جو شیام یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ سیاست کے گورکن نے انھیں نہ معلوم کہاں دفن کر دیا تھا۔

شیام نے مجھ سے کہا۔ میرے ساتھ ساتھ رہو مگر اس کے دل و دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا۔ اس سے یہ وعدہ کر کے کہ رات کو اس سے فلیٹی ہوٹل میں ملوں گا، چلا گیا۔

شیام سے اتنی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی مگر خوشی کے بجائے ایک عجیب قسم کی گھٹی گھٹی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ طبیعت میں اس قدر جھنجلاہٹ تھی کہ جی چاہتا تھا کسی سے زبردست لڑائی ہو جائے۔ خوب مار کٹائی ہو اور میں تھک کر سو جاؤں۔ گھٹن کا تجزیہ کیا تو کہاں کہاں پہنچ گیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں خیالات کے سارے دھاگے بری طرح آپس میں الجھ گئے۔ اس سے طبیعت اور بھی جھنجلا گئی اور فلیٹیز میں جا کر میں نے ایک دوست کے کمرے میں پینا شروع کر دی۔

نو ساڑھے نو بجے کے قریب شور سننے پر معلوم ہوا کہ شیام آ گیا ہے۔ اس کے کمرے میں ملنے والوں کی ویسی ہی بھیڑ تھی۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا۔ مگر کھل کر کوئی بات نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں کے جذبات میں تالے لگا کر چابیاں کسی نے ایک بہت بڑے گچھے میں پرو دی تھیں۔ ہم دونوں اس گچھے میں سے ایک ایک چابی نکال کر یہ تالے کھولنے کی کوشش کرتے اور ناکام رہتے تھے۔

میں اکتا گیا۔ ڈنر کے بعد شیام نے بڑی جذباتی قسم کی تقریر کی مگر میں نے اس کا ایک لفظ تک نہ سنا۔ میرا اپنا دماغ بڑے اونچے سروں میں جانے کیا بک رہا تھا۔ شیام نے اپنی بکواس ختم کی تو لوگوں نے بھرے پیٹ کے ساتھ تالیاں پیٹیں۔ میں اٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔ وہاں فضلی بیٹھے تھے۔ ان سے ایک معمولی بات پر چخ ہو گئی۔ شیام آیا تو اس نے کہا۔ ”یہ سب لوگ ہیرا منڈی جا رہے ہیں چلو آؤ تم بھی چلو۔“

میں قریب قریب رو دیا۔ میں نہیں جاتا۔ تم جاؤ اور تمہارے یہ لوگ جائیں۔ ”تو میرا انتظار کرو...... میں ابھی آیا۔“

یہ کہہ کر شیام ہیرا منڈی جانے والی پارٹی کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے شیام کو اور فلمی صنعت سے متعلق تمام لوگوں کو موٹی موٹی گالیاں دیں اور فضلی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے۔ آپ تو یہاں انتظار کریں گے اگر تکلیف نہ ہو تو از راہِ کرم اپنی موٹر میں مجھے میرے گھر تک چھوڑ آیئے۔“

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

رات بھر اوٹ پٹانگ خواب دیکھتا رہا۔ شیام سے کئی مرتبہ لڑائی ہوئی، صبح دودھ والا آیا تو میں کھوکھلے غصّے میں اس سے کہہ رہا تھا۔ "تم بالکل بدل گئے ہو...... الّو کے پٹھے، کمینے، ذلیل...... تم ہندو ہو۔"

نیند کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے منہ سے ایک بہت بڑی گالی نکل گئی ہے۔ لیکن جب میں نے خود کو اچھی طرح ٹٹولا تو یقین ہو گیا کہ وہ میرا منہ نہیں تھا۔ سیاست کا بھونپا تھا۔ جس سے یہ گالی نکلی تھی۔ اس کے متعلق سوچتے ہوئے میں نے دودھ والے سے دودھ لیا جس میں ایک چوتھائی پانی تھا۔ اس خیال نے مجھے بڑی ڈھارس دی کہ شیام ہندو تھا مگر پانی ملا ہندو نہیں تھا۔

عرصہ ہوا جب تقسیم پر ہندو مسلمانوں میں خونریز جنگ جاری تھی اور طرفین کے ہزاروں آدمی روزانہ مرتے تھے۔ شیام اور میں راولپنڈی سے بھاگے ہوئے ایک سکھ خاندان کے پاس بیٹھے تھے۔ اس کے افراد اپنے تازہ زخموں کی روداد سنا رہے تھے جو بہت ہی دردناک تھی۔ شیام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ہلچل جو اس کے دل و دماغ میں مچ رہی تھی اس کو بھی میں بخوبی سمجھتا تھا۔ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو میں نے شیام سے کہا کہ "میں مسلمان ہوں۔" "کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کر دو۔"

شیام نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اس وقت نہیں...... لیکن اُس وقت جبکہ میں مسلمانوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی داستان سن رہا تھا...... میں تمہیں قتل کر سکتا تھا۔"

شیام کے منہ سے یہ سن کر میرے دل کو زبردست دھکّا لگا۔ اس وقت شاید میں بھی اسے قتل کر سکتا۔ مگر بعد میں جب میں نے سوچا اور اُس وقت اور اِس وقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے کیا۔ تو ان تمام فسادات کا نفسیاتی پس منظر میری سمجھ میں آ گیا۔ جس میں روزانہ سینکڑوں بے گناہ ہندو اور مسلمان موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے۔

اس وقت نہیں...... اُس وقت ہاں...... کیوں؟ آپ سوچئے تو آپ کو اس کیوں کے پیچھے انسان کی فطرت میں اس سوال کا صحیح جواب مل جائے گا۔

بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ بمبئی ٹاکیز کی عنانِ حکومت جب اشوک اور واچا نے سنبھالی تو بڑے بڑے عہدے اتفاق سے مسلمانوں کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس سے بمبئی ٹاکیز کے ہندو اسٹاف میں نفرت اور غصّے کی لہر دوڑ گئی۔ واچا کو گمنام خط موصول ہونے لگے۔ جس میں اسٹوڈیو کو آگ لگانے اور مرنے مارنے کی دھمکیاں ہوتی تھیں۔ اشوک اور واچا دونوں کو ان کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ لیکن کچھ ذکی الحس ہونے کے باعث اور

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کچھ مسلمان ہونے کی وجہ سے میں حالات کی نزاکت کو بہت زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے اشوک اور واچا سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اور ان کو رائے دی کہ وہ مجھے بمبئی ٹاکیز سے الگ کر دیں۔ کیونکہ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ صرف میری وجہ سے مسلمان وہاں داخل ہو رہے ہیں مگر انھوں نے کہا کہ میرا دماغ خراب ہے۔

دماغ میرا واقعی خراب ہو رہا تھا۔ بیوی بچے پاکستان میں تھے۔ جب وہ ہندوستان کا ایک حصّہ تھا تو میں اسے جانتا تھا اس میں وقتاً فوقتاً جو ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے۔ میں ان سے بھی واقف تھا۔ مگر اب اس خطۂ زمین کو نئے نام نے کیا بنا دیا تھا۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ اپنی حکومت کیا ہوتی ہے؟ اس کی تصویر بھی کوشش کے باوجود میرے ذہن میں نہیں آتی تھی۔

۱۴ راگست کا دن میرے سامنے بمبئی میں منایا گیا۔ پاکستان اور بھارت دونوں آزاد ملک قرار دیئے گئے تھے۔ لوگ بہت مسرور تھے مگر قتل اور آگ کی وارداتیں باقاعدہ جاری تھیں۔ ہندوستان زندہ باد کے ساتھ ساتھ پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگتے تھے۔ کانگریس کے ترنگے کے ساتھ اسلامی پرچم بھی لہراتا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور قائداعظم محمد علی جناح دونوں کے نعرے بازاروں اور سڑکوں میں گونجتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان اور وہ لہو کس کا ہے جو ہر روز اتنی بے دردی سے بہایا جا رہا ہے۔ وہ ہڈیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائیں گی جن پر سے مذہب کا گوشت پوست چیلیں اور گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے تھے۔ اب کہ ہم آزاد ہوئے ہیں، ہمارا غلام کون ہوگا...... جب غلام تھے تو آزادی کا تصوّر کر سکتے تھے اب آزاد ہوئے ہیں تو غلامی کا تصور کیا ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ ہم آزاد بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔ ہندو اور مسلمان دھڑا دھڑ مر رہے تھے۔ کیسے مر رہے تھے، کیوں مر رہے تھے...... ان سوالوں کے مختلف جواب تھے، بھارتی جواب، پاکستانی جواب، انگریزی جواب، ہر سوال کا جواب موجود تھا مگر اس جواب میں حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا تو اس کا کوئی جواب نہ ملتا۔ کوئی کہتا اسے غدر کے کھنڈرات میں تلاش کرو۔ کوئی کہتا نہیں، یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملے گا۔ کوئی اور پیچھے ہٹ کر اسے مغلیہ خاندان کی تاریخ میں ٹٹولنے کے لئے کہتا۔ سب پیچھے ہی پیچھے ہٹتے جاتے تھے اور قاتل اور سفاک برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے اور لہو اور لوہے کی ایسی تاریخ لکھ رہے تھے جس کا جواب تاریخ عالم میں کہیں بھی نہیں ملتا۔

ہندوستان آزاد ہو گیا تھا۔ پاکستان عالمِ وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا تھا لیکن انسان ان دونوں مملکتوں میں غلام تھا۔ تعصب کا غلام...... مذہبی جنون کا غلام۔ حیوانیت و بربریت کا غلام......

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں نے بمبئی ٹاکیز جانا چھوڑ دیا۔ اشوک اور واچا آتے تو میں خرابیِ طبیعت کا بہانہ کر دیتا۔ اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ شیام مجھے دیکھتا اور مسکرا دیتا۔ اس کو میری قلبی کیفیات کا بخوبی علم تھا۔ کچھ دن بہت زیادہ پی کر میں نے یہ شغل بھی چھوڑ دیا تھا۔ سارا دن گم صم صوفے پر لیٹا رہتا۔ ایک دن شیام اسٹوڈیو سے آیا تو اس نے مجھے لیٹا دیکھ کر مزاحیہ انداز میں کہا۔ "کیوں خواجہ جگالی کر رہے ہو؟"

مجھے بہت جھنجلاہٹ ہوتی تھی کہ شیام میری طرح کیوں نہیں سوچتا۔ اس کے دل و دماغ میں وہ طوفان کیوں برپا نہیں ہیں جن کے ساتھ میں دن رات لڑتا رہتا ہوں۔ وہ اسی طرح مسکراتا، ہنستا اور شور مچاتا رہتا۔ مگر شاید وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ جو فضا اس وقت گرد و پیش تھی اس میں سوچنا بالکل بے کار ہے۔

میں نے بہت غور فکر کیا، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر تنگ آ کر میں نے ہٹاؤ چلیں یہاں سے......شیام کی نائٹ شوٹنگ تھی۔ میں نے اپنا اسباب وغیرہ باندھنا شروع کر دیا۔ ساری رات اسی میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو شیام شوٹنگ سے فارغ ہو کر آیا۔ اس نے میرا بندھا ہوا اسباب دیکھا تو مجھ سے صرف اتنا پوچھا "چلے؟"

میں نے بھی صرف اتنا ہی کہا۔ "ہاں۔"

اس کے بعد میرے اور اس کے درمیان "ہجرت" کے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔ بقایا سامان رکھوانے میں اس نے میرا ہاتھ بٹایا اس دوران میں رات کی شوٹنگ کے لطیفے بیان کرتا رہا۔ اور خوب ہنستا رہا۔ جب میرے رخصت ہونے کا وقت آیا تو اس نے الماری میں سے برانڈی کی بوتل نکالی۔ دو پیگ بنائے اور ایک مجھے دے کر کہا۔ "ہپ ٹلا"

میں نے جواب میں ہپ ٹلا کہا اور اس نے قہقہے لگاتے ہوئے مجھے اپنے چوڑے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ "سؤر کہیں کے۔"

میں نے اپنے آنسو روکے "پاکستان کے۔"

شیام نے پرخلوص نعرہ بلند کیا۔ "زندہ باد پاکستان۔"

"زندہ باد بھارت اور میں نیچے چلا گیا۔ جہاں ٹرک والا میرا انتظار کر رہا تھا۔

بندرگاہ تک شیام میرے ساتھ گیا۔ جہاز چلنے میں کافی دیر تھی۔ وہ اِدھر اُدھر کے لطیفے سنا کر میرا دل بہلاتا رہا۔ جب وسل ہوا تو اس نے ہپ ٹلا کہہ کر میرا ہاتھ دبایا۔ اور "گینگ وے" سے نیچے اتر گیا...... مُڑ کر اس نے میری طرف نہ دیکھا اور مضبوط قدم اٹھاتا بندرگاہ سے باہر چلا گیا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں نے لاہور پہنچ کر اس کو خط لکھا۔ انیس ایک اڑتالیس کو اس کا جواب آیا۔

''یہاں تمہیں سب لوگ یاد کرتے ہیں۔ تمہاری اور تمہاری بذلہ سنجی کی غیر موجودگی محسوس کرتے ہیں۔ جو تم بڑی فراخدلی سے ان پر ضائع کرتے تھے۔ واچا ابھی تک اس بات پر مصر ہے کہ تم کنی کترا گئے۔ اب کی دفعہ اس کو اطلاع دیئے بغیر پاکستان بھاگ کر گئے۔ عجیب متناقص بات ہے کہ وہ جو بمبئی ٹاکیز میں مسلمانوں کے داخلے کی مخالفت میں سب سے آگے تھا سب سے پہلا آدمی تھا جو پاکستان بھاگ کر چلا گیا خود کو اپنے نظریے کا شہید بناتے ہوئے...... یہ واچا کا اپنا نظریہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم نے اس کو ضرور خط لکھا ہوگا۔ اگر نہیں لکھا تو فوراً لکھو۔ کم از کم شرافت کا یہی تقاضا ہے۔''

تمہارا شیام
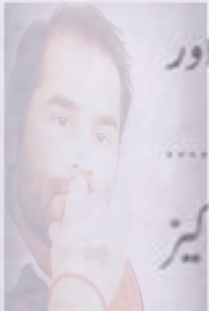
آج چودہ اگست ہے، وہ دن جب پاکستان اور ہندوستان آزاد ہوئے ہیں اِدھر اور اُدھر دونوں طرف خوشیاں منائی جارہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حملے اور دفاع کی تیاریاں بھی زور شور سے جاری ہیں...... میں شیام کی روح سے مخاطب ہوتا ہوں۔ پیارے شیام، میں بمبئی ٹاکیز چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ کیا پنڈت جواہر لال نہرو، کشمیر نہیں چھوڑ سکتے...... ہے ناہپ ٹلا بات؟''

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# میرا صاحب

یہ سن سینتیس (۳۷ء) کا ذکر ہے۔ مسلم لیگ رو بہ شباب تھی۔ میں خود شباب کی ابتدائی منزلوں میں تھا جب خواہ مخواہ کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ صحت مند تھا، طاقت ور تھا اور جی میں ہر وقت یہی خواہش تڑپتی تھی کہ سامنے جو قوت آئے تو اس سے بھڑ جاؤں، اگر کوئی قوت سامنے نہ آئے تو اسے خود پیدا کروں۔ اور مدِ مقابل بنا کر اس سے گتھ جاؤں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب آدمی ہر وقت کچھ کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ کچھ کرنے سے میرا مطلب ہے کوئی بڑا کام، کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام نہ ہو، تو سرزد ہی ہو جائے ___ مگر کچھ ہو ضرور۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں پھر اس زمانے کی طرف لوٹتا ہوں جب غالب جوان تھا۔ معلوم نہیں اس نے اپنی جوانی کے دنوں میں کسی سیاسی تحریک میں حصہ لیا تھا یا نہیں۔ مگر خاکسار مسلم لیگ کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ غازی آباد کور مجھ ایسے کئی نوجوانوں کی ایک جماعت تھی۔ جس کا میں ایک مخلص ممبر تھا۔ اپنے اخلاص کا ذکر میں نے اس لئے بڑے وثوق سے کیا ہے — کہ اُن دنوں میرے پاس سوائے اس کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔

یہ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ محمد علی جناح دہلی تشریف لائے اور مسلمانوں نے ان کا شاندار جلوس نکالا۔ جیسا کہ ظاہر ہے غازی آباد کور نے اس جلوس کو پُر رونق اور پُر جوش بنانے میں پورا حصہ لیا۔ ہماری جماعت کے سالار انور قریشی صاحب تھے، بڑے تنومند جوان جواب شاعرِ پاکستان کے لقب سے مشہور ہیں۔ ہماری کور کے جوانوں کے ہونٹوں پر ان ہی کا تصنیف کردہ قومی ترانہ تھا۔ معلوم نہیں ہم سر تال میں تھے یا نہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ جو کچھ بھی ہمارے حلق سے باہر

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نکلا اس کو سُر تال کی پابندیوں میں جکڑنے کا ہوش کسی کو بھی نہیں تھا۔
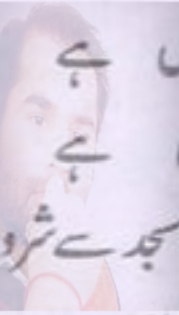
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

یہ تاریخی جلوس تاریخی شہر دلّی کی تاریخی جامع مسجد سے شروع ہوا اور پُر جوش نعرے بکھیرتا چاندنی چوک، لال کنواں، حوض قاضی اور چاوڑی بازار سے ہوتا ہوا اپنی منزل یعنی مسلم لیگ کے آفس پہنچ کر ختم ہو گیا۔

اجتماعی طور پر اس تاریخی جلوس میں محمد علی جناح صاحب کو قائد اعظم کے غیر فانی خطاب سے نعرہ زن کیا گیا۔ ان کی سواری کے لئے چھ گھوڑوں کی فٹن کا انتظام تھا۔ جلوس میں مسلم لیگ کے تمام سر کردہ اراکین تھے۔ موٹروں، موٹر سائیکلوں، بائسکلوں اور اونٹوں کا ایک ہجوم تھا۔ مگر بہت ہی منظم۔ اس نظم کو دیکھ کر قائد اعظم جو طبعاً بہت ہی نظم پسند تھے۔ بہت مسرور نظر آتے تھے۔

میں نے اس جلوس میں ان کی کئی جھلکیاں دیکھیں۔ ان کی پہلی جھلک دیکھ کر میرا ردِ عمل معلوم نہیں کیا تھا۔ اب سوچتا ہوں اور تجزیہ کرتا ہوں تو صرف اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ خلوص چونکہ بے رنگ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ردِ عمل بھی یقیناً بے رنگ تھا...... اس وقت اگر کسی بھی آدمی کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا جاتا کہ وہ دیکھو تمہارا قائد اعظم ہے تو میری عقیدت اسے قبول کر لیتی اور اپنے سر آنکھوں پر جگہ دیتی۔ لیکن جب میں نے جلوس کے مختلف موڑوں اور پیچوں میں ان کو کئی مرتبہ دیکھا تو میری تنومندی کو دھکا سا لگا۔ میرا قائد اور اس قدر دبلا — اس قدر نحیف!

غالب نے کہا تھا ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

وہ ہمارے گھر آئے تھے۔ یہ ان کی مہربانی اور خدا کی قدرت تھی۔ خدا کی قسم میں کبھی ان کو دیکھتا تھا۔ ان کے نحیف و نزار جسم کو۔ اور کبھی اپنے ہٹے کٹے ڈیل ڈول کو۔ جی میں آتا کہ یا تو میں سکڑ جاؤں یا وہ پھیل جائیں۔ لیکن میں دل ہی دل میں ان کے ان ہی ناتواں دست و بازو کو نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کے لئے دعائیں بھی مانگیں۔ دشمنوں پر ان کے لگائے ہوئے زخموں کا چرچا عام تھا۔

حالات پلٹا کھاتے ہی رہتے ہیں۔ معلوم نہیں پلٹوں کا نام حالات ہے یا حالات کا نام پلٹے۔ بہر حال کچھ ایسی صورت ہوئی کہ دماغ میں آرٹ کا کیڑا جو کچھ دیر سے سو رہا تھا۔ جاگا اور آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ طبیعت میں یہ اکساہٹ پیدا ہوئی کہ بمبئی چل کر اس میدان میں قسمت

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

آزمائی کی جائے۔ ڈرامے کی طرف بچپن ہی سے مائل تھا۔ سوچا کہ شاید وہاں چل کر اپنے جوہر دکھانے کا موقع مل جائے ___ کہاں خدمتِ قوم وملّت کا جذبہ اور کہاں اداکاری کا خبط۔ انسان بھی عجب مجموعۂ اضداد ہے۔

بمبئی پہنچا۔ ان دنوں امپیریل فلم کمپنی اپنے جوبن پر تھی۔ یہاں رسائی گو بہت ہی مشکل تھی۔ مگر کسی نہ کسی حیلے داخل ہو ہی گیا۔ آٹھ آنے روز پر ایکسٹرا کے طور پر کام کرتا تھا۔ اور یہ خواب دیکھتا تھا کہ ایک روز آسمانِ فلم کا درخشندہ ستارہ بن جاؤں گا۔

اللہ کے فضل سے باتونی بہت ہوں، خوش گفتار نہ سہی تو کچھ ایسا بدگفتار بھی نہیں۔ اردو مادری زبان ہے۔ جس سے امپیریل فلم کمپنی کے تمام ستارے ناآشنا تھے۔ اس نے میری مدد دہلی کے بجائے بمبئی میں کی۔ وہ یوں کہ وہاں کے قریب قریب تمام ستاروں نے اپنی گردشوں کا حال مجھ سے لکھوایا اور پڑھوایا کرتے تھے۔ اردو میں کوئی خط آتا تو میں انھیں پڑھ کر سناتا۔ اس کا مطلب بتاتا، اس کا جواب لکھتا۔ مگر اس منشی گیری اور خطوط نویسی سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ ایکسٹرا تھا ایکسٹرا ہی رہا۔

اس دوران میں امپیریل فلم کمپنی کے مالک سیٹھ آرڈیشر ایرانی کے خاص الخاص موٹر ڈرائیور بدھن سے میری دوستی ہوگئی اور اس نے اس کا حق یوں ادا کیا کہ فرصت کے اوقات میں مجھے موٹر چلانا سکھا دی مگر چونکہ یہ اوقات نہایت ہی مختصر ہوتے تھے اور بدھن کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ سیٹھ کو اس کی چوری کا علم نہ ہو جائے۔ اس لئے میں اپنی تمام ذہانت کے باوصف موٹر چلانے کے فن پر پوری طرح حاوی نہ ہو سکا۔ حاوی ہونا تو بہت بڑی بات ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ مجھے بدھن کی مدد کے بغیر الف جیسی سیدھی سڑک پر سیٹھ آرڈیشر کی بیوک چلانا آ گئی تھی۔ اس کے کل پرزوں کے متعلق میرا علم صفر تھا۔

اداکاری کی دھن سر پر بہت بُری طرح سوار تھی۔ مگر یہ گھر کا معاملہ تھا۔ دِل میں مسلم لیگ اور اس کے روحِ رواں قائدِاعظم محمد علی جناح بدستور بسے ہوئے تھے۔ امپیریل فلم کمپنی میں، کینیڈی برج پر، بھنڈی بازار اور محمد علی روڈ میں اور پلے ہاؤس پر اکثر مسلمانوں کی اقلیت کے ساتھ کانگریس کے سلوک کا تذکرہ ہوتا تھا۔

امپیریل میں سب جانتے تھے کہ میں مسلم لیگی ہوں۔ اور قائدِاعظم محمد علی جناح کا نام لیوا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو کسی کے منہ سے قائدِاعظم کا نام سن کر اس کے جان لیوا نہیں ہو جاتے تھے۔ قیامِ پاکستان کا مطالبہ ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔ میرا خیال ہے امپیریل فلم کمپنی کے لوگ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جب مجھ سے قائداعظم کا تعریفی ذکر سنتے تو یہ سمجھتے تھے کہ وہ بھی کوئی ہیرو ہے جس کا میں پرستار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن اس زمانے کے سب سے بڑے فلمی، ہیرو ڈی بلی موریا نے ٹائمز آف انڈیا کا پرچہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''لو بھئی، یہ تمہارے جناح صاحب ہیں۔

میں سمجھا ان کی کوئی تصویر چھپی ہے۔ پرچہ بلی موریا کے ہاتھ سے لے لیا، اُلٹ پلٹ کر کے دیکھا۔ مگر ان کی شبیہ نظر نہ آئی، میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیوں بھیا کہاں ہے ان کا فوٹو۔''

بلی موریا کی جون گلبرٹ اسٹائل کی باریک باریک مونچھیں مسکراہٹ کے باعث اس کے ہونٹ پر کچھ پھیل سی گئیں۔ '' پھوٹو ووٹو نہیں ہے ___ ان کا اشتہار چھپا ہے۔ میں نے پوچھا۔'' اشتہار؟ کیسا ___ اشتہار!''

بلی موریا نے پرچہ لیا اور ایک لمبا کالم دکھا کر کہا۔ '' مسٹر جناح کو ایک موٹر میکینک کی ضرورت ہے۔ جو ان کے گیراج کا سارا کام سنبھال سکے۔

میں نے اخبار میں وہ جگہ دیکھی۔ جہاں بلی موریا نے انگلی رکھی ہوئی تھی، اور یوں (اوہ) کیا جیسے میں نے ایک ہی نظر میں اس اشتہار کا سارا مضمون پڑھ لیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خاکسار کو انگریزی اتنی ہی آتی تھی۔ جتنی ڈی۔ بلی موریا کو اُردو ___

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میری موٹر ڈرائیوری صرف الف ایسی سیدھی سڑک تک محدود تھی، موٹر کی مکینزم کیا ہوتی ہے اس کے متعلق حرام ہے جو مجھے کچھ علم ہو، سیلف دبانے پر انجن کیوں اسٹارٹ ہوتا ہے۔ اس وقت اگر مجھ سے کوئی یہ سوال کرتا تو میں یقیناً یہ جواب دیتا کہ یہ قانون موٹر ہے۔ سیلف دبانے پر بعض اوقات انجن کیوں اسٹارٹ نہیں ہوتا ___ اس سوال کا بھی جواب یہ ہوتا کہ یہ بھی قانونِ موٹر ہے۔ جس میں انسانی عقل کو کوئی دخل نہیں۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ میں نے بلی موریا سے جناح صاحب کے بنگلے کا پتا وغیرہ نوٹ کر لیا اور دوسرے روز صبح ان کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اصل میں مجھے ملازمت حاصل کرنے کا خیال تھا، نہ اس کی توقع تھی، بس یونہی ان کو ان کی رہائش گاہ میں قریب سے دیکھنے کا شوق تھا۔

چنانچہ اپنے خلوص کو ڈیلوے کے طور پر ساتھ لئے میں مونٹ پلیزنٹ روڈ واقع مالا بار ہل پر ان کی خوش نما کوٹھی پر پہنچ گیا۔ باہر پٹھان پہرہ دار تھا۔ کئی تھانوں کی سفید شلوار، سر پر ریشمی لنگی بہت ہی صاف ستھرا اور بارعب گرانڈیل اور طاقتور، اس کو دیکھ کر میری طبیعت خوش ہو گئی۔ دل ہی دل میں کئی مرتبہ میں نے اس کے اور اپنے ڈنتر کی پیمائش کی اور یہ محسوس کر کے مجھے بڑی عجیب سی تسکین ہوئی کہ فرق بہت معمولی ہے یہی ایک آدھ انچ کا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مجھ سے پہلے اور کئی امیدوار جمع تھے۔ سب کے سب اپنی اسناد کے فائلیں بغل میں دابے کھڑے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ اسناد تو ایک طرف رہیں۔ میرے پاس ڈرائیونگ کا معمولی لائسنس تک نہیں تھا۔ اس وقت دل صرف اس خیال سے دھڑک رہا تھا کہ بس اب چند لمحوں میں قائداعظم کا دیدار ہونے والا ہے۔

میں ابھی اپنے دل کی دھڑکن کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ قائداعظم پورچ میں نمودار ہوئے۔ سب اٹینشن ہو گئے۔ میں ایک طرف سمٹ گیا۔ ان کے ساتھ ان کی دراز قد اور ڈبلی پتلی ہمشیرہ تھیں۔ جن کی متعدد تصاویر میں اخباروں اور رسالوں میں دیکھ چکا تھا۔ ایک طرف ہٹ کر ان کے باادب سکریٹری مطلوب صاحب تھے۔

جناح صاحب نے اپنی یک چشمی عینک آنکھ پر جمائی اور تمام امیدواروں کو بڑے غور سے دیکھا۔ جب ان کی مسلح آنکھ کا رخ میری طرف ہوا۔ تو میں اور زیادہ سمٹ گیا۔ فوراً ان کی کھب جانے والی آواز بلند ہوئی مجھے صرف اتنا سنائی دیا۔ ''یُو___؟

اتنی انگریزی میں جانتا تھا۔ ان کا مطلب تھا۔ ''تم'' مگر وہ ''تم'' کون تھا۔ جس سے وہ مخاطب ہوئے تھے؟ میں سمجھا کہ میرے ساتھ والا ہے چنانچہ میں نے اسے کہنی سے ٹھوکا دیا۔ اور کہا۔ ''بولو۔ تمہیں بلا رہے ہیں۔''

میرے ساتھی نے لکنت بھرے لہجہ میں پوچھا۔ '' صاحب میں؟''

قائداعظم کی آواز پھر بلند ہوئی۔ ''نو___ تم۔''

ان کی باریک مگر لوہے جیسی سخت انگلی میری طرف تھی۔ میرا تن بدن کانپ اٹھا'' جی جی___ میں؟''

''یس'' یہ تھری ناٹ تھری کی گولی تو میرے دل و دماغ کے پار ہو گئی۔ میرا حلق قائداعظم کے نعرے بلند کرنے والا حلق بالکل سُوکھ گیا___ میں کچھ نہ کہہ سکا___ مگر جب انہوں نے اپنا مونوکل آنکھ سے اتار کر آل رائٹ کہا تو میں نے محسوس کیا کہ شاید میں نے کچھ کہا تھا۔ جو انہوں نے سن لیا تھا یا وہ میری کیفیت بھانپ گئے تھے اور میرے نطق کو مزید اذیت سے بچانے کے لئے انہوں نے ''آل رائٹ'' کہہ دیا تھا۔

پلٹ کر انہوں نے اپنے حسین و جمیل اور صحت مند سکریٹری کی طرف دیکھا اور اس سے کچھ کہا۔ اس کے بعد وہ اپنی ہمشیرہ کے ساتھ اندر تشریف لے گئے۔ میں اپنے دل و دماغ کی گڑبڑ جلدی جلدی سمیٹ کر وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ مطلوب صاحب نے مجھے پکارا۔ اور کہا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

کہ صاحب نے تمہیں کل دس بجے یہاں حاضر ہونے کے لئے کہا ہے۔

میں مطلوب صاحب سے یہ سوال نہ کر سکا کہ صاحب نے مجھے کیوں بلایا ہے، ان کو بھی نہ بتا سکا کہ میں بلائے جانے کے ہرگز ہرگز قابل نہیں ہوں۔ اس لئے کہ میں اس ملازمت کا بالکل اہل نہیں۔ جس کے لئے قائداعظم نے اشتہار دیا ہے۔ وہ بھی اندر چلے گئے اور میں گھر لوٹ آیا۔

دوسرے دن صبح دس بجے پھر درِ دولت پر حاضر ہوا۔ جب اطلاع کرائی تو ان کے خوش پوش، حسین و جمیل اور صحت مند سکریٹری تشریف لائے اور مجھے یہ حیرت انگیز مژدہ سنایا کہ صاحب نے مجھے پسند کیا ہے۔ اس لئے میں فوراً گیراج کا چارج لے لوں۔

یہ سن کر جی میں آئی کہ ان پر اپنی قابلیت کا سارا پول کھول دوں اور صاف صاف کہہ دوں کہ حضرت قائداعظم کو اس خاکسار کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے میں تو محض تفریحاً یہاں چلا آیا تھا۔ یہ آپ گیراج کا بوجھ اس نااہل کے کاندھوں پر کیوں دھر رہے ہیں مگر جانے کیوں میں کچھ نہ بولا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آناً فاناً گیراج کا پردھان بنا دیا گیا۔ چابیاں میرے حوالے کردی گئیں۔ چار کاریں تھیں مختلف میک کی۔ اور مجھے صرف سیٹھ آرڈیشر ایرانی کی بیوک چلانا آتی تھی۔ اور وہ بھی الف جیسی سیدھی سڑک پر۔ مالابار ہل تک پہنچنے میں کئی موڑ تھے۔ کئی خم اور موٹر میں آزاد کو صرف اپنی اکیلی جان نہیں لے جانا تھی۔ اسے خدا معلوم کن کن اہم کاموں پر اس رہنما کو لیے لیے پھرنا تھا۔ جس کی زندگی کے ساتھ لاکھوں مسلمانوں کی جان وابستہ تھی۔

میں نے سوچا چابیاں وغیرہ سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاؤں، بھاگ کے سیدھا گھر پہنچوں۔ وہاں سے اپنا اسباب اٹھاؤں اور ٹکٹ کٹا کے دہلی کا رخ کروں۔ مگر پھر سوچا یہ درست نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ بلا کم و کاست جناح صاحب کو سارے حقائق سے باخبر کردوں اور معافی مانگ کر انسانوں کی طرح واپس اس جگہ چلا جاؤں۔ جو کہ میرا اصل مقام ہے۔ مگر آپ یقین مانئے کہ مجھے پورے چھ مہینے تک اس کا موقع نہ ملا۔

میں نے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

محمد حنیف آزاد نے جواب دیا۔ ''آپ سن لیجئے ____ دوسرے روز حکم ہوا کہ آزاد موٹر لائے۔ وہ جو ایسے موقعوں پر خطا ہوا کرتا ہے، خطا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ جونہی صاحب سامنے آئیں گے سلام کر کے گیراج کی چابیاں ان کے حوالے کردوں گا اور ان کے قدموں میں گر پڑوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ پورچ میں تشریف لائے تو اس بندۂ ناہنجار کے منہ سے رعب کے مارے ایک لفظ بھی نکل نہ سکا۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ فاطمہ صاحبہ تھیں۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

عورت کے سامنے کسی کے قدموں میں گرنا، منٹو صاحب، کچھ بہت ہی وہ تھا ــــ۔''

میں نے آزاد کی موٹی موٹی آنکھوں میں شرم کے لال لال ڈورے دیکھے اور مسکرا دیا۔

''خیر ــــ پھر کیا ہوا۔''

''ہوا یہ منٹو صاحب کہ خاکسار کو موٹر اسٹارٹ کرنی ہی پڑی، نئی پیکارڈ تھی اللہ کا نام لے کر انگل پنچوا اسٹارٹ تو کر دی۔ اور بڑی صفائی سے کوٹھی کے باہر بھی لے گیا، پر جب مالا بار ہل سے نیچے اترتے وقت لال بتی کے موڑ کے پاس پہنچا، جانتے ہیں نہ لال بتی؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں ہاں!''

''بس صاحب، وہاں مشکل پیدا ہوگئی۔ استاد بدھن نے کہا تھا کہ بریک دبا کر معاملہ ٹھیک کر لیا کرو۔ افراتفری کے عالم میں کچھ ایسے اناڑی پن سے بریک دبائی کہ گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رکی۔ قائداعظم کے ہاتھ سے ان کا سگار گر پڑا ــــ فاطمہ جناح صاحبہ اچھل کر دو بالشت آگے ــــ لگیں مجھے گالیاں دینے ــــ کاٹو تو لہو نہیں۔ میرے بدن میں، ہاتھ کانپنے لگے۔ دماغ چکرانے لگا۔ قائداعظم نے سگار اٹھایا اور انگریزی میں کچھ کہا۔ جس کا غالباً یہ مطلب تھا کہ واپس لے چلو ــــ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ تو انھوں نے نئی گاڑی اور نیا ڈرائیور طلب فرمایا اور جہاں جانا تھا چلے گئے ــــ اس واقعے کے بعد چھ مہینے تک مجھے ان کی خدمت کا موقع نہ ملا۔''

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کسی بھی خدمت کا؟''

آزاد بھی مسکرایا۔ ''جی ہاں ــــ بس یوں سمجھئے کہ صاحب نے مجھے اس کا موقع نہ دیا دوسرے ڈرائیور تھے۔ وہ ان کی وردی میں رہتے تھے۔ مطلوب صاحب رات کو بتا دیتے تھے کہ کون ڈرائیور کب اور کس گاڑی کے لئے چاہئے۔ میں اگر ان سے اپنے متعلق کچھ دریافت کرتا تو وہ کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکتے۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ صاحب کے دل میں کیا ہے۔ اس کے متعلق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اور نہ ان سے کوئی کسی امر کے بارے میں استفسار ہی کر سکتا تھا۔ وہ صرف مطلب کی بات کرتے تھے اور مطلب کی بات ہی سنتے تھے، یہی وجہ ہے کہ میں ان سے اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی یہ معلوم نہ کر سکا کہ اپنے گیراج کا قائد بنا کر ایک بے کار پرزے کی طرح انھوں نے مجھے کیوں ایک طرف پھینک رکھا ہے۔ میں نے آزاد سے کہا۔ ''ہو سکتا ہے وہ تمہیں قطعاً بھول ہی گئے ہوں۔''

آزاد کے حلق سے وزنی قہقہہ بلند ہوا۔ ''نہیں جناب نہیں ــــ صاحب بھولے سے بھی کبھی نہیں بھولتے تھے۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آزاد چھ مہینے سے گیراج میں پڑا روٹیاں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

توڑ رہا ہے۔ اور منٹو صاحب جب آزاد روٹیاں توڑے تو وہ معمولی روٹیاں نہیں ہوتیں۔ یہ تن و توش ملاحظہ فرمایئے۔"

میں نے آزاد کی طرف دیکھا۔ سن سینتیس، اڑتیس میں جانے اس کا کیا تن و توش تھا۔ مگر میرے سامنے ایک کافی مضبوط اور تنومند آدمی بیٹھا تھا۔ جس کو آپ ایکٹر کی حیثیت میں یقیناً جانتے ہوں گے۔ تقسیم سے پہلے وہ بمبئی کی فلموں میں کام کرتا تھا۔ اور آج کل یہاں لاہور میں اپنے دوسرے ایکٹر بھائیوں کے ساتھ فلمی صنعت کی زبوں حالی کا شکار کسی نہ کسی حیلے گذر اوقات کر رہا ہے۔

مجھے پچھلے برس ایک دوست سے معلوم ہوا تھا کہ یہ موٹی موٹی آنکھوں، سیاہ رنگ اور کسرتی بدن والا ایکٹر ایک مدت تک قائداعظم محمد علی جناح کا موٹر ڈرائیور رہ چکا ہے، چنانچہ اسی وقت سے میری نگاہ اس پر تھی، جب کبھی اس سے ملاقات ہوتی، میں اس کے آقا کا ذکر چھیڑ دیتا۔ اور اس سے باتیں سن سن کر اپنے حافظے میں جمع کرتا رہتا۔

کل جب میں نے یہ مضمون لکھنے کے لئے اس سے کئی باتیں دوبارہ سنیں تو مجھے قائداعظم کی زندگی کے ایک بہت ہی دلچسپ پہلو کی جھلک نظر آئی۔ محمد حنیف آزاد کے ذہن پر اس بات نے خاص طور پر اثر کیا تھا کہ اس کا آقا طاقت پسند تھا۔ جس طرح علامہ اقبال کو بلند قامت چیزیں پسند تھیں۔ اسی طرح قائداعظم کو تنومند چیزیں مرغوب تھیں، یہی وجہ ہے کہ اپنے ملازموں کا انتخاب کرتے وقت وہ جسمانی صحت اور طاقت سب سے پہلے دیکھتے تھے۔

اُس زمانے میں جس کا ذکر محمد حنیف آزاد کرتا ہے قائداعظم کا سکریٹری مطلوب بڑا وجیہہ آدمی تھا۔ جتنے ڈرائیور تھے، سب کے سب جسمانی صحت کا بہترین نمونہ تھے۔ کوٹھی کے پاسبان بھی اسی نقطۂ نظر سے چنے جاتے تھے۔ اس کا نفسیاتی پس منظر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جناح مرحوم خود بہت ہی لاغر اور نحیف تھے مگر طبیعت چونکہ بے حد مضبوط اور کسرتی تھی اس لئے کسی ضعیف اور نحیف شئے کو خود سے منسوب ہوتا پسند نہیں کرتے تھے۔

وہ چیز جو انسان کو مرغوب اور پیاری ہو، اس کے بناؤ سنگھار کا وہ خاص اہتمام کرتا ہے۔ چنانچہ قائداعظم کو اپنے صحت مند اور طاقتور ملازموں کی پوشش کا بہت خیال رہتا تھا۔ پٹھان چوکیدار کو حکم تھا کہ وہ ہمیشہ اپنا قومی لباس پہنا کرے۔ آزاد پنجابی نہیں تھا۔ لیکن کبھی کبھی ارشاد ہوتا تھا کہ پگڑی پہنے، سر کا یہ لباس بڑا طرحدار ہے۔ چونکہ اس سے قد و قامت میں خوش گوار اضافہ ہوتا ہے اس لئے وہ اس کے سر پر پگڑی بندھوا کر بہت خوش ہوتے تھے، اور اس خوشی میں اس کو انعام دیا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کرتے تھے۔

اگر غور کیا جائے تو جسم کی لاغری کا یہ احساس ہی ان کی مضبوط اور پر وجاہت زندگی کی سب سے بڑی قوت تھی۔ ان کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، اور بولنے سوچنے میں یہ قوت ہر وقت کارفرما رہتی۔

محمد حنیف آزاد نے مجھے بتایا کہ قائداعظم کی خوراک بہت ہی قلیل تھی۔ وہ اتنا کم کھاتے تھے کہ مجھے بعض اوقات تعجب ہوتا تھا کہ وہ جیتے کس طرح ہیں۔ اگر مجھے اس خوراک پر رکھا جاتا تو یقیناً دوسرے ہی روز میری چربی پگھلنے لگتی۔ لیکن اس کے برعکس ہر روز چار پانچ مرغیاں، باورچی خانہ میں ذبح ہوتی تھیں۔ ان میں سے صرف ایک چوزے کی یخنی اور وہ بھی بمشکل ایک چھوٹی پیالی ان کی خوراک کا جزو بنتی تھی۔ فروٹ ہر روز آتا تھا۔ اور کافی مقدار میں آتا مگر یہ سب ملازموں کے پیٹ میں جاتا تھا۔

"ہر روز رات کے کھانے کے بعد صاحب کاغذ پر اشیاء خوردنی کی فہرست پر نشان لگا دیتے تھے اور ایک سو کا نوٹ میرے حوالے کر دیتے تھے۔ یہ دوسرے روز کے طعام کے اخراجات کے لئے ہوتا تھا۔"

میں نے آزاد سے پوچھا۔ "ہر روز سو روپے۔"

"جی ہاں، پورے سو روپے اور قائداعظم کبھی حساب طلب نہیں فرماتے تھے، جو باقی بچتا وہ سب ملازموں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ کبھی تیس بچ جاتے تھے۔ کبھی چالیس اور کبھی کبھی ساٹھ ستر، ان کو یقیناً اس بات کا علم تھا کہ ہم ہر روز بہت سے روپے گول کرتے ہیں۔ مگر اس کا ذکر انھوں نے کبھی نہ کیا۔ البتہ مس جناح بہت تیز تھیں۔ اکثر بگڑ جاتی تھیں کہ ہم سب چور ہیں۔ ایک آنے کی چیز کا ایک روپیہ لگاتے ہیں۔ مگر صاحب کا سلوک کچھ ایسا تھا کہ ہم سب ان کے مال کو اپنا مال سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ ان کی جھڑکیاں اور گھڑکیاں سن کر اپنے کان سمیٹ لیتے تھے— صاحب ایسے موقعوں پر اپنی ہمشیرہ سے "اٹ از آل رائٹ۔ اٹ از آل رائٹ" کہتے اور معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔

مگر ایک دفعہ "اِٹ از آل رائٹ" کہنے سے معاملہ رفع نہ ہوا۔ اور محترمہ مس جناح نے باورچی کو نکال دیا۔ ایک باورچی کو نہیں دونوں باورچیوں کو کیونکہ قائداعظم بیک وقت باورچی خانے کے لئے دو ملازم رکھتے تھے۔ ایک وہ جو ہندوستانی کھانے پکانا جانتا ہو۔ دوسرا وہ جو انگریزی طرز کے کھانے پکانے کی مہارت رکھتا ہو۔ عام طور پر ہندوستانی باورچی بیکار پڑا رہتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی، بعض اوقات مہینوں کے بعد اس کی باری آتی تھی۔ اور اس کو حکم ملتا تھا کہ وہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

ہندوستانی کھانے تیار کرے۔ مگر قائد اعظم کو ان سے دلی رغبت نہیں تھی۔

آزاد نے بتایا ''جب دونوں باورچی نکال باہر کئے گئے تو صاحب نے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنی ہمشیرہ کے معاملوں میں دخل نہیں دیا کرتے تھے۔ چنانچہ کئی دن دونوں وقت کا کھانا تاج ہوٹل میں تناول فرماتے رہے۔ اس دوران میں ہم لوگوں نے خوب عیش کئے۔ گھر سے موٹر لے کر نئے باورچیوں کی تلاش میں نکل جاتے اور گھنٹوں اِدھر اُدھر گھوم گھام کر واپس آ جاتے تھے کہ کام کا کوئی آدمی نہیں ملا۔ آخر میں مس جناح کے کہنے پر پرانے باورچی واپس بلا لئے گئے۔

جو شخص بہت کم خور ہو وہ دوسروں کو بہت کھاتے دیکھ کر یا تو جلتا بھنتا ہے یا بہت خوش ہوتا ہے۔ قائد اعظم دوسری قبیل کے کم خوروں میں تھے وہ دوسروں کو کھلا کر دلی مسّرت محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر روز سو روپے دے کر وہ حساب کتاب سے بالکل غافل ہو جاتے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اسراف پسند تھے۔ محمد حنیف آزاد ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہے۔

''یہ سن انتالیس کا ذکر ہے۔ شام کے وقت ورلی کی سیر ہو رہی تھی۔ میں ان کی سفید پیکارڈ آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔ سمندر کی موجیں ہولے ہولے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ موسم میں گلابی خنکی تھی۔ صاحب کا موڈ بہت اچھا تھا۔ میں نے موقع پا کر عید کا ذکر چھیڑا، اس سے جو میرا مطلب تھا وہ ظاہر ہے صاحب فوراً تاڑ گئے۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ ان کے پتلے ہونٹ مسکرائے نہ جدا ہونے والا سگار منہ سے نکال کر انھوں نے کہا ''اوہ...... ویل ویل ابھی تم ایک دم مسلمان ہو گیا ہے۔ تھوڑا ہندو بنو۔

اس سے چار روز پہلے قائد اعظم، آزاد کو مسلمان بنا چکے تھے یعنی انعام کے طور پر اسے دو سو روپے دے چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس کو تھوڑا سا ہندو بننے کی تلقین کی ___ مگر آزاد پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس عید پر وہ سید مرتضیٰ جیلانی فلم پروڈیوسر کے پاس اپنی مسلمانی مستحکم کرنے کی غرض سے آیا تھا کہ اس سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے یہ مضمون تیار کرنے کے لئے اس سے مزید معلومات حاصل کیں۔

قائد اعظم کی گھریلو زندگی کا نقشہ مستور ہے اور ہمیشہ مستور رہے گا ___ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ان کی گھریلو زندگی، ان کی سیاسی زندگی میں کچھ اس طرح مدغم ہو گئی تھی کہ اس کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ بیوی تھی، وہ مدت ہوئی ان سے جدا ہو چکی تھی۔ لڑکی تھی اس نے ان کی مرضی کے خلاف ایک پارسی لڑکے سے شادی کر لی تھی۔

محمد حنیف آزاد نے مجھے بتایا۔ ''صاحب کو اس کا سخت صدمہ پہنچا تھا۔ ان کی خواہش

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تھی کہ وہ کسی مسلمان سے شادی کرے۔ خواہ وہ کسی بھی رنگ و نسل کا ہو۔ لیکن ان کی لڑکی جواز پیش کرتی تھی کہ "جب صاحب کو اپنی شریکِ زندگی منتخب کرنے میں آزادی حاصل تھی تو وہ یہ آزادی اسے کیوں نہیں بخشتے۔"

قائداعظم نے بمبئی کے ایک بہت بڑے پارسی کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ یہ تو سب کو معلوم ہے۔ لیکن یہ بات بہت کم آدمیوں کو معلوم ہے کہ پارسی اس سے بہت ناخوش تھے، ان کی یہ کوشش اور خواہش تھی کہ جناح صاحب سے بدلہ لیں۔ چنانچہ بعض دقیقہ رس اصحاب کا یہ کہنا ہے کہ قائداعظم کی لڑکی کا پارسی لڑکے سے شادی کرنا ایک منظم سازش کا نتیجہ ہے، میں نے جب اس کا ذکر آزاد سے کیا تو اس نے کہا۔ "اللہ بہتر جانتا ہے، لیکن مجھے صرف اس قدر معلوم ہے کہ صاحب کی زندگی میں اپنی بیوی کی موت کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کی صاحبزادی نے ایک پارسی سے شادی کرلی ہے تو وہ بے حد متاثر ہوئے، ان کا چہرہ اس قدر لطیف تھا کہ معمولی سے معمولی واقعہ بھی اس پر اتار چڑھاؤ پیدا کردیتا تھا۔ وہ دوسروں کو فوراً نظر آجاتا تھا۔ ماتھے پر ہلکی سی شکن ایک خوفناک خط کی صورت اختیار کرجاتی تھی ___ ان کے دل و دماغ پر اس حادثے سے کیا گزری، اس کے متعلق مرحوم ہی کچھ کہہ سکتے تھے۔ ہمیں صرف خارجی ذریعوں سے جو کچھ معلوم ہوا اس کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ بہت مضطرب رہے، پندرہ روز تک وہ کسی سے نہ ملے۔ اس دوران میں انھوں نے سیکڑوں سگار پھونک ڈالے ہوں گے۔ اور سیکڑوں میل ہی اپنے کمرے میں ادھر اُدھر چکر لگا کر طے کئے ہوں گے۔"

"سوچ بچار کے عالم میں ان کو اِدھر اُدھر ٹہلنے کی عادت تھی۔ رات کے سناٹے میں وہ اکثر پختہ اور بے داغ فرش پر ایک عرصے تک ٹہلتے رہتے تھے۔ نپے تلے قدم ادھر سے اُدھر ایک فاصلہ، خاموش فضا، جب وہ چلتے تو ان کے سفید اور کالے یا سفید اور براؤن شوز ایک عجیب قسم کی ایک آہنگ ٹک ٹک پیدا کرتے، جیسے کلاک معیّن وقفوں کے بعد اپنی زندگی کی خبر دے رہا ہے۔" قائداعظم کو اپنے جوتوں سے پیار تھا۔ اس لئے کہ وہ ان کے قدموں میں ہوتے تھے اور ہر وقت ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔

"پندرہ دن مسلسل ذہنی اور روحانی طور پر مضطرب رہنے کے بعد ایک روز ایکا ایکی نمودار ہوئے، ان کے چہرے پر اب اس صدمے کا کوئی اثر باقی نہیں تھا۔ ان کی گردن جس میں فرطِ غم کے باعث خفیف سا خم پیدا ہوگیا تھا، پھر اسی طرح سیدھی اور اکڑی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس صدمے کو بالکل بھول گئے تھے۔"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جب آزاد نے قائداعظم کی زندگی کے اس صدمے کا ذکر دوبارہ چھیڑا تو میں نے اسے پوچھا۔ "وہ اس صدمے کو نہیں بھولے تھے۔ یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

آزاد نے جواب دیا۔ ملازموں سے کیا بات چھپی رہتی ہے۔ کبھی کبھی وہ صندوق کھلوانے کا حکم دیتے تھے۔ جست کے اس جہازی صندوق میں بے شمار کپڑے تھے۔ ان کی مرحوم بیوی اور نافرمانبردار لڑکی کے جب وہ چھوٹی سی بچی تھی۔ یہ کپڑے باہر نکالے جاتے تو صاحب بڑی سنگین خاموشی سے ان کو دیکھتے رہتے۔ ایک دم ان کے دبلے پتلے اور شفاف چہرے پر غم و اندوہ کی لکیروں کا ایک جال سا بکھر جاتا۔ اِٹ از آل رائٹ۔ اِٹ از آل رائٹ، کہہ کر وہ اپنی آنکھ سے مونوکل اتارتے اور اسے پونچھتے ہوئے ایک طرف چل دیتے۔"

محمد حنیف آزاد کے بیان کے مطابق قائداعظم کی تین بہنیں فاطمہ جناح، رحمت جناح، تیسری کا نام مجھے یاد نہیں۔ وہ ڈونگری میں رہتی تھیں۔ چوپاٹی کارنر نزد چنائی موٹر ورکس پر رحمت جناح مقیم تھیں، ان کے شوہر کہیں ملازم تھے، آمدنی قلیل تھی، صاحب ہر مہینے مجھے ایک بند لفافہ دیتے، جس میں کچھ کرنسی نوٹ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ایک پارسل سا بھی دیتے۔ جس میں غالباً کپڑے وغیرہ ہوتے تھے۔ یہ چیزیں مجھے رحمت جناح کے ہاں پہنچانا ہوتی تھیں۔ یہاں مس فاطمہ جناح اور خود صاحب بھی کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ وہ بہن جو ڈونگری میں رہتی تھیں، شادی شدہ تھیں، ان کے متعلق مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ آسودہ حال تھیں، اور کسی امداد کی محتاج نہیں تھیں۔ ایک بھائی تھا۔ اس کی مدد وہ باقاعدہ کرتے تھے مگر اس کو گھر میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔

قائداعظم کے اس بھائی کو میں نے بمبئی میں دیکھا ہے، سیوائے بار میں ایک شام کو میں نے دیکھا کہ قائداعظم کی شکل وصورت کا ایک آدمی آدھا رم کا آرڈر دے رہا ہے۔ ویسا ہی ناک نقشہ، ویسے ہی الٹے کنگھی کئے ہوئے بال، قریب قریب ویسی ہی سفید لٹ، میں نے کسی سے اس کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مسٹر محمد علی جناح کا بھائی احمد علی ہے۔ میں بہت دیر تک اس کو دیکھتا رہا۔ رم کا آدھا پیگ اس نے بڑی شان سے آہستہ آہستہ لبوں کے ذریعے سے چوس چوس کر ختم کیا۔ بل جو ایک روپے سے کم تھا یوں ادا کیا، جیسے ایک بہت بڑی رقم ہے اور اس کی نشست سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بمبئی کی ایک گھٹیا بار کے بجائے تاج محل ہوٹل کے شراب خانے میں بیٹھا ہے۔

گاندھی، جناح کی تاریخی ملاقات سے کچھ دیر پہلے بمبئی میں مسلمانوں کا ایک تاریخی اجتماع ہوا۔ میرے ایک دوست اس جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پلیٹ فارم پر قائداعظم اپنے مخصوص انداز میں تقریر کر رہے تھے اور بہت دوران کا بھائی احمد علی آنکھ پر مونوکل

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

لگائے کچھ اس انداز سے کھڑا تھا۔ جیسے وہ اپنے بھائی کے الفاظ دانتوں تلے چبا رہا ہے۔

اندرون خانہ کھیلوں میں قائداعظم کو صرف بلیئرڈ سے دلچسپی تھی۔ کبھی کبھی جب ان کو اس کھیل سے شغل فرمانے کی خواہش ہوتی تو وہ بلیئرڈ روم کھلوانے کا حکم دیتے۔ صفائی یوں تو ہر کمرے میں ہر روز ہوتی تھی۔ مگر جب وہ کسی خاص کمرے میں جانے کا ارادہ فرماتے تو ملازمین ان کے داخلے سے پہلے اپنا اچھی طرح اطمینان کر لیتے کہ ہر چیز صاف ستھری اور ٹھیک ٹھاک ہے۔ بلیئرڈ روم میں مجھے جانے کی اجازت تھی اس لئے کہ مجھے بھی اس کھیل سے تھوڑا بہت شغف ہے۔ بارہ گیندیں ان کی خدمت میں پیش کر دی جاتیں، ان میں سے وہ انتخاب کرتے اور کھیل شروع ہو جاتا۔ محترمہ فاطمہ جناح پاس ہوتیں۔ صاحب سگار سلگا کر ہونٹوں میں دبا لیتے۔ اور اُس گیند کی پوزیشن کو اچھی طرح جانچتے جس کے ٹھوکر لگانا ہوتی تھی۔ اس جانچ پڑتال میں وہ کئی منٹ صرف کرتے۔ کبھی ایک زاویے سے دیکھتے کبھی دوسرے زاویے سے۔ ہاتھ میں کیو کو تولتے، اپنی پتلی پتلی انگلیوں پر اسے سارنگی کے گز کی طرح پھیرتے۔ زیر لب کچھ کہتے، شست باندھتے، مگر کوئی دوسرا مناسب وموزوں زاویہ ان کے ذہن میں آ جاتا اور وہ اپنی ضرب روک لیتے۔ ہر طرف سے اپنا پورا اطمینان کرنے پر جب کیو گیند کے ساتھ ٹکراتے اور نتیجہ ان کے حساب کے مطابق ٹھیک نکلتا تو اپنی بہن کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھ کر مسکرا دیتے۔''

سیاست کے کھیل میں قائداعظم اسی طرح محتاط تھے۔ وہ ایک دم کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے، ہر مسئلے کو وہ بلیئرڈ کے میز پر پڑی ہوئی گیند کی طرح ہر زاویے سے بغور دیکھتے تھے اور صرف اسی وقت اپنے کیو کو حرکت میں لا کر ضرب لگاتے تھے جب ان کو اس کے کارگر ہونے کا پورا وثوق ہوتا تھا۔ وار کرنے سے پہلے شکار کو اپنی نگاہوں میں اچھی طرح تول لیتے تھے۔ اس کی نشست کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیتے تھے، پھر اس کی جسامت کے مطابق ہتھیار منتخب کرتے تھے، وہ ایسے نشانچی نہیں تھے کہ بندوق اٹھایا اور داغ دیا، اس یقین کے ساتھ کہ نشانہ خطا نہیں جائے گا۔ نشانچی کی ہر ممکن خطا شست باندھنے سے پہلے ان کے پیش نظر رہتی تھی۔

آزاد کے بیان کے مطابق قائداعظم عام ملاقاتیوں سے پرہیز کرتے تھے۔ دور از کار باتوں سے انہیں سخت نفرت تھی، صرف مطلب کی بات اور وہ بھی انتہائی اختصار کے ساتھ سننے اور کرنے کی عادت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاص کمرے میں جہاں بہت کم لوگوں کو داخلے کی اجازت تھی، صرف ایک صوفہ تھا۔ اس صوفے کے ساتھ ایک چھوٹی سی تپائی تھی۔ اس میں صاحب اپنے سگار کی راکھ پھینکتے تھے۔ صوفے کے بالمقابل دو شوکیس تھے۔ ان میں وہ قرآن مجید رکھے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

رہتے تھے جو ان کے عقیدت مندوں نے ان کو تحفے کے طور پر دیئے تھے۔ اس کمرے میں ان کے ذاتی کاغذات بھی محفوظ تھے۔ عام طور پر وہ اپنا زیادہ وقت اسی کمرے میں گذارتے تھے۔ اس میں کوئی میز نہیں تھا۔ مطلوب یا کوئی اور شخص جب بھی اس کمرے میں بلایا جاتا تو اسے دروازے میں کھڑا رہنا پڑتا۔ یہیں وہ صاحب کے احکام سنتا اور الٹے پاؤں چلا جاتا ___ صوفے کے خالی حصے پر ان کے زیرِ مطالعہ کاغذات بکھرے رہتے تھے۔ کوئی خط لکھوانا ہوتا تو مطلوب کو یا اسٹینو کو بلاتے اور خط یا بیان کی عبارت بول دیتے۔ ان کے لہجے میں ایک قسم کی کرختگی تھی۔ میں انگریزی زبان کے مزاج سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن جب وہ بولتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ زور نہ دینے والے الفاظ پر بھی زور دے رہے ہیں۔''

آزاد کے مختلف بیانات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قائد اعظم کی جسمانی کمزوری کا غیر شعوری یا تحت الشعوری احساس ہی ان کرخت مظاہرہ کا باعث تھا۔ ان کی زندگی حباب بر آب تھی، مگر وہ ایک بہت بڑا بھنور بن کر رہتے تھے۔ بعض اصحاب کا تو یہ کہنا ہے کہ وہ اتنے دن صرف اسی قوت کے بل پر جیے ___ جسمانی کمزوری کے اس احساس کی قوت پر۔

محمد حنیف آزاد کے بیان کے مطابق بہادر یار جنگ مرحوم قائدِ اعظم کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ صرف ان ہی سے ان کے مراسم بہت بے تکلفانہ تھے۔ وہ جب بھی ان کے یہاں قیام کرتے تو یہ دونوں شخصیتیں ٹھیٹ دوستانہ انداز میں قومی اور سیاسی مسائل پر غور کرتی تھیں۔ اس وقت قائد اعظم اپنی آمریت کچھ عرصے کے لئے اپنی شخصیت سے جدا کر دیتے ___ ''میں نے صرف یہی ایک شخص دیکھا جس سے صاحب ہجولی کی طرح باتیں کرتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بچپن کے ساتھی ہیں، جب آپس میں باتیں کرتے تو کئی مرتبہ قید و بند سے آزاد قہقہوں کی آواز سنائی دیتی ___ بہادر یار جنگ کے علاوہ مسلم لیگ کے دوسرے سر برآوردہ اراکین۔ مثال کے طور پر راجہ محمود آباد، آئی۔ آئی چندریگر، مولانا زاہد حسین، نواب زادہ لیاقت علی خان، نواب اسماعیل اور علی امام صاحب اکثر تشریف لاتے تھے۔ لیکن صاحب ان سے بالکل دفتری انداز میں پیش آتے ___ وہ بے تکلفی کہاں جو بہادر یار جنگ کے لئے مخصوص تھی۔''

میں نے آزاد سے پوچھا ''خان لیاقت علی خان تو اکثر آتے ہوں گے۔''

آزاد نے جواب دیا۔ ''جی ہاں صاحب ان سے اس طرح پیش آتے تھے جیسے وہ ان کے سب سے ہونہار شاگرد ہیں۔ اور خان صاحب بھی بڑے ادب اور بڑی سعادت مندی سے ان کا ہر حکم سنتے اور بجالاتے تھے۔ جب ان کی طلبی ہوتی تو وہ مجھ سے کبھی کبھی پوچھ لیا کرتے تھے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کہو آزاد، صاحب کا موڈ کیسا ہے؟ ان کا جیسا موڈ ہوتا میں بتا دیا کرتا تھا۔ جب اس میں کوئی خرابی واقع ہو جاتی تو کوٹھی کے تمام در و دیوار کو فوراً پتہ چل جاتا تھا۔"

قائداعظم اپنے ملازمین کے کردار و اطوار کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جس طرح ان کو تن کے میل سے نفرت تھی۔ اسی طرح وہ من کے میل سے متنفر تھے۔ مطلوب ان کو بہت پسند تھا۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ ایک رضا کار لڑکی سے محبت کی پینگیں بڑھا رہا ہے تو ان کو بہت کوفت ہوئی۔ مگر وہ اس قسم کی کوفت زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتے تھے۔ اُس کی طلبی ہوئی اور فوراً ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا مگر اس کو رخصت کرنے کے بعد وہ اس سے اس طرح پیش آئے۔ جس طرح دوستوں سے آتے ہیں۔

آزاد بیان کرتا ہے۔ "ایک بار میں رات کے دو بجے سیر و تفریح سے فارغ ہو کر کوٹھی آیا۔ وہ دن ایسے تھے جب رگوں میں جوانی کے خون کو کھولانے میں ایک عجیب قسم کی لذت محسوس ہوا کرتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ صاحب کو میرے دیر سے آنے کا علم تک نہ ہوگا۔ مگر ان کو کسی نہ کسی طرح پتہ چل گیا۔ دوسرے روز ہی مجھے طلب فرمایا۔ اور انگریزی میں کہا کہ تم اپنا کیریکٹر خراب کر رہے ہو۔ پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں ارشاد ہوا۔ "ویل اب تمہارا شاڈی بنائے گا۔" ____ چنانچہ چار ماہ بعد جب وہ بمبئی سے دہلی اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تو ان کی ہدایت کے مطابق میری شادی ہوگئی۔ اور میری خوش قسمتی ہے کہ محض ان کی وجہ سے میرا رشتہ سادات خاندان میں ہوا۔ ورنہ میں تو شیخ تھا۔ لڑکی والوں نے مجھے اس لئے قبول کیا کہ آزاد، قائداعظم کا غلام ہے۔

میں نے آزاد سے دفعتاً ایک سوال کیا۔ "کیا تم نے کبھی قائداعظم کے منہ سے آئی ایم سوری سنا تھا۔

آزاد نے اپنی موٹی تنومند گردن زور سے نفی میں ہلائی۔ "نہیں ____ کبھی نہیں۔" پھر وہ مسکرایا۔ "اگر اتفاق سے کبھی آئی ایم سوری ان کے منہ سے نکل جاتا تو مجھے یقین ہے کہ ڈکشنری میں سے وہ یہ الفاظ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا دیتے۔"

میرا خیال ہے کہ آزاد کے اس بے ساختہ جملے میں قائداعظم محمد علی جناح کا پورا پورا کردار آ جاتا ہے۔

محمد حنیف آزاد زندہ ہے، اس پاکستان میں جو اسے قائداعظم نے اسے عطا کیا ہے اور جو اب اس کے ہونہار شاگرد خان لیاقت علی خان کی قیادت میں دنیا کے نقشے پر زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ اس آزاد خطۂ زمین پر آزاد پنجاب آرٹ پکچرز کے دروازے کے باہر پان

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

والے کی دکان کے پاس ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر بیٹھا اکثر اپنے آقا کا منتظر رہتا ہے۔ اور اس اچھے وقت کے لئے دست بدعا رہتا ہے۔ جب وقت پر اس کی تنخواہ مل جایا کرے۔ اب وہ قائداعظم کی تلقین کے مطابق ہندو بننے کے لئے بھی تیار ہے۔ بشرطیکہ اس کو اس کا موقعہ دیا جائے۔

وہ بے حد متفکر تھا۔ جب میں نے اس سے قائداعظم کی زندگی کے بارے میں اس کے تاثرات کے متعلق استفسار کیا۔ اس کے پاس پان کے لئے بھی پیسے نہیں تھے۔ میں نے جب اس کے تفکرات اِدھر اُدھر کی باتوں سے کسی قدر دور کئے تو اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ”صاحب انتقال فرما گئے ہیں۔ کاش ان کے اس سفر میں، میں بھی شریک ہوتا۔ ان کی سفید اوپن پیکارڈ ہوتی، اس کا وھیل میرے ہاتھوں میں ہوتا، اور میں آہستہ آہستہ ان کو منزلِ مقصود تک لے جاتا۔ ان کی نازک طبیعت دھچکوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے سنا ہے واللہ اعلم درست ہے یا غلط جب ان کا جہاز کراچی ایئر وڈرام پر پہنچا تو ان کو گورنمنٹ ہاؤس تک پہنچانے کے لئے جو ایمبولنس تھی اس کا انجن درست حالت میں نہیں تھا۔ وہ کچھ دور چل کر رک گئی تھی۔ اس وقت میرے صاحب کو کس قدر کوفت ہوئی ہوگی۔“

آزاد کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو تھے۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

# نرگس
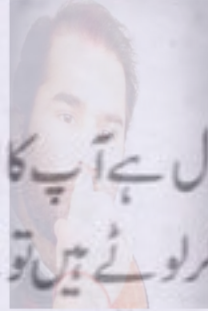
عرصہ ہوا۔ نواب چھتاری کی صاحب زادی تسنیم (مسز تسنیم سلیم) نے مجھے ایک خط لکھا تھا۔

"تو کیا خیال ہے آپ کا اپنے بہنوئی کے متعلق؟ وہ جو اندازہ آپ کی طرف سے لگا کر لوٹے ہیں تو مجھے اپنے لئے شادیٔ مرگ کا اندیشہ ہوا جاتا ہے۔ اب میں آپ کو تفصیل سے بتادوں گا کہ یہ حضرت مجھے آپ کے نام سے چھیڑا کرتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ جب وہ میرے نادیدہ بھائی سے ملیں گے، تو نہ جانے کیا کیا حماقتیں سرزد ہوں گی...... اور مجھے شرمندگی ہوگی۔ اور اب پرسوں سے مصر ہیں کہ بمبئی چل کر منٹو سے ملو۔ بہت ہی دلچسپ آدمی ہیں۔" اور اس طرح کہتے ہیں۔ گویا منٹو میرے بجائے ان کا بھائی ہے۔ اور میں ہمیشہ سے کہتی تھی کہ دیکھنا یہ حضرت کیسے نکلتے ہیں...... زبردستی تو ملاحظہ کیجئے...... بہر حال بہت خوش ہیں کہ میرا انتخاب بہت خوب رہا...... ہمارے برادرِ محترم یعنی ابن بھائی، سلیم سے قبل ہی پہنچ گئے تھے۔ اور انھوں نے سب سے قبل یہی بات بتائی کہ وہ آپ سے نیاز حاصل کر کے آئے ہیں۔ نرگس کا ذکر عمداً گول کر کے باقی سب تفصیل سے بتادیا۔ پھر جب سلیم آئے تو انھوں نے نہ صرف داستانِ جبہ سائی بتائی بلکہ آپ کی اور نخشب کی جنگ کا واقعہ بھی دلچسپی سے بیان کیا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اس سلسلے میں سلیم معافی خواہ ہیں دوبارہ جدن بائی کے یہاں جانے کے محرک شمشاد بھائی (جو آپ سے مل چکے ہیں) وغیرہ تھے۔ اور ان سے ممکن ہوتا تو آپ سے علاوہ نہ جانے اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ سلیم کو اگر عشق ہوا ہے تو لیلا چٹنس سے ورنہ ایسے بدنظر بھی نہیں۔"

میں بہت مصروف تھا جب سلیم میرے یہاں آئے۔ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اور بقول تسنیم کے وہ میرے بہنوئی تھے اس لئے ان کی خاطرداری کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ گھر میں جو حاضر تھا ان کو اور ان کے مصاحبوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ فلم سے متعلق لوگوں کے پاس ایک تحفے کی چیز "شوٹنگ" ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ بھی ان کو شری ساؤنڈ اسٹوڈیو میں دکھادی گئی۔ غالباً "پھول" تھی۔ جسے ڈائریکٹر دھانسو یعنی آصف بنا رہا تھا۔

سلیم اور ان کے ساتھیوں کو بظاہر مطمئن ہو جانا چاہئے تھا کہ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا پروگرام بنا کر بمبئی پہنچے تھے۔ سلیم نے برسبیل تذکرہ مجھ سے پوچھا۔ "کیوں صاحب نرگس کہاں ہوتی ہے۔ آج کل؟"

میں نے ازراہ مذاق کہا۔ "اپنی ماں کے پاس۔"

میرا مذاق غیر طبعی موت کی گود میں چلا گیا۔ جب میرے مہمانوں میں سے ایک نے بڑی نوابانہ سادہ لوحی سے کہا۔ "جدن بائی کے پاس؟"

"جی ہاں۔"

سلیم نے پوچھا۔ "کیا اس سے ملاقات ہو سکتی ہے...... میرا یہ مطلب ہے کہ میرے یہ دوست اس کو دیکھنے کے بہت مشتاق ہیں...... کیا آپ اس کو جانتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "جانتا ہوں...... مگر معمولی سا۔"

ایک صاحب نے بڑے ڈھب انداز میں سوال کیا۔ "کیوں؟"

"اس لئے کہ اسے اور مجھے ابھی تک کسی فلم میں اکٹھے کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

سلیم نے یہ سن کر کہا۔ "تو چھوڑیئے...... ہم آپ کو خواہ مخواہ تکلیف دینا نہیں چاہتے۔"

لیکن میں خود نرگس کے یہاں جانا چاہتا تھا۔ کئی دفعہ ارادہ کیا مگر اکیلا جانا مجھے پسند نہیں تھا۔ ساتھ ملتا تو تھا مگر نہایت ہی بے ہودہ۔ یعنی دیدے پھاڑ پھاڑ کر گھورنے والا۔ اب موقعہ تھا آدمی سادہ لوح تھے۔ محض عیاشی کے طور پر نرگس کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے تاکہ واپس اپنی جاگیرو ں اور ریاستوں میں جا کر اپنے دوستوں اور مصاحبوں کو مشہور فلم اسٹار نرگس کے چشم دید حالات

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

سنائیں۔ چنانچہ میں نے سلیم سے کہا۔ ''تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ چلتے ہیں۔ ممکن ہے ملاقات ہو جائے۔

میں نرگس سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ بمبئی میں اتنی ایکٹریسیں تھیں جن کے ہاں میں جب چاہتا آجا سکتا تھا۔ مگر خاص طور پر نرگس سے ملنے کا کیا مطلب تھا؟ میرا خیال ہے۔ اس کا جواب دینے سے پہلے میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سنا دوں۔

میں فلمستان میں ملازم تھا۔ صبح جاتا تو شام کو آٹھ کے قریب لوٹتا۔ ایک روز اتفاق سے واپسی جلدی ہوئی۔ یعنی میں دوپہر ہی کے قریب گھر پہنچ گیا اندر داخل ہوا تو ساری فضا مرتعش نظر آئی۔ جیسے کوئی ساز کے تار کو چھیڑ کر خود چھپ گیا ہے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس میری دو سالیاں کھڑی بظاہر اپنے بال گوندھ رہی تھیں۔ مگر ان کی انگلیاں ہوا میں چل رہی تھیں۔ ہونٹ دونوں کے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ مگر آواز نہیں نکلتی تھی۔ دونوں مل جل کر گھبراہٹ کی ایسی تصویر پیش کر رہی تھیں جو اپنی گھبراہٹ چھپانے کی خاطر بے مطلب دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ملحقہ کمرے کے دروازے کا پردہ اندر کی طرف دبا ہوا تھا۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف قصوروار نگاہوں کی طرح دیکھا۔ ہولے ہولے کھسر پھسر کی۔ پھر دونوں نے بیک وقت کہا ''بھاجی سلام۔''

''وعلیکم السلام'' میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟''

میں نے سوچا کہ سب مل کر سینما جا رہی ہیں۔ دونوں نے میرا سوال سن کر پھر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک دم کھلکھلا کر ہنسیں اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئیں۔

میں نے سوچا کہ شاید انھوں نے اپنی کسی سہیلی کو مدعو کیا ہے۔ وہ آنے والی ہے۔ اور چونکہ میں غیر متوقع طور پر جلد چلا آیا ہوں اس لئے ان کا پروگرام درہم برہم ہو گیا ہے۔

دوسرے کمرے میں کچھ دیر تک تینوں بہنوں میں سرگوشیاں ہوتی رہیں، دبی دبی ہنسی کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ اس کے بعد سب سے بڑی بہن یعنی میری بیوی بظاہر اپنی بہنوں سے مخاطب، مگر دراصل مجھے سنانے کے لئے یہ کہتی ہوئی باہر نکلی۔ ''مجھے کیا کہتی ہو۔ کہنا ہے تو خود ان سے کہو...... سعادت صاحب آج بہت جلدی آ گئے؟''

میں نے وجہ بیان کر دی کہ اسٹوڈیو میں کوئی کام نہیں تھا اس لئے چلا آیا۔ پھر اپنی بیوی سے پوچھا۔ ''کیا کہنا چاہتی ہیں میری سالیاں؟''

''یہ کہنا چاہتی ہیں کہ نرگس آ رہی ہے۔''

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

''تو کیا ہوا...... آئے۔ کیا وہ پہلے کبھی نہیں آئی۔''

میں سمجھا کہ وہ اس پارسی لڑکی کی بات کر رہی ہیں جس کی ماں نے ایک مسلمان سے شادی کر لی تھی اور ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ مگر میری بیوی نے کہا۔ ''ہائے! وہ پہلے کب ہمارے ہاں آئی ہے۔''

''تو کیا وہ کوئی اور نرگس ہے؟''

''میں نرگس ایکٹریس کی بات کر رہی ہوں۔''

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''وہ کیا کرنے آ رہی ہے یہاں؟''

میری بیوی نے مجھے سارا قصہ سنایا۔ گھر میں ٹیلیفون تھا جسے تینوں بہنیں فرصت کے اوقات میں بڑی فراخدلی سے استعمال کرتی تھیں۔ جب اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتے کرتے تھک جاتیں تو کسی ایکٹریس کا نمبر گھما دیتیں۔ وہ مل جاتی تو اس سے اوٹ پٹانگ گفتگو شروع ہو جاتی...... ہم آپ کی بہت مداح ہیں۔ آج ہی دلی سے آئی ہیں۔ بڑی مشکلوں سے آپ کا نمبر حاصل کیا ہے۔ آپ سے ملاقات کرنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ ضرور حاضر ہوتیں مگر پردے کی پابندی ہے......

...... آپ بہت حسین ہیں، چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ گلا ماشاءاللہ بہت ہی سریلا ہے (حالانکہ ان کو معلوم ہوتا تھا کہ اس میں امیر بائی بولتی ہے یا شمشاد)

عام طور پر مشہور فلم ایکٹرسوں کے ٹیلی فون نمبر ڈائریکٹری میں درج نہیں ہوتے۔ وہ خود نہیں کراتیں کہ ان کے چاہنے والے بے کار رنگ نہ کریں مگر ان تین بہنوں نے میرے دوست خلش کاشمیری کے ذریعے سے قریب قریب ان تمام فلم ایکٹرسوں کے فون نمبر معلوم کر لئے تھے جو انھیں ڈائریکٹری میں نہیں ملے تھے۔

اس ٹیلی فونی شغل کے دوران میں جب انھوں نے نرگس کو بلایا اور اس سے بات چیت کی تو بہت پسند آ گئی۔ اس گفتگو میں ان کو اپنی عمر کی آواز سنائی دی۔ چنانچہ چند گفتگوؤں ہی میں وہ اس سے بے تکلف ہو گئیں مگر اپنی اصلیت چھپائے رکھی ایک کہتی میں افریقہ کی رہنے والی ہوں۔ وہی دوسری بار یہ بتاتی کہ لکھنؤ سے اپنی خالہ کے پاس آئی ہے۔ دوسری یہ ظاہر کرتی کہ وہ راولپنڈی کی رہنے والی ہے اور صرف اس لئے بمبئی آئی ہے کہ اسے نرگس کو ایک بار دیکھنا ہے۔ تیسری یعنی میری بیوی کبھی گجراتن بن جاتی کبھی پارسن۔

ٹیلی فون پر کئی بار نرگس نے جھنجھلا کر پوچھا کہ تم لوگ اصل میں کون ہو۔ کیوں اپنا نام

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

پتہ چھپاتی ہوئے صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں کہ یہ روز روز کی ٹن ٹن ختم ہو۔

ظاہر ہے کہ نرگس ان سے متاثر تھی اس کو یقیناً اپنے سینکڑوں مداحوں کے فون آتے ہوں گے۔ مگر یہ تین لڑکیاں ان سے کچھ مختلف تھیں اس لئے وہ سخت بے چین تھی کہ ان کی اصلیت جانے اور ان سے ملے جلے۔ چنانچہ جب بھی اسے معلوم ہوتا کہ ان پر اسرار لڑکیوں نے اسے بلایا ہے تو وہ سو کام چھوڑ کر آتی اور بہت دیر تک ٹیلی فون کے ساتھ چپکی رہتی۔

ایک دن نرگس کے پیہم اصرار پر بالآخر طے ہو گیا کہ ان کی ملاقات ہو کے رہے گی۔ میری بیوی نے اپنے گھر کا پتہ اچھی طرح سمجھا دیا اور کہا کہ اگر پھر بھی مکان ملنے میں دقت ہو تو بائی کلہ کے پل کے پاس کسی ہوٹل سے ٹیلی فون کر دیا جائے۔ وہ سب وہاں پہنچ جائیں گی۔

جب میں گھر میں داخل ہوا۔ بائی کلہ پل کے ایک اسٹور سے نرگس نے فون کیا تھا کہ وہ پہنچ چکی ہے مگر مکان نہیں مل رہا۔ چنانچہ تینوں افراتفری کے عالم میں تیار ہو رہی تھیں کہ میں بلائے ناگہانی کی طرح پہنچ گیا۔

چھوٹی دو کا خیال تھا کہ میں ناراض ہوں گا۔ بڑی یعنی میری بیوی محض بوکھلائی ہوئی تھی کہ یہ سب کیا ہوا ہے...... میں نے ناراض ہونے کی کوشش کی مگر مجھے اس کے لئے کوئی معقول جواز نہ ملا۔ سارا قصہ کافی دلچسپ اور بے حد معصوم تھا۔ اگر ''کان مچولی'' کی یہ حرکت صرف میری بیوی سے سرزد ہوئی ہوتی تو بالکل جدا بات تھی۔ ایک سالی آدھی گھر والی ہوتی ہے اور یہاں دو سالیاں تھیں۔ پورا گھر ہی ان کا تھا۔ میں جب اٹھا تو دوسرے کمرے میں خوش ہونے اور تالیاں بجانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

بائی کلہ کے چوک میں جدن بائی کی لمبی چوڑی موٹر کھڑی ہے۔ میں نے سلام کیا تو اس نے حسب معمول بڑی بلند آواز میں اس کا جواب دیا اور پوچھا ''کہو منٹو کیسے ہو۔''

میں نے کہا ''اللہ کا شکر ہے...... کہئے آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔''

جدن بائی نے پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی نرگس کی طرف دیکھا۔ ''کچھ نہیں بی بی کو اپنی سہیلیوں سے ملنا تھا۔ مگر ان کا مکان نہیں مل رہا۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''چلئے میں آپ کو لے چلوں۔''

نرگس یہ سن کر کھڑکی کے پاس آ گئی۔ ''آپ کو ان کا مکان معلوم ہے؟''

میں نے اور زیادہ مسکرا کر کہا۔ ''کیوں نہیں...... اپنا مکان کون بھول سکتا ہے۔''

جدن بائی کے حلق نے عجیب سی آواز نکالی۔ پان کے بیڑے کو دوسرے کلے میں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری
بس بک گروپ
0314.595.1212

تبدیل کرتے ہوئے "یہ تم کیا افسانہ نگاری کر رہے ہو۔"

میں دروازہ کھول کر جدن بائی کے پاس بیٹھ گیا۔ "بی بی! یہ افسانہ نگاری میری نہیں ہے۔ میری بیوی اور اس کی بہنوں کی ہے۔" اس کے بعد میں نے مختصراً تمام واقعات بیان کر دیئے۔ نرگس بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔ جدن بائی کو بہت کوفت ہوئی۔ "لاحول ولا...... یہ کیسی لڑکیاں ہیں۔ پہلے ہی دن کہہ دیا ہوتا کہ ہم منٹو کے گھر سے بول رہی ہیں...... خدا کی قسم میں فوراً بی بی کو بھیج دیتی۔ بھئی حد ہو گئی ہے اتنے دن پریشان کیا...... خدا کی قسم بے چاری بی بی کو اتنی الجھن ہوتی تھی کہ میں تم سے کیا کہوں۔ جب ٹیلیفون آتا۔ بھاگی بھاگی جاتی...... میں ہزار پوچھتی یہ کون ہے جس سے اتنی دیر میٹھی میٹھی باتیں ہوتی ہیں۔ مجھ سے کہتی۔ کوئی ہیں۔ جانتی نہیں کون ہیں۔ مگر ہیں بڑی اچھی۔ دو ایک بار میں نے بھی ٹیلی فون اٹھایا۔ گفتگو ماشاء اللہ بڑی شائستہ تھی۔ کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر معاف کرنا کم بخت اپنا نام پتہ صاف بتاتی ہی نہیں تھیں۔ آج بے بی آئی خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ کہنے لگی بی بی انھوں نے بلایا ہے۔ اپنا ایڈریس دے دیا ہے۔ میں نے کہا۔ پاگل ہوئی ہو ہٹو جانے کون ہیں۔ کون نہیں ہیں۔ پر اس نے میری ایک نہ مانی بس پیچھے پڑ گئی چنانچہ مجھے ساتھ آنا ہی پڑا...... خدا قسم اگر معلوم ہوتا کہ یہ آفتیں تمہارے گھر کی ہیں......"

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "تو ساتھ آپ نازل نہ ہوتیں۔"

جدن بائی کے کلّے میں دبے ہوئے پان میں چوڑی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "اس کی ضرورت ہی کیا تھی...... میں کیا تمہیں جانتی نہیں۔"

مرحومہ کو اردو ادب سے بڑا شغف تھا۔ میری تحریریں بڑے شوق سے پڑھتی اور پسند کرتی تھیں۔ ان دنوں میرا ایک مضمون "ساقی" میں شائع ہوا تھا۔ غالباً ترقی یافتہ قبرستان۔ معلوم نہیں اس کا ذہن کیوں اس طرف چلا گیا خدا کی قسم منٹو...... بہت خوب لکھتے ہو۔ ظالم کیا طنز کیا ہے اس مضمون میں...... کیوں بے بی اس دن کیا حال ہوا تھا میرا مضمون پڑھ کر۔

مگر نرگس اپنی نادیدہ سہیلیوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اضطراب بھرے لہجہ میں اس نے اپنی ماں سے کہا۔ "چلو بی بی۔"

جدن بائی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "چلو بھائی۔"

گھر پاس ہی تھا۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی اور ہم پہنچ گئے۔ اوپر بالکنی سے تینوں بہنوں نے ہمیں دیکھا۔ چھوٹی دو کا مارے خوشی کے برا حال ہو رہا تھا۔ خدا معلوم آپس میں کیا گھسر پھسر کر رہی تھیں۔ جب ہم اوپر پہنچے تو عجیب و غریب طریقے پر سب کی ملاقات ہوئی۔ نرگس اپنی ہم عمر

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

لڑکیوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور میں، میری بیوی اور جدّن بائی وہیں بیٹھ گئے۔

بہت دیر تک مختلف زاویوں سے کان مچولی کے سلسلے پر تبصرہ کیا گیا۔ میری بیوی کی بوکھلاہٹ جب کسی قدر کم ہوئی تو اس نے میزبان کے فرائض سرانجام دینے شروع کر دیئے۔

میں اور جدّن بائی فلم انڈسٹری کے حالات پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ پان کھانے کے معاملے میں بڑی خوش ذوق تھی۔ ہر وقت اپنی پندنیا ساتھ رکھتی تھی۔ بڑی دیر کے بعد موقعہ ملا تھا۔ اس لئے میں نے اس پر خوب ہاتھ صاف کیا۔

نرگس کو میں نے ایک مدّت کے بعد دیکھا تھا۔ دس گیارہ برس کی بچّی تھی۔ جب میں نے ایک دو مرتبہ فلموں کی نمائش عظمیٰ میں اسے اپنی ماں کی انگلی کے ساتھ لپٹی دیکھا تھا۔ چندھیائی ہوئی آنکھیں، بے کشش سالمبوترا چہرہ۔ سوکھی سوکھی ٹانگیں ایسا معلوم ہوتا تھا سو کے اٹھی ہے یا سونے والی ہے مگر اب وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ عمر نے اس کی خالی جگہیں پر کر دی تھیں۔ مگر آنکھیں ویسی کی ویسی تھیں۔ چھوٹی اور خواب زدہ...... بیمار بیمار...... میں نے سوچا اس رعایت سے اس کا نام نرگس موزوں و مناسب ہے۔

طبیعت میں نہایت ہی معصوم کھلنڈرا پن تھا۔ بار بار اپنی ناک پونچھتی تھی جیسے ازلی زکام کی شکار ہے۔ برسات میں اس کو ادا کے طور پر پیش کیا گیا ہے، مگر اس کے اداس اداس چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ اپنے اندر کردار نگاری کا جوہر رکھتا ہے۔ ہونٹوں کو کسی قدر بھینچ کر بات کرنے اور مسکرانے میں گو بظاہر ایک بناوٹ تھی مگر صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ بناوٹ سنگار کا روپ اختیار کر کے رہے گی۔ آخر کردار نگاری کی بنیادیں بناوٹ ہی پر استوار ہوتی ہیں۔

ایک بات جو خاص طور پر میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ نرگس کو اس بات کا کامل احساس تھا کہ وہ ایک دن بہت بڑی اسٹار بننے والی ہے مگر یہ دن قریب تر لانے اور اسے دیکھ کر خوش ہونے میں اسے کوئی عجلت نہ تھی۔ اس کے علاوہ اپنے لڑکپن کی چھی منی خوشیاں گھسیٹ کر بڑی بڑی بے ہنگم خوشیوں کے دائرے میں نہیں لے جانا چاہتی تھی۔

تینوں ہم عمر لڑکیاں ایک دوسرے کمرے میں جو باتیں کر رہی تھیں ان کا دائرہ گھر اور کنونٹ کی چار دیواری تک محدود تھا۔ فلم اسٹوڈیو میں کیا ہوتا ہے۔ رومانس کیا بلا اس سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نرگس بھول گئی تھی کہ وہ فلم اسٹار ہے۔ پردے پر جس کی ادائیں بکتی ہیں اور اس کی سہیلیاں بھی یہ بھول گئی تھیں کہ نرگس اسکرین پر بری بری حرکتیں کرنے والی ایکٹریس ہے۔

میری بیوی جو عمر میں نرگس سے بڑی تھی اب اس کی آمد پر بالکل بدل گئی تھی۔ اس کا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سلوک اس سے ایسا ہی تھا، جیسا اپنی چھوٹی بہنوں سے تھا۔ پہلے اس کو نرگس سے اس لئے دلچسپی تھی کہ وہ فلم ایکٹریس ہے۔ پردے پر بڑی خوبی سے نت نئے مردوں سے محبت کرتی ہے۔ ہنستی ہے، آہیں بھرتی ہے۔ کدکڑے لگاتی ہے۔ اب اسے خیال تھا کہ وہ کھٹی چیزیں نہ کھائے۔ بہت ٹھنڈا پانی نہ پئے۔ زیادہ فلموں میں کام نہ کرے۔ اپنی صحت کا خیال رکھے۔ اب اس کے نزدیک نرگس کا فلموں میں کام کرنا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

میں، میری بیوی اور جدّن بائی اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول تھے کہ آپا سعادت آ گئیں۔ میری ہم نام ہیں اور بڑی دلچسپ چیز ہیں۔ تصنع سے لاکھوں میل دور...... حسبِ معمول وہ اس انداز سے آئیں کہ جدّن بائی سے ان کو متعارف کرانے کا ہمیں موقعہ ہی نہ ملا۔ اپنے دو ڈھائی من کے بوجھ کو صوفے پر ہلکا کرتے ہوئے بولیں۔ ''صفو جان! تمہارے بھائی جان سے میں نے لاکھ کہا تھا کہ ایسی مُردار موٹر نہ خریدو۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی...... دو قدم چلی ہوگی کہ ہانپنے لگی اور کھڑی ہوگئی۔ اب کھڑے ہینڈل مار رہے ہیں۔ میں نے کہا آپ جایئے۔ میں تو صفو کے پاس بیٹھتی ہوں۔

جدّن بائی غالباً کسی نواب کی بات کر رہی تھیں۔ جو بہت عیاش تھا۔ آپا سعادت کی وجہ سے یہ بات مکمل نہ ہو سکی۔ جب پھر شروع ہوئی تو آپا سعادت نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ کاٹھیاواڑ کی قریب قریب تمام ریاستوں اور ان کے نوابوں کو وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ کیونکہ ریاست مانگرول کے نوابی خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔

جدّن بائی اپنے پیشے کی وجہ سے تمام والیانِ ریاست کو اچھی طرح جانتی پہچانتی تھیں۔ باتوں باتوں میں ایک بڑی ریاست خور قسم کی طوائف کا ذکر چھڑ گیا۔ آپا سعادت شروع ہو گئیں۔ ''خدا ان سے محفوظ رکھے۔ جس کے ساتھ چمٹتی ہیں، اس کو دین کا رکھتی ہیں نہ دنیا کا۔ دولت برباد۔ صحت برباد۔ عزت برباد۔ صفو جان میں تمہیں کیا بتاؤں، سو بیماروں کی ایک بیماری ہے یہ طوائف......''

میں اور میری بیوی سخت پریشان کہ آپا سعادت کو کیسے روکیں۔ جدّن بائی بڑی فراخدلی سے آپا سعادت کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی اور ہم دونوں پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے تھے۔ ایک دو بار میں نے ان کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ اور زیادہ جوش میں آ گئیں۔ جی بھر کے گالیاں دینے لگیں۔ لیکن یک لخت انھوں نے جدّن بائی کی طرف دیکھا۔ ان کے سفید گوشت بھرے چہرے پر ایک عجیب و غریب تھرتھری پیدا ہوئی۔ ان کی ناک کی کیل کا ہیرا گردن کی جنبش کے ساتھ دو تین دفعہ بڑی تیزی سے چمکا اور پھر ان کا منہ کھلا۔ زور سے اپنی رانوں پر دو ہتڑ مار کر انھوں نے تتلاتے ہوئے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

لہجے میں جدّن بائی سے کہا۔ ''آپ؟...... آپ تو جدّن...... آپ جدّن بائی ہیں نا؟''

جدّن بائی نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ ''جی ہاں!''

آپا سعادت کا منہ اور زیادہ کھلا...... اوہ...... تو آپ...... میرا مطلب ہے کہ آپ تو بہت اونچی طوائف ہیں...... کیوں صفو جان؟ صفو جان برف ہوگئی۔ میں نے جدّن بائی کی طرف دیکھا اور مسکرایا...... میرا خیال ہے، بہت ہی واہیات قسم کی مسکراہٹ تھی۔ جدّن بائی نے یوں ظاہر کیا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی اور اس بڑی ریاست خور قسم کی طوائف کے بقایا حالات بیان کرنے شروع کردیئے جس کا ذکر چھیڑنے پر آپا سعادت کو لکچر دینا پڑا ہے۔

جدّن بائی کی کوشش کے باوجود بات نہ جمی۔ آپا سعادت کو اپنی غلطی کا اور ہمیں اپنی خفت کا بہت ہی شدید احساس تھا مگر جب لڑکیاں آگئیں تو فضا کا تکدّر دور ہوگیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد نرگس سے فرمائش کی گئی کہ وہ گانا سنائے۔ اس پر جدّن بائی نے کہا۔ ''میں نے اس کو موسیقی کی تعلیم نہیں دی۔ موہن بابو اس کے خلاف تھے اور سچ پوچھئے تو مجھے بھی پسند نہیں تھا۔ تھوڑا بہت ٹوں ٹاں کرلیتی ہے۔'' اس کے بعد وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئی۔ ''سنادو بے بی...... جیسا بھی آتا ہے سنادو۔''

نرگس نے بڑی ہی معصومانہ بے تکلفی سے گانا شروع کردیا...... پرلے درجے کی کن سری تھی۔ آواز میں رس، نہ لوچ، میری چھوٹی سالی اس سے لاکھوں درجے بہتر گاتی تھی مگر فرمائش کی گئی تھی اور وہ بھی بڑی پُر اصرار اس لئے دو تین منٹ تک اس کا گانا برداشت کرنا ہی پڑا۔ جب اس نے ختم کیا تو سب نے تعریف کی۔ میں اور آپا سعادت خاموش رہے تھوڑی دیر کے بعد جدّن بائی نے رخصت چاہی۔ لڑکیاں نرگس سے گلے ملیں۔ دوبارہ ملنے کے وعدے وعید ہوئے۔ کچھ کھسر پھسر بھی ہوئی اور ہمارے مہمان چلے گئے۔

نرگس سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد اور کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لڑکیاں ٹیلی فون کرتی تھیں اور نرگس اکیلی موٹر میں چلی آتی تھی۔ اس آمد و رفت میں اس کے ایکٹریس ہونے کا احساس قریب قریب مٹ گیا۔ وہ لڑکیوں سے اور لڑکیاں اس سے یوں ملتی تھیں جیسے وہ ان کی بہت پرانی سہیلی ہے۔ یا کوئی رشتہ دار ہے۔ لیکن جب وہ چلی جاتی تو کبھی کبھی تینوں بہنیں اس استعجاب کا اظہار کرتیں۔ خدا کی قسم عجیب بات ہے کہ نرگس بالکل ایکٹریس معلوم نہیں ہوتی۔

اس دوران میں تینوں بہنوں نے اس کی ایک تازہ فلم دیکھی جس میں ظاہر ہے کہ وہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اپنے ہیرو کی محبوبہ تھی۔ جس سے وہ پیار کی باتیں کرتی تھی اور اسے عجیب عجیب نگاہوں سے دیکھتی تھی اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوتی تھی۔ اس کا ہاتھ دباتی تھی۔ میری بیوی کہتی۔ "کم بخت اس کے فراق میں کیسی لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھی۔ جیسے سچ مچ اس کے عشق میں گرفتار ہے اور اس کی چھوٹی دو بہنیں اپنے کنوارے ایکٹنگ سے نا آشنا دلوں میں سوچتیں۔" اور کل وہ ہم سے پوچھ رہی تھی کہ گُڑ کی ٹوفی کیسے بنائی جاتی ہے۔"

نرگس کی اداکاری کے متعلق میرا خیال بالکل مختلف تھا۔ وہ قطعی طور پر جذبات و احساسات کی صحیح عکاسی نہیں کرتی تھی۔ محبت کی نبض کس طرح چلتی ہے یہ اناڑی انگلیاں کیسے محسوس کر سکتی تھیں۔ عشق کی دوڑ میں تھک کر ہانپنا اور اسکول کی ڈور میں تھک کر سانس کا پھول جانا دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ خود نرگس بھی اس کے فرق سے آگاہ نہیں تھی۔ اس کے شروع شروع کی فلموں میں چنانچہ دقیقہ رس نگاہیں فوراً معلوم کر سکتی ہیں کہ اس کی اداکاری یکسر فریب کاری سے معرا تھی۔

تصنع کا یہ کمال ہے کہ وہ تصنع معلوم نہ ہو۔ لیکن نرگس کے تصنع کی بنیادیں چونکہ تجربے پر استوار نہیں تھیں اس لئے اس میں یہ خوبی نہیں تھی۔ یہ صرف اس کا خلوص تھا۔ وہ بے پناہ خلوص جو اسے اپنے شوق سے تھا کہ وہ جذبات و احساسات کے نہایت ہی خام اظہار کے باوجود اپنا کام نبھا جاتی تھی۔ عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ وہ بہت پختگی اختیار کر چکی ہے اب اس کو عشق کی دوڑ ہو اور اسکول کی ایک میل کی دوڑ میں تھک کر ہانپنے کا فرق معلوم ہے اب تو اس کو سانس کے ہلکے سے ہلکے زیر و بم کا نفسیاتی پس منظر بھی معلوم ہے۔

یہ بہت اچھا ہوا کہ اس نے اداکاری کی منازل آہستہ آہستہ طئے کیں اگر وہ ایک ہی جست میں آخری منزل پر پہنچ جاتی تو اہلِ ذوق فلم بینوں کے صناعانہ جذبات کو بہت ہی گنوار قسم کا صدمہ پہنچتا اور اگر لڑکپن کے زمانے میں پردے سے الگ زندگی میں بھی وہ ایکٹرس بنی رہتی اور اپنی عمر کو عیار بزازوں کے گز سے ماپ دکھاتی تو میں اس صدمے کی تاب نہ لا کر یقیناً مر گیا ہوتا۔

نرگس ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی کہ اس کو لامحالہ ایکٹریس بننا ہی تھا......

......جدّن بائی کے گلے میں بڑھاپے کا گھنگرو بول رہا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے مگر اس کی ساری توجہ بے بی نرگس پر مذکور تھی۔ اس کی شکل و صورت معمولی تھی۔ گلے میں سُر کی پیدائش کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ مگر جدّن بائی جانتی تھی کہ سُر مستعار لیا جا سکتا ہے اور معمولی شکل و صورت میں اندرونی روشنی سے جسے جوہر کہتے ہیں۔ دلکشی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جان مار کر اس کی پرورش کی اور کانچ کے نہایت ہی نازک اور چھوٹے چھوٹے ذرّے جوڑ جوڑ کر اپنا درخشاں و تاباں خواب پورا کیا۔

جدّن بائی تھی۔ اس کی ماں تھی...... موہن بابو تھا، بے بی نرگس تھی۔ اس کے دو بھائی تھے۔ اتنا بڑا کنبہ تھا جس کا بوجھ صرف جدّن بائی کے کندھوں پر تھا۔ موہن بابو ایک بڑے رئیس زادہ تھے۔ جدّن بائی کے گلے کی تانوں اور مرکیوں میں ایسے الجھے کہ دین دنیا کا ہوش نہ رہا۔ خوبصورت تھے۔ صاحب ثروت تھے۔ تعلیم یافتہ تھے۔ صحت مند تھے مگر یہ سب دولتیں جدّن بائی کے در پر مفلس اور گداگر بن گئیں۔ جدّن بائی کے نام کا اس زمانے میں ڈنکا بجتا تھا۔ بڑے بڑے نواب اور راجے اس کے مجروں پر سونے اور چاندی کی بارش برساتے تھے مگر جب بارشیں تھم جاتیں اور آسمان نکھر جاتا تو جدّن بائی اپنے موہن کو اٹھا کر سینے سے لگالیتی کہ اسی موہن کے پاس اس کا من تھا۔

موہن بابو تادمِ آخر جدّن بائی کے ساتھ تھے۔ وہ ان کی بہت عزّت کرتی تھی۔ اس لئے کہ وہ راجوں اور نوابوں کی دولت میں غریبوں کے خون کی بو سونگھ چکی تھی۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کے عشق کا دھارا ایک ہی سمت نہیں بہتا۔ وہ موہن بابو سے محبت کرتی تھی کہ وہ اس کے بچّوں کا باپ تھا۔

خیالات کی رو میں جانے کدھر بہہ گیا۔ نرگس کو بہر حال ایکٹریس بننا تھا۔ چنانچہ وہ بن گئی اس کے بامِ عروج تک پہنچنے کا راز جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا خلوص ہے جو قدم بہ قدم، منزل بہ منزل اس کے ساتھ رہا ہے۔

ایک بات جو ان ملاقاتوں میں خاص طور پر میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ نرگس کو اس بات کا احساس تھا کہ جن لڑکیوں سے وہ ملتی ہے وہ جدا قسم کے آب و گل سے بنی ہیں۔ وہ ان کے پاس آتی تھی۔ گھنٹوں ان سے معصوم معصوم باتیں کرتی تھی۔ مگر وہ ان کو اپنے گھر مدعو کرنے میں ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس کرتی تھی۔ اس کو شاید یہ ڈر تھا کہ وہ اس کی دعوت ٹھکرا دیں گی۔ یہ کہیں گی کہ وہ اس کے یہاں کیسے جاسکتی ہیں۔ میں ایک دن گھر پر موجود تھا کہ اس نے سرسری طور پر اپنی سہیلیوں سے کہا۔ ''اب کبھی تم بھی ہمارے گھر آؤ۔''

یہ سن کر تینوں بہنوں نے بڑے ہی بینڈے پن سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ شاید یہ سوچ رہی تھی کہ ہم نرگس کی یہ دعوت کیسے قبول کر سکتی ہیں لیکن میری بیوی چونکہ میرے خیالات سے واقف تھی اس لئے ایک روز نرگس کے پیہم اصرار پر اس کی دعوت قبول کر لی گئی اور مجھے بتائے بغیر تینوں اس کے گھر چلی گئیں۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نرگس نے اپنی کار بھیج دی تھی۔ جب وہ بمبئی کے خوبصورت ترین مقام میرین ڈرائیو کے اس فلیٹ میں پہنچیں۔ جہاں نرگس رہتی تھی تو انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی آمد پر خاص انتظامات کیے گئے تھے۔ موہن بابو اور اس کے دونو جوان لڑکوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ وہ گھر میں داخل نہ ہوں۔ کیونکہ نرگس کی سہیلیاں آرہی ہیں۔ مرد نوکروں کو بھی اس کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی جہاں ان معزز مہمانوں کو بٹھا دیا گیا تھا۔ خود جدّن بائی تھوڑی دیر کے لئے رسمی طور پر اس کے پاس بیٹھی اور اندر چلی گئی۔ وہ ان کی معصوم گفتگوؤں میں حارج نہیں ہونا چاہتی تھی۔

تینوں بہنوں کا بیان ہے کہ نرگس ان کی آمد پر پھولی نہ سماتی تھی۔ وہ اس قدر خوش تھی کہ بار بار گھبرا سی جاتی تھی۔ اپنی سہیلیوں کی خاطر داری میں اس نے بڑے جوش کا اظہار کیا۔ پاس ہی پیرژین ڈیری تھی۔ اس کے ''ملک شیک'' مشہور تھے۔ گاڑی میں جا کر نرگس خود یہ مشروب جگ میں تیار کرا کے لائی کیونکہ وہ یہ کام نوکر کے سپرد کرنا نہیں چاہتی تھی اس لئے کہ پھر اس کے اندر آنے کا احتمال تھا۔

خاطر داری کے اس جوش و خروش میں نرگس نے اپنے نئے سیٹ کا گلاس توڑ دیا۔ مہمانوں نے افسوس کا اظہار کیا تو نرگس نے کہا ''کوئی بات نہیں، بی بی غصے ہوں گی مگر ڈیڈی ان کو چپ کرا دیں گے اور معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔''

موہن بابو کو اس سے اور اس کو موہن بابو سے بہت محبت تھی۔ ''ملک شیک'' پلانے کے بعد نرگس نے مہمانوں کو اپنا البم دکھایا جس میں اس کے مختلف فلموں کے اسٹل تھے۔ اس نرگس میں جوان کو یہ فوٹو دکھا رہی تھی اور اس نرگس میں جوان تصویروں میں موجود تھی کتنا فرق تھا۔ تینوں بہنیں کبھی اس کی طرف دیکھتیں اور کبھی البم کے اوراق کی طرف اور اپنی حیرت کا یوں اظہار کرتیں۔

''نرگس، تم یہ نرگس کیسے بن جاتی ہو۔''

نرگس جواب میں صرف مسکرا دیتی۔

میری بیوی نے مجھے بتایا کہ گھر میں نرگس کی ہر حالت، ہر ادا میں الھڑپن تھا۔ اس میں وہ شوخی، وہ طراری، وہ تیکھا پن نہیں تھا جو اس کے سراپا میں پردے پر نظر آتا ہے۔ وہ بڑی ہی گھریلو قسم کی لڑکی تھی۔ میں نے خود ہی محسوس کیا تھا۔ لیکن جانے کیوں اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب و غریب قسم کی اداسی تیرتی نظر آتی تھی۔ جیسے کوئی لاوارث لاش، تالاب کے ٹھہرے پانی پر ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ارتعاش پذیر ہے۔

یہ قطعی طور پر طے تھا کہ شہرت کی جس منزل پر نرگس کو پہنچنا تھا، وہ کچھ زیادہ دور نہیں۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تقدیر اپنا فیصلہ اس کے حق میں کر کے تمام متعلقہ کاغذات اس کے حوالے کر چکی تھی لیکن پھر وہ کیوں مغموم تھی کیا غیر شعوری طور پر وہ یہ محسوس تو نہیں کر رہی تھی کہ عشق و محبت کا یہ مصنوعی کھیل کھیلتے کھیلتے ایک دن وہ کسی ایسے لق و دق صحرا میں نکل جائے گی۔ جہاں سراب ہی سراب ہوں گے، پیاس سے اس کا حلق سوکھ رہا ہوگا اور آسمان پر چھوٹی چھوٹی بدلیوں کے تھنوں میں صرف اس لئے دودھ نہیں اترے گا کہ وہ یہ خیال کریں گے کہ نرگس کی پیاس محض بناوٹ، ہے زمین کی کوکھ میں پانی کی بوندیں اور زیادہ اندر کو سمٹ جائیں گی اس خیال سے کہ اس کی پیاس صرف ایک دکھاوا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود نرگس بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ میری پیاس کہیں جھوٹی پیاس تو نہیں ہے۔

اتنے برس گزر جانے پر میں اب اسے پردے پر دیکھتا ہوں تو مجھے اس کی اداسی کچھ مضمحل سی نظر آتی ہے۔ پہلے اس میں ایک مستعد جستجو تھی لیکن اب یہ جستجو بھی اداس اور مضمحل ہے۔ کیوں......؟ اس کا جواب خود نرگس ہی دے سکتی ہے۔

تینوں بہنیں چونکہ چوری چوری نرگس کے ہاں گئی تھیں۔ اس لئے وہ زیادہ دیر تک اس کے پاس نہ بیٹھ سکیں۔ چھوٹی دو کو یہ اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو مجھے اس کا علم ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے نرگس سے رخصت چاہی۔ اور واپس گھر آگئیں۔

نرگس کے متعلق وہ جب بھی بات کرتیں۔ گھوم پھر کر اس کی شادی کے مسئلے پر آجاتیں۔ چھوٹی دو کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ وہ کب اور کہاں شادی کرے گی۔ بڑی جس کی شادی ہوئے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہ سوچتی تھی کہ شادی کے بعد وہ ماں کیسے بنے گی۔

کچھ دیر تک میری بیوی نے نرگس سے اس خفیہ ملاقات کا حال چھپائے رکھا۔ آخر ایک روز بتا دیا۔ میں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔ تو اس نے سچ سمجھتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی اور کہا۔ واقعی ہم سے غلطی ہوئی۔ مگر خدا کے لئے اب آپ اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے گا۔

وہ چاہتی تھی کہ بات مجھ ہی تک رہے۔ ایک ایکٹریس کے گھر جانا تینوں بہنوں کے نزدیک بہت معیوب بات تھی۔ وہ اس "حرکت" کو چھپانا چاہتی تھیں چنانچہ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی ماں سے بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ بالکل تنگ خیال نہیں تھی۔

میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ ان کی وہ حرکت حرکتِ مذموم کیوں تھی۔ اگر وہ نرگس کے ہاں گئی تھیں تو اس میں برائی ہی کیا تھی۔ اداکاری معیوب کیوں سمجھی جاتی ہے۔ کیا ہمارے اپنے خاندان کے حلقے میں ایسے افراد نہیں ہوتے۔ جن کی ساری عمر فریب کاریوں اور ملمع کاریوں میں گزر جاتی ہے۔ نرگس نے تو اداکاری کو اپنا پیشہ بنایا تھا۔ اس نے اس کو راز بنا کر نہیں رکھا تھا۔ کتنا

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

بڑا فریب۔ جس میں یہ لوگ مبتلا رہتے ہیں۔

اس مضمون کے آغاز میں، میں نے ایک خط کا کچھ حصہ نقل کیا ہے۔ جو مجھے تسنیم سلیم نے لکھا تھا۔ اب اس کی طرف لوٹتا ہوں۔ دراصل ساری بات ہی اُسی سے چلی تھی۔

چونکہ مجھے نرگس کو اس کے گھر میں ملنے کا اشتیاق تھا۔ اس لئے میں مصروف ہونے کے باوجود مسٹر سلیم اور ان کے مصاحبوں کے ساتھ میرین ڈرائیو چل پڑا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میں فون کے ذریعے سے جدّن بائی کو اپنی آمد سے مطلع کر دیتا اور یہ بھی معلوم کر لیتا کہ نرگس فارغ بھی ہے یا نہیں۔ لیکن میں عام زندگی میں بھی چونکہ ایسے تکلفات کا قائل نہیں۔ اس لئے بغیر اطلاع دئے وہاں جا دھمکا۔ جدّن بائی باہر برآمدے میں بیٹھی سروتے سے چھالیا کاٹ رہی تھی مجھے دیکھا تو بلند آواز میں کہا۔ ''اوہ منٹو۔۔۔ آؤ۔۔۔ بھائی آؤ'' پھر نرگس کو آواز دی۔ ''بے بی..... تمہاری سہیلیاں آئی ہیں۔''

میں نے قریب جا کر اسے بتایا کہ میرے ساتھ سہیلیاں نہیں ''سہیلے'' ہیں۔ جب میں نے نواب چھتاری کے داماد کا ذکر کیا تو اس کا لہجہ بدل گیا۔ ''بلالو نہیں۔'' نرگس دوڑی دوڑی آئی تو اس سے کہا۔ ''تم اندر جاؤ بے بی۔ منٹو صاحب کے دوست آئے ہیں۔''

جدّن بائی نے میرے دوستوں کی کچھ اس انداز سے آؤ بھگت کی۔ جیسے وہ مکان دیکھنے اور پسند کرنے آئے تھے۔ وہ بے تکلفی جو میرے لئے مخصوص تھی غائب ہو گئی۔ بیٹھو تشریف رکھئے میں تبدیل ہو گیا۔ کیا پیو گے۔ کیا نوش فرمایئے گا بن گیا۔ تم آپ ہو گیا۔ اور میں خود کو چغد محسوس کرنے لگا۔

میں نے اپنی اور اپنے دوستوں کی آمد کا مدعا بیان کیا۔ تو جدّن بائی نے بڑے ہی پُر تصنع انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے میرے ساتھیوں سے کہا ''بے بی سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا بتاؤں کئی دنوں سے غریب کی طبیعت ناساز ہے۔ دن رات کی شوٹنگ نے اُسے بے حد مضمحل کر دیا ہے۔ بہت منع کرتی ہوں کہ ایک روز آرام کر لو۔ مگر شوق ایسا ہے کہ نہیں سُنتی۔ محبوب نے بھی کہا کہ بیٹا کوئی حرج نہیں۔ تم ریسٹ کر لو۔ میں شوٹنگ بند کر دیتا ہوں۔ مگر نہ مانی..... آج میں نے زبردستی روک لیا..... زکام سے نڈھال ہو رہی ہے۔ غریب!''

یہ سُن کر میرے دوستوں کو ظاہر ہے، بہت مایوسی ہوئی۔ نرگس کی ایک جھلک وہ ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے دیکھ چکے تھے۔ اور اس کو مفصّل طور پر دیکھنے کے لئے بیتاب تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ بے بی کی طبیعت ناساز ہے تو انہیں بڑی کوفت ہوئی۔ جدّن بائی اِدھر اُدھر کی باتیں کئے جاتی تھی۔ جن سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد جمائیاں لینے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

لگیں گے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ نرگس کی ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ محض رسمی ہے چنانچہ میں نے جدّن بائی سے کہا۔ ''بے بی کو زحمت تو ہوگی۔ مگر یہ اتنی دور سے آئے ہیں۔ ذرا بلا لیجیے۔''

اندر تین چار مرتبہ کہلوانے کے بعد نرگس آئی۔ سب نے اُٹھ کر تعظیماً اسے سلام کیا۔ میں بیٹھا رہا۔ نرگس کا داخلہ فلمی تھا۔ اس کا سلام کا جواب دینا فلمی تھا۔ اس کا بیٹھنا اٹھنا فلمی تھا۔ اس کی گفتگو فلمی تھی۔ جیسے سیٹ پر مکالمے بول رہی ہو۔

اور میرے ساتھیوں کے سوال جواب بڑے ہی نوآبانہ قسم کے اوٹ پٹانگ تھے۔

''آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔''

''جی ہاں آج ہی بمبئی پہنچے ہیں۔''

''کل پرسوں واپس چلے جائیں گے۔''

''آپ ماشاء اللہ اس وقت ہندوستان کی چوٹی کی اداکارہ ہیں۔''

''آپ کے ہر فلم کا ہم نے پہلا شو دیکھا ہے۔''

''یہ تصویر جو آپ نے دی ہے میں اسے اپنے البم میں لگاؤں گا۔''

اس دوران میں موہن بابو بھی آگئے۔ مگر وہ خاموش بیٹھے رہے۔ کبھی کبھی اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں گھما کر ہم سب کو دیکھ لیتے۔ اور پھر خدا جانے کس سوچ میں غرق ہو جاتے۔

سب سے زیادہ باتیں جدّن بائی نے کیں۔ ان میں اس نے ملاقاتیوں پر بڑے واضح الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ وہ ہندوستان کے ہر راجے اور ہر نواب کو اندر باہر سے اچھی طرح جانتی ہے۔ نرگس نے جتنی باتیں کیں بہت مختصر اور بناوٹ سے بھرپور تھیں۔ اس کی ہر حرکت اور ہر ادا سے یہ صاف مترشح تھا کہ وہ اپنے ملنے والوں کو یہ چیزیں پلیٹ میں ڈال کر بڑے تکلف سے پیش کر رہی ہے تاکہ وہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ وہ دلی طور پر ممنون و متشکر تھے۔ مگر اس امتنان و تشکر سے نرگس مطمئن نہیں تھی۔ وہ غالباً جواب میں تصنّع ہی کی طالب تھی۔

یہ ملاقات کچھ بہت ہی پھیکی رہی۔ میرے لئے بھی اور میرے ساتھیوں کے لئے بھی۔ میری موجودگی میں وہ کھل کر احمقانہ باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ اور میں ان کی موجودگی کے باعث بہت ہی تکلیف دہ گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ بہر حال نرگس کا دوسرا رنگ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔

سلیم اپنے دوستوں کے ساتھ دوسرے روز پھر نرگس کے ہاں گئے۔ اس کی اطلاع انہوں نے مجھے نہ دی۔ میرا خیال ہے اس ملاقات کا رنگ کچھ اور ہی ہوگا ___ نخشب کے ساتھ جس جنگ کا ذکر تسنیم نے اپنے خط میں کیا ہے۔ وہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت

0314.595.1212
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

وہاں موجود ہوں۔ کیونکہ جدن بائی کو شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی اور بمبئی کے اکثر شعرا اپنا کلام سنانے کے لئے وہاں جایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نخشب سے ان کی شاعری ہی پر اختلاف رائے کے باعث ہلکی سی چخ ہوگئی ہو۔

نرگس کا ایک اور دلچسپ رنگ میں نے اس وقت دیکھا جب اشوک میرے ساتھ تھا۔ جدن بائی کوئی اپنا ذاتی فلم تیار کرنے کا ارادہ کررہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اشوک اس کا ہیرو ہو۔ اشوک حسب عادت اکیلا جانے سے گھبراتا تھا۔ چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

دورانِ گفتگو میں کئی نکتے تھے۔ کاروباری نکتے، دوستانہ نکتے، خوشامدی نکتے، یہ نکتے بڑے ہی دلچسپ طریقے پر آپس میں گڈمڈ ہوتے رہے۔ جدن بائی کا انداز کبھی بزرگانہ ہوتا تھا۔ اور کبھی ہم عصرانہ۔ وہ کبھی پروڈیوسر بن جاتی اور کبھی نرگس کی ماں۔ ایسی ماں جو اپنی بیٹی کی قدر و قیمت بڑھانا چاہتی ہے۔ موہن بابو سے کبھی کبھی ہاں میں ہاں ملالی جاتی تھی۔

لاکھوں روپے کا ذکر آیا۔ وہ جو خرچ ہوچکے تھے۔ خرچ ہونے والے تھے۔ اور جو خرچ کئے جاچکے تھے۔ سب کا حساب انگلیوں پر گنوایا گیا۔ نرگس کا یہ انداز تھا کہ دیکھو اشوک، مانتی ہوں کہ تم منجھے ہوئے ایکٹر ہو۔ تمہاری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ مگر میں بھی کسی طرح کم نہیں۔ تم مان جاؤ گے کہ میں اداکاری کے میدان میں تمہارا مقابلہ کرسکتی ہوں۔ چنانچہ اس کی تمام کوششیں اس نقطے پر مرکوز تھیں۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی اس کے اندر عورت بھی بیدار ہوجاتی تھی۔ اس وقت وہ اشوک سے یہ کہتی معلوم ہوتی۔ ”تم پر ہزاروں لڑکیاں فریفتہ ہیں۔ لیکن میں اسے کیا سمجھتی ہوں، میرے بھی ہزاروں چاہنے والے موجود ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی مرد سے پوچھ لو“۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس چیلنج کی ہلکی سی جھلک بھی ہوتی۔ ”ہوسکتا ہے تم بھی مجھ پر مرنا شروع کردو“۔

اور جدن بائی کبھی مصالحت کی طرف جھک جاتی کہ نہیں، اشوک تم اور بے بی دونوں پر دنیا مرتی ہے۔ اسی لئے تو میں چاہتی ہوں کہ تمہیں ایک ساتھ پیش کروں تا کہ ایک قتلِ عام ہو اور ہم سب خوب فائدہ اٹھائیں۔ کبھی کبھی وہ ایک اور انداز اختیار کرلیتی اور مجھ سے مخاطب ہوتی۔

”منٹو، اشوک اتنا بڑا ایکٹر بن گیا ہے۔ لیکن خدا کی قسم بہت ہی نیک آدمی ہے۔ بڑا کم گو، بڑا ہی شرمیلا ___ خدا عمر دراز کرے۔ میں جو فلم شروع کررہی ہوں اس میں اشوک کے لئے خاص طور پر میں نے کیریکٹر لکھوایا ہے۔ تم سنو گے تو خوش ہوجاؤ گے“۔

میں یہ کیریکٹر سنے بغیر ہی خوش تھا۔ اس لئے کہ جدن بائی کا کیریکٹر خود بہت ہی دلچسپ تھا۔ اور نرگس جو رول ادا کررہی تھی۔ وہ تو اور بھی زیادہ دلچسپ تھا۔ میرا خیال ہے اگر پر

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

دے پردہ حالات پیش کیے جاتے اور اس سے کہا جاتا کہ اشوک سے مل کر تمہیں ایسی گفتگو کرنا ہے تو وہ کبھی اتنی کامیاب نہ ہوتی جتنی کہ وہ اس وقت تھی۔
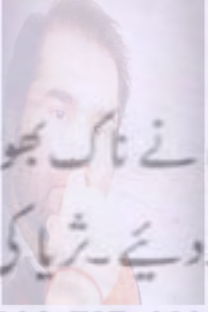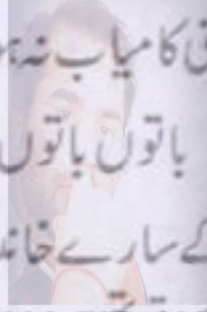
باتوں باتوں میں ثریا کا ذکر آیا۔ تو جدّن بائی نے ناک بھوں چڑھا کر اس میں اور سارے کے سارے خاندان میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ ثریا کی عیب جوئی وہ ایک فرض کے طور پر کرتی تھی۔ اس کا گلا خراب ہے ـــ بے سُری ہے، بے استادی ہے۔ دانت بڑے واہیات ہیں۔ ادھر ثریا کے ہاں جاؤ تو نرگس اور جدّن بائی پر عمل جراحی شروع ہو جاتا تھا۔ ثریا کی نانی جو حقیقت میں اس کی ماں تھی ٹھٹھے کے بخیے اُڑا اُڑا کر دونوں کو خوب کوستی تھی۔ نرگس کا ذکر آتا تو وہ برا سا منہ بنا کر میراثنوں کے انداز میں جگت کرتی، منہ دیکھو جیسے گلا سڑا پپیتا ہوتا ہے۔

موہن بابو کی خوبصورت اور بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مند چکی ہیں۔

جدّن اپنے دل کی بقایا حسرتیں اور تمنائیں لیے منوں مٹی کے نیچے دفن ہے اس کی بے بی، نرگس تصنع اور بناوٹ کے آخری زینے پر پہنچ کر معلوم نہیں اوراوپر دیکھ رہی ہے یا اس کی اداس آنکھیں نیچے سب سے پہلے زینے کو دیکھ رہی ہیں جب اس نے گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا۔ وہ خیرہ کن روشنی میں تاریک ترین سائے کی تلاش میں ہے۔ یا تاریک ترین سائے میں روشنی کی ننھی سی کرن ٹٹول رہی ہے؟ ـــ روشنی اور سائے کا تانا بانا ہی زندگی ہے اور اس تانے بانے کی عکاسی فلمی زندگی جس میں کبھی ایسا پیچ، ایسا خم بھی آ جاتا ہے۔ جب روشنی، روشنی رہتی ہے نہ سایہ، سایہ!

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
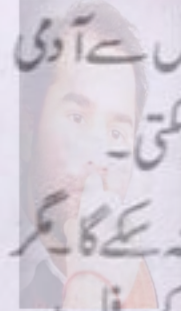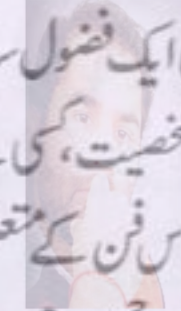
# نواب کاشمیری

یوں تو کہنے کو ایکٹر تھا۔ جس کی عزت اکثر لوگوں کی نظر میں کچھ نہیں ہوتی جس طرح مجھے بھی محض افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ یعنی ایک فضول سا آدمی۔ پر یہ فضول سا آدمی اس فضول سے آدمی کا جتنا احترام کرتا تھا۔ وہ کوئی بے فضول شخصیت، کسی بے فضول شخصیت کا اتنا احترام نہیں کر سکتی۔

وہ اپنے فن کا بادشاہ تھا۔ اس فن کے متعلق آپ کو یہاں کا کوئی وزیر کچھ بتا نہ سکے گا۔ مگر کسی چیتھڑے پہنے ہوئے مزدور سے پوچھیں جس نے چونی دے کر نواب کاشمیری کو کسی فلم میں دیکھا ہے۔ تو وہ اس کے گن گانے لگے گا۔ وہ آپ کو بتائے گا (اپنی خام زبان میں) کہ اس نے کیا کمال دکھائے۔ انگلستان کی یہ رسم ہے کہ جب ان کا کوئی بادشاہ مرتا ہے تو فوراً اعلان کیا جاتا ہے۔ ”بادشاہ مر گیا ہے ___ بادشاہ کی عمر دراز ہو۔“

نواب کاشمیری مر گیا ہے ___ لیکن میں کس نواب کاشمیری کی درازی عمر کے لئے دعاء مانگوں ___ مجھے تو اس کے مقابلے میں تمام کردار نگار پیارے معلوم ہوتے ہیں۔

نواب کاشمیری سے میری ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ خان کاشمیری جو ان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ ساتھ تھے۔ بمبئی کے ایک اسٹوڈیو میں ہم دیر تک بیٹھے اور باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد میں نے اس کو اپنی ایک فلمی کہانی سنائی لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے بلا تکلف کہہ دیا۔ ٹھیک ہے ___ لیکن مجھے پسند نہیں۔“

میں اس کی اس بے باک تنقید سے بہت متاثر ہوا۔ دوسرے روز میں نے اسے پھر ایک کہانی سُنائی۔ سُننے کے دوران میں اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ جب میں نے کہانی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری الحمد لائبریری

ختم کی تو اس نے رومال سے آنسو خشک کر کے مجھ سے کہا "یہ کہانی آپ کس فلم کمپنی کو دے رہے ہیں ___ بھڑوے کا رول مجھے بہت پسند ہے۔"

میں نے اس سے کہا۔ "یہ کہانی کوئی پروڈیوسر لینے کے لئے تیار نہیں۔ نواب نے کہا "تو لعنت بھیجوان پہ ___"

نواب مرحوم کو پہلی بار میں نے "یہودی کی لڑکی" میں دیکھا تھا۔ جس میں رتن بائی ہیروئن تھی۔ نواب عذرا یہودی کا پارٹ کررہے تھے۔ میں نے اس سے پہلے یہودیوں کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ لیکن جب بمبئی گیا تو یہودیوں کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ نواب نے ان کا صحیح، سو فیصد صحیح چربہ اُتارا ہے۔ جب نواب مرحوم سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ عذرا یہودی کا پارٹ ادا کرنے کے لئے اس نے کلکتہ میں یہ پارٹ ادا کرنے سے پہلے کئی یہودیوں کے ساتھ ملاقات کی۔ ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھا رہا اور جب اس نے محسوس کیا۔ وہ یہ رول ادا کرنے کے قابل ہوگیا ہے تو اس نے مسٹر بی۔ این سرکار مالک نیو تھیٹر سے حامی بھرلی۔

جن اصحاب نے "یہودی کی لڑکی" فلم دیکھا۔ ان کو نواب کاشمیری کبھی بھول نہیں سکتا۔ اس نے بوڑھا بننے کے لئے اور پوپلے مُنہ باتیں کرنے کے لئے اپنے سارے دانت نکال دیئے تھے تاکہ کردار نگاری پر کوئی حرف نہ آئے۔

نواب بہت بڑا کردار نگار تھا۔ وہ کسی ایسے فلم میں حصہ لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ جس میں کوئی ایسا رول نہ ہو، جس میں وہ سما سکتا ہو۔ چنانچہ وہ کسی فلم کمپنی سے معاہدہ کرنے سے پہلے پوری کہانی سنتا تھا۔ اس کے بعد گھر جا کر اس پر کئی دن غور کرتا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے چہرے پر مختلف جذبات پیدا کرتا تھا۔ جب اپنی طرف سے مطمئن ہو جاتا تو معاہدہ پر دستخط کر دیتا۔

اس کو آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں سے بہت محبت تھی، مگر تعجب ہے یہ شخص جو عرصے تک امپیریل تھیٹر یکل کمپنی کے ڈراموں میں اسٹیج پر آتا رہا اور دادِ تحسین وصول کرتا رہا۔ فلم میں آتے ہی ایک دم بدل گیا۔ اس کے لب و لہجے میں کوئی تھیٹر پن نہیں تھا۔ وہ اپنے مکالمے اسی طرح ادا کرتا تھا۔ جس طرح کہ لوگ عام گفتگو کرتے ہیں۔

جس تھیٹر یکل کمپنی کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اس میں نواب مرحوم نے "خوبصورت بلا" "نورِ وطن" اور "باغِ ایران" میں اپنی اداکاری کے ایسے جوہر دکھائے کہ اس کی دھاک بیٹھ گئی۔

نواب کاشمیری لکھنؤ کے بڑے امام باڑے کے سیّد مفتی اعظم کے اکلوتے لڑکے تھے۔ قدرت کی یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہاں امام باڑے کا مفتی اعظم اور کہاں منڈوہ۔ لیکن بچپن ہی سے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اس کو ناٹک سے لگاؤ تھا۔

لکھنؤ میں ایک ناٹک کمپنی آئی۔ جس کا مالک اگروال تھا۔ اس کمپنی کے کھیل نواب باقاعدہ دیکھتا رہا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اس سلسلے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کھیل دیکھ کر گھر آتا تو گھنٹوں اس ڈرامے کے یاد رہے ہوئے مکالمے اپنے انداز میں بولتا۔

اس ناٹک کمپنی میں چنانچہ ایک مرتبہ خود کو پیش کیا کہ وہ اس کا امتحان لیں۔ ڈائریکٹر نے جب نواب کی ایکٹنگ دیکھی اور مکالمہ کی ادائیگی سنی تو حیران و ششدر رہ گیا۔ اس نے فوراً اسے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ اس کی تنخواہ کیا مقرر ہوئی۔

اس کمپنی کے ساتھ نواب کلکتہ پہنچے۔ اور اپنے مزید جوہر دکھائے۔ کاؤس جی کھٹاؤ جی نے ان کی اداکاری دیکھی تو ان کو الفریڈ تھیئٹرز کمپنی میں لے لیا۔ ان دنوں وہ کیریکٹر ایکٹر مشہور ہو گئے۔

سیٹھ سکھ لال کرنانی جو الفریڈ تھیئٹر کے مالک تھے۔ اور پرلے درجے کے گدھے اور بیوقوف تھے۔ انھوں نے اپنے حواریوں سے سُنا کہ ایک ایکٹر جس کا نام نواب ہے، کمال کر رہا ہے۔ اس کا کوئی جواب ہی نہیں ہے تو اُنھوں نے اپنے ٹھیٹ اندازِ گفتگو میں کہا ''تو لے آؤ اس سانڈ کو۔''

وہ سانڈ آ گیا۔ اور وہ سانڈ نواب کاشمیری تھا۔ اس کو زیادہ تنخواہ دے کر اپنے یہاں ملازم رکھا۔ وہ دیر تک میرا مطلب ہے دو سال تک کرنانی صاحب کی کمپنی کے کھیلوں میں کام کرتے رہے۔

مجھے یاد نہیں کون سا سن تھا ــــــ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب بمبئی کی ''امپیریل فلم کمپنی'' نے ہندوستان کا پہلا بولتا فلم ''عالم آرا'' بنایا تھا۔

جب بولتی فلموں کا دور شروع ہوا تو مسٹر بی۔ این۔ سرکار جو بڑے تعلیم یافتہ اور سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ انھوں نے جب نیو تھیئٹرز کی بنیاد رکھی تو نواب کاشمیری کو جس سے وہ اکثر ملتے جلتے تھے۔ اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ تھیئٹر چھوڑ کر فلمی دُنیا میں آ جائے۔

بی۔ این۔ سرکار نواب کو اپنا ملازم نہیں محبوب سمجھتے تھے۔ ان کا ذوق بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ وہ آرٹ کے گرویدہ تھے۔ نواب مرحوم کا پہلا فلم ''یہودی کی لڑکی'' تھا۔ اس فلم کی ہیروئن ''رتن بائی'' تھی جس کے سر کے بال اس کے ٹخنوں تک پہنچتے تھے۔ اس فلم کے ڈائریکٹر ایک بنگالی مسٹر اٹھارتھی تھے۔ (جو اب دنیا تیاگ چکے ہیں) اس ٹیم میں حافظ جی اور میوزک ڈائریکٹر بالی تھے۔ اس تگڑھم میں کیا کچھ ہوتا تھا، میرا خیال ہے اس مضمون میں جائز نہیں۔

مسٹر اٹھارتھی نے جو بہت پڑھے لکھے اور قابل آدمی تھے۔ مجھ سے کہا کہ نواب صاحب ایسا ایکٹر پھر کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ وہ اپنے رول میں ایسے دھنس جاتا ہے جیسے ہاتھ میں دستانہ۔ وہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اپنے فن کا ماسٹر ہے۔
حافظ جی بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسا اچھا ایکٹر کبھی نہیں دیکھا۔
خیر! ان باتوں کو چھوڑیئے ___ میں اب نواب ایکٹر کی طرف آتا ہوں۔
ایک فلم میں جس کا عنوان غالباً "مایا" تھا۔ مرحوم کو جیب کترے کا پارٹ دیا گیا۔ اس نے جب ساری کہانی سُنی تو انکار کر دیا کہ میں یہ رول ادا نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ میں جیب کترا نہیں ہوں ___ میں نے آج تک کسی کی جیب نہیں کاٹی ___ لیکن وہ کلکتے کے ایک واہیات ہوٹل میں ہر روز جاتا رہا۔ وہاں اس کی کئی جیب کتروں اور اٹھائی گیروں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں ___ سُنا ہے کہ ان کے ساتھ اس نے شراب بھی پی ___ حالانکہ اسے اس کی عادت نہیں تھی ___ ایک ہفتہ کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ چنانچہ اس نے فلم کمپنی کے مالک سے کہہ دیا کہ وہ جیب کترے کا رول ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔
اس نے اس دوران میں کئی بدمعاشوں اور بدکاروں سے دوستی پیدا کر لی تھی۔ ان کے تمام خصائص اس نے سیکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس رول میں کامیاب رہا۔ مرحوم کی زندگی یوں بڑی پاک صاف تھی، ان کے ایک عزیز اے۔ ایم عماد ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ نواب بڑا طہارت پسند تھا۔ شیعہ تھا۔ کوئی کام بغیر استخارے کے نہیں کرتا تھا۔ سُنی اور شیعہ ہونے میں کیا فرق ہے ___ لیکن جب ان دو فرقوں میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں تو اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ان کے دماغوں میں مذہبی فتور ہے۔
میں نواب مرحوم کی بات کر رہا تھا ___ میں "مکتی" کا وہ "سین" کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب اس نے اپنی بدچلن بیوی کو بھُنے ہوئے چنے دیئے ___ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اتنا غم و اندوہ تھا جو چہرہ بھی ظاہر نہیں کر سکتا۔
"دیوداس" میں جب سہگل اس کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے تو وہ کچھ دیر اپنا چہرہ سہلاتا ہے جہاں ضرب آئی ہے۔ اور صرف اتنا کہتا ہے "تم نے دینو بھائی کو مارا" ___ اور ___ اب میں کیا کہوں ___ سارے حساس تماشائی لرز جاتے ہیں۔
فلم "ضدی" میں جب اس کے بھتیجے کی بیوی (کلدیپ کور) اس کے پاس سے گزرتی ہے۔ وہ غصّے کے عالم میں (پران ایکٹر سے) جا رہی ہوتی ہے ___ نواب کاشمیری مرحوم "انویلڈ چیئر" میں بیٹھا ہے ___ اس کو دیکھتا ہے ___ اور عجب فلسفیانہ انداز میں ہم کلامی کرتا ہے "پھر ___ چلی گئی"۔
میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن آپ کو فی الحال یہ بتا دینا چاہتا ہوں جو غالباً

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ابھی تک کسی پرچے میں شائع نہیں ہوا کہ اس کی پہلی بیوی اپنے وطن کی تھی۔ اس لڑکی سے اس کی کب شادی ہوئی اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔

اس بیوی سے اس کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جب اس طرف سے نا امیدی ہوئی تو نواب نے ادھر اُدھر کسی دوسرے رشتے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ آخر پرنس مہر قدر (بادشاہ اودھ کے بڑے لڑکے) کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لے لیا۔

جب یہ شادی ہوئی تو گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ نواب نے کوئی پرواہ نہ کی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس کی پہلی بیوی نے خودکشی کرلی۔ اب آپ اس خودکشی کا مختصر حال سن لیجئے۔ جب اس کی پہلی بیوی کو معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے دوسری شادی کرلی ہے تو اس نے نوکرانی سے توشک منگوائی۔ اس پر مٹی کا تیل چھڑکا ___ اس کے بعد اپنے تن بدن پر بھی یہی تیل ملا ___ اپنے کپڑوں کو بھی اس سے مانوس کیا ___ پھر آرام سے چارپائی پر لیٹ کر، دیا سلائی جلائی اور خود کو آگ لگا دی ___ وہ مرگئی ___ نواب کو معلوم ہی نہ تھا کہ اس کی بیوی کوئلہ بن گئی ہے۔ وہ اپنی دوسری بیوی کے ساتھ دوسرے گھر میں تھا۔

جب نواب کو معلوم ہوا کہ وہ مرگئی ہے تو اس نے اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ آخری وقت یہ وصیت کرگئی تھی کہ اپنی دس ہزار کی انشورنس پالیسی میں اپنے خاوند کے نام سپرد کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک سو ساٹھ تولہ سونا بھی ان کی تحویل میں دیتی ہوں۔

نواب یہ وصیت سن کر بہت متعجب ہوا۔

اسے دیر تک مٹی کے تیل کی بو آتی رہی۔

میں اب بھی سوچتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں مٹی کا تیل ہوں۔

کیروسین ہوں۔ نواب کاشمیری ہوں ___ کاشمیری میں بھی ہوں۔ لیکن اتنا ظالم نہیں جتنا کہ وہ تھا۔ اس لیے کہ اس نے صرف اولاد کی خاطر اپنی پہلی بیوی کو خودکشی پر مجبور کردیا ___

میں بھی کشمیری ہوں ___ مجھے کشمیریوں سے بہت محبت ہے لیکن میں ایسے کشمیریوں سے نفرت کرتا ہوں جو اپنی بیویوں سے بُرا سلوک کریں۔

میں نواب مرحوم کے فن کا قائل ہوں۔ میں اسے بہت بڑا فنکار مانتا ہوں ___ لیکن جب بھی میں نے اسے اسکرین پر دیکھا تو مجھے گھاسلیٹ (مٹی کے تیل) کی بو آئی۔

خدا کرے اُسے دوزخ نصیب ہو، کہ وہ وہاں زیادہ خوش رہے گا۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
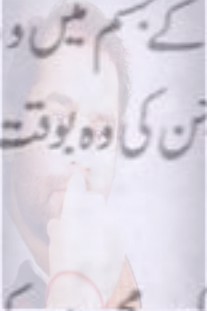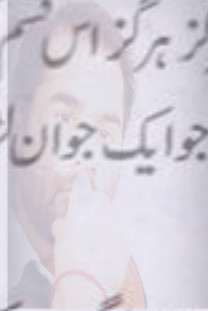
# نور جہاں

میں نے شاید پہلی مرتبہ نور جہاں کو فلم ''خاندان'' میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں وہ بے بی تھی۔ حالانکہ پردے پر وہ ہرگز ہرگز اس قسم کی چیز معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے جسم میں وہ تمام خطوط، وہ تمام قوسیں موجود تھی جو ایک جوان لڑکی کے جسم میں ہوسکتی ہیں۔ اور جن کی وہ بوقت ضرورت نمائش کرسکتی ہے۔

'نور جہاں' ان دنوں فلم بین لوگوں کے لئے ایک فتنہ تھی، قیامت تھی، لیکن مجھے اس کی شکل وصورت میں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی، ایک فقط اس کی آواز قیامت خیز تھی۔ سہگل کے بعد، میں نور جہاں کے گلے سے متاثر ہوا۔ اتنی صاف وشفاف آواز، مُرکیاں اتنی واضح، کھرج اتنا ہموار، پنچم اتنا نوکیلا! میں نے سوچا، اگر یہ لڑکی چاہے تو گھنٹوں ایک سُر پر کھڑی رہ سکتی ہے، اسی طرح جس طرح بازیگر تنے ہوئے رسّے پر بغیر کسی لغزش کے کھڑے رہتے ہیں۔

نور جہاں کی آواز میں اب وہ لوچ، وہ رس، وہ بچپنا اور وہ معصومیت نہیں رہی، جو کہ اس کے گلے کی امتیازی خصوصیت تھی۔ لیکن پھر بھی نور جہاں، نور جہاں ہے۔ گو، لتا منگیشکر کی آواز کا جادو آج کل ہر جگہ چل رہا ہے۔ اگر کبھی نور جہاں کی آواز فضا میں بلند ہو تو کان اس سے بے اعتنائی نہیں برت سکتے۔

نور جہاں کے متعلق بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ وہ راگ ودیا اتنا ہی جانتی ہے جتنا کہ کوئی استاد۔ وہ ٹھمری گاتی ہے، خیال گاتی ہے، دھرپد گاتی ہے۔ اور ایسا گاتی ہے کہ گانے کا حق ادا کرتی ہے۔ موسیقی کی تعلیم تو اس نے یقیناً حاصل کی تھی کہ وہ ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی، جہاں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کا ماحول ہی ایسا تھا۔ لیکن ایک چیز خداداد بھی ہوتی ہے۔ موسیقی کے علم سے کسی کا سینہ معمور ہو، مگر گلے میں رس نہ ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خالی خولی علم سننے والوں پر کیا اثر کر سکے گا۔

نور جہاں کے پاس علم بھی تھا اور وہ خداداد چیز بھی کہ جسے گلا کہتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں مل جائیں تو قیامت کا برپا ہونا لازمی ہے۔

میں یہاں آپ کے لئے ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ وہ لوگ جن پر خدا کی مہربانی ہوتی ہے۔ وہ اس سے ناجائز فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں۔ میرا مطلب ابھی آپ پر واضح ہو جائے گا۔

چاہیے تو یہ کہ جو چیز خدا نے عطا کی ہو، اس کی حفاظت کی جائے۔ تاکہ وہ مسخ نہ ہو، لیکن میں نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگ ان کی پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ غیر شعوری یا شعوری طور پوری کوشش کرتے ہیں کہ وہ تباہ و برباد ہو جائے۔

شراب گلے کے لئے سخت غیر مفید ہے۔ لیکن سہگل مرحوم ساری عمر بلانوشی کرتے رہے۔ کھٹی اور تیل کی چیزیں گلے کے لئے تباہ کن ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا! مگر نور جہاں پاؤ پاؤ بھر تیل کا اچار کھا جاتی ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ، جب اسے فلم کے لئے گانا ہوتا ہے تو وہ خاص اہتمام سے پاؤ بھر اچار کھائے گی۔ اس کے بعد برف کا پانی پیئے گی۔ پھر مائکروفون کے پاس جائے گی۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ ''اس طرح آواز نکھر جاتی ہے۔''

یوں آواز کیونکر نکھرتی ہے، گلا کیسے صاف ہوتا ہے اس کے متعلق نور جہاں ہی بہتر جانتی ہے۔ یوں میں نے اشوک کمار کو بھی برف استعمال کرتے دیکھا ہے کہ جب اسے گانے کی صدا بندی کرانا ہوتی ہے تو وہ سارا وقت برف کے ٹکڑے چباتا رہتا ہے۔

جب تک ریکارڈ زندہ ہیں، سہگل مرحوم کی آواز کبھی نہیں مر سکتی۔ اسی طرح نور جہاں کی آواز بھی ایک عرصے تک زندہ رہے گی۔ اور آنے والی نسلوں کے کانوں میں اپنا شہد ٹپکاتی رہے گی۔

نور جہاں کو میں نے صرف پردے پر دیکھا تھا۔ میں اس کی شکل وصورت اور اداکاری کا نہیں، اس کی آواز کا شیدائی تھا۔ وہ کم عمر تھی۔ اس لئے مجھے حیرت تھی کہ وہ کیونکر اتنے دلفریب طریقے سے گا سکتی ہے۔ ان دنوں دو آدمیوں کا دور دورہ تھا۔ مرحوم سہگل کا اور نور جہاں کا۔

یوں تو ان دنوں خورشید چھائی ہوئی تھی، شمشاد کے بھی چرچے تھے مگر نور جہاں کی آواز میں سب کی آواز دب گئی۔

ثریا بعد کی پیداوار ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ سہگل اور ثریا تو اکٹھے فلم میں پیش ہوئے لیکن نور جہاں اور وہ دونوں الگ الگ رہے۔ معلوم نہیں پروڈیوسروں کے دماغ میں ان دونوں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کو یکجا کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا یا کسی اور وجہ سے پروڈیوسر ان کو ایک فلم میں کاسٹ نہ کر سکے۔ بہر حال مجھے اس کا افسوس ہے اور ہمیشہ رہے گا اگر وہ دونوں آمنے سامنے ہوتے تو موسیقی کی دنیا میں نہایت خوشگوار انقلاب برپا ہوتا۔

نور جہاں سے میری پہلی ملاقات کیسے ہوئی، کب ہوئی اور کہاں ہوئی؟! یہ ایک لمبی داستان ہے ___ میں کئی برس تک بمبئی کی فلمی دُنیا میں گزار کر چند وجوہ کی بنا پر دل برداشتہ ہو کر دہلی چلا گیا۔ وہاں پر میں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ مگر یہاں سے بھی دل اُچاٹ ہو گیا۔ بمبئی سے ''مصور'' کے ایڈیٹر نذیر لدھیانوی کے متعدد خطوط آئے کہ تم واپس چلے آؤ ___! ''خاندان'' کے ڈائریکٹر شوکت حسین رضوی یہاں آئے ہوئے ہیں۔ اور میرے ہی پاس ٹھہرے ہیں۔ ان کی یہ خواہش ہے کہ تم ان کے لئے ایک کہانی لکھو۔

میں دہلی چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب کرپس مشن فیل ہو چکا تھا۔ میں غالباً ۷ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی پہنچا۔ شوکت سے میری پہلی ملاقات ۱۷۔ اڈلفی چیمبرز، کلیئر روڈ پر ہوئی۔ جو دفتر بھی تھا اور رہائشی مکان بھی۔

بڑا بانکا چھیلا نوجوان تھا۔ گورا رنگ، گالوں پر سرخی، مہین مہین جون گلبرٹ اسٹائل کی مونچھیں، گھنگریالے بال۔ لمبا قد۔ بہت خوش پوش، بے داغ پتلون شکنوں سے بے نیاز کوٹ، ٹائی کی گرہ نہایت عمدہ، چال میں لٹک۔ ہم پہلی ملاقات ہی میں خوب گھل مل گئے۔

میں نے اس کو بہت مخلص انسان پایا۔ میں دہلی سے اپنے ساتھ اپنے پسندیدہ سگریٹ یعنی کریون اے کا کافی اسٹاک لیکر آیا تھا۔ جنگ چھڑی ہوئی تھی، اس لئے بمبئی میں یہ سگریٹ قریب قریب نایاب تھے۔ شوکت نے میرے پاس بیس پچیس ڈبے اور پچاس کے قریب ڈبیاں دیکھیں تو بہت خوش ہوا۔

ہم دونوں کا قیام وہیں ۱۷۔ اڈلفی چیمبرز میں تھا۔ دو کمرے تھے۔ جہازی سائز کے۔ ایک میں دفتر تھا دوسرے میں رہائشی معاملہ! مگر رات کو ہم دفتر میں سوتے تھے۔ مرزا اشرف وغیرہ آجاتے تھے۔ وہ ہماری چارپائیاں بچھا دیتے تھے۔

جب تک شوکت وہاں رہا، بڑے ہنگامے رہے، کریون اے کے سگریٹ اور ناسک کی ہرن مارکہ وسکی جو بڑی واہیات تھی۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ شوکت ''خاندان'' کے بعد گو بہت بڑا ڈائریکٹر بن گیا تھا۔ مگر لاہور سے بمبئی پہنچنے اور وہاں کچھ دیر رہنے کے دوران میں وہ سب کچھ خرچ ہو چکا تھا جو اس نے لاہور میں فلم کی ہنگامی اور اخراجات سے پُر زندگی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

گزارنے کے بعد پس انداز کیا تھا ــــ اور میرے پاس تو صرف چند سو تھے جو کہ ہرن مارکہ وسکی میں غرق ہو گئے۔

بہر حال کسی نہ کسی حیلے گزر ہوتا رہا۔ وہ وقت بہت نازک تھا۔ میں سات اگست کو وہاں پہنچا اور نو اگست کی صبح کو جب میں نے کہیں ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی تو لائن ''ڈیڈ'' یعنی مردہ تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ کانگریسی لیڈروں کی گرفتاریاں چونکہ عمل میں آرہی تھیں۔ اس لئے احتیاطاً ٹیلی فون کا سارا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور ابوالکلام آزاد وغیرہ سب گرفتار کر لئے گئے۔ اور کسی نہ معلوم جگہ منتقل کر دیئے گئے۔ شہر کی فضا بالکل ایسی تھی جیسے بھری بندوق۔ باہر نکلنے کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ کئی دن تک ہم ہرن مارکہ شراب پی کر اپنا وقت کاٹتے رہے۔ اس دوران فلم انڈسٹری میں بھی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ حالات چونکہ غیر یقینی تھے اس لئے کسی نئی فلم کی تیاری کون کرتا۔ چنانچہ جن لوگوں سے شوکت کی بات چیت ہو رہی تھی، ایک غیر معینہ عرصے کے لئے کھٹائی میں پڑ گئی، اور ہم نذیر لدھیانوی کے ہاں پکے ہوئے بدمزہ کھانے کھا کر لمبی تان کر سوتے رہے۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھار زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے تھے۔ اور ہم کہانیوں کے متعلق سوچنا شروع کر دیتے تھے۔

اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ نور جہاں بھی بمبئی میں ہے۔ لیکن ٹھہریئے! میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے کیسے معلوم ہوا۔ میرا حافظہ جواب دے گیا تھا۔ اصل میں مجھے آٹھ اگست ہی کو معلوم ہو گیا تھا۔ جبکہ میری ملاقات ابھی شوکت سے نہیں ہوئی تھی۔

مجھے ماہم جا کر اپنے چند رشتہ داروں سے ملنا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک ریڈیو آرٹسٹ ثمینہ کا پتہ لینا تھا۔ (بعد میں کرشن چندر سے جس کے مراسم رہے) اس لڑکی کو میں نے آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے بمبئی بھیجا تھا۔ کیونکہ اس کو فلم میں کام کرنے کا شوق تھا۔ میں نے اسے پرتھوی راج اور برج موہن کے نام تعارفی خط لکھ کر دے دیئے تھے۔ اور اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا وہ فلمی دُنیا میں داخل ہو چکی ہے یا نہیں! لڑکی ذہین تھی، کردار اس کا بہت اچھا تھا۔ مکالمے بہت روانی کے ساتھ ادا کرتی تھی۔ شکل وصورت کی بھی خاصی تھی اس لئے مجھے یقین تھا کہ وہ کامیاب ہو گئی ہو گی۔

مجھے پتہ چلا کہ وہ شواجی پارک میں کہیں رہتی ہے۔ مگر یہ اتنی بڑی جگہ ہے کہ ثمینہ خاتون کا پتہ لگانا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ میں نظامی صاحب کے یہاں روانہ ہو گیا جو قریب ہی کیڈل روڈ پر رہتے تھے۔ مجھے ان کا ایڈریس معلوم تھا کہ وہ اکثر مجھے خط لکھتے رہتے تھے۔ یہ وہی نظامی ہیں جنہوں نے ممتاز شانتی کو تربیت دی جن کے پاس ولی صاحب برسوں پڑے رہے اور آخر میں ممتاز شانتی کو

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نظامی صاحب کے بتائے ہوئے اصولوں کے تحت ہی لے اڑے۔ یہ وہی نظامی صاحب ہیں جن کی بیوی گیتا نظامی کے نام سے فلمی دُنیا میں مشہور ہوئیں۔ اور جس نے نظامی صاحب کو لات مار کر پے در پے کئی شادیاں کیں۔ عدالتوں میں جس کے کئی مقدمے چلے اور جواب ایک نئی خوبصورت لڑکی کے ساتھ ڈانس پارٹی بنا کر شہر بہ شہر پاکستان کا پرچار کر رہے ہیں۔ نظامی صاحب سے میری ملاقاتیں صرف خطوط تک ہی محدود تھیں اور وہ بھی بڑے رسمی تھے۔ میں نے ان کو پہلی مرتبہ ان کے فلیٹ پر دیکھا۔ میں اگر اس ملاقات کو بیان کروں تو میرا خیال ہے، دس پندرہ صفحے اس کی نذر ہو جائیں گے۔ اس لئے میں اختصار سے کام لوں گا۔

نظامی صاحب جو کہ دھوتی اور بنیان پہنے تھے۔ مجھے بڑے تپاک سے ملے۔ انہوں نے میرے آنے کا مقصد پوچھا، جو میں نے عرض کر دیا آپ نے کہا ”ثمینہ خاتون ابھی آپ کے قدموں میں حاضر ہو جائے گی۔“

ان کا ایک مریل قسم کا ہندو منیجر تھا۔ اس کو آپ نے حکم دیا کہ منٹو صاحب کے لیے فوراً ثمینہ خاتون کو حاضر کرو۔ یہ حکم دینے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ اور کہا کہ وہ میرے لئے ہر قسم کی خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فوراً زبانی طور پر میرے لئے ایک عمدہ فلیٹ، بہترین فرنیچر اور ایک عدد کار کا بندوبست کر دیا۔

ظاہر ہے کہ میں بہت خوش ہوا۔ چنانچہ میں نے مناسب اور موزوں الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ جس کی ان کو بالکل ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے کہ وہ میرے افسانوں کے گرویدہ تھے۔ قارئین سے مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نظامی صاحب زبانی جمع خرچ کے بادشاہ ہیں۔

نظامی کچھ بھی ہو، لوگ اسے بھڑوا کہیں، کنجر کہیں۔ کچھ بھی ہو مجھے اس کا حدودِ اربعہ معلوم نہیں۔ لیکن میرا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ وہ ایک مہم جُو انسان ہے۔ وہ اپنے فن میں پوری پوری مہارت رکھتا ہے۔ میں نے اس روز یعنی پہلی ملاقات کے دن ہی دیکھا ممتاز شانتی پر اس کا اتنا رعب داب تھا کہ کسی باپ کا بھی نہیں ہو سکتا۔ اور ولی صاحب اس کے سامنے یوں جھکتے تھے کہ جیسے کوئی سائیس!۔

وہ اس گھر کا بادشاہ تھا جس کو سب خراج ادا کرتے تھے۔ اس کا کام صرف پروڈیوسروں کو کھانے اور شراب کی دعوتیں دینا، اور بلیک مارکیٹ سے پیٹرول خریدنا تھا۔ اور ممتاز شانتی کو کامیاب ہونے کے گر بتاتا تھا۔ کہ دیکھو! اگر تم یوں مسکراؤ گی تو فلاں پروڈیوسر سے تمہیں کنٹریکٹ لینے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ اگر تم فلاں سیٹھ سے یوں ہاتھ ملاؤ گی تو اس کا مطلب ہے کہ دس ہزار روپے اسی رات ہماری جیب میں ہوں گے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

میں وہاں بیٹھا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ میں کس دُنیا میں آ نکلا ہوں۔ وہاں ہر چیز مصنوعی تھی۔ ولی صاحب، نظامی صاحب کے حکم پر ان کا سلیپر اٹھا کے لائے اور جھک کر ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس میں بناوٹ تھی ___ خدا کی قسم! یکسر بناوٹ تھی۔

اور ممتاز شانتی دوسرے کمرے میں معمولی لباس میں ___ نہایت معمولی لباس میں، کھڑکی کے پردوں کے لئے کیلیں ٹھونک رہی تھی، اور نظامی کہہ رہا تھا۔ "منٹو صاحب! یہ بچی نہایت سادہ ہے۔ فلم لائن میں رہ کر بھی اسے آس پاس کی دنیا کا کچھ علم نہیں۔ مردوں کی طرف تو یہ نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی اور یہ سب میری تربیت کا نتیجہ ہے۔"

میرا دل کہتا تھا کہ یہ سب فراڈ ہے، یہ سب جعل ہے، لیکن مجھے نظامی صاحب کی ان کے منہ کے سامنے تعریف کرنا پڑی۔

لیکن بات نور جہاں کی ہو رہی تھی۔

ممتاز شانتی کو سیدھے راستے پر لگانے اور اس کو صالح تربیت دینے کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں تو نظامی صاحب نے نور جہاں کا ذکر کیا، اور مجھے بتایا کہ ان دنوں وہ بھی ان کے زیر سایہ ہے۔ اور ممتاز کی طرح تربیت حاصل کر رہی ہے۔ آپ نے کہا:

"منٹو صاحب! اگر یہ لڑکی زیادہ دیر لاہور میں رہتی تو اس کا بیڑہ غرق ہو جاتا، میں نے اسے یہاں اپنے پاس بلا لیا ہے اور سمجھایا ہے کہ دیکھو بیٹا! صرف فلم اسٹار بننے سے کچھ نہیں ہوگا کوئی سہارا بھی ہونا چاہئے۔ اوّل تو شروع میں عشق لڑانے کی کوئی ضرورت نہیں ادھر اُدھر دونوں طرف سے خوب کماؤ۔ جب بینک میں تمہارا کافی روپیہ جمع ہو جائے تو کسی ایسے شریف آدمی سے شادی کر لو جو ساری عمر تمہارا غلام بن کے رہے۔ آپ کا کیا خیال ہے منٹو صاحب! آپ تو بڑے دانا ہیں"۔

میری ساری دانائی تو نظامی صاحب کے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی نیچے فٹ پاتھ پر بھاگ گئی تھی۔ میں کیا جواب دیتا؟ بس کہہ دیا کہ آپ جو کر رہے ہیں وہ مصلحت کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے چنانچہ انہوں نے آواز دے کر نور جہاں کو بلایا مگر اسی وقت فون کی گھنٹی بجی اور چند لمحات کے بعد نور جہاں کی آواز کسی کمرے سے آئی۔ "ابھی آتی ہوں کمال صاحب کا فون آیا ہے۔"

نظامی صاحب زیرِ لب مسکرائے۔ یہ کمال صاحب، حیدر امروہوی تھے ___ "پکار کے شہرت یافتہ" نظامی صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "میں عرض کر رہا تھا کہ سہارا ہونا چاہئے تو نور جہاں کے لئے کمال امروہوی سے بہتر سہارا اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن میں اس سے صاف صاف کہہ چکا ہوں کہ شادی وادی کا معاملہ غلط ہے بس اپنا اُلّو سیدھا کئے جاؤ۔ کمال کما سکتا ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اس کی آدھی کمائی اگر نور جہاں کو مل جایا کرے تو کیا ہرج ہے ـــــ اصل میں منٹو صاحب ان ایکٹریسوں کو روپیہ کمانے کے گُر آنے چاہئیں۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "آپ گُرو جو موجود ہیں۔" نظامی خوش ہو گیا اور اس نے مجھے فوراً ایک فسٹ کلاس لیمن سکواش پلایا۔

بس یہاں ـــــ نظامی صاحب کے فلیٹ میں، جہاں نور جہاں کی سائینٹفک طریقہ سے تربیت ہو رہی تھی۔ اس کو وہ تمام چلتر خاص سکھائے جا رہے تھے۔ میری نور جہاں سے سرسری ملاقات ہوئی۔ اور میرا ردِ عمل یہ تھا کہ یہ لڑکی اپنی جوانی کی منزلیں بڑی سرعت سے طئے کر رہی ہے اور جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہنسی تجارتی رنگ اختیار کر رہی ہے اور جو موٹاپے کی طرف مائل ہے، اپنے اُستاد کی بہترین شاگرد ثابت ہو گی۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

نظامی کی خواہش دراصل یہ تھی کہ جس طرح ممتاز شانتی اس کے قبضے میں ہے اور اس کا رعب داب تسلیم کرتی ہے اسی طرح وہ ایک بوڑھی نائکہ کی طرح نور جہاں کو بھی اپنی نوچی بنا لے۔ ـــــ ممتاز شانتی کی ساری آمدنی نظامی کی تحویل میں رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ممتاز شانتی کے مقابلے میں نور جہاں کی قدر و قیمت بہت زیادہ تھی اور نظامی کا ہوشیار دماغ اچھی طرح جانتا تھا کہ نور جہاں کا مستقبل خیرہ کن ہے چنانچہ وہ اس کو اپنے جال میں پھنسانے کی تیاریاں مکمل کر رہا تھا کہ.....

سید شوکت حسین رضوی بمبئی پہنچ گیا۔ وہ شوکت، وہ رضوی جس سے نور جہاں کا عشق پنچولی اسٹوڈیو میں لڑ چکا تھا۔ مقدمہ بازی بھی ہو چکی تھی۔ اور بچنے کی خاطر نور جہاں نے عدالت میں یہ بیان دیا تھا کہ شوکت صاحب سے اس کا کوئی ناجائز تعلق نہیں، وہ تو انہیں اپنا بھائی سمجھتی ہے۔

نور جہاں کا یہ عدالتی بھائی اب بمبئی میں موجود تھا۔ وسیع و عریض بمبئی میں، جو فلمی دُنیا کی ہالی ووڈ تھی۔

میں نے شوکت سے بات کی کہ میں نور جہاں سے ملا ہوں۔ اس وقت مجھے ان کے رومانس کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ دونوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ میں نے صرف برسبیلِ تذکرہ اس کو بتایا تھا کہ نور جہاں سے میری ملاقات نظامی صاحب کے گھر میں ہوئی ہے۔ ہرن مارکہ شراب کا گلاس تپائی پر رکھ کر اس نے بڑی تندہی سے کہا "لعنت بھیجو اس پر"۔

میں نے ازراہِ مذاق کہا "میں ہزار بار اس کے لئے تیار ہوں مگر بھئی! وہ تمہارے 'خاندان' کی ہیروئن رہ چکی ہے"۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری بس بک گروپ 0314.595.1212

شوکت ذہین ہے فوراً سمجھ گیا کہ میں لفظ 'خاندان' پر کھیلا ہوں اور اسے ذومعنی استعمال کیا ہے، مسکرادیا۔ "منٹو تم بہت شریر ہو۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں سُننا چاہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بمبئی میں ہے۔ سالی! میرے پیچھے پیچھے آئی ہے۔ لیکن مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہیں"۔ میں نے جب اس کو بتایا کہ وہ کمال امروہوی کو ٹیلی فون کر رہی تھی، اور یہ کہ نظامی ان دونوں کو قریب لانا چاہتا ہے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بظاہر بے اعتنائی اور بے پرواہی ظاہر کر رہا ہے مگر اندرونی طور پر سخت بے چین ہو گیا ہے۔ اس لئے فوراً ہی ہرن مارکہ وسکی کا ایک اور ادھا مرزا مشرف سے منگوایا۔ اور ہم رات دیر تک پیتے رہے۔

اس دوران میں لمبے وقفوں کے بعد نور جہاں کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ میں نے شوکت کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ ابھی تک اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ بھائی والا معاملہ تو محض حکمتِ عملی تھا۔ اس کو وہ راتیں یاد آ رہی تھیں۔ جب نغموں کی ننھی منّی شہزادی اس کی آغوش میں ہوتی تھی۔ اور جب غالباً دونوں ایک دوسرے سے جُدا نہ ہونے کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

میں نے ایک دن شوکت سے پوچھ ہی لیا "دیکھو یار بتاؤ! سچ سچ بتاؤ____! کیا تمہیں نور جہاں سے محبت نہیں ہے؟"

شوکت نے زور سے اپنے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور کسی قدر کھسیانے پن سے کہا "ہے یار____ ہے____ مگر لعنت بھیجو اس پر____ میں اس کو آہستہ آہستہ بھول جاؤں گا"۔

لیکن قدرت زیرِ لب مسکرا رہی تھی، وہ جو فیصلہ کر چکی تھی اٹل تھا۔ شوکت کا کنٹریکٹ سیٹھ وی۔ ایم۔ ویاس سے ہوا۔ جو اس سے پہلے ایک فلم کے لئے نور جہاں سے معاہدہ کر چکا تھا۔

اب لگے ہاتھوں سیٹھ وی۔ ایم۔ ویاس کے متعلق بھی سن لیجئے۔ یہ ایک کائیاں آدمی ہے۔ شروع شروع میں طبلچی تھا۔ پھر کیمرہ قلی ہوا۔ آہستہ آہستہ کیمرہ مین بن گیا۔ ترقی کر کے اور زینے طے کئے تو ڈائریکشن کا موقع مل گیا۔ یہاں سے چھلانگ لگائی تو پروڈیوسر، اب وہ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ہے اور لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔

بہت ہی منحنی قسم کا انسان ہے۔ مجھ سے بھی کہیں پتلا۔ اتنا پتلا کہ اسے قمیض کے نیچے ایک موٹا اونی بنیان پہننا پڑتا ہے کہ اس کی پسلیاں لوگوں کو نظر نہ آئیں۔ مگر بلا کا پھرتیلا ہے اور بڑا محنتی۔ اس کے مقابلے میں پہلوان تھک جائیں گے مگر وہ ڈٹا رہے گا۔ جیسے مشقت اس پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتی۔

اس کی ایک خوبی اور ہے کہ وہ اپنے ذاتی سرمائے سے فلم نہیں بناتا۔ ایک فلم تیار کر کے اس کو ٹھکانے لگا کر وہ اپنے دوسرے فلم کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس وقت جتنے اونچے ستارہ ہوتے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہیں، وہ اپنی کاسٹ میں جمع کر لیتا ہے۔ کہانی کا اس وقت نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی 'فائی نینسر' اس کے دام میں آ جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے روپیہ لے کر وہ کالی کا نام لیکر کام شروع کر دیتا ہے۔ نور جہاں بمبئی آئی تو اس کو پتہ چل گیا۔ اس نے فوراً ہی نور جہاں سے کنٹریکٹ کر لیا۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ 'خاندان' اور دوسرے فلموں کے قابل رشک کامیابی کے بعد اس کا نام ہی کسی 'فائی نینسر' کو پھانسنے کے لئے کافی ہے۔ اور جب اس کو معلوم ہوا کہ 'خاندان' کا ڈائریکٹر بھی بمبئی میں موجود ہے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے فوراً اپنے کارندے دوڑائے۔ شوکت حسین رضوی سے کئی ملاقاتیں کیں۔ اور اس کے ساتھ بھی ایک پکچر کا معاہدہ کر لیا۔

فلم کیا ہوگا؟ کیسا ہوگا؟ کہانی کیا ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ مگر سیٹھ وی۔ ایم۔ ویاس نے جب اپنے 'فائی نینسر' کو نور جہاں اور شوکت سے اپنی ''سن رائز پکچرز'' کے کانٹریکٹ دکھائے تو مطلوبہ سرمایہ کسی دقت کے بغیر فوراً مل گیا۔

قدرت بھی عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ نہ شوکت کو معلوم تھا کہ نور جہاں 'سن رائز' میں آ چکی ہے اور نہ نور جہاں کو پتہ تھا کہ اس کا عدالتی بھائی شوکت بھی اس کا ہمراہی ہے۔ بڑی لمبی داستان ہے۔ میں اسے مختصر کرنا چاہتا ہوں۔

ایک دن یہ راز فاش ہو گیا۔ نظامی بہت گھبرایا کہ ایسا نہ ہو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ جو فلم شوکت کو ڈائریکٹ کرنا تھی، اس کی ہیروئن نور جہاں مقرر کی گئی تھی۔ دونوں کا 'پنر ملن' نظامی کے لئے بڑا اندوہناک ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ نور جہاں کے والی کی حیثیت سے اس نے سیٹھ ویاس سے کہا کہ وہ ہرگز ہرگز اس قسم کا سلسلہ برداشت نہیں کرے گا۔ مگر سیٹھ ویاس نظامی سے کچھ زیادہ ہی کائیاں نکلا کہ اس نے اپنی گجراتی حکمتِ عملی سے جو کہ پنجابی حکمتِ عملی کے معاملے بڑی گھری اور دھانسو قسم کی ہوتی ہے، نظامی کو ہموار کر دیا اور وہ راضی ہو گیا کہ نور جہاں شوکت کی پکچر میں کام کرے گی اور ضرور کرے گی، چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے۔ چنانچہ وہیں دفتر میں دونوں نے ایک دوسرے سے معانقہ کیا، ہاتھ ملائے اور ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔

اب دونوں اپنی اپنی جگہ پر خوش تھے۔ سیٹھ ویاس اس لئے کہ اس نے اپنا الو سیدھا کر لیا تھا۔ اور نظامی اس لئے کہ اس نے ایک فلمی سیٹھ کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ اور اس کو زیرِ احسان کر لیا تھا۔ سیٹھ ویاس کٹر قسم کا ویشنو تھا، ورنہ نظامی اسے اسی رات گھر بلا کر ممتاز شانتی کے ہاتھ کے پکے ہوئے مُرغ اور پلاؤ سے اپنی اور اس کی دوستی ضرور مستحکم کرتا۔ اور اگر سیٹھ بوتل کا رسیا ہوتا تو وہ اپنے مریل منیجر کے ذریعہ سے دو عدد اسکاچ بلیک مارکیٹ سے ضرور منگواتا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

بہر حال بات پکی ہوگئی۔ کیونکہ نظامی سینے پر ہاتھ رکھ کر سیٹھ ویاس سے کہہ چکا تھا کہ ''سیٹھ! اب جبکہ تم نے مجھے بھائی کہہ دیا ہے۔ میں تم کو بچن دیتا ہوں کہ مینہہ یا آندھی یا..... طوفان بھی ہو___ تمہاری شوٹنگ ہوگی تو بے بی نور جہاں وقت پر پہنچے گی۔''

اب ایک لطیفہ سُنئے بات تو خیر پکی ہوگئی تھی۔ میرا ابھی سیٹھ ویاس سے ایک کہانی کے لیے کانٹریکٹ ہوگیا تھا۔ چنانچہ میں اور شوکت اس کا موضوع تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ ''پیشگیاں'' مل چکی تھیں۔ اس لئے ناسک کی ہرن مارکہ وسکی کی فراوانی تھی۔ دور پر دور چلتے تھے۔ مرزا مشرف، چاولہ اور سہگل (یہ دونوں حضرات اب بڑے ڈائریکٹر بن چکے ہیں) ہماری اردلی میں ہوتے تھے، ذرا وسکی ختم ہوئی اور چاولہ بھاگے ناگپاڑے۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی تو مرزا مشرف حاضر تھے۔

لطیفہ میں سے لطیفہ نکلتا ہے۔ مرزا مشرف ہمارے ساتھ پیتے تھے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ تیسرے پیگ کے بعد رونا شروع کر دیتے۔ زار و قطار روتے تھے۔ شوکت کے ہاتھ پاؤں چومتے اور وہ شکوک جو شوکت کے دل میں ان کے بارے میں کبھی گذرے بھی نہیں تھے۔ ان کا ذکر کرتے اور کہتے تھے کہ وہ سب غلط ہیں، اس کے بعد وہ رو رو کر اپنی نئی بیاہتا بیوی کو یاد کرنے لگتے تھے۔ اور پھر گانا سُنانا شروع کر دیتے تھے۔ یہ سب فراڈ یعنی جال تھا۔ مگر فلمی دُنیا میں اس کے سوا اور ہوتا بھی کیا ہے؟

اب میں اصل لطیفے کی طرف آتا ہوں کہ وہ اس مضمون کا سب سے دلچسپ حصّہ ہے۔

سیٹھ ویاس اپنی فلم کی شوٹنگ کر چکا تھا۔ جو سین فلمائے گئے تھے ان میں نور جہاں نہیں تھی یعنی دوسرے الفاظ میں شوکت اور نور جہاں کی ابھی تک سہی معنوں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

ایک رات نوٹس بورڈ پر یہ اعلان چسپاں ہوگیا کہ نور جہاں سیٹ پر آرہی ہے۔ اس کو باضابطہ طور پر کمپنی کی طرف سے مطلع کر دیا گیا تھا۔

اسی رات کو میں گھومتا گھامتا شواجی پارک میں رفیق غزنوی کے پاس چلا گیا۔ اس مشہور نغمہ ساز اور موسیقار کے پاس جس کی مختلف ٹائیوں کی گرہوں میں مختلف قسم کے رومان بندھے تھے۔

رفیق غزنوی میرا دوست ہے۔ میرے اس کے بڑے ہی بے تکلف مراسم ہیں۔ میں اس کے فلیٹ پر پہنچا تو محفل جمی ہوئی تھی۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہوگیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صوفے پر تازہ ترین بیوی خورشیدہ عرف ''نورادھا'' بیٹھی ہے۔ اس کے ساتھ نور جہاں ہے۔ ایک کرسی پر شری نظامی جی براجمان ہیں۔ اور فرش پر ہمارے رفیق غزنوی صاحب یوں بیٹھے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہیں۔ جیسے کسی سومنات پر حملے کی تیاری کر رہے ہوں۔

رفیق غزنوی کے متعلق میں چند سطروں یا چند صفحات میں کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اس کا تشخص و کردار اتنا وسیع ہے کہ اس پر اگر کوئی ضخیم کتاب نہیں تو ایک طویل مضمون ضرور ہونا چاہئے۔ میں اپنے قارئین سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ قرض بھی میں ایک نہ ایک دن ضرور چکادوں گا۔

رفیق میرا دوست ہے۔ میں اگر کل کلاں موت کی آغوش میں چلا گیا اور وہ بھی کچھ دیر بعد میری طرح سو گیا تو حقِ رفاقت کون ادا کرے گا۔ کون اتنے بڑے موسیقار، اتنے بڑے دلچسپ کردار کی داستانِ حیات بیان کرے گا۔ انشاء اللہ یہ میں کروں گا مگر وقت آنے پر۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا...... رفیق...... سومناتھ پر اپنے تازہ ترین حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نظامی اس سے غافل تھا۔ یا نہیں۔ یا نور جہاں کو اس کے ارادوں کا علم تھا۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

مجھے نظامی سے اتنا معلوم ہوا کہ ممتاز (شانتی) ابھی آنے ہی والی ہے۔ میں حیران تھا کہ ادھر شوٹنگ ہونے والی ہے۔ ادھر اسکاچ کے دور چل رہے ہیں۔ نظامی کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ نور جہاں بھی ہولے ہولے خوش رنگ مشروب اپنے ہونٹوں سے چوس رہی تھی۔ خورشید عرف انورادھا تو خیر پختہ کار شرابیوں کی طرح گھونٹ بھرتی تھی۔ اور رفیق۔ غزنہ کا رفیق۔ اس غزنہ کا۔ جس نے محمود پیدا کیا تھا اور جو ایک ایاز کی محبت میں گرفتار تھا۔ گلاس زمین پر رکھے میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا۔

میں جب اندر داخل ہوا تو اس نے حسب عادت استقبال کے طور پر ایک بھاری بھرکم گالی اپنے منہ سے اگلی۔ لیکن پھر فوراً ہی شریفانہ لب ولہجہ اختیار کر کے مجھ سے کہا۔ ''جانتے ہو ان کو؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جانتا ہوں۔''

رفیق چار پیگ پینے کے بعد عام طور پر شرابی ہو جاتا ہے۔ لکنت بھرے لہجے میں اس نے مجھ سے کہا۔ ''نہیں! تم کچھ نہیں جانتے منٹو ____ یہ نور ہے۔ نور جہاں ہے۔ سرورِ جاں ہے۔ خدا کی قسم! ایسی آواز پائی ہے کہ بہشت میں خوش الحان حور بھی سنے تو اسے سیندور کھلانے کے لئے زمین پر اتر آئے۔''

میں جانتا تھا کہ وہ تعریف کے یہ پل کیوں باندھ رہا تھا۔

دراصل ان پلوں کے ذریعے ہی وہ نور جہاں کے جسم تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ نور جہاں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ رفیق کی یہ باتیں سنتی تھی اور اسے خوش کرنے کے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

لئے ایک مصنوعی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر پیدا کر لیتی تھی۔

رفیق اوّل درجے کا کنجوس ہے۔ مگر اس دن اس نے غیر معمولی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ بوتل میں سے میرے لئے ایک بہت بڑا پیگ عنایت کیا اور اصرار کیا کہ میں اسے ایک ہی جرعے میں ختم کردوں تاکہ ایک دوسرا بھی رہے۔

سب پی رہے تھے۔ نورجہاں کا پیگ بہت ہلکا تھا جسے وہ آہستہ آہستہ ہونٹوں کے ذریعے چوس رہی تھی۔ جیسے مکھیاں پھولوں سے آہستہ اور ہولے ہولے رس چوستی ہیں۔

رفیق، نورجہاں کی تعریف وتوصیف کے مزید پل باندھ رہا تھا کیونکہ پہلے پل سب ٹوٹ گئے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

خورشید عرف انوراد ھا نے اپنے دبلے پتلے مگر خوبصورت ہاتھ سے ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا اور کان کے ذریعے سے دوسری طرف کی آواز سنی اور سٹپٹا سی گئی۔ فوراً چونگے کا منھ بند کر کے نورجہاں سے مخاطب ہوئی۔ "سیٹھ ویاس ہیں۔"

نظامی نے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ کیا اور کہا۔ "بیٹا! کہہ دو کہ نورجہاں ان کے یہاں نہیں ہے۔"

خورشید عرف انوراد ھا نے سیٹھ ویاس سے مناسب وموزوں الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔

جب ٹیلی فون کا سلسلہ ختم ہوا تو رفیق نے خورشید سے کہا۔ "شیداں ___ ! جاؤ، اندر سے ہارمونیم لاؤ ___ سیٹھ ویاس جائے جہنم میں۔"

شیداں اندر گئی اور ہارمونیم کی پیٹی لے آئی۔ رفیق نے اس کو کھولا۔ اس کا ڈھکنا اٹھایا اور ہوا بھر کے اپنے مخصوص انداز میں ایک سُر چھیڑا اور خود ہی جھومنے لگا۔ "ہائے۔ سبحان اللہ! ___ واہ!"

دیر تک وہ باجے کے مختلف سروں کو چھیڑ کر "ہائے، سبحان اللہ، اور واہ واہ" کرتا رہا ___ میرا خیال ہے، رفیق پر علامہ اقبال کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے

دیتے ہیں سُرور اوّل، لاتے ہیں شراب آخر۔ گانے سے پہلے ہی رفیق سامعین پر وجد طاری کردینے کا عادی ہے۔ مگر اس دن وہ نہ گایا۔ اس لئے کہ اس کی ساری توجہ نورجہاں پر تھی۔ ایک سُر چھیڑ کر اس نے مخمور آنکھوں سے نورجہاں کی طرف دیکھا اور درخواست کی۔

"نور ___ بس ہو جائے کوئی چیز ___ ہائے کتنا پیارا اور مدھر سُر ہے ___ چلو گاؤ ___"

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

آپ پردے پر ایکٹر، ایکٹریسوں کے ڈرامے دیکھتے ہیں اور ان کی کردار نگاری سے متاثر ہوتے ہیں۔ میں آپ کو اس ڈرامے کی ایک جھلک دکھاتا ہوں۔ جو اس روز وہاں کھیلا گیا ____ جیتے جاگتے سو فیصدی حقیقی ڈرامے کی جھلک۔

نور جہاں نے ہارمونیم صوفے پر رکھ لیا۔ اس کے پاس خورشید عرف انور ادھا وسکی کا گلاس ہاتھ میں لئے بیٹھی ہے۔ رفیق غزنوی قالین پر آلتی پالتی مارے نور جہاں کی طرف اپنی عشق پیشہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور گانا سننے سے پہلے ہی جھوم رہا ہے۔ دائیں ہاتھ کرسی پر شری نظامی جی براجمان ہیں اور ان کے ساتھ ہی خاکسار ہے جو اپنا دوسرا پیگ پی رہا ہے۔

نور جہاں گانا شروع کرتی ہے۔ غالباً پیلو کی ٹھمری ہے۔

تورے نین کا جد بن کارے کہ ایک موٹر ہولے سے پورچ میں رکتی ہے۔ ایک صاحب اس کے اندر سے نکلتے ہیں اور سیدھے اندر چلے آتے ہیں ____ یہ سیٹھ ویاس ہیں۔

ایک لحظہ کے لئے سب بوکھلا جاتے ہیں۔ مگر نظامی فوراً ہی حالات پر قابو پالیتا ہے۔ سیٹھ ویاس کی آمد سے گویا بے خبر وہ چلا کر خورشید سے کہتا ہے۔ ''بیٹا! یہ کیا ظلم کر رہی ہو تم ____ اسے اتنی تکلیف ہے اور تم اسے گانے پر مجبور کر رہی ہو۔

دیکھو! ایک بول گانے کے بعد اس کا کیا حال ہو گیا ہے۔'' پھر وہ نور جہاں سے تشویش بھری آواز میں کہتا ہے۔ ''لیٹ جاؤ نور جہاں ____ لیٹ جاؤ۔'' اور وہ آگے بڑھ کر اسے لٹا دیتا ہے۔ نور جہاں زور زور سے کراہنا شروع کر دیتی ہے۔ رفیق بھی اٹھ کر انتہائی تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ نظامی خورشید سے مخاطب ہوتا ہے، کسی قدر تیز لہجے میں۔ ''شیداں!، اٹھ، بیٹھی کیا سوچ رہی ہے، جا جلدی سے گرم پانی کی بوتل لا۔ بڑے زور کا دورہ پڑا ہے۔''

شیداں اٹھ کر تیز قدمی سے اندر چلی جاتی ہے۔ نظامی کراہتی ہوئی نور جہاں کو پچکارتا ہے، پھر سیٹھ ویاس سے مخاطب ہوتا ہے۔ ''بھائی جان! ____ وہ، وہ تکلیف ہے۔ وہی جو عورتوں کو ہوا کرتی ہے۔''

سیٹھ ویاس خاموش رہتا ہے۔ میں بھی دم بخود ہوں۔

نظامی ایک بار پھر کراہتی ہوئی، دوہری ہوتی ہوئی نور جہاں کو پچکارتا ہے اور سیٹھ ویاس کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کل سے غریب درد کے مارے پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ مجھ سے کہتی تھی۔ چچا جان! مجھ سے شوٹنگ نہ ہو سکے گی۔ پر میں نے کہا۔ نہیں بیٹا! یہ بُرا شگون ہے۔ یہاں بمبئی میں یہ تمہاری پہلی پکچر ہے اور پھر شوٹنگ کا پہلا دن ____ یہ بھی چھوڑو۔ سیٹھ ویاس مجھے اپنا بھائی کہہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

چکا ہے ___ تم گھر جاؤ مگر ضرور جاؤ ___ چنانچہ ہم اسی لئے یہاں آ گئے تھے کہ رفیق سے تھوڑی سی برانڈی لیں اور اس کی کار لے کر اسٹوڈیو پہنچ جائیں۔ آپ کچھ فکر نہ کریں ___ آپ کا نقصان میرا نقصان ہے۔ نور جہاں ابھی پہنچتی ہے ___ آپ میرے بھائی ہیں نا۔"

سیٹھ ویاس، خاموش رہا ___ نظامی کے سوا اور سب خاموش تھے۔ رفیق غزنوی دانتوں سے اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں گلاس ہاتھ میں لئے سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟

کہانی میری تھی۔ میوزک رفیق غزنوی دے رہا تھا ___ اور سیٹھ ویاس، ہمارا آقا، عین موقعہ پر پہنچ گیا تھا۔ جبکہ ہم رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ رنگ رلیاں ہی تو تھیں اور کیا تھا۔ وسکی کا دور چل رہا تھا اور نور جہاں گا رہی تھی۔

تورے نین کا جدبن کارے

اچھا خاصا مجرا ہو رہا تھا۔

نظامی نے اپنے مخصوص انداز میں سیٹھ ویاس سے کچھ اور باتیں کیں اور اسے یقین دلایا کہ جب دونوں ہی ایک دوسرے کو بھائی کہہ چکے ہیں تو دلوں میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔

اتنے میں خورشید گرم پانی کی بوتل لے کر آ گئی۔ جو نور جہاں کے پیٹ پر رکھ دی گئی۔ اس سے اس کو کچھ سکون ہوا۔ اس پر نظامی نے سیٹھ ویاس سے جو ابوالہول بنا بیٹھا تھا، کہا۔

"آپ تشریف لے چلئے، میں اور رفیق نور جہاں کو ساتھ لے کر ابھی آتے ہیں۔"

پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "میرا خیال ہے، خورشید بھی ساتھ چلے۔ عورتیں عورتوں کے سب معاملات جانتی ہیں۔"

سیٹھ ویاس اٹھا اور اپنی ٹوپی ٹھیک کرتا ہوا چلا گیا ___ سب کی جان میں جان آئی۔ نور جہاں نے اپنے پیٹ سے گرم پانی کی بوتل الگ کی، جو ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی تھی اور نظامی سے کہا۔ "نظامی چچا! آپ نے تو کہا تھا۔ مت جانا۔" نظامی سنجیدہ ہو گیا ___ "بیٹا! وہ میں نے تمہارے بھلے کے لئے ہی کہا تھا۔ پہلے ہی دن آدمی شوٹنگ پر چلا جائے۔ اور پروڈیوسر کو پھیرے نہ کرائے تو وہ سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ اپنی ممتاز سے پوچھو، جب تک اسٹوڈیو سے گاڑی نہ آئے، مجال ہے جو وہ شوٹنگ میں جائے۔ اور پھر جب گاڑی بھی آتی ہے تو میں اسے کم از کم ایک گھنٹہ نیچے کھڑی رکھتا ہوں۔ رائے بہادر چونی لال میرے اتنے گہرے دوست ہیں مگر میں ان کی پرواہ نہیں کرتا ___ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ وہ خود اپنی گاڑی میں ممتاز کو لینے آئے۔ بہرحال

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

اب سب ٹھیک ہے۔ خود آیا ہے یہاں چل کر، اور پھر تم بیمار ہو اور بیماری کی حالت میں جا رہی ہو۔ سیٹھ ویاس کو اس کا خیال رہے گا۔"

نظامی نے کچھ دیر اور پروڈیوسر اور آرٹسٹ کے باہمی رشتے کی باریکیاں بیان کیں اور وہ تمام گُر بتائے جو آرٹسٹ کو استعمال کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد گفتگو آہستہ آہستہ شوکت حسین رضوی میں تحلیل ہو گئی۔ نظامی اپنی باتوں سے زبردستی نور جہاں کے دل و دماغ میں یہ خیال ٹھونسنا چاہتا تھا کہ اب اس کو اس شخص سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے دل میں اب اس کے لئے کوئی جگہ نہیں اور یہ کہ اسے وہی راستہ اختیار کرنا چاہئے جس پر ممتاز شانتی اس کی ہدایات کے مطابق اتنے عرصے سے چل رہی ہے اور اتنا نام اور روپیہ پیدا کر چکی ہے۔

اس گفتگو میں مجھے بھی حصہ لینا پڑا کہ شوکت سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور وہ اس بات کا اقرار بھی کر چکا تھا کہ اسے نور جہاں سے محبت ہے۔ اور مرزا مشرف سے جو اس کا سلسلہ جاری تھا، اس سے تو قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ دوسری عورتوں کی آغوش میں نور جہاں کی یاد کو دفن کرنا چاہتا ہے۔ اور ہرن مارکہ جیسی تھرڈ کلاس وسکی سے اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اصلاً شوکت گھڑی ساز تھا اور اپنے فن میں مہارتِ تامہ رکھتا تھا۔ اس لئے وہ ہر شے کی نوک پلک درست کرتا رہتا تھا۔ اس کی طبیعت کسی اکھڑے ہوئے پرزے، کسی ٹیڑھی کیل، کسی غلط وقت دینے والی گھڑی، کپڑے میں کسی شکن اور سلوٹ کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی جبلّت میں ایک نظم ہے۔ وہی نظم جو ایک اچھی گھڑی میں ہوتا ہے۔ مگر یہاں نور جہاں کے معاملے میں وہ خود کو بے بس سمجھتا ہے۔ وہ اس گھڑی کے کل پرزے کیسے درست کر سکتا تھا۔ جس کو دل کہتے تھے۔ اگر یہ کوئی ایسی چیز ہوتی جسے وہ اپنے سامنے رکھ کر محدّب شیشے میں دیکھ سکتا۔ اس کی بال کمانی اور اس کی گراریوں کا مطالعہ کر سکتا تو یقیناً وہ پیچ کش لے کر اسے سب کا سب کھول دیتا۔ جو گڑبڑ پیدا ہونے کا موجب ہو رہی تھیں۔ مگر یہ دل کا معاملہ تھا۔

اُدھر نور جہاں بھی جو اپنے گلے سے باریک سے باریک سُر نکال سکتی تھی، حیران تھی کہ اپنے دل سے شوکت کی یاد کیسے نکالے۔ وہ خیال بڑے بڑے استادوں کی طرح گا سکتی تھی۔ مگر ایک خیال اس کے دل و دماغ پر ہر وقت چھایا رہتا تھا۔ اور یہ خیال اس کے محبوب کا تھا۔ بانکے چھبیلے شوکت کا جس نے اس کی زندگی کو بہترین لذّت بخشی تھی۔ جس نے اس کے بدن میں وہ حرارت پیدا کی تھی جو موسیقی جیسی لطیف چیز بھی پیدا نہیں کر سکتی ـــــ وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

جو اس کے جسم میں ایک عرصہ تک ڈبکیاں لگا تا رہا تھا۔

شوکت کے متعلق گفتگو شروع ہوئی اور نور جہاں نے اوپرے دل سے اس کے متعلق اپنی نفرت کا اظہار کیا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اس سے کہا:-

"نور جہاں! یہ سب بکواس ہے۔ جو کچھ تم نے کہا ہے۔ خدا کی قسم وہ تمہارے دل سے نہیں نکلا اور جو کچھ میں اس خر زاد شوکت سے سنتا ہوں۔ خدا کی قسم! وہ بھی قطعاً جھوٹ ہوتا ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے پر مرتے ہو۔ مگر دونوں ہی خود فریب ہو ___ ابھی کل "مصور" کے دفتر میں تمہاری باتیں ہو رہی تھیں۔ اور ___ کل شام کیا ___ ہر شام جب میں اور شوکت پینا شروع کرتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی حیلے تمہاری بات چھیڑ دیتا ہے۔ پھر خود ہی کہتا ہے کہ اس کی بات نہ کرو۔ یہی حال تمہارا ہے۔ میں نے تمہاری یاد میں اس کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے ہیں اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ وہ اگر تم سے دور رہا، تو وہ اپنی جوانی اور اپنی صحت تباہ کر لے گا۔ وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ معلوم نہیں، تم نے اس پر کیا جادو پھونک رکھا ہے۔"

نور جہاں پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

میں نے پھر کہنا شروع کیا ___ "نور جہاں! خود فریبی سے کام نہ لو۔ میں مانتا ہوں کہ نظامی صاحب بڑے جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ لیکن عشق و محبت میں وہ گُر کبھی نہیں چلتے، جو زندگی کے دوسرے بازاروں میں چلتے ہیں۔ یہ کھوٹے سکے ہیں ___" میں ایک دم نظامی سے مخاطب ہوا!

"کیوں نظامی صاحب! کیا یہ جھوٹ ہے۔"

نظامی صاحب کچھ ایسے میری تقریر میں گم تھے کہ انھوں نے جب نفی میں اپنا سر ہلایا تو انھیں مطلق اس کا احساس نہیں تھا۔ پھر جب ایک دھچکے کے ساتھ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں بہت آگے نکل چکا تھا۔ میں نور جہاں سے جس کی آنکھوں میں اب آنسو تیر رہے تھے، کہہ رہا تھا۔ "تم دونوں بے وقوف ہو۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو مگر اسے چھپائے پھرتے ہو۔ کس سے؟ ___ کن سے! ___ یہ دنیا تو، معاف کرنا نور جہاں، کسی کو بھی محبت کرتے نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ لوگ محبت کرنا ہی چھوڑ دیں ___ ممتاز شانتی کی زندگی واقعی قابلِ رشک ہے۔ نظامی صاحب جیسے شفیق اور ہوشیار چچا کی سرپرستی میں وہ یقیناً خدا کے فضل و کرم سے اور بھی ترقی کرے گی۔ لیکن ___ (یہاں میں پھر نظامی سے مخاطب ہوا)۔" لیکن نظامی صاحب! آپ سے یہ مخفی نہیں ہوگا کہ ہر آدمی کے لئے ایک ہی چچا کام نہیں دے سکتا ___ آپ نے جو ہدایات ممتاز کے لئے سوچی تھیں، ظاہر ہے کہ وہ نور جہاں کے لئے کار آمد نہیں ہو سکتیں۔ دونوں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے ___ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟ ___"

میں اب نظامی کو اس مقام پر لے آیا تھا جہاں وہ میری کوئی بات جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ میں نے موقعہ غنیمت جانا اور بولتا چلا گیا۔ میں نے نور جہاں کے دل و دماغ پر جو کہ اس کے لئے غالباً پہلے ہی سے تیار تھا، یہ حقیقت اچھی طرح مُرتسم کردی کہ وہ اور شوکت ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں اور یہ جو خود فریبی سے کام لے رہے ہیں، بڑی مہلک چیز ہے۔

نظامی جب اٹھا تو وہ کوئی خوش آدمی نہیں تھا (اس جملے میں انگریزی پن ہے مگر یہ مجھے پسند ہے) مگر اپنی فطرت سے مجبور وہ مجھ سے روکھے پن کا اظہار نہ کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے نور جہاں سے یہ کہہ کر کہ وہ ٹھنڈی بوتل کی بجائے گرم بوتل لے کر خورشید کے ساتھ اسٹوڈیو چلی جائے اور وہاں وقتاً فوقتاً درد کا بہانہ کرتی رہے ___ تو اس نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھ سے گفتگو کی اور مجھے یقین دلایا کہ میرے فلیٹ اور فرنیچر وغیرہ کا مکمل بندوبست کر رکھا ہے۔ اس کو حیرت تھی کہ میں اتنے دنوں کہاں غائب رہا۔ فلیٹ کی چابی اس کے منیجر کے پاس تھی اور وہ میرا منتظر تھا۔ بلیک مارکیٹ سے پٹرول حاصل کرنے کے لئے بھی انھوں نے ویسا ہی مکمل انتظام کر چھوڑا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی دلی خواہش تھی کہ میں ان کی دعوت قبول کروں، جس میں وہ میری تواضع علاوہ مرغوں کے "جونی واکر کی بلیک لیبل" سے کریں گے۔

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا، لیکن وہ مصر تھا کہ میں ضرور اس کی دعوت قبول کروں۔ چنانچہ میں نے قبول کرلی۔ مگر مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس کے ہاں چلا بھی گیا تو مرغ اور جونی واکر بلیک لیبل کا ذکر تک بھی نہیں ہوگا۔

خیر ___ ! نظامی صاحب کو چھوڑیئے کہ وہ نظامی صاحب ہیں ___ معلوم نہیں کس رعایت سے۔ ممکن ہے حسن نظامی دہلوی کے مرید ہوں یا خود ساختہ نظامی ہوں۔ مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ میری اس شام کی تقریر نما گفتگو نے نظامی کے تمام پلان درہم برہم کردیئے۔

مجھے معلوم ہوا کہ نور جہاں اب کمال امروہوی سے کوئی دلچسپی نہیں لیتی۔ اس کے ٹیلی فون آتے ہیں۔ مگر وہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ اپنی سیکنڈ ہینڈ کار لے کر آتا ہے۔ مگر وہ کسی کمرے میں چھپ جاتی ہے اور نظامی کی ہدایات کے مطابق عمل نہیں کرتی۔

ان تمام باتوں کی رپورٹ میرے ذریعے سے شوکت تک پہنچ جاتی تھی۔ ہمیں اس بات کا کامل احساس تھا کہ وہ مردِ تسمہ پا نظامی کے شکنجے میں ہے اور اس کا وہاں سے نکلنا مشکل ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک کانفرنس کی۔ جس میں نذیر لدھیانوی ایڈیٹر "مصور" ویکلی، میں اور

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

شوکت شامل تھے۔ طے ہوا کہ وہیں یعنی کیڈل روڈ پر کوئی مکان حاصل کیا جائے۔

''نذیر لدھیانوی کی کوششوں سے کیڈل روڈ پر ساحلِ سمندر کے بالکل قریب گراؤنڈ فلور پر ایک نہایت عمدہ فلیٹ مل گیا، جس میں تین غسل خانے تھے۔ کئی کمرے تھے اور ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم تھا۔

نذیر نے جو کہ ۱۷۔اڈلفی چیمبرز جیسے واہیات فلیٹ میں رہتے رہتے اکتا گیا تھا_ شوکت سے کہا کہ وہ شرکت کرنے کے لئے تیار ہے۔ دونوں اکھٹے رہیں گے۔ چنانچہ فوراً فلیٹ حاصل کر لیا گیا۔ کرایہ غالباً ایک سو پچھتر روپے یا دو سو روپے ماہوار تھا۔ فرنیچر اور دوسرے ساز و سامان سے چند دن کے اندر اندر یہ جہازی فلیٹ سجا دیا گیا۔ شوکت کا بیڈروم سمندر کی طرف تھا۔

ادھر سے اگر پانچ سو قدم کا فاصلہ طے کیا جاتا تو نظامی کا فلیٹ آتا تھا۔ مطلب یہ کہ اب نور جہاں اور شوکت میں صرف اتنے ہی قدموں کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔ میرے ذمہ جو کام تفویض کیا گیا تھا، وہ میں خوش اسلوبی سے نبھا رہا تھا۔ کبھی کبھی نظامی کے ہاں جا نکلتا تھا۔ اور اگر نور جہاں موجود ہوتی تو اس کو بتا دیتا تھا کہ شوکت نے کتنی آہیں اس کے لئے بھری ہیں اور رات کو پینے کے بعد وہ کتنی مرتبہ اس کے فراق میں رویا ہے۔

نور جہاں کو میرے ذریعہ یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ شوکت اس کے پڑوس میں مقیم ہے اور یہ کہ صرف پانچ سو قدم ساحل کے ساتھ چل کر وہ اس کے پاس پہنچ سکتی ہے۔ یا وہ اس کے پاس___ سیر کی سیر اور دیدارِ یار بھی۔

میں نے کئی دفعہ محسوس کیا کہ یہ کام جو میں کر رہا ہوں کسی بوڑھی کٹنی کا ہے۔ مگر دوست کے لئے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا___؟

یہاں میں آپ پر یہ واضح کر دوں کہ میں دونوں کی شادی کے سخت خلاف تھا۔ ایکٹریس سے شادی کا سلسلہ ہی میرے نزدیک غلط بات ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، بس ٹھیک ہے۔ جب اکتا جائیں تو اپنا اپنا راستہ لیں___ مگر شوکت پٹہ لکھوانے کا قائل تھا کہ زمین ساری عمر اسی کی ملکیت رہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا۔ وہ مان گیا، کہ اگر نور جہاں سے اس کا ملاپ ہو گیا تو وہ شادی نہیں کرے گا۔

مجھے جو کرنا تھا، کر چکا تھا۔ میں اب اپنی کہانی کا جس کا عنوان ''نوکر'' تجویز ہوا تھا، منظر نامہ لکھنے میں بے طرح مصروف تھا۔ اس کے علاوہ کیڈل روڈ اور بائی کلہ میں کئی میل حائل تھے، اس لئے شوکت کے ہاں میرا آنا جانا کم ہو گیا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ان دنوں اچھی بیئر نایاب تھی۔ اتفاق سے امریکی بیئر کی چار فربہ اندام بوتلیں مجھے مل گئیں۔ میں یہ ساتھ لے کر کیڈل روڈ پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ مشروب ناشتے ہی سے شروع کیا جائے۔

جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ فلیٹ سنسان ہے۔ نذیر لدھیانوی نہا دھو کر اور ناشتہ کر کے دفتر روانہ ہو چکا ہے۔ اور شوکت سو رہا ہے۔

میں اس کی خوابگاہ کے پاس پہنچا اور دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پھر ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے شوکت کی خواب آلود آواز آئی ____ ”کون ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”منٹو۔“

شوکت نے کہا۔ ”ٹھہرو!“

میں ٹھہرا رہا۔ تین منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ کمرے کے اکلوتے پلنگ پر نور جہاں لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ ”انقلاب زندہ باد۔“

نور جہاں کی آنکھیں ایسے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی وہ لانڈری سے دھل کے آئی ہیں۔ میں نے شوکت کو دیکھا کہ وہ کسی قدر مضمحل تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تو چتوڑ گڑھ فتح ہو گیا۔“

شوکت مسکرا دیا۔ اس کی یہ مسکراہٹ اطمینان بھری تھی۔ کہنے لگا۔ ”آؤ بیٹھو!“

میں ان کے پلنگ کے پاس ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اور شوکت سے مخاطب ہوا ____ ”کیوں بھائی! یہ محترمہ کیسے تشریف لائیں؟“

شوکت نے فاتحانہ نظروں سے نور جہاں کو دیکھا جو پلنگ پر چادر سے خود کو اچھی طرح ڈھانپ رہی تھی۔ ”بس کچے دھاگے سے بندھی آئی ہیں۔“

معلوم نہیں وہ کچے دھاگے سے بندھی آئی تھی یا پکے دھاگے سے بندھی آئی تھی۔ پر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ دھاگہ جیسا بھی تھا اس کی تخلیق ہاتھوں سے نہیں، دلوں سے ہوئی تھی۔ بڑے عمدہ طریقے سے بٹا ہوا تھا، ورنہ وہ پانچ سو قدموں کا فاصلہ اتنی جلدی اور اتنی خوبی سے پاٹا نہیں جا سکتا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ شوکت کے بیڈ روم میں جس فرنیچر کی کمی تھی، وہ پوری ہو گئی تھی۔ اور اب وہ مکمل طور پر سج گیا تھا۔ لیکن ادھر نظامی کے فلیٹ میں ایک بتی بجھ گئی تھی۔ وہ بتی جو ایک پورے بجلی گھر میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

نظامی نے اسے بہت سمجھایا بجھایا، بھائیوں نے اسے بہت دھمکیاں دیں، پر جب

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

عشق کا بھوت سر پر سوار ہو تو کانوں کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ دھمکیاں اور بھبھکیاں، پند و نصائح قطعاً اثر انداز نہیں ہوتے۔

شوکت نے مجھ سے کہا۔ ''منٹو! میرا خیال ہے، میں سالی سے شادی کر ڈالوں۔''

میں نے پھر اس سے کہا: ''یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اس کے مالک ہو، لیکن میری ایماندارانہ رائے یہی ہے کہ تمہارا یہ اقدام درست نہیں ہوگا۔ کیا تم نے اس بارے میں اپنے گھر والوں سے مشورہ کیا ہے؟''

اس سوال کا جواب شوکت گول کر گیا۔ بہر حال اب مجھے یقین تھا کہ وہ اب سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے گا اور عجلت سے کام نہ لے گا۔

بمبئی میں ایک بزرگ حکیم ابو محمد طاہر اشک عظیم آبادی کے نام سے تھے۔ یہ ایک عجیب شئے تھے۔ عمر آپ کی پچھتر برس کے قریب تھی، مگر دل جوان تھا۔ آنکھوں کی بینائی بالکل درست تھی۔ دانت سلامت تھے۔ ہر نئے فلم کا پہلا شو دیکھتے تھے۔ پانچ زبانیں بولتے تھے۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور پنجابی۔ بڑے معرکے کے آدمی تھے۔ طبابت سے شغف تھا اور شعر و شاعری سے بھی۔ شوکت سے میں نے ان کی ملاقات کرائی تو وہ ان کے گرویدہ ہو گئے۔ اور ان کو چچا جان کہنے لگے۔

حکیم صاحب نے ان سے دور دراز کا کوئی رشتہ بھی پیدا کر لیا تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق وہ شوکت کے خاندان سے بہت پرانے مراسم رکھتے تھے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں، شوکت کے ہاں میرا آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ بائی کلہ اور کیڈل روڈ میں فاصلہ کافی تھا۔ اس کے علاوہ میں کہانی کی منظر نویسی میں مشغول تھا۔ چند دن گزرے تو حکیم صاحب تشریف لائے۔ مجھے ان سے بڑی عقیدت تھی کہ میری زبان درست کرنے میں آپ نے غیر شعوری طور پر میری بہت مدد کی تھی۔ ان کو بھی مجھ سے محبت تھی کہ میں ان کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ باتوں باتوں میں آپ نے مجھے بتایا کہ شوکت بیٹے کا نکاح نور جہاں سے ہو گیا ہے۔ میں بہت حیران تھا کہ مجھے اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

جب میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو حکیم صاحب نے سارا معاملہ گول کرنے کی کوشش کی۔ جب ناکام رہے تو انھوں نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھو سعادت! یہ سب کچھ خفیہ طور پر ہوا ہے تاکہ لوگوں میں چرچا نہ ہو۔ میں نے تم سے ذکر کر دیا کہ تم بھی شوکت کی طرح میرے بیٹے ہو، اس لئے یہ راز راز ہی رہے۔''

یہ راز کب تک راز رہ سکتا تھا؟ میں پچھتر برس کے بڈھے سے کیا بحث کرتا! غصہ تو

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مجھے صرف اس بات کا تھا کہ شوکت نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی؟ اگر اسے نکاح کرنا ہی تھا تو میری شمولیت اس میں کیوں ضروری نہ سمجھی؟ اور مجھے کیوں تاش کی گڈی میں سے جوکر سمجھ کر الگ کر دیا گیا ___ میرے دل میں تکدّر تھا، لیکن شوکت سے میں نے اس کا ذکر نہ کیا کہ اس سے میرے اور اس کے تعلقات یقیناً کشیدہ ہو جاتے۔

دن گزرتے گئے۔

نظامی تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ سید کمال حیدر امروہوی نے ہزار ہا مرتبہ ٹیلی فون کیا۔ سینکڑوں مرتبہ اپنی سیکنڈ ہینڈ کار میں نظامی کے فلیٹ کے چکّر کاٹے، آخر وہ بھی ناامید ہو کر دیگر مشاغل میں مصروف ہو گیا۔

شوکت کا بیڈ روم آباد تھا۔ وہاں ہنسی کے چھینٹے اڑتے تھے۔ نور جہاں کے گلے سے نور برستا تھا۔ رفیق غزنوی سے جس قسم کی دھنیں بنوائی ہوتی تھیں، ان کی ریہرسل ہوتی تھی۔ دو جوانیاں کیڈل روڈ کے اس فلیٹ میں کھُل کھیل رہی تھیں۔

میں آپ کو ایک لطیفہ سناؤں۔

میرے بھائی جان! سعید حسن بیرسٹر، جزائر فجی سے ایک مدّت کے بعد امرتسر جانے کے لئے تشریف لائے۔ انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ وہ بذریعہ ہوائی جہاز آ رہے ہیں۔ ان دنوں میں میں ماہم میں رہتا تھا اور ہمارا فلیٹ بہت ہی چھوٹا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا۔ مصوّر کے ایڈیٹر نذیر لدھیانوی بھی موجود تھے۔ طئے یہ پایا کہ ان کو اس فلیٹ میں ٹھہرایا جائے جہاں نذیر اور شوکت دونوں اکھٹے رہتے ہیں۔

یہ فلیٹ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، بہت بڑا تھا۔ نذیر چھڑا چھٹانک تھا۔ شوکت تھا، اس کی نور جہاں تھی۔ ان کو تو بس فقط ایک بیڈ روم چاہئے تھے۔ باقی کمروں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے بھائی جان کے لئے جو یوروپی طرزِ رہائش کے عادی تھے۔ ایک علیحدہ کمرے اور غسل خانے کا انتظام بڑی آسانی سے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بمبئی تشریف لائے اور چند روز کے لئے وہاں رُکے تو میں انھیں کیڈل روڈ پر لے گیا۔

وہ یہ فلیٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ عمارت قریب قریب نئی تھی، جدید طرز کی، دو منزلہ تھی۔ اوپر کی منزل میں صاحبِ مکان رہتے تھے۔ پچھلی طرف یعنی جدھر سمندر کا ساحل تھا، کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا بغیچہ تھا۔ اس میں بچوں کے کھیلنے کے لئے جھولے تھے اور وہ جنھیں انگریزی میں ''سی سا'' کہتے ہیں اور وہ پھسلنے والے تختے!

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سمندر کی مرطوب ہوا ہر وقت آتی رہتی تھی۔ بعض اوقات یہ اس قدر تیز ہو جاتی تھی کہ فلیٹ کے وہ تمام دروازے، وہ تمام کھڑکیاں، جن کا رخ سمندر کی طرف تھا، بند رکھنا پڑتی تھیں کہ چیزیں اپنی جگہ سلامت رہیں۔

اس فلیٹ میں بھائی جان اپنے مختصر سے اسباب کے ساتھ اترے اور بہت خوش ہوئے۔ لیکن چند ہی روز میں ایک ٹریجڈی وقوع پذیر ہو گئی۔

شوکت، نور جہاں کو دوبارہ پا کر بہت خوش تھا۔ اس خوشی کا نکاس کسی نہ کسی طرح نفسیاتی طور پر ہونا ہی چاہئے تھا۔ پھر مرزا مشرف تھا، شوکت کی دیگ کا بہت بڑا چمچہ، چاولہ تھا، سہگل تھا اور دوسرے تھے جو شوکت کے فلم میں شریک ہونے کے لئے بے قرار تھے۔

فلمی دنیا دراصل رات کی دنیا ہے۔ دن بھر یہ سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے اور سرِ شام شوکت کے ہاں جمع ہو جاتے تھے۔ وسکی کے دور چلتے تھے۔ سوقیانہ قسم کی ہنسی ٹھٹھے ہوتے تھے۔ گانے گائے جاتے تھے۔ کہانیاں سنائی جاتی تھیں اور بعض اوقات تو اتنا شور برپا ہوتا تھا کہ اوپر کی منزل والوں کو پکار پکار کر کہنا پڑتا تھا کہ بابا خاموش رہو۔

ایک رات شوکت نے غالباً ایم اے مغل کو جو پری چہرہ نسیم بانو کے ڈھنڈورچی کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اپنے ہاں مدعو کیا۔ مرزا مشرف بھی تھے، میں بھی تھا اور میری بیوی بھی تھی۔ دعوت طعام سے فارغ ہو کر میں اور میری بیوی تو فوراً چلے گئے کہ ہمیں ایک ضروری کام سے کہیں جانا تھا۔ بھائی جان شوکت علی کے بیٹے زاہد کے ہاں مدعو تھے۔ وہ دیر سے لوٹے۔ مگر جب انھوں نے ہال میں قدم رکھا تو دیکھا کہ رندی و سرمستی اپنے بال کھولے ناچ رہی ہے۔ وہ ہاؤ ہو ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ معلوم نہیں، انھوں نے اور کیا کچھ دیکھا کہ صبح ہوتے ہی اپنا سامان بندھوا کر خلافت ہاؤس چلے گئے اور مجھے اور میرے دوستوں کو اس قدر تند و تیز لہجے میں برا بھلا کہا کہ اب میں نے اس واقعہ کو یاد کیا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اتر رہا ہے۔

انھوں نے اصل میں اپنی ساری زندگی قانون کی کتابوں میں گزاری تھی۔ ساری عمر مقدمے لڑتے رہے تھے۔ لاہور میں، بمبئی میں، مشرقی افریقہ اور جزائر فجی میں۔ ان کو کیا معلوم کہ فلمی دنیا کیا ہوتی ہے؟ اور اس کے عاشق و معشوق کس قسم کے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ اور خلافت ہاؤس میں جا کر پناہ لی۔ پر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ خلافت ہاؤس ایک ایسی گلی میں واقع ہے جس کا نام ”لو لین“ ہے۔ یعنی محبت کی گلی۔

یہ قصہ تو خیر ضمناً آ گیا کہ زیبِ داستان کے لئے ضروری تھا۔ اب میں نور جہاں کی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

طرف لوٹتا ہوں۔ جس کی بڑی بہن وہیں کیڈل روڈ پر پاس ہی اپنے بھائی کے ذریعہ سے پیشہ کراتی تھی مگر پرائیویٹ طور پر ____ مجھے معلوم نہیں کہ یہ دونوں بہنیں آپس میں ملتی تھیں یا نہیں، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، شوکت نے اس کی اجازت نورجہاں کو کبھی نہ نہیں دی ہوگی۔

نورجہاں کا بھائی پرلے درجے کا جواری تھا۔ سٹہ کھیلتا تھا۔ تاش کے پتوں پر داؤ لگاتا تھا۔ ریسوں میں جاتا تھا۔ اس کو ظاہر ہے کہ نورجہاں اور شوکت کا ملاپ سخت شاق گزرا تھا۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں۔ اس نے چچا نظامی سے مل کر بہت کوشش کی کہ وہ پھر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور نورجہاں ان دونوں کی روزی کا ٹھیکرہ بن جائے۔ مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔

شوکت کو ہر قسم کی دھمکیاں دی گئیں مگر وہ بھی ایک دبنگ آدمی ہے، اس نے ان کی کوئی پرواہ نہ کی اور نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ یہ محاذ بالکل خاموش ہوگیا۔

فلم ''نوکر'' کی شوٹنگ جاری تھی۔ رفیق اس کی موسیقی مرتب کر رہا تھا۔ بظاہر وہ اپنے کام میں پورے انہماک سے دلچسپی لیتا تھا، مگر میں صاف محسوس کرتا تھا کہ رفیق غزنوی ہر وقت الجھن سی محسوس کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی عین ناک کے نیچے (یہ بھی انگریزی محاورہ ہے) ایک اور شخص اس لونڈیا کو اڑا لے گیا تھا جس پر اس کی عشق پیشہ آنکھ تھی۔

بہر حال فلم ''نوکر'' کی تکمیل افتاں و خیزاں جاری تھی۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ شوکت فلم سازی کے معاملے میں بے حد متلون مزاج ہے۔ اس کو ایک آدمی کا کام پسند نہیں آتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس کو فقط ایک آدمی کے کام سے اطمینان نہیں ہوتا۔ میں نے اس کو کہانی کا منظر نامہ معہ مکالموں کے لکھ کر دے دیا تھا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ خفیہ طور پر کئی آدمیوں سے مکالمے لکھوا رہا ہے۔ ان میں ہمارے بزرگ اشک عظیم آبادی بھی تھے۔ مجھے بہت تاؤ آیا۔ جہاں تک اشک صاحب کا تعلق تھا، مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ مگر دوسروں کو میں قطعاً برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بڑے گرم الفاظ میں شوکت سے اپنی شکایت کا اظہار کیا۔ آدمی سمجھدار ہے۔ حکمتِ عملی سے کام لے کر اس نے میرے دماغ پر برف کی کئی سلیں رکھ دیں۔ مگر میں دل برداشتہ ہو چکا تھا کیونکہ کہانی بھی میری مرضی کے مطابق نہیں لکھی گئی تھی۔ اور اس کے ہر کونے اور ہر موڑ پر شوکت نے اپنی من مانی کی تھی۔

میں بڑا ہٹ دھرم اور ضدی آدمی ہوں، لیکن شوکت کے سامنے میری کوئی پیش نہ چلتی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے چند دن اس کے ساتھ کام کر کے قطعی طور پر جان لیا تھا کہ یہ شخص جو میرے ساتھ ہرن مارکہ وسکی اور کریون اے کے سگریٹ پیتا رہا ہے اور میری ہر بات مانتا رہا ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

فلم سازی کے معاملے میں وہی کچھ کرے گا جو اس کا گھڑی ساز دماغ مناسب سمجھتا ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ دبے پاؤں فلم "نوکر" کی پروڈکشن سے باہر نکل جاؤں گا۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ شوکت چونکہ میرے اڑیل مزاج سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے میرے اس فرار کو سکون کے لئے اچھا ہی سمجھا۔ کیونکہ بہت ممکن تھا کہ اگر میں کسی نکتے پر اڑ جاتا تو فلم کی شوٹنگ مہینوں تک کھٹائی میں پڑی رہتی۔

مجھے اس سے شکایت تھی۔ اس کو بھی اپنی جگہ یقیناً ہوگی۔ مگر ہمارے دوستانہ تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ ملک میں سیاسی گڑبڑ کے باعث فلم انڈسٹری کی حالت بالکل چھوئی موئی کی سی تھی۔ کسی نے اسٹول پر چڑھ کر "انقلاب زندہ" کا نعرہ لگایا تو کئی فلموں کا اسقاط ہو جاتا تھا۔ یوں بھی ان دنوں جنگ کے باعث خام مال قریب قریب نایاب تھا۔ حالات چونکہ غیر یقینی تھے۔ اس لئے بہت کم فلم ڈائریکٹروں کی مالی حالت اچھی تھی۔ پروڈیوسروں کے پاس ایک گھڑا گھڑایا اور بہت معقول بہانہ موجود تھا کہ روپیہ کہاں سے لائیں؟ جنگ شروع ہے۔ آج کریٹ کی لڑائی ہے اور کل فن لینڈ کی۔ پرسوں جاپان کے حملے کا خطرہ ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہی وہ زمانہ تھا کہ جب پروڈیوسروں اور سرمایہ لگانے والوں نے جھولیاں بھر بھر کے کمایا۔

شوکت کا اس دوران میں ایک اور جگہ کنٹریکٹ ہوا۔ غالباً سیٹھ زویری (بمبئی میں جوہری کی بگڑی ہوئی شکل) ہے ___ یہ ایک بڑا برخود غلط قسم کا انسان تھا۔ بڑے ادنیٰ درجے سے تعلق رکھتا تھا، مگر جنگ نے اسے سیٹھ بنا دیا تھا۔ اب وہ کھُل کھیلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فلم کمپنی کھڑی کردی تھی۔ دو چار موٹریں لے لی تھیں۔ اونچی جگہوں پر تو اس کا ہاتھ نہ پہنچتا تھا مگر وہ ایکسٹرا لڑکیوں کو پھانسنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

اس سیٹھ سے شوکت کا کنٹریکٹ ہوا۔ تو اس نے تین ہزار روپے پیشگی دیئے۔ میں شوکت کے ساتھ تھا۔ جب چیک کیش ہو گیا تو میں نے روپے اس سے لے لئے اور اس سے کہا۔

"چلو! ڈاک خانے چلیں۔"

ڈاک خانے پہنچ کر میں نے وہ روپے سب کے سب ہی شوکت کے گھر رجسٹری اور بیمہ کرا کے بھیج دیئے۔ میرا خیال ہے نورجہاں کو میری یہ حرکت یقیناً ناگوار گزری ہوگی۔ لیکن میرا اس سے کیا سروکار؟

اسی دوران میں شوکت کو میں نے مجبور کیا کہ وہ اپنی زندگی کا بیمہ کرالے۔ وہ میری باتوں کو بہت کم رد کرتا تھا، فوراً مان گیا۔ چنانچہ دس ہزار روپے کی پالیسی لے لی گئی۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

معلوم نہیں میں یہ سب کچھ کیوں کر رہا تھا۔ میں اب سوچتا ہوں تو مجھے اپنی یہ سب باتیں اور یہ تمام حرکات بزرگانہ ہونے کے بجائے طفلانہ معلوم ہوتی ہیں۔ صاف اوروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت والا معاملہ تھا۔

نور جہاں اب خوب نکھر گئی تھی۔ مرد کی قربت بھی عورت کے حسن کے لئے کتنی ضروری ہوتی ہے ــــ اس کے جسم کے خطوط اب واضح شکل اختیار کر چکے تھے۔ وہ تمام خالی جگہیں جو لاہور میں پُر نہ ہوئی تھیں، یہاں بمبئی میں پُر ہو گئی تھیں۔ اور اس پر جسم کی لذتوں کے قریب قریب تمام اسرار منکشف ہو چکے تھے۔ نور جہاں گو اب بھی لوگوں کی زبان پر "بے بی نور جہاں" تھی۔ مگر وہ عشق و محبت کا جھولا جھول جھول کر ان تمام جھونٹوں سے آگاہ ہو چکی تھی جو اسکی رسیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

ایک دن آؤٹ ڈور شوٹنگ تھی۔ بمبئی کے مضافات میں کسی کا ایک خوبصورت باغ تھا۔ جس کو شوکت نے منتخب کیا تھا۔ کیمرے کے لینس کے ساتھ ریڈ فلٹر لگا کر منظر کشی کرنا تھا کہ دن کی بجائے رات معلوم ہو اور جو دھوپ ہو وہ چاندنی نظر آئے۔

شوکت نے اصرار کیا کہ میں اس کے ساتھ ضرور چلوں۔ مجھے دیر ہو گئی۔ اس لئے میں سیٹھ ویاس کی گاڑی میں وہاں پہنچا۔ نور جہاں کو میں نے لوکیشن پر دیکھا تو میری آنکھوں کو زبردست دھکا لگا۔ عجیب وغریب لباس پہنے تھی۔ لباس کی وضع قطع میرے لئے نئی نہیں تھی۔ معمولی شلوار قمیض تھی۔ مگر اس میں آنکھوں کیلئے بڑی خارش پیدا کرنے والی حدت تھی۔

شلوار جالی کی تھی۔ جسے انگریزی میں "نیٹ" کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ کپڑا کھڑکیوں کے پردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ معلوم نہیں یہ نور جہاں کی اپج تھی یا سید شوکت حسین رضوی کی۔ مگر وہ یہ لاکھوں کھڑکیوں والی شلوار پہنے تھی۔ جس میں اس کی ٹانگیں بغیر کسی تکلیف کے چھن چھن کے باہر آ رہی تھیں۔ قمیض بھی اسی کپڑے کی تھی۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ اس ملبوس نے نور جہاں کو ڈھانکنے کی کتنی کوشش کی ہوگی۔!

شوبھنا سمرتھ بھی موجود تھی۔ نور جہاں کو اس لباس میں دیکھ کر واللہ میں تو بوکھلا گیا تھا۔ ایسا لباس، پھر روشنی کے پیش منظر میں۔ میں نے اپنی زخمی نگاہیں ادھر سے ہٹائیں اور شوبھنا کے پاس چلا گیا ــــ کہ وہ مستور تھی۔

شوبھنا سمرتھ تعلیم یافتہ عورت ہے۔ گفتگو کا سلیقہ رکھتی ہے۔ چونکہ اچھے مرہٹی خاندان کی ہے۔ اس لئے اس میں بلگٹ پن (بمبئی کی زبان میں) نہیں۔ بڑی ہی باتمیز عورت ہے۔ وہ بھی اس فلم میں کام کر رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ گھاس کے ایک تختے پر بیٹھ گیا اور اپنی وہ کوفت اور اپنا وہ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

الحمد لائبریری

تکدّر دور کرتا رہا جو نور جہاں کا کھڑکیوں والا لباس دیکھ کر میرے دل و دماغ میں پیدا ہوا تھا۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ مجھے فلم ''نوکر'' سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ شوکت اپنی من مانی کر رہا تھا۔ اور میں اس میں دخل دینے سے کتراتا تھا کہ میرے اور اس کے تعلقات کہیں خراب نہ ہو جائیں۔

نور جہاں سے اس کے گھر میں کئی مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے اس کا جب بھی اور زیادہ غور سے مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی ہے، اسی کی خصوصیات اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کی ہر ادا میں اور ہر حرکت میں ایک بناوٹی ادا تھی، ایک نخرہ تھا جسے سنجیدہ نگاہیں شاید ہی قبول کر سکیں۔

مجھے تعجب ہے، کہ سیٹھ شوکت ٹھیٹھ ہندوستانی (یعنی یو۔پی کا باشندہ) اور وہ ٹھیٹھ پنجابی، ایک لحاظ سے ''جٹنی۔'' گاؤں کی مٹیار لیکن دونوں بہت خوش تھے۔ شوکت پنجابی نما اردو بولنے کی کوشش کرتا اور وہ اردو نما پنجابی۔ خاصی دلچسپ چیز تھی۔

فلم ''نوکر''، ختم ہوئی تو شوکت اور میرے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ وہ عشق کے جھولے جھول کر اب کاروباری دھندوں میں مشغول ہو گیا تھا، اور میں اپنے کاموں میں۔ گاہے گاہے کسی فلم کمپنی کے دفتر میں، یا سڑک پر اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ مگر وہ بھی چند منٹوں کی، خیر خیریت دریافت کی اور اپنی اپنی راہ لی۔

''فلم انڈسٹری کی حالت اب بہتر تھی۔ جنگ کا خوف پروڈیوسروں کے سر سے اتر چکا تھا۔ اور فلم انڈسٹری کے تمام متعلقین کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ زمانہ کمانے کا ہے۔ چنانچہ لاکھوں روپے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔

شوکت ذہین ہونے کے علاوہ کاروباری آدمی بھی ہے۔ چنانچہ اس نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور کچھ عرصے کے بعد اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی اور ایک بڑی کامیاب فلم بنائی۔ یوں تو اس کی ساکھ پہلے ہی قائم تھی کہ فلم انڈسٹری کے لوگ اسے ایک قابل ڈائریکٹر اور ماہر ایڈیٹر مانتے تھے لیکن جب اس نے اپنی ذاتی فلم کمپنی کھڑی کی تو انڈسٹری کے حلقوں میں اس کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔

عام طور پر ڈائریکٹر یا پروڈیوسر فلمی دنیا میں کسی ایکٹریس سے صرف اس لئے شادی کرتے ہیں کہ وہ ان کی کشتیٔ حیات میں پتوار کا کام دے۔ معلوم نہیں شوکت نے نور جہاں سے کیا اسی مقصد کے پیشِ نظر شادی کی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اس سے شادی نہ بھی کرتا تو بھی اس کی آمدنی میں روز افزوں ترقی ہوتی رہتی۔ اس لئے کہ وہ اپنے فن کو جانتا ہے اور پھر مزدوروں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کی طرح مشقت کر سکتا ہے۔

مجھے معلوم نہیں، شوکت بمبئی کو چھوڑ کر پاکستان کیوں آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بڑا کٹر قسم کا مسلمان ہے۔ اگر وہاں بمبئی میں کسی نے مسلمانوں کے خلاف ایک جملہ بھی کہہ دیا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس کی کھوپڑی پیچ کش سے کھول دیتا اور اس کی اصلاح کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نور جہاں نے اسے مجبور کیا ہو کہ اسے لاہور بہت پیارا ہے۔ کیونکہ پنجابیوں کے کہنے کے مطابق "لاہور لاہور ہے۔"

بمبئی میں وہ بہت کامیاب تھا۔ اس نے ایک دو فلم ایسے بنائے تھے جن سے اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی، وہ کروڑوں روپے وہاں پیدا کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے پاکستان کو اپنا گھر بنایا۔ اس کا گھڑی ساز دماغ جو سوئی کی ایک خفیف سی غلط حرکت کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہاں پاکستان کی فلم انڈسٹری کے لئے جو حالت نزع میں تھی، کام آیا۔

اس نے شوری کا جلا ہوا، سڑا ہوا، نہایت شکستہ، اسٹوڈیو حاصل کیا اور اسے ایک اعلیٰ ترین نگار خانے میں تبدیل کر دیا۔

آپ میں سے بہت کم حضرات جانتے ہوں گے کہ شاہ نور اسٹوڈیو میں جو بھی کیل ٹھکی ہے، اس میں سوکت حسین رضوی کا ہاتھ ہے۔ جو پیچ لگا ہے، اس پر شوکت کے پیچ کش کا نشان ہے۔ وہاں چھوٹے سے بوٹے سے لے کر لیبارٹری کی بھاری بھرکم مشینری تک سب اس کے ہاتھ کی لگی ہے۔

یہ بہت بڑا وصف ہے ___ اتنا بڑا کہ اس کے اور دوسروں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ ہر بات میں عملی طور پر دخل دینے سے اس نے کئی گڑ بڑ گھوٹالے (بمبئی کی زبان میں) کئے ہیں۔ یوں وہ بڑے ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ لیکن میں آپ کو ایک پُر لطف قصہ سناتا ہوں۔

یہاں لاہور میں آ کر بھی وہ میرا دوست ہے۔ اکثر میری مدد کرتا رہا ہے۔ ایک بار میں اس کے پاس گیا۔ اس کی بے داغ سفید قمیض کے بٹن موجود نہیں تھے۔ میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کیا قصہ ہے؟

اس نے مسکرا کر کہا: "کیا بتاؤں یار ___ پیسے ہی نہیں کہ بٹن خرید سکوں۔"

جب میں نے اس سے سگریٹ طلب کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ دس روز سے وہ سگریٹ ادھار لے رہا ہے ___

یہ اس شخص کی حالت تھی جس کے اسٹوڈیو میں لوگوں کو ریفریجریٹر کا ٹھنڈا پانی ملتا ہے۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جہاں پر پھول کھلتے ہیں۔ جہاں کئی مالی کام کرتے ہیں۔ جہاں سینکڑوں مزدور ہیں۔ جہاں نور جہاں ہے، جو اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے پہنتی ہے۔ اور موٹروں میں گھومتی ہے۔

نور جہاں کے متعلق کئی افواہیں مشہور ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ حقیقت پر مبنی بھی ہوں۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ دو نہایت پیارے بچوں کی ماں ہے جو چیفس کالج کے صاف ستھرے ماحول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور وہ ان سے پیار کرتی ہے۔

پچھلے دنوں چیفس کالج میں ایک جلسہ تھا۔ جس میں چند ننھے منے بچوں نے حصہ لیا تھا۔ اس میں ایک ڈانس تھا، رادھا کرشنا ڈانس۔ نور جہاں کا بڑا لڑکا ایک گوپی بنا ہوا تھا۔ اس نسوانی لباس میں وہ بہت پیارا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا رقص بھی بہت خوب تھا۔

نور جہاں یقیناً رقص جانتی ہے۔ معلوم نہیں اس نے اپنے اکبر کو خود تعلیم دی ہے یا وہ خود بخود خون کے ذریعے سے یہ سب کچھ سیکھا ہے۔ بہر حال اب دیکھنا یہ ہے کہ اکبر، اور اصغر جو کہ چیفس کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، آگے چل کر کیا بنتے ہیں؟

کیا یہ بیری موروں اور پرتھوی راجوں کا خاندان بنے گا؟ ــــــ فی الحال ہم اس کے متعلق کیا کچھ کہہ سکتے ہیں؟

نور جہاں ذرا بد دماغ ہے۔ اس کو اپنے حسن پر تو ناز نہیں ہونا چاہئے کہ ایسی کوئی چیز اس میں نہیں ہے۔ ایک فقط آواز ہے، گلا ہے، جو نور سے بھرا ہے۔ اس پر اگر اسے ناز ہے تو بجا ہے۔ مگر بد دماغ ہونے کا پھر بھی کوئی صحیح جواز نہیں۔

مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ میری بیوی نے بمبئی میں مجھ سے کہا۔ ''آپ نور جہاں کو جانتے ہیں۔ وہ ہمارے گھر کئی مرتبہ آ چکی ہے۔ کیا وہ اب نہیں آ سکتی۔ میری چند سہیلیاں اس سے ملنا چاہتی ہیں۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''کیوں نہیں آ سکتی۔ ہزار مرتبہ آ سکتی ہے۔''

میں نے شوکت سے کہا تو اس نے دوسرے ہی روز اسے بھیج دیا۔ میں نے بہت سی ایکٹریسیں دیکھی ہیں۔ بڑے اونچے پائے کی، بہت مشہور، بہت معروف، مگر ان میں مجھے وہ تکلف نظر نہ آیا جو نور جہاں میں ہے۔ وہ بنتی ہے۔ اس کی مسکراہٹ، اس کی ہنسی، اس کا سلام، اس کی مزاج پرسی، سب مصنوعی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں یہ چیز اس کی طبیعت میں کیسے داخل ہوئی۔ بعض اوقات جب میں اس کی اور شوکت کی ازدواجی زندگی کا تصور کرتا ہوں تو مجھے وہ بھی مصنوعی سی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن! خدا کا شکر ہے کہ ایسی نہیں!

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نور جہاں آئی، سب سے بڑے پر خلوص، تپاک سے مجھے میں اب بھی مصنوعی سمجھتا ہوں، ملی۔ میں تو چاہتا تھا کہ عورتوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں کہ وہ آزادانہ طور پر گفتگو کر سکیں گی۔ مگر میری بیوی کی ایک سہیلی نے اصرار کیا کہ میں موجود رہوں اور نور جہاں سے کہوں کہ وہ گانا گائے۔

چنانچہ میں نے فوراً بڑے بے تکلف انداز میں نور جہاں سے کہا کہ بھئی ایک دو گانے ہو جائیں کہ یہ لوگ تمہاری آواز کا ''زندہ ناچ و گانا'' سننا اور دیکھنا چاہتی ہیں۔

نور جہاں نے ایک پر تکلف ادا سے جواب دیا۔ ''نہیں منٹو صاحب! پھر کبھی ____ میرا گلا ٹھیک نہیں۔''

میں کباب ہو گیا ____ اس کا گلا بالکل ٹھیک تھا۔ اس کا گلا فولاد کا گلا ہے جو کبھی خراب ہی نہیں ہو سکتا۔ صریحاً نخرے کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پھر کہا۔ ''نور جہاں! یہ بہانہ نہیں چلے گا ____ تمہیں گانا پڑے گا۔ میں تو تمہیں ہزار مرتبہ سن چکا ہوں۔ مگر ان لوگوں کو اشتیاق ہے، اس لئے تمہیں اچھے بُرے گلے کے ساتھ ہی گا دینا چاہئے۔''

بہت دیر تک اُدھر سے انکار، اِدھر سے اصرار ہوتا رہا۔ میری بیوی نے کہا، جانے دو، جب وہ نہیں گانا چاہتیں تو آپ اس قدر زور کیوں دیتے ہیں۔ مگر...... میں بھی ایک ضدّی ہوں، نور جہاں کے پیچھے پڑ گیا۔ آخر اس کو فیض کی وہ غزل گانی پڑی۔ آج کی رات سازِ دردنہ چھیڑ کم بخت نے کیا دھن بنائی تھی اور کیا آواز تھی کہ اب اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی میرے کان اس شہد بھری آواز کو سن سکتے ہیں۔

نور جہاں کے کئی عاشق ہوں گے۔ میں ایسے کئی باورچیوں کو جانتا ہوں جو چولھے کے پاس نور جہاں کی تصویریں لگا کر اپنے صاحبوں اور میموں وغیرہ کا کھانا پکاتے ہیں اور اس کے گائے ہوئے گیت اپنی کن سری آوازوں میں گاتے ہیں۔

گھروں کے ان نوکروں کو بھی میں جانتا ہوں جو گی ہرگس اور کامنی کوشل کو پسند نہیں کرتے لیکن نور جہاں کے والہ و شیدا ہیں۔ جہاں کہیں اس کی تصویر مل جائے، کاٹ کر اپنے ٹوٹے ہوئے ٹرنک میں رکھ لیتے ہیں، اور فرصت کے وقت دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکتے ہیں۔ اور نور جہاں کو اگر کوئی بُرا کہے تو لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

اور میرے گھر میں اس کا ایک عاشق زار موجود ہے۔

وہ ہر خوبصورت لڑکی، ہر دلہن، ہر سرخ پوش عورت کو نور جہاں کہتا ہے۔ اس کو نور جہاں کے گائے ہوئے گانے قریب قریب سب یاد ہیں۔ وہ خود بھی بڑا حسین ہے لیکن جانے اسے

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نور جہاں کی کون سی ادا بھا گئی ہے کہ وہ دن رات اسی کا ذکر کرتا ہے۔

وہ میرا قریب ترین عزیز ہے۔ میری سالی اور میرے بھانجے کا لڑکا ہے۔ اس کا نام شاہد جلال ہے۔ ہم سب اسے پیار سے ٹا کو کہتے ہیں۔ اس کو ہم سب بہت سمجھا بجھا چکے ہیں کہ دیکھو تم نور جہاں کا خیال چھوڑ دو۔ وہ ایک بیاہتا عورت ہے۔ جس کے کئی بچے ہیں۔ تمہاری اور اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ نہیں مانتا۔

فلم دیکھتا ہے لیکن اگر اس میں نور جہاں نہ ہو تو اسے بہت کوفت ہوتی ہے۔ یہ کوفت وہ گھر آ کر نور جہاں کے گائے ہوئے گانے گا کر دور کرتا ہے۔ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے کہتا ہے کہ مجھے اور کوئی نہیں چاہئے، صرف نور جہاں چاہئے۔

پچھلے دنوں اس کے دادا میاں جلال دین، شوکت رضوی کے پاس گئے تھے اور انھوں نے اس سے کہا تھا کہ دیکھو! تمہاری بیوی کا ایک عاشق پیدا ہو گیا ہے جو بری طرح اس پر لٹو ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی روز نور جہاں کو لے اڑے اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔

وہ بہت حیران ہوا۔ اس لئے کہ میاں صاحب موصوف نے یہ بات شوکت کو بتائی تھی۔ پہلے تو وہ جھینپا ـــــ پھر اس نے پوچھا۔ ''میاں صاحب! وہ کون شخص ہے؟''

میاں صاحب نے مسکرا کر اس سے کہا۔ ''میرا پوتا۔''

''آپ کا پوتا؟ ـــــ کیا عمر ہے اس کی؟''

میاں صاحب نے جواب دیا ـــــ ''یہی! چار برس کے قریب۔!''

یہ حال ہی کی بات ہے۔ نور جہاں نے جب یہ ساری بات سنی تو بہت محظوظ ہوئی۔ اس نے کہا۔ ''میں خود اپنے عاشق کے پاس جاؤں گی اور اس سے شادی کر لوں گی۔''

شاہد جلال بہت خوش ہے۔ وہ اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہا ہے۔ جب نور جہاں خود اس کے پاس چل کر آئے گی۔ اور وہ اسے اپنی دلہن بنا لے گا۔

پچھلے دنوں نور جہاں کے ایک اور عاشق کا قصہ سننے میں آیا تھا۔ مگر وہ چار برس کا نہیں تھا۔ اچھا خاصا جوان تھا اور غالباً نائی یعنی حجام تھا۔ ہر وقت اس کے گائے ہوئے گانے گاتا رہتا تھا اور اسی کی باتیں کرتا تھا۔ ایک آدمی نے اس سے کہا۔ ''کیا واقعی تمہیں نور جہاں سے محبت ہے؟''

حجام نے بڑے پُر خلوص انداز میں اسے جواب دیا۔

''اس میں کیا شک ہے۔''

''اس کے دوست نے اس کا امتحان لینا چاہا۔''

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

''اگر تمہیں اس سے سچی محبت ہے تو کیا مہیوال کی طرح تم اس کے لئے اپنا گوشت دے سکتے ہو؟ کہ کباب بنا کر اسے بھیجے جائیں؟''

حجام نے تیز استرا نکال کر اپنے دوست کے ہاتھ میں دے دیا اور اپنے دوست سے کہا۔ ''جہاں سے چاہو، تم میرا گوشت کاٹ لو۔''

اس کا دوست بھی معلوم نہیں، کس قسم کا انسان تھا کہ اس نے اس کے بازو سے پاؤ بھر گوشت کا ٹکڑا استرے سے کاٹ کر الگ کر دیا اور خود بھاگ گیا، کہ حجام صاحب اس قربانی کے بعد خون کے بہاؤ کے باعث بے ہوش ہو گئے۔

اس عاشقِ زار کو جب میو ہسپتال میں داخل کیا گیا اور جب اس کو تھوڑا سا ہوش آیا تو اس کی زبان پر نور جہاں کا نام تھا۔

شوکت حسین رضوی کی بیگم اور دو بچوں کی ماں نور جہاں کا تازہ عشق بہت رسوا کن ثابت ہوا ہے۔ واقف کار حلقوں کا بیان ہے کہ نور جہاں ایک عرصے سے کرکٹ کے مشہور کھلاڑی نذر محمد کی جوانی اور وجاہت سے بے حد متاثر نظر آتی تھی۔ ان کی ملاقاتیں اکثر شک و شبہ کی نظروں سے دیکھی جاتی تھیں۔ اور بار ہا ان ملاقاتوں کی وجہ سے شوکت اور نور جہاں کی مقابل زندگی میں شدید بدمزگی پیدا ہو چکی تھی۔ اس جوڑے کے حالات سے دلچسپی رکھنے والے (اور شاید خود شوکت بھی) ممکن ہے اس کے رومان کو اس لئے وقعت نہ دیتے ہوں کہ اب وہ دو بچوں کی ماں بن چکی ہے اور زندگی کے متعدد پُر شباب سال شوکت کی بیوی کی حیثیت سے بسر کر چکی ہے، خود بخود سنبھل جائے گی کہ میاں بیوی کی زندگی میں ایک عورت نے داخل ہو کر قیامت برپا کر دی۔ شاہ نور اسٹوڈیو میں ایک نئی لڑکی نگہت سلطانہ ایکٹریس بننے کے لئے آئی۔ شوکت اس کے حسن و جمال سے بے حد متاثر ہوا۔ اور نور جہاں ان دونوں کی باہمی دلچسپی سے سوتیا ڈاہ محسوس کرنے لگی۔ چنانچہ معاملہ جب کچھ اور آگے بڑھا تو قصور کی جٹی نور جہاں نے ایک دن اسٹوڈیو میں ہی نگہت سلطانہ کو چٹیا سے پکڑ کر امریکن فری اسٹائل کے ایسے ایسے ہاتھ دکھائے کہ اگر ہیروئن اور شوکت حسین کی محبوبہ بن کر شاہ نور اسٹوڈیو پر حکومت کرنے کے خواب دیکھنے والی اس ایکٹریس کے ایک دو ہمدرد ہمت سے کام لے کر اسے نور جہاں کے پنجوں سے نہ چھڑاتے، تو اس روز شاہ نور اسٹوڈیو میں نئی ہیروئن کا جنازہ ہی دھوم دھام سے نکلتا۔

اس حادثہ سے بچ نکلنے کے بعد نگہت سلطانہ عدالت میں جا پہنچی۔ لیکن واقعہ چونکہ شاہ نور اسٹوڈیو میں ہوا تھا۔ جہاں ''میڈم'' یعنی ''بے بی نور جہاں''۔ بے تاج ملکہ کی مانند حکومت

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کرتی ہے۔ اس لئے استغاثہ ناکام رہا۔ لیکن اس حادثہ نے شوکت اور نور جہاں کے دلوں میں زہر بھر دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ اس واقعہ سے نور جہاں کے پرانے محبوب نذر کو نور جہاں کے قریب آ جانے کا موقع مل گیا۔ نور جہاں بھی ہموار ہو گئی۔ دونوں کی نئے سرے سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔

نذر اور نور جہاں کی عشق بازی کا یہ سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہتا اور یہ انتقامی محبت نہ معلوم کیا صورت اختیار کر لیتی کہ نور جہاں کی ایک ذاتی خادمہ نے شوکت کو دونوں کی ملاقاتوں سے آگاہ کر کے سب کچھ چوپٹ کر دیا۔

اور آخر ایک دن، جب کہ نور جہاں اپنے عشرت کدہ میں نذر کی آغوش میں مچل رہی تھی کہ شوکت نے دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لینے کے لئے چھاپہ مارا۔ اس بے جا مداخلت پر جب دونوں نے خطرہ محسوس کیا تو نذر اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر دوسری منزل کی کھڑکی میں سے کود پڑا۔ انجانی جگہ اور اندازے کی غلطی کے باعث نذر اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور کلائی کی ہڈی تڑوا بیٹھا۔ اور یوں نور جہاں کے عشق میں کرکٹ کا نامور کھلاڑی ہمیشہ کے لئے کرکٹ کے کھیل سے محروم ہو گیا!

اور نور جہاں بدستور شوکت کے لئے سُر در جان بن گئی۔

نور جہاں کا خاوند بانکا چھبیلا سید شوکت حسین رضوی موجود ہے۔ اس کی خوبصورت اولاد ہے۔ وہ ماں ہے۔ اس کے لئے لاہور کا حجام اپنی ران کا نہیں تو اپنے بازو کا پاؤ بھر گوشت دے سکتا ہے۔ اس ۸ چار برس کا معصوم عاشق شاہد جلال عرف ٹاکو ہے جو ہر وقت اس کو دلہن بنانے کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ وہ باورچی ہیں جو اس کی تصویر چولھے کے پاس رکھ کر کھانا پکاتے ہیں ___ جو برتن مانجھتے وقت اس کے گائے ہوئے گانے اپنی کن سُری آواز میں گاتے ہیں۔ اور یوں اپنی مشقت کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ اور ایک میں ہوں کہ جو اُس کی واہیات انگیا دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں ___ معلوم نہیں، وہ اتنی اُٹھان میں کیا خوبصورتی دیکھتی ہے۔ اور سید شوکت حسین رضوی اس زیادتی کی اجازت کیوں دیتا ہے، جو باذوق نگاہوں پر بہت گراں گزرتی ہے۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.